

خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

جون 2014

# خواتین معاشرہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس ماہ کی خاص پیشکش  
سائبرہ رضا کا سیکل ناول





- |                                                                                                                                                                                                                                   |                                                                                                                                                                    |
|-----------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------|--------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------|
| <p><b>کچھان</b></p> <p>284 آپ کا باورچی خانہ صائمہ عصمت</p> <p>286 جب اچانک مہمان آجائیں صبا سحر</p> <p><b>نفسیات</b></p> <p>288 نفسیاتی ازدواجی الجھنیں حدسان</p> <p><b>بیوی بکس</b></p> <p>290 بیوی بکس کے مشورے امت الصبور</p> | <p><b>رنگارنگ پھول</b></p> <p>266 رنگارنگ سلسلہ شگفتہ جہاں</p> <p>272 خبریں و بریں واصفہ سہیل</p> <p><b>میری بیاض سے</b></p> <p>270 آپ کی بیاض سے خالدہ جیلانی</p> |
|-----------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------|--------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------|

جون 2014  
جلد 42 نمبر 2  
قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آذر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

### سلسلہ ناول

- 80 تنزیلہ ریاض عہد الست
- 116 محبت و اخ کی صورت سائرہ رضا

### ناولٹ

- 230 ماہ تمام آمنہ ریاض

### افسانے

- 70 سمیرا حمید خستہ
- 112 کیمز نور علی حق
- 66 حیا بخاری قرض
- 253 فوزیہ احسان عزت
- 259 فرح بخاری برادرین

### فطیمیں غزلیں

- 265 شکیب جلالی غزل
- 264 شاعر لکھنوی غزل
- 265 یوسف خالد نظم
- 264 کلیم عثمانی غزل

14 مسیر

15 اداف

275 نادرہ خاتون

### آپ سے کیا پوچھوں

20 بڑا غرا اس ملاپ میں ہے انشاہی

### خاتون کی ڈائری

269 میری ڈائری سے امت الصبور

### مجھ سے ملے

22 سمیرا حسن شاین رشید

### انٹرویو

30 رولڈ شوق امت الصبور

26 مایہن خالد شاین رشید

### ناول

36 کوہ گراں تھے ہم عنیزہ سید

202 بن مائیک ڈعا عفت سحر طاہر

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے ہر جوں ماہنامہ شائع اور ماہنامہ کن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی نوعیت میں کاپی یا ڈیجیٹل یا کسی اور طریقے میں اور سلسلہ وار قطع کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔



خواتین ڈائجسٹ جون کا شمار آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ غلطی کرتا ابن آدم کی سرشت میں داخل ہے۔ کون ہے جو دعا کر سکے کہ اس نے کبھی غلطی نہیں کی۔ کچھ غلطیوں کا تعلق فرد کی اپنی ذات سے ہوتا ہے لیکن وہ غلط افعال جو معاشرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ان کے لیے مہذب معاشرے میں قوانین بنائے جلتے ہیں۔ عدالتیں ہوتی ہیں جو غلط صحیح کا تعین کر کے سزا دیتی ہیں۔ ہمارے ہاں قوانین بھی ہیں اور عدالتیں بھی لیکن عدالتوں کے فیصلوں پر عمل درآمد نہیں ہے اور جہاں یہ صورت حال ہو وہاں ہر شخص کی اپنی عدالت اور اپنا قانون ہو تب سے اور منظر نامہ وہی تشکیل پاتا ہے جو آج ہم اپنے ملک میں دیکھ رہے ہیں۔ ان لوگوں نے بھی پتھر اٹھا رکھے ہیں جن کے اپنے دامن صاف نہیں ہیں۔ قوموں کا مزاج، اس کی فکر، سوچ، شعور، دانش و ادب الہائے علم بناتے ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں وہ لوگ جو اہل علم کہلاتے ہیں۔ لوگوں کو باخبر رکھنے کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ وہ آپل میں ہی برسرِ بیکار نظر آ رہے ہیں۔ فیصلے صادر کر رہے ہیں۔ اس رجحان کی خواہش افزائی کی گئی تو یہ کسی کے حق میں بھی بہتر نہیں ہوگا۔ فیصلے کرنے، سزا دینے کا اختیار صرف عدالتوں کو ہے جو قوانین کے مطابق فیصلہ کرنے کی پابند ہیں۔ ان کے علاوہ کسی فرد یا ادارے کو یہ اختیار نہیں دیا جاسکتا۔ بہتر ہے کہ یہ کام عدالتوں پر چھوڑ دیا جائے۔

### رمضان المبارک۔ سروے،

پرچے میں آپ کی شمولیت کے لیے ہم اہم مواقع پر قارئین سے سروے کرتے ہیں۔ جولائی سے رمضان المبارک کے مقدس مہینے کا آغاز ہو رہا ہے۔ جولائی کے شمارے میں اس حوالے سے سروے شامل ہوگا۔ سوال یہ ہے۔

رمضان المبارک کے مہینے میں ہر گھر میں خصوصی اہتمام ہوتا ہے۔ سحری، افطاری کی تیاری کے ساتھ ساتھ عبادت پر بھی خاص توجہ ہوتی ہے۔ آپ رمضان المبارک میں سحری افطاری پر کیا خاص اہتمام کرتی ہیں اور رمضان کی خصوصی عبادت، تلاوت، تراویح وغیرہ کیلئے کیسے وقت نکالتی ہیں۔

### اس شمارے میں،

- سارہ رضا کا مکمل ناول۔ محبت طاع کی صورت،
- تنزیلہ ریاض کا ناول۔ عبد الست،
- آمنہ ریاض کے ناول "ماہ تمام" کی آخری قسط،
- سمیرا حمید حسا بخاری، کنیز نود علی، فرح بخاری اور فوزیہ احسان رانا کے افسانے،
- ٹی وی فنکارہ مایہین خالد سے ملاقات،
- رہ نود شوقی۔ مصنفین سے سروے،
- کرن کرن روشنی۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- ہمارے نام، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور دیگر دلچسپیاں شامل ہیں۔
- خواتین ڈائجسٹ کا یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ اپنی رائے سے آگاہ کیجیے گا۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔ پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

## کرن کرن روشنی

ادارہ

### اللہ کے لیے محبت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "ایک آدمی کسی دوسری بستی میں اپنے بھائی کی زیارت کے لیے گیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے راستے میں ایک فرشتہ بٹھادیا جو اس کا انتظار کرتا تھا جب وہ شخص اس کے پاس سے گزرا تو فرشتے نے پوچھا۔ "تم کہاں جا رہے ہو؟" اس نے کہا۔ "اس بستی میں میرا بھائی رہتا ہے" اس کے پاس جا رہا ہوں۔" فرشتے نے پوچھا۔ "کیا اس کا تم پر کوئی احسان ہے جس کی وجہ سے تم یہ تکلیف اٹھا رہے ہو اور اس کا بدلہ اتارنے جا رہے ہو؟" اس نے کہا۔ "نہیں" صرف اس لیے جا رہا ہوں کہ میں اس سے اللہ کے لیے محبت کرتا ہوں۔"

### اہل خیر کی زیارت

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ "اور جب موسیٰ نے اپنے نوجوان (ساتھی) سے کہا میں تو سفر جاری رکھوں گا یہاں تک کہ میں دو سمندروں (بحر فارس اور بحر روم) کے ملنے کی جگہ پر پہنچ جاؤں یا پھر میں طویل عرصے تک چلتا رہوں گا۔" اللہ تعالیٰ کے اس قول تک۔۔۔ حضرت موسیٰ نے (حضرت خضر سے کہا) کیا میں تیرے ساتھ چلوں میں شرط پر کہ تو مجھے ہدایت کی وہ باتیں سکھائے جو تجھے سکھائی گئی ہیں۔" نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ "روکے رکھ اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ جو پکارتے ہیں اپنے رب کو صبح و شام وہ اس کی رضا کے طالب ہیں۔"



فرشتے نے کہا ”میں تیری طرف اللہ کا فرستادہ ہوں (اور یہ بتانے کے لیے آیا ہوں کہ) اللہ تعالیٰ (بھی) تجھ سے محبت کرتا ہے۔ جیسے تو اس سے صرف اللہ کے لیے محبت کرتا ہے۔ (مسلم)

فائدہ: اس میں محض اللہ کے لیے ایک دوسرے سے محبت کرنے اور ایک دوسرے سے ملاقات کرنے کی فضیلت کا بیان ہے لیکن یہ آج کل مفقود ہے۔ لوگ عموماً ”کسی غرض یا مطلب ہی سے ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ بے شک یہ ملنا جائز ہے مگر نہ کوہ حدیث میں جو فضیلت بیان ہوئی ہے وہ محض اللہ ہی کے لیے ملاقات کرنے پر بیان ہوئی ہے۔

### اچھا سا تھی

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، ”بے شک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”نیک ساتھی کی اور برے ساتھی کی مثال ایسی ہے جیسے کستوری اٹھانے والا اور آگ کی بھیڑی دھونکنے والا ہو۔ چنانچہ کستوری اٹھانے والا یا تو تجھے (کستوری) عطیہ دے دے گا یا تو خود اس سے خرید لے گا۔ (یہ دونوں صورتیں نہ ہوں تب بھی) یا یہ کہ تو اس سے پاکیزہ خوشبو پالے گا اور بھیڑی دھونکنے والا یا تو تیرے کپڑے جلا دے گا یا پھر تو اس سے بدبودار ہو پائے گا۔“ (بخاری و مسلم)

### فوائد و مسائل :

- 1- اس میں نیکوں کی صحبت اختیار کرنے اور برے لوگوں کی ہم نشینی سے اجتناب کرنے کی تلقین کی گئی ہے کیونکہ نیک لوگوں کی صحبت میں عطر فروش کی طرح فائدہ ہی فائدہ ہے کہ ان کے ساتھ رہنے سے اور اٹھنے بیٹھنے سے انسان ان کے اثرات قبول کرے گا اور آہستہ آہستہ ان کے سانچے میں ڈھل جائے گا۔
- 2- بروں کی صحبت بھیڑی کی آگ جلائے پر مامور شخص کی طرح ہے کہ اس سے انسان کو نقصان ہی پہنچے گا، فائدہ کدیں نہیں۔ کسی شاعر کا قول ہے۔ (لا

تصحب الاروی فتروی) گھٹیا لوگوں کے ساتھ نہ رہو کہ تم بھی گھٹیا بن جاؤ گے۔“

### اللہ اور رسول سے محبت

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دہاتی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا۔

”قیامت کب قائم ہوگی؟“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

”تو نے اس کے لیے کیا تیاری کی ہے؟“ اس نے کہا۔

”اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت (یعنی ان کی اطاعت اور ان کے احکام کی فرماں برداری) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”تو ان ہی کے ساتھ ہو گا جن سے تو نے محبت رکھی۔“

(بخاری و مسلم یہ الفاظ مسلم کے ہیں۔)

اور بخاری و مسلم کی ایک اور روایت میں ہے،

(دہاتی نے جواب میں کہا۔)

”میں نے اس (قیامت) کے لیے نہ تو زیادہ (نفلی) روزے تیار کیے ہیں نہ زیادہ (نفلی) نمازیں اور نہ زیادہ صدقہ۔ لیکن میں اللہ اور اس کے رسول سے محبت رکھتا ہوں۔“

### فوائد و مسائل :

- 1- صحابہ کرام رضی اللہ عنہما کی اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت، محض زبان کی حد تک نہیں تھی، جیسے آج کل ہم مسلمانوں کی ہے، بلکہ ان کے ہاں محبت کا مطلب اطاعت اور فرماں برداری کرنا تھا جو فی زمانہ مفقود ہے اور یہی مطلب اس قول کا ہے کہ میں نے زیادہ روزوں اور نمازوں وغیرہ کا تو اہتمام نہیں کیا ہے، یعنی نفلی روزوں اور نمازوں کا اور نہ فرض نمازیں اور فرض روزے اور اسی طرح فرض صدقہ (موکاة) نہایت ضروری ہیں۔ ان کی ادائیگی کے بغیر تو مسلمانی کا یا اللہ اور رسول سے محبت کرنے کے دعوے

کا کوئی اعتبار ہی نہیں ہے۔

2- اگر انسان کو اللہ اور رسول سے محبت ہوگی، جس کا عملی مظاہرہ اس کی زندگی میں فرائض و واجبات اور سنن و احکام کی پابندی سے ہو گا تو پھر اس نے اگر نوافل کا زیادہ اہتمام نہ بھی کیا ہو گا تو اللہ کے ہاں وہ سرخرو قرار پائے گا۔ یہی مطلب اس حدیث کا ہے۔ ورنہ فرائض و سنن کی ادائیگی کے بغیر اللہ و رسول سے محبت کا دعوا فریب نفس کے سوا کچھ نہیں جس کی کوئی قدر و قیمت اللہ کے ہاں نہیں ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان (قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی) کا مفاد اور تقاضا بھی یہی ہے۔

### محبت

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا۔

”اے اللہ کے رسول! اس شخص کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں جو کچھ لوگوں سے محبت رکھتا ہے جب کہ وہ (عمل و تقویٰ میں) ان کے ساتھ نہیں ملا (یعنی ان کے سے اعمال صالحہ اس نے نہ کیے ہیں اور نہ کرنے کی طاقت ہی ہے)“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”آدمی ان کے ساتھ ہو گا جن سے اس کو محبت ہو گی۔“ (بخاری و مسلم)

فائدہ : مطلب یہ ہے دنیا میں عمل کے لحاظ سے ان کو نہیں ملا، لیکن آخرت میں اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اہل خیر و تقویٰ کے ساتھ محبت کرنے کی وجہ سے اسے ان کے ہم رتبہ کر کے ان کے ساتھ ملا دے گا۔ یہ سوال بھی صحابی نے کیا اور جن کی بابت سوال کر رہا ہے وہ بھی صحابہ تھے۔ اس کے باوجود یہ حدیث حکم کے اعتبار سے عام ہے لیکن شرط یہ ہے کہ عقیدہ قرآن و سنت کے مطابق ہو اور حتی المقدور احکام شریعت کی پابندی ہو۔

### آپس میں محبت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے،

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”لوگ سونے چاندی کی کانوں کی طرح (مختلف) کانیں ہیں۔ ان میں سے زمانہ جاہلیت کے بہتر لوگ اسلام میں بھی بہتر ہیں جب کہ انہیں دین کی سمجھ ہو (اور اس پر وہ عامل ہوں) اور وہیں مختلف قسم کے لشکر ہیں۔ چنانچہ ان روحوں میں سے جن کی (عالم ارواح میں) ایک دوسرے سے جان پہچان ہو گئی وہ (دنیا میں) آپس میں مانوس ہیں اور جو وہاں ایک دوسرے سے انجان رہیں وہ (دنیا میں) ایک ایک دوسرے سے الگ ہیں۔“ (مسلم)

### فوائد و مسائل :

- 1- کانیں، ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ کسی سے صاف ستھری چیزیں نکلتی ہیں اور کسی سے ردی۔ یہی حال اخلاق و اعمال کے لحاظ سے لوگوں کا ہے۔ ان میں بھی اچھے اور برے دونوں قسم کے لوگ ہیں۔
  - 2- زمانہ جاہلیت کے اچھے لوگ (یعنی شرف و فضل اور اخلاق و کردار کے اعتبار سے) ایمان لانے کے بعد بھی اگر دین کے تقاضوں کو سمجھیں اور اس پر عمل کریں تو ان کا شرف و فضل اسلامی معاشرے میں بھی زمانہ کفر کی طرح برقرار رہے گا، ایمان و اسلام سے اس میں کمی نہیں آئے گی بلکہ اضافہ ہو گا۔
  - 3- ”روحیں“ مختلف قسم کے لشکر ہیں، کامطلب مزاجوں اور طبیعتوں کا فطری اختلاف ہے۔ جو مزاج خیر پسند ہیں وہ نیکوں کے ساتھ جو شریک ہیں بدوں کے ساتھ متعارف ہوں گے اور دونوں اپنے اپنے اخلاق و کردار کے حامل لوگوں سے ربط و ضبط اور تعلقات رکھیں گے۔
- بعض علماء نے لکھا ہے کہ جو شخص اپنے دل میں اہل خیر و صلاح سے نفرت رکھتا ہے، اسے سوچنا



چاہیے کہ ایسا کیوں ہے۔ یہ تو اس کے انجام بد کی خطرناک علامت ہے اور پھر اپنے اس شریک مزاج کو بدلنے کی سعی کرنی چاہیے۔

### اولیں قرنی رحمۃ اللہ عنہ

حضرت اسیر بن عمرو (ہمزہ پر پیش اور سین پر زیر) اور بعض کے نزدیک اسیر بن جابر سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطاب کے پاس جب بھی اہل یمن میں سے غازیان اسلام آتے تو ان سے پوچھتے: ”کیا تمہارے اندر اولیں بن عامر ہیں؟“ حتیٰ کہ بالآخر (ایک وفد میں) اولیں آگئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا: ”تم اولیں بن عامر ہو؟“

انہوں نے کہا: ”ہاں۔“

آپ نے پوچھا: ”مراد (کے گھرانے) اور قرن (قبیلے) سے تمہارا تعلق ہے؟“

انہوں نے کہا: ”ہاں۔“

حضرت عمر نے پوچھا: ”تمہارے جسم پر برص کے داغ تھے جو صحیح ہو گئے، سوائے ایک درہم جتنے حصے کے؟“

انہوں نے کہا: ”ہاں۔“

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے: ”تمہارے پاس مراد (گھرانے) اور قرن قبیلے کا اولیں بن عامر اہل یمن کے ان غازیوں کے ساتھ آئے گا جو جہاد میں لشکر اسلام کی مدد کرتے ہیں۔ اس کے جسم پر برص کے داغ ہوں گے جو سوائے درہم جتنی جگہ کے صحیح ہو گئے ہوں گے وہ اپنی والدہ کے ساتھ بڑا اچھا سلوک کرنے والا ہو گا۔ اگر وہ اللہ پر کوئی قسم کھالے تو یقیناً اللہ اس کی قسم کو پورا فرما دے گا۔ چنانچہ اگر تم (اے عمر!) ان سے اپنے لیے مغفرت کی دعا کرو اسکو تو ضرور کروانا۔“ اس لیے تم میرے لیے بخشش کی دعا کرو۔“

چنانچہ انہوں نے عمر رضی اللہ عنہ کے لیے بخشش کی دعا فرمائی، اس کے بعد حضرت عمر نے ان سے پوچھا: ”اب کدھر جانے کا ارادہ ہے؟“

انہوں نے کہا: ”کوفہ۔“

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”کیا میں کوفہ کے گورنر کو تمہارے لیے (تحریر) لکھ کر نہ دے دوں۔“

حضرت اولیں رحمۃ اللہ نے جواب دیا: ”میں ان لوگوں میں رہنا (یا شمار کرنا) زیادہ پسند کرتا ہوں جو غریب مسکین قسم کے ہیں، جنہیں کوئی جانتا ہے نہ ان کی کوئی پروا کی جاتی ہے۔“

جب آئندہ سال آیا تو یمن کے معزز لوگوں میں سے ایک شخص حج پر آیا اور اس کی ملاقات حضرت عمر سے ہوئی۔ انہوں نے اس سے حضرت اولیں کی بابت پوچھا تو اس نے بتلایا: ”کہ میں انہیں اس حال میں چھوڑ کر آیا ہوں کہ ان کی زندگی نہایت سادہ ہے اور دنیا کا سامان بہت کم رکھتے ہیں۔“

حضرت عمر نے فرمایا: ”میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے: ”تمہارے پاس مراد (گھرانے) اور قرن قبیلے کا اولیں بن عامر یمن کے رہنے والوں میں سے مجاہدین کے امدادی فوجی گروہ کے ساتھ آئے گا۔ اسے برص کی تکلیف ہوگی جو درست ہو چکی ہوگی، سوائے ایک درہم جتنی جگہ کے۔ اس کی والدہ (زندہ) ہوگی جس کے ساتھ وہ بہت اچھا سلوک کرنے والا ہو گا۔ اگر وہ اللہ پر قسم کھالے تو اللہ اس کی قسم پوری فرما دے گا۔ چنانچہ اگر تم ان سے مغفرت کی دعا کرو اسکو تو ضرور کروانا۔“

تو یہ (یمنی) شخص حج سے فراغت کے بعد حضرت اولیں کے پاس گیا اور ان سے درخواست کی ”میرے لیے بخشش کی دعا فرمائیں۔“

اولیں نے جواب دیا: ”ایک نیک سفر سے تو تم نئے نئے آئے ہو، تم میرے لیے بخشش کی دعا کرو۔ نیز انہوں نے کہا: ”کیا تم عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ملے؟“ انہوں نے کہا: ”ہاں۔“

چنانچہ اولیں نے اس شخص کے لیے مغفرت کی دعا فرمائی، تب لوگوں نے ان کے مقام کو سمجھا اور وہ (اولیں) اپنے سامنے (کی طرف) چل پڑے۔ (مسلم) اور مسلم کی ایک اور روایت حضرت اسیر بن جابر رضی اللہ عنہ سے ہے کہ کوفہ کے کچھ لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے ان میں ایک ایسا آدمی بھی تھا جو حضرت اولیں کا استہزاء کرنے والوں میں سے تھا (کیونکہ وہ ان کی فضیلت سے ناواقف تھا)۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ”کیا یہاں قرینوں میں سے بھی کوئی ہے؟“

چنانچہ یہ شخص آیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ”تمہارے پاس یمن سے ایک آدمی آئے گا جسے اولیں کہا جاتا ہو گا۔ وہ یمن میں صرف اپنی والدہ کو چھوڑ کر آئے گا۔ اسے برص کی بیماری تھی تو اس نے اللہ سے دعا کی جس کی وجہ سے اللہ نے اس سے وہ بیماری دور کر دی اور اب (وہ برص کا داغ) صرف ایک درہم یا درہم جتنا باقی رہ گیا ہے۔ چنانچہ تم میں سے جو بھی اسے ملے اس سے اپنے لیے مغفرت کی دعا کروائے۔“

اور مسلم ہی کی ایک اور روایت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے: ”تاہعین میں سب سے بہتر وہ شخص ہے جسے اولیں کہا جاتا ہے۔ اس کی والدہ (زندہ) ہے اور اس کے جسم پر (برص کے) سفید داغ ہیں۔ تم اس سے کہو کہ وہ تمہارے لیے بخشش کی دعا کرے۔“

فوائد و مسائل: یہ حدیث نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے واضح اور مسلم ہی کی ایک اور روایت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے: ”تاہعین میں سب سے بہتر وہ شخص ہے جسے اولیں کہا جاتا ہے۔ اس کی والدہ (زندہ) ہے اور اس کے جسم پر (برص کے) سفید داغ ہیں۔ تم اس سے کہو کہ وہ تمہارے لیے بخشش کی دعا کرے۔“

1۔ یہ حدیث نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے واضح

معجزات میں سے ہے کہ آپ نے حضرت اولیں رحمۃ اللہ کا نام اور ان کی بعض صفات و خصوصیات بیان فرمائیں جو اسی طرح پائی گئیں جس طرح آپ نے فرمایا تھا۔

2۔ سادگی، عزت اور گم نامی کی فضیلت بھی اس حدیث سے ثابت ہوتی ہے۔

3۔ والدین کے ساتھ حسن سلوک کی فضیلت پتا چلتی ہے۔

4۔ یہ حدیث اس بات پر بھی نص ہے کہ حضرت اولیں خیر التاہعین ہیں۔ بعض حضرات نے حضرت سعید بن مسیب کو جو خیر التاہعین قرار دیا ہے تو اس سے مراد ان کی علوم شرعیہ، تفسیر، حدیث اور فقہ وغیرہ میں تمام تاہعین پر افضلیت اور برتری کا اثبات ہے نہ کہ عند اللہ بہتر ہونا کیونکہ حدیث کی رو سے یہ مقام خیریت حضرت اولیں کو حاصل ہے۔ (نووی)

5۔ حضرت اولیں کے بارے میں جو یہ معروف ہے کہ انہوں نے جب سنا کہ احد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دانت شہید ہو گئے ہیں تو انہوں نے اپنے سارے دانت اس لیے توڑ ڈالے کہ نہ جانے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کون سے دانت ٹوٹے ہیں، تو یہ واقعہ سراسر باطل ہے اور اصول اسلام کے بھی مخالف ہے۔

6۔ وسائل ہونے کے باوجود مسکینی کی زندگی گزارنا باعث فضیلت ہے۔

### عرش کا سایہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ قیامت والے دن فرمائے گا ”میری عظمت و جلالت کے لیے باہم محبت کرنے والے کہاں ہیں؟ آج میں انہیں اپنے سائے میں جگہ دوں گا جس دن میرے سائے کے علاوہ کوئی سایہ نہیں ہو گا۔“ (مسلم)



## بڑا امرا اس میلپ میس ہے

الشابی

”صاحب میں نے تو بات خود ہی ختم کر دی۔ کیا فائدہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑے سے“  
”جی میں بھی کچھ بحثی سے کتراتا ہوں۔“  
”آپ کا تو کہہ نہیں سکتا مجھے کچھ بحثی سے نفرت ہے سوچنے کی بات ہے کہ کیا ذرا سی بات۔“  
”میں خود سوچ کر حیران ہوں کہ کیوں ذرا سی بات کا جھگڑا بنایا آپ نے۔“  
”میں نے بنایا۔۔۔ قبلہ گستاخی معاف میری یہ عادت نہیں۔“  
”خیر آپ کی عادت ہے یا نہیں ہے یہ تو محلے والے جانتے ہیں وہ تو میں ہی تھا جو طرح دے گیا اور نہ۔“  
”نہ صاحب نا آپ تو شیر ہوتے جارہے تھے میں ہی صلہ ہوں میں نے کہا کہ خاک ڈالو اس قصے پر۔“  
”دیکھیے آپ زیادتی کر رہے ہیں اب تو خیر جھگڑا ہی ختم ہو گیا ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ پہل آپ کی طرف سے ہوئی تھی۔“  
”تو آپ کا مطلب ہے کہ میں جھگڑا لو ہوں پاگل ہوں وحشی ہوں۔“  
”نہیں صاحب پاگل تو میں ہوں وحشی تو میں ہوں جھگڑا لو تو میں ہوں آپ تو معصوم ہیں دودھ پیتے بچے ہیں۔“  
”اس سے یاد آیا کہ آپ کی بیوی روز چائے کے لیے دودھ ہمارے ہاں سے منگواتی ہیں۔“  
”اور آپ کا نوکر جو لسن پیاز لینے کے لیے ہمارے دروازے پر کھڑا رہتا ہے۔“  
”گڑے مڑے اکھاڑنا ٹھیک نہیں لیکن میں پوچھ

سکتا ہوں آپ کو ہمارے بارے میں یہ بات کہنے کی جرات کیسے ہوئی کہ میں لال حویلی والوں کے منہ پر تھوکتا بھی نہیں۔“  
”جھوٹ سرا سر جھوٹ میں نے تو فقط اتنا کہا تھا کہ لال حویلی والے۔۔۔ بلکہ میں نے تو لال حویلی والوں کا نام ہی نہیں لیا تھا۔“  
”خیر یہ تو آپ اس وقت کہہ رہے ہیں جو کچھ آپ نے اس وقت کہا تھا وہی تھا جو میں نے کہا ہے کہ آپ نے کہا تھا۔“  
”اجی اب چھوڑیے مان جائیے کہ زیادتی آپ کی تھی اگر آپ اس وقت چپکے سے واپس آکر معافی مانگ لیتے تو میں نہایت فرخ دلی اور سیر چشتی سے۔“  
”معافی۔۔۔ آپ سے معافی اسے کہتے ہیں۔ نا لے جو رہا لے چڑ نہیں صاحب یہ اشرافوں کے رہنے کی جگہ نہیں ایسا ندیدہ پن ہم نے نہیں دیکھا تھا کہ آپ کے بچے ہر روز ناشتے کے وقت ہمارے ہاں آدھمکتے ہیں۔“  
”وہ تو خیر آدھمکتے ہیں تو اپنی قسمت کا کھاتے آپ اپنی مرغیوں کو بھول گئے کہ چرتی چکتی ہمارے کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر ہیں اور انڈے آپ کے ہاں دیتی ہیں۔“  
”اے صاحب آپ جھگڑے کو ہوا دے رہے ہیں بھلا مرغیوں کے ذکر کا یہ کون سا موقع ہے۔“  
”اور معصوم بچوں کے ذکر کی کیا تک تھی۔ مرغیوں کا تو یہ ہے کہ جو ان کو کھلائے گا وہ کسے گا ضرور۔“  
”اور اپنی بات آپ کو یاد ہی نہیں پچھلی برسات میں

آپ کو بھوسہ نہیں مل رہا تھا تو دوڑے دوڑے لال حویلی والوں کے پاس ہی آئے تھے یہ ہماری ہی شرافت تھی کہ آپ کو خشک بھوسہ دے دیا اور ان داموں بجن پر آپ کو بازار میں ملتا۔“  
”آپ کی یادداشت اتنی تیز ہے تو آپ کو وہ چرخہ بھی یاد ہو گا۔ جو آپ کی خالہ تین مہینے ہوئے ہمارے ہاں سے مانگ کر لے گئی تھیں۔“  
”واہ اس باوا آدم کے چھکڑے کو آپ چرخہ کہتے ہیں اور ایک بار ہماری خالہ نے اپنے کھیتوں سے گو بھی کا پھول بھی تو آپ ہی کو بھجوایا تھا اور آپ کے نلکے میں جو لمبی سی کیل لگی ہے وہ کس نے دی تھی؟“  
”اور آپ کے کھن میں کپڑے سکھانے کے لیے جو رسی تھی ہے وہ آپ نے کہاں سے لی تھی۔“  
”خیر میرے دوست یہ مثالیں تو میں نے اس بات کے ثبوت میں دی تھیں کہ میں بھی چھچھورا ہوتا تو جھگڑا بڑھا سکتا تھا میری عادت ہی درگزر کی ہے ورنہ وہ چھتری۔“  
”اور وہ بہادپور کی کوری ہٹایا۔“  
”اور وہ ملتان بدھنا جو میں اتنی دور سے لایا تھا۔“  
”اور وہ آب زم زم جو میں نے خاصی سفارش سے حاجی صاحب سے آپ کو دلایا تھا۔“  
”اور وہ ماچس جو آپ نے کل منگوالی تھی۔“  
”اور وہ دوات۔“  
”اور وہ چپل۔“  
”اور وہ جھاڑو۔“  
”چل بد ذات کمینہ کہیں گا۔“  
”ہت تیری احسان فراموش کی وہ پٹنی دوں گا کہ یاد رکھے گا۔“  
”اتنے جوتے لگاؤں گا کہ۔“



شعاع  
آینا ماہنامہ

جون 2014

جون 2014  
کاشمیر  
ہو گیا



”صنم سے صدمتک“ کینز نبوی کا مکمل ناول  
”تیرے سنگ حسین ہے رہگوز“  
شہزادی عباس ظہری کا ناول  
”امایہ خان اور وجہ احمد کے ناول“  
”سمیرا حمید، نورین، میمونہ صدف، سمیرا عثمان گل اور قرۃ العین ہاشمی کے افسانے“  
”ٹی وی فنکارہ“ فائق خان اور ثانیہ خان کا بندھن  
”معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ“ ”دستک“  
”شعاع کے ساتھ ساتھ قارئین سے سروے“  
”بیٹھ کر سیر دو جہاں کرنا“ ممتاز مفتی کی کتاب پر تبصرہ  
”بیارے نمی کی پیاری باتیں“  
اور دیگر مستقل سلسلے

شعاع جون 2014 کا شمارہ آج ہی خرید لیں





- 6 "تعلیمی قابلیت؟"
- 7 "شادی؟"
- 8 "شوہر میں آمد؟"
- 9 "اپنے شوق اور نیلنٹپہ آئی ہوں۔"
- 10 "پہلا ڈراما وجہ شہرت؟"
- 11 "نوری جام تماچی کافی ہیں۔"
- 12 "پہلی کمائی؟"
- 13 "اسکا لرشپ کو میں اپنی پہلی کمائی کہوں گی، کیونکہ یہ بھی بہت محنت کرنے کے بعد ملا تھا۔"
- 14 "آپ کی صبح کب ہوتی ہے؟"
- 15 "جلدی ہو جاتی ہے۔"

## بائیں سمیرا حسین سے

شایین رشید

- 1 "اصلی نام؟"
- 2 "سمیرا حسن"
- 3 "پیار کا نام؟"
- 4 "سی۔ سی۔ سم۔ مگر امی کہتی ہیں کہ نام بگاڑنا نہیں چاہیے۔"
- 5 "نامت خیدائش ر شر؟"
- 6 "یکم ستمبر اسلام آباد۔"
- 7 "قدر ستارہ؟"
- 8 "فٹ 8 انچ سنبہ۔"
- 9 "بہن بھائی آپ کا نمبر؟"
- 10 "چار بہن بھائی ہیں۔ ایک بھائی، تین بہنیں۔ تیرا نمبر"
- 11 "اور رات؟"
- 12 "مجھے رات کے وقت مطالعہ کرنے کا شوق ہے تو بس جب نیند آجائے۔ رات ہو جاتی ہے۔"
- 13 "صبح اٹھ کر کیا دل چاہتا ہے؟"
- 14 "اچھا سا ناشتا کرنے کو دل چاہتا ہے۔ کیونکہ ناشتا لازمی ہونا چاہیے۔"
- 15 "اپنے میاں کی کون سی بات بری لگتی ہے؟"
- 16 "کوئی بھی نہیں۔"
- 17 "تہوار مناتی ہیں؟"
- 18 "بالکل۔ قوی بھی اور مذہبی بھی۔ بہت شوق سے مناتی ہوں۔"

- 16 "اے ملک کا کون سا قانون برا لگتا ہے؟"
- 17 "قانون تو کوئی بھی برا نہیں ہے۔ مگر ان پر عمل درآمد کرنا برا لگتا ہے۔"
- 18 "اپنی جسمانی ساخت میں کیا کمی محسوس کرتی ہیں؟"
- 19 "اللہ کا شکر ہے، کوئی کمی نہیں ہے۔"
- 20 "شدید بھوک میں مزاج کی کیفیت؟"
- 21 "مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہوتا، کیونکہ میں تو اکثر ڈائننگ پیہ ہوتی ہوں۔"
- 22 "حلقہ احباب وسیع ہے یا کم ہے؟"
- 23 "دیے تو بہت وسیع ہے، مگر دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا۔"
- 24 "آپ کو انتظار رہتا ہے؟"
- 25 "ہر اچھے دن کا۔"
- 26 "خوشی کا اظہار کس طرح کرتی ہیں؟"
- 27 "بہت زیادہ خوش ہو کر ہلا گلا کرتے۔ بچی بن جاتی ہوں۔"
- 28 "طبیعت میں ضد ہے؟"
- 29 "بہت کم۔۔۔ زندگی میں ضد ایک یا دو بار ہی کی ہوگی لیکن اگر ضد یہ آجاؤں تو دنیا ادھر کی ادھر کر دیتی ہوں۔"
- 30 "شدید غصہ کب آتا ہے؟"
- 31 "جب ٹریفک میں گاڑی پھنس جائے یا کسی کو غلط گاڑی چلاتے ہوئے دیکھ لوں۔"
- 32 "غصے میں کیفیت؟"
- 33 "پلی لیتی ہوں۔"
- 34 "مردوں میں کیا بات ہونی چاہیے؟"
- 35 "ڈینٹ ہونا چاہیے۔ چھچھورے مرد بہت برے لگتے ہیں۔"
- 36 "کوئی لڑکا یا مرد مسلسل گھورے تو؟"
- 37 "غصہ تو آتا ہے مگر نظر انداز کر دیتی ہوں۔"
- 38 "پرائز بانڈ خریدنے کا شوق ہے؟"
- 39 "نہیں، کبھی نہیں خریدے، نہ ہی شوق ہے۔ اپنی محنت پر بھروسہ ہے۔"
- 40 "کس کے غصے سے ڈر لگتا ہے؟"
- 41 "کسی کے غصے سے ڈر نہیں لگتا۔"
- 42 "وقت سے پہلے نہیں، نصیب سے زیادہ نہیں، یقین ہے اس بات پر؟"
- 43 "بالکل ہے۔ اور مجھے کبھی بھی وقت سے پہلے کچھ نہیں ملا۔"
- 44 "اکاؤنٹ منگل ہونا چاہیے یا۔۔۔؟"
- 45 "سنگل زیادہ بہتر رہتا ہے۔"
- 46 "سائلگر اپنی مناتی ہیں؟"
- 47 "بالکل مناتی ہوں۔ اپنی بچوں کی، میاں کی اور شادی کی سالگرہ۔ ضرور مناتی ہوں۔"
- 48 "کس ملک کی شہریت لینے کی خواہش ہے۔"
- 49 "برطانیہ۔ بہت پسند ہے۔ وہاں رشتے دار بھی ہیں اور پاکستان تو اپنا ہے ہی۔"
- 50 "شاپنگ پر پہلی ترجیح؟"
- 51 "دی چیز لینے جاتی ہوں جس کی ضرورت ہوتی ہے۔ کبھی شوقیہ جاؤں تو پھر پرفوم خریدتی ہوں۔"
- 52 "آپ کے دنیا میں آنے کا مقصد؟"
- 53 "یہ تو اللہ میاں کو بتا ہو گا۔"
- 54 "پیسہ خرچ کرتے وقت سوچتی ہیں؟"
- 55 "سوچتی تو ہوں مگر ضروری شاپنگ کرتے وقت کچھ نہیں سوچتی۔"
- 56 "کرائسز میں وقت گزارا؟"
- 57 "ہاں بہت۔۔۔ مگر ایک اچھی عادت ہے کہ گھبراتی نہیں ہوں۔"
- 58 "بہترین تحفہ؟"
- 59 "مسکراہٹ۔"
- 60 "کس پسندیدہ شخصیت کے ساتھ ایک شام گزارنا چاہتی ہیں؟"
- 61 "کوئی خاص نہیں۔۔۔ صرف اپنے بچوں کے ساتھ۔"
- 62 "پسندیدہ پروفیشن؟"
- 63 "جس میں میں ہوں اداکاری۔"
- 64 "موڈ اچھا ہو جاتا ہے جب۔۔۔؟"



”جب کوئی اچھی بات کرے کوئی محبت کے دہول بول دے۔ میاں صاحب اظہار محبت کر دیں۔“

42 ”کیا آنکھ کھلتے ہی بستر چھوڑ دیتی ہیں؟“

”اگر نیند پوری ہو جائے تو چھوڑ دیتی ہوں۔ ورنہ ابھی اٹھتی ہوں“ والی بات ہوتی ہے۔“

44 ”چھٹی کا دن کیسے گزارتی ہیں؟“

”اپنی فیملی کے ساتھ۔“

45 ”لباس میں کیا پسند ہے؟“

”ایسٹرن ویسٹرن دونوں۔ مشرقی لباس میں چوڑی دار پاجامہ اور کرنا اچھا لگتا ہے اور ساڑھی۔“

46 ”گھر کے کس کمرے میں سکون ملتا ہے؟“

”اپنے بیدروم میں۔“

47 ”کس کے ایس ایم ایس کے جواب فوراً دیتی ہیں؟“

”اپنے بچوں کے اور میاں کے۔“

48 ”نبوت کب ہوتی ہے؟“

”میں کبھی زندگی میں بور نہیں ہوئی کیونکہ میں ڈائجسٹ بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔“

49 ”کون سا گروار کرنے کی خواہش ہے؟“

”بہت سے کردار کرنے کی خواہش ہے۔“

50 ”مہمانوں کی اچانک آمد؟“

”بری نہیں لگتی، لیکن اگر تباہ کر آئیں تو بہتر ہے۔“

51 ”پاور میں آکر کیا کریں گی؟“

”ہزاروں کام ایسے ہیں جو میں کرنا چاہتی ہوں۔ مگر اولین ترجیح دہشت گردی ختم کرنا ہے۔“

53 ”نصیحت اچھی لگتی ہے یا۔۔۔؟“

”نصیحت تو کوئی بھی اچھی نہیں لگتی۔“ تہقہ۔۔۔

54 ”زندگی کا سب سے اچھا دور کون سا ہوتا ہے؟“

”اسکول کا دور۔ بے فکری، مزے، شرارتیں۔“

55 ”پڑھائی سے بھاگتی تھیں؟“

”نہیں۔ پڑھائی کا بہت شوق تھا۔ پرائمری سے لے کر میٹرک تک اپنی کلاس کی مانیٹر رہ چکی ہوں۔“

56 ”وقت کی پابندی کرنی چاہیے؟“

”بالکل کرنی چاہیے۔۔۔ اور میں خود بھی کرتی ہوں اور زیادہ تر ایسا ہوتا ہے کہ میں پہنچ جاتی ہوں، مگر لوگ نہیں۔“

57 ”خرچ کرنے کا مزا کہاں آتا ہے؟“

”اپنی فیملی پر۔“

58 ”اداکاری کے علاوہ مشاغل؟“

”مشاغل تو نہیں کہوں گی۔ میرا بزنس مائنڈ ہے تو کچھ نہ کچھ کرتی رہتی ہوں۔ کبھی پر اپنی کا کام کر لیتی ہوں، کبھی شیئر مارکیٹ کا۔“

59 ”کھانا کھانے کا مزا کہاں آتا ہے، چٹائی، ڈائننگ ٹیبل یا بیڈ؟“

”اپنے بیڈ سے اچھی جگہ تو کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔“

60 ”اگر آپ کے علاوہ ساری دنیا سو جائے تو؟“

”تو مجھے کیا کرنا ہے جاگ کر میں بھی سو جاؤں گی۔ دنیا کے ساتھ ہی جاگنے اور سونے کا مزا ہے۔“

61 ”انٹرنیٹ اور فیس بک سے دلچسپی؟“

”پہلے نہیں تھی۔ مگر اب ہے۔ مجبوری ہے۔“

62 ”کس کو وقت دینا ہے، بزنس کو یا ایکٹنگ کو؟“

”اداکاری کو زیادہ وقت دینا چاہتی ہوں اور پروڈکشن کو۔“

63 ”کون سا کھانا بہت اچھا لگتا ہے؟“

”میرے ہاتھ کے شامی کباب سب کو بہت پسند ہیں۔“

64 ”نرم دل کون ہوتا ہے مرد یا عورت؟“

”میرے خیال میں عورت۔“

65 ”بہترین لگ کون ہوتا ہے؟“

”مرد۔ سارے اچھے شیفت تو مرد ہی ہیں۔“

66 ”کس پسندیدہ شخصیت کو اغوا کرنا چاہیں گی اور تاوان میں کیا مانگیں گی؟“ تہقہ۔۔۔ ”شاہ رخ خان کو کروں گی اور اس کی قسمت مانگ لوں گی۔“

67 ”کن کیڑوں سے ڈر لگتا ہے؟“

”میں بہت بہادر ہوں۔۔۔ نہیں ڈرتی کیڑے مکوڑوں سے۔ بچپن میں تو سانپ بھی پکڑ لیتی تھی۔ ہاں مکڑی سے مجھے گھن آتی ہے۔“

68 ”خود کش حملہ آور بہادر ہوتا ہے یا بزدل؟“

”بہت بزدل ہوتا ہے۔۔۔ حالات سے اس طرح چھٹکارا پانا تو بزدلی ہے نا۔“

69 ”شادی میں پسندیدہ رسم؟“

”منہدی اور ہلا گلا۔“

71 ”کس تاریخی شخصیت سے ملنا چاہتی ہیں؟“

”قائد اعظم۔“

72 ”اپنا موبائل نمبر کتنی بار تبدیل کیا؟“

”ایک نمبر تو بالکل تبدیل نہیں کرتی۔ جبکہ سینڈ نمبر ایک دو بار چینیج کیا ہے۔“

73 ”گھر سے نکلتے وقت کیا نہیں بھولتیں؟“

”گاڑی کی چابی، موبائل، پرس وغیرہ۔“

74 ”آپ سمجھتی ہیں کہ آپ دوسروں سے الگ ہیں؟“

”نہیں ایسا کچھ نہیں ہے، چونکہ اسکرین پہ آتے ہیں اور لوگ ہمیں پہچانتے ہیں تو اچھا لگتا ہے۔“

75 ”پاکستان کے لیے کیا سوچتی ہیں؟“

”جب میں لندن جاتی ہوں تو سوچتی ہوں کہ جو وہاں کی خوبیاں ہیں، کاش وہ پاکستان میں آجائیں۔“

76 ”اپنی غلطی کا اعتراف کرتی ہیں؟“

”بہت کم۔“

77 ”کوئی اچھی اور بری عادت؟“

”اچھی تو یہ کہ دوسروں کے کام آتی ہوں اور ہر ایک سے اچھی طرح مل لینا بعض اوقات برا ہو جاتا ہے، تو یہ بری عادت ہے۔“

78 ”کھانے سے ناراضی کب ہوتی ہے؟“

”نہیں ہوتی کیونکہ سارا دن تو فرصت ہی نہیں ملتی کھانے کی۔“

79 ”مارننگ شو۔ آپ کے تاثرات؟“

”برائی نہیں کروں گی، کیونکہ میں خود بہت بلائی جاتی ہوں۔ ویسے بھوتوں اور جنوں والے برے لگتے ہیں۔“

80 ”بستر لیٹتے ہی نیند آ جاتی ہے یا کروٹیں بدلتی ہیں؟“

”میں کبھی بھی ڈائریکٹ نہیں سوتی۔ بلکہ ڈائجسٹ کا مطالعہ کر کے سوتی ہوں۔“

81 ”بیڈ کی سائڈ ٹیبل پہ کیا کیا رکھتی ہیں؟“

”بکس، موبائل اور پانی۔“

82 ”خدا کی حسین تخلیق؟“

”انسان۔۔۔“

83 ”زندگی بری لگتی ہے؟“

”بری نہیں لگتی، مگر جب کوئی کام نہ ہو رہا ہو تو ڈپرسلڈ ہو جاتی ہوں۔“

84 ”وہلشائن ڈے منانا کیسا لگتا ہے؟“

”اچھا لگتا ہے۔ منانا چاہیے۔“

85 ”کس میں جرات ہے گہری نیند سے اٹھانے کی؟“

”ہنٹے ہوئے۔“ کسی میں نہیں۔ میں کہوں گی تو کوئی اٹھائے گا ورنہ نہیں، آلام ہی اٹھاتا ہے۔“

86 ”اپنے گھر والوں سے کس چیز کا ایوارڈ لینا چاہتی ہیں؟“

”اگر وہ لفظ یہ کہہ دیں کہ آپ ہمارے لیے بہت کچھ کر رہی ہیں تو یہی ایوارڈ بہت ہوتا ہے۔“

87 ”جھوٹ بولنے کی ضرورت کب پیش آتی ہے؟“

”اکثر مگر بہت مجبوری میں۔ ویسے میں ننانوے فیصد جج بولتی ہوں۔“

90 ”فریش کب ہوتی ہیں؟“

”نیند پوری ہو جائے تو صبح سمجھ۔“

91 ”گھر آتے ہی کیا دل چاہتا ہے؟“

”گرم گرم چائے مل جائے اور چائے کی جسکیوں کے ساتھ ٹی وی دیکھوں۔“

93 ”لوگوں کو بچ کرنے کا بہترین طریقہ؟“

”یہ کام آج تک نہیں آیا۔ انسان سے زیادہ غلا کوئی نہیں۔“

98 ”اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟“

”اتنی زیادہ شہرت ہے بھی نہیں۔ اس لیے کیا کہوں۔۔۔ یہ عروج و زوال تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جو بہتر سمجھے گا، وہی کرے گا۔“



## ماہین خالد سے ملاقات

شاہین رشید

حقیقت پسندی ہی ہو بلاشبہ بہت عمدگی سے کر رہی ہیں۔  
ماہین خالد بہت اچھی فنکارہ ہیں مگر ان کے کریڈٹ کے تسلسل کے ساتھ نہ کٹھن روٹر ہیں۔ اگرچہ انہوں نے سارے کردار یکسانیت کا شکار ہوئے بغیر بہت خوبی سے نبھائے ہیں مگر اب ناظرین انہیں مثبت کردار میں دیکھنے کے خواہاں ہیں۔ ماہین اس بارے میں کیا کہتی ہیں۔ آئیے جانتے ہیں۔

”جی ماہین خالد! کیسی ہیں آپ؟“  
”جی الحمد للہ۔“

”ادھوری عورت“ کلمہ ہی ”اور اب“ بشر مومن“ تینوں میں نیگیٹو رول تھے۔ مشکل کہاں پیش آئی؟“  
”مشکل نہیں نہیں ہوئی کیونکہ تینوں رولز ایک دوسرے سے بہت مختلف تھے۔ جب میں نے ”ادھوری عورت“ کیا تو وہ میرے لیے سب سے زیادہ آسان تھا کیونکہ وہ میرا پہلا منفی رول تھا۔ ”ادھوری عورت“ ختم ہوا تو مجھے ”کلمہ ہی“ آفر ہو گیا۔ تب میں نے سوچا کہ اس کو کس طرح مختلف انداز میں کیا جائے۔ ”کلمہ ہی“ میں میرا کردار ایک لورٹل کلاس فیملی کی عورت تھی۔ اس کا اٹھنا بیٹھنا، بولنا چالنا رہتا سہنا بالکل مختلف تھا۔ اس کے لیے گیٹ اپ بنانا ذرا مشکل تھا، مگر اس کا سارا کریڈٹ میں عاطف حسین کو دوں گی۔ کچھ اپنے آپ کو بھی دوں گی، دونوں نے مل کر ڈیپائڈ کیا کہ ”مونا“ کو کس طرح نظر آنا چاہیے۔ یعنی مونا سخت مزاج بھی لگے، کیونکہ بھی لگے اور مونا فتنہ بھی لگے۔ پرفارمنس کا مارجن بہت زیادہ نہیں تھا۔



کچھ عرصہ قبل تک ہمارے ڈراموں، فلموں میں ولن یا منفی کرداروں میں عموماً ”مرد حضرات ہی کاسٹ کیے جاتے تھے۔ مگر دور حاضر میں ولن مرد کا تصور بہت تیزی سے تبدیل ہوا ہے۔ اب یہ کردار خواتین ادا کر رہی ہیں۔ وجہ ٹریڈ کی تبدیلی کے علاوہ بے شک

اس لو بہت دھیان سے لے کر چلنا تھا اس کے گیٹ اپ پر کام کرنا بڑا ضروری تھا۔ مثلاً ”مجھے آلتی پالتی مار کر بیٹھنا بھی تھا۔ ہاتھ سے چاول بھی کھانے تھے جو کہ میں نے ایسا حقیقی زندگی میں کیا تھا اور نہ ہی کسی سیریل میں پھر جب مجھے ”بشر مومن“ کی آفر آئی۔ تب میں اپ سیٹ ہو گئی، نروس بھی ہو گئی تب مجھے احساس ہوا کہ اگر میں نے یہ کردار کر لیا تو میں اسی ٹائپ اداکارہ بن جاؤں گی اور مجھے مزید ایسے ہی رولز آفر ہوں گے۔ دوسرا اتفاق یہ ہوا کہ تینوں پروجیکٹس ایک ہی چینل پر آن ابر ہوئے۔

”یہ بتائیں کہ ان تینوں کرداروں میں ہمارے معاشرے کی عکاسی کس رول نے کی؟ کون سی عورت ہمارے معاشرے کا حصہ ہے؟“

”ایمان داری کے ساتھ آپ کو بتاؤں کہ تینوں ہی ہمارے معاشرے کا حصہ ہیں۔ تینوں کردار حقیقت پر مبنی ہیں۔ کلمہ ہی کی ”مونا“ آپ کو چھوٹے علاقوں یعنی لورڈ طبقے کے کسی گلی کے کنکر پل جائے گی۔ جو ذرا اپر کلاس ہوں گے یا مل کلاس وہاں آپ کو ”ادھوری عورت“ کی فائزہ مل جائے گی اور جب آپ ایلٹیٹ کلاس میں جاتے ہیں تو پھر وہاں آپ کو ”بشر مومن“ کی سائرہ نظر آئے گی۔ ایسے لوگوں کو میں نے سوشلائز کیا ہوا ہے۔ یہ کوئی میک اپ کردار نہیں تھے بلکہ ہمارے ہی معاشرے کا حصہ ہیں اور یہی لوگ ہمیں آپ کو اور دوسروں کو پریشان کرتے ہیں۔“

”آپ کا خود کیا دل چاہتا ہے کہ آپ کو کس طرح کے کردار ملیں گے جہاں نفرتیں نہ ملیں گالیاں نہ سنی پڑیں۔ بس سب تعریف کریں۔“

”نہیں ایسا کچھ دل نہیں چاہتا۔ اگر مجھے گالیاں پڑ رہی ہیں، اگر مجھے نفرتیں مل رہی ہیں اگر لوگ مجھ سے آکر کہتے ہیں کہ آپ ”رودادہ“ کے ساتھ اچھا نہیں کر رہیں۔ آپ کلمہ ہی کے اوپر ظلم کر رہی ہیں تو یقیناً جانیں مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ مجھے بہت خوشی ہوئی کہ میں نے اپنے کردار میں حقیقت کا رنگ بھر دیا

ہے۔ نیگیٹو رول میں اگر لوگ آپ سے نفرت کرتے ہیں اور پوزیٹو کردار میں محبت کرتے ہیں تو سمجھئے کہ آپ نے اپنے کردار کے ساتھ انصاف کر دیا۔“

”ہمارے ڈرامے یکسانیت کا شکار نہیں ہیں؟ کیا کہتی ہیں آپ؟“

”ہاں بالکل میں بھی یہی سوچتی ہوں کہ ہم مختلف موضوعات پر کیوں نہیں کام کرتے۔ ہزاروں موضوعات ہیں حب الوطنی پہ کر سکتے ہیں سوشل ایٹو پہ لکھوا سکتے ہیں ثقافت ہے مذہب ہے مگر ہم تو ایک ہی چکر میں پڑے ہوئے ہیں۔ اس لیے میں نے تو اب یہ سوچا ہے کہ اب میں کو اتنی ورک کروں گی۔ مختلف تو میں نہیں کہہ سکتی کیونکہ کرنا تو ہمیں وہی ہے جو ہمیں آفر ہو گا اور وہ ہی ہوتا ہے جو بن رہا ہے جو لکھا جا رہا ہے اور لکھا بھی وہ ہی جا رہا ہے جو لوگ دیکھنا چاہ رہے ہیں۔ لوگوں کے مائنڈ کو رائٹر اور ڈائریکٹر ہی تبدیل کر سکتے ہیں بشرطیکہ وہ کرنا چاہیں تو۔“

”آپ کے خیال میں آج کل کون سب سے اچھا اور مختلف لکھ رہا ہے؟“

”ذہن جمیل بہت حساس رائٹر ہیں۔ انہوں نے بشر مومن لکھا ہے۔ ان کے دو تین اور بھی پروجیکٹ آرہے ہیں۔ ان کی تحریر میں مجھے گہرائی نظر آتی ہے۔ سمیرا فضل ایک کیونٹ رائٹر ہیں۔ وہ کیونٹ چیزیں لکھتی ہیں۔ فرحت اشتیاق جنہوں نے ہم سفر لکھا تھا بہترین رائٹر ہیں اور داد دیں گے اس ڈائریکٹر کو کہ جنہوں نے ان کی تحریر کو سمجھا اور صحیح طریقے سے پورٹریٹ کیا اور عمیقہ احمد جو نئے نئے موضوعات کو فوکس کرتی ہیں۔ خالد احمد بھی بہت اچھے ہیں۔“

”آج کل کیا مصوفیات ہیں؟“

”میرا ایک نیا سیریل ”نزدیکیاں“ آن ابر ہونے والا ہے۔ اس میں میرا بہت اچھا پوزیٹو کردار ہے۔ ایک اور سیریل آن ابر ہے ”کوئی نہیں ہے اپنا“ تھوڑا کام کر رہی ہوں مگر بہت سوچ سمجھ کے کر رہی ہوں۔“



”کوئی نہیں ہے اپنا“ کیا فلم ”آئینہ“ کی کاپی نہیں ہے؟“

”جی بالکل۔۔۔ آئینہ کے اندر ایک مختلف قسم کا ٹونسٹ تھا اور اس سیریل میں اس ٹونسٹ کو انہوں نے ذرا مختلف انداز میں پیش کیا ہے اور اس وقت جو پچاس ڈرامے چل رہے ہیں ان میں انہجاس کی کہانیاں آپ کو ایک جیسی لگیں گی، بس فرق اس کو پیش کرنے کا ہوتا ہے۔ ایک اچھا ڈائریکٹر اسے بہترین طریقے سے پیش کرتا ہے تو وہ سیریل مقبولیت حاصل کرتا ہے۔ اس کی مثال ”ہم سفر“ اور ”میری ذات ذرا بے نشان“ ہے۔ اس کے موضوع نے نہیں تھے مگر پیش کرنے کا انداز نیا تھا۔ اس طرح ”کوئی نہیں ہے اپنا“ جس کو آپ آئینہ کہہ رہی ہیں۔ اسے بدر محمود نے بہت اچھے انداز میں ڈائریکٹ کیا ہے اور سب فنکاروں سے بہت اچھے طریقے سے کام لیا ہے۔“

”آج کل تو ایک ”سینٹ“ اٹھائیں تو کئی ڈائریکٹر مل جائیں گے تو کون بہتر کام کر رہا ہے؟“

”کام تو اپنے طور پر سب ہی اچھا کر رہے ہیں کیونکہ سب ہی بہت محنت سے کام کرتے ہیں۔ کسی کا کنسپٹ یا وژن بہت زیادہ براؤ ہوتا ہے اور کچھ لکیر کے فقیر ہوتے ہیں کہ جیسا اسکرپٹ میں لکھا ہے ویسا ہی کرتا ہے۔ اسامہ کے ساتھ کام کر کے مجھے لگا کہ اس نے ایک معمولی سے ڈرامے کو ”بشر مومن“ بنا دیا۔ اس نے میرے مشکل کردار کو آسان بنا دیا۔ اسامہ کا وژن بہت براؤ ہے اور عابدس رضا اچھا کام کر رہے ہیں۔ مہرین جبار محسب حسن بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔“

”فیوج پلاننگ کیا ہے آپ کی؟“

”میں باہر سے بڑھ کر آئی ہوں صرف اس لیے کہ اپنے ملک میں رہ کر کام کروں کیونکہ ایک تو مجھے یہاں کا انیس پوٹر زیادہ اچھا لگ رہا تھا پھر مجھے بچپن سے شوق تھا کہ میں پاکستانی میڈیا کے لیے کام کروں تو اسی لیے میں نے ٹیلی وژن پروڈکشن، ڈائریکشن اور فلم میکنگ

میں تعلیم حاصل کی۔ کیمرے کے پیچھے کام کرنے کا ارادہ ہے۔ مجھے شو ہو سٹ کرنے کا بہت شوق ہے۔ خاص طور پر مارٹنگ شو اور مجھے آفرز آئی ہیں لیکن نہیں کر پائی کہ آج کل ٹائم نہیں ہے، لیکن ڈراموں سے بریک لے کر اپنے اس شوق کو ضرور پورا کروں گی۔“

”اس فیلڈ میں کیسے آئیں اور کس طرح اپنے آپ کو منوایا کہ مجھ میں ہر کام کی صلاحیت ہے؟“

”اپنے آپ کو منوانا تو بہت آسان تھا نہ بہت مشکل۔ چونکہ باہر سے بڑھ کر آئی تھی، خود اعتمادی تھی مجھ میں، مخلص تھی۔ اپنے کام پر فوکس تھا میرا۔ اور بچپن سے ہی محسوس کرتی تھی کہ مجھ میں اس فیلڈ میں کام کرنے کا ٹیلنٹ ہے۔ بچپن سے ہی تھیٹر کیا، اسکول اور کالج کی غیر نصابی سرگرمیوں میں بھج جڑ کر حصہ لیا۔ اداکاری کا جنون بچپن سے تھا تو جب فیلڈ میں قدم رکھا تو یقین تھا کہ ڈگری بھی میڈیا کی ہے اور بات کرنے کا سلیقہ بھی ہے، ٹیلنٹ پہ بھی بھروسہ تھا۔ میں ایک دم سے اوپر نہیں چڑھی بلکہ بہت دیر سے دیر سے اوپر چڑھی ہوں اور اب اپنی جگہ بنائی ہے اور میرا اس بات پر بھی یقین ہے کہ ”دیر آید درست آید۔“

”فیملی بیک گراؤنڈ بھی بتائیے؟“

”یو ایس میں میں اپنے والدین کے ساتھ رہتی تھی پاکستان آنے کی اجازت اس لیے مل گئی کہ میرے بھائی یہاں رہتے ہیں۔ ورنہ کراچی کے حالات تو ایسے ہیں کہ کوئی اکیلی لڑکی نہیں رہ سکتی یہاں میرے ابو کا گھر ہے اور ہم سب مل کر رہتے ہیں اور فیملی بیک گراؤنڈ کچھ یوں ہے کہ ہم اردو اسپیکنگ ہیں۔ لکھنؤ سے ہمارا تعلق ہے۔ آباؤ اجداد میں کچھ یہاں ہیں کچھ انڈیا میں اور کچھ بنگلہ دیش میں۔ مگر زیادہ تر لوگ یو ایس آئے ہیں۔ وہ کراچی کے حالات سے ڈر کر وہاں سیٹل ہو گئے ہیں۔ میں 28 جولائی کو پیدا ہوئی۔ میں گھر میں بڑی ہوں، مجھ سے چھوٹا ایک بھائی اور

ایک بہن ہے۔ شادی فی الحال نہیں ہوئی اور نہ ہی کوئی ایسا بندہ ٹکرایا ہے کہ جس کے لیے اپنا جنون اپنا کیریئر چھوڑ دوں اور ابھی جو زندگی میں گزار رہی ہوں اس سے بہتر زندگی جو دے گا۔ اس کو اپنا شریک سفر بناؤں گی۔“

”رومانٹک رول نہیں کیا۔ کیا آفر نہیں ہوا؟“

”مجھے رومانٹک رول کرنے کا شوق نہیں ہے۔

دوسری بات کہ فیملی کی بھی کچھ حدود اور پابندیاں ہیں۔ میری فیملی میں لی وی انڈسٹری کو اتنا پسندیدہ نہیں سمجھا جاتا۔ اگر کبھی رومانٹک رول کیا تو اسے اپنے طریقے سے کروں گی۔ جس طرح ”دھوپ کنارے“

میں مرینہ خان اور راحت کاظمی صاحب نے کیا تھا۔“

”کبھی ایسا ہوا کہ کام کو دل نہیں چاہا طبیعت سے ہے۔ بیعت خراب ہے، موڈ آف ہے، مگر کام تو کرنا ہے تو سیٹ پر موڈ بنالیتی ہیں؟“

”موڈ بنانا پڑتا ہے کیونکہ نہ صرف یہ میرا پروفیشن ہے بلکہ میرا شوق، میرا جنون بھی ہے۔ اور گھر میں سو طرح کے مسائل ہوتے ہیں، لیکن جب سیٹ پہ آتی ہوں تو سب کچھ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ دو باتوں سے مجھے بہت اری لپٹ ہوتی ہے ایک تو میک اپ کروانے اور بال سیٹ کروانے سے، دوسرا کسی کا انتظار کرنا۔ اس وجہ سے میرا موڈ سخت آف ہو جاتا ہے۔“

”پھر موڈ ٹھیک کب ہوتا ہے؟“

”کام شروع ہو جائے، تو میرا موڈ ٹھیک ہو جاتا ہے اور میرے موڈ کو مزید بہتر کرنے کے لیے ایک اچھی سی چائے کی پیالی۔ کوئی اچھا کھانا اور سمو سے وغیرہ کافی ہوتے ہیں۔“

”ماؤٹنگ کی یا فلم؟“

”ماؤٹنگ نہیں کی شوق بھی نہیں ہے اور اجازت بھی نہیں ہے۔ فلم میں اگر مجھے ناچنا گانا نہ پڑے تو پھر ضرور کروں گی۔ لیکن اس پر بھی شرط یہ ہے کہ میرے گھروالے اجازت دیں کیونکہ ان کو ناراض کر کے میں کوئی کام نہیں کر سکتی۔“

”امور خانہ داری سے کتنا لگاؤ ہے، بچپن وغیرہ؟“

”بچپن سے لگاؤ تو مجھے نہیں ہے، لیکن بنانا مجھے سب کچھ آتا ہے میری اماں نے میری ٹریننگ بہت اچھی کی ہوئی ہے کیونکہ ان کو پتا ہے کہ ایک دن شادی ہوئی ہے، دوسرے گھر میں، ہر وقت آرٹسٹ بن کے تو نہیں رہ سکتی تو جناب! جب سر پر پڑے گی تو سب کچھ کر لوں گی۔“

”اپنے ڈرامے دیکھتی ہیں۔ تنقید ہوتی ہے یا صرف تعریف؟“

”اپنے ڈرامے بہت شوق سے دیکھتی ہوں اگر کوئی کہے کہ بہت اچھا کام کر رہی ہو تب بھی سیریس نہیں ہوتی اور کوئی تعریف نہ کرے تو اسے بھی سیریس نہیں لیتی۔ بس اپنا اطمینان بہت ضروری ہے۔ ہاں جب گھر سے باہر جاتی ہوں اور پبلک جو فیڈ بیک دیتی ہے وہ میرے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے کیونکہ بہترین نقاد ہمارے ناظرین ہیں۔“

”شوہر کیسی فیلڈ ہے، اچھی یا بری؟“

”اچھی بھی ہے اور بری بھی۔ شوہر میں وہ بن کے رہنا پڑتا ہے جو آپ نہیں ہیں، لیکن میں وہ ہی ہوں جو میں ہوں۔ مجھے ماؤن کے رہنا پسند نہیں ہے۔ میں سیٹ پہ آتی ہوں اپنا کام کرتی ہوں اور چلی جاتی ہوں۔ نہ میری زیادہ پی آر ہے، نہ میں زیادہ سوشل ہوں، ایوارڈ کی تقریب میں کوئی دل سے بلاتا ہے تو چلی جاتی ہوں۔“

”فاسٹ اوکالت کس طرح گزارتی ہیں؟“

”اپنی فیملی کے ساتھ۔ اپنی بچی کے ساتھ جو کہ ابھی صرف آٹھ ماہ کی ہے نماز روزے کے لیے وقت ضرور نکالتی ہوں۔ ایکسرسائز بھی کرتی ہوں۔ کھانے پینے کا بہت شوق ہے تو ہر جا کر فیملی کے ساتھ انجوائے کرتی ہوں۔ وغیرہ وغیرہ۔“

”اور اس کے ساتھ ہی ہم نے ماہین خالد سے اجازت چاہی۔“



زندگی کا تسلسل جاری رہتا ہے اور تخلیق کا عمل بھی۔  
تخلیق..... انسانوں پر بننے والی واردات کا آئینہ بھی ہے اور اپنی ذات کا اظہار بھی۔

منصور بن حلاج نے کہا ہے۔  
”لکھنا بھی اظہار ہے اور اس اظہار کی توفیق اسی کو حاصل ہوتی ہے جو حقیقت کو پہچان لیتا ہے۔“  
لیکن عورت پر بہت عرصے تک اظہار کے دروازے بند ہی رہے پھر اظہار کی اجازت ملی بھی تو بہت سی پابندیوں کے ساتھ۔

ڈری سہمی عورت نے جھجکتے جھجکتے قلم اٹھایا تو تہذیب، فکر اور سوچ کے نئے زاویے سامنے آئے اور اس حوالے سے جڑی خواب دیکھنے والی آنکھیں بھی محرروں میں منعکس ہوئیں، محبتوں کے نرم گول، مدھرا احساسات فطری نسوانی دلچسپی لہجے میں ہی بیاں ہو سکتے تھے۔

وقت کچھ اور آگے بڑھا عورت کو آزادی ملی تو فکر و شعور کی نئی جہتیں سامنے آئیں۔ آج حقیقت کی سنگلاخ چٹانوں سے ٹکرا کر خوابوں کا ہر طلسم بکھریا ہے۔ آج کی تخلیق کار زیادہ حقیقت پسند ہے۔ آج دیگر میدانوں کی طرح ادب کے میدان میں بھی عورت نے خود کو منوالیا ہے۔

بارہا ایسا ہوا کہ کوئی اچھا شعر، اچھی تحریر، اچھی کتاب پڑھ کر سوچا، کیا اس سے بہتر لکھا جاسکتا ہے؟ کیا اس سے اچھا کوئی لکھ سکتا ہے؟ پھر کوئی نئی تحریر، کوئی نئی کتاب سامنے آجاتی ہے۔۔۔ کوئی اور تخلیق کار ابھرتا ہے۔

خواتین ڈائجسٹ میں لکھنے والی مصنفین کی ایک کھشال سی ہے بہت سے درخشندہ ستارے جگمگائے اور آسمان ادب پر اپنی پہچان ثبت کر گئے۔ بہت سے نئے ستارے ابھر رہے ہیں، نئے نام سامنے آ رہے ہیں کہ زندگی کا تسلسل جاری ہے اور اس سے جڑی کمائیاں بھی۔

اس بار سالگرہ نمبر میں ہم نے ان نو عمر مصنفین سے سروے کیا ہے جنہوں نے ابھی لکھنے کا آغاز کیا ہے اور آگے مزید روشن امکانات ہیں۔

- سروے کے سوالات یہ ہیں:
- (1) خواتین ڈائجسٹ کے لیے پہلی تحریر بھجواتے ہوئے کیا احساسات تھے؟ وہ شائع ہوئی تو کیسا لگا؟
  - (2) کیا آپ کو توقع تھی کہ اتنی پذیرائی ملے گی؟
  - (3) خواتین ڈائجسٹ کی کن سینئر مصنفین کی تحریریں شوق سے پڑھتی ہیں؟
  - (4) ادارہ خواتین کے علاوہ دیگر کن مصنفین کو پڑھتی ہیں؟ پسندیدہ کتابیں؟
  - (5) لکھنے کے علاوہ دیگر مشاغل کیا ہیں؟ زندگی کے روز و شب، معمولات، تعلیم کیا ہے؟ آئیے دیکھتے ہیں ہماری مصنفین نے کیا جوابات دیے ہیں۔

## دلورہ شوق

امت الصبور

عاصمہ احمد علی

1

سے یہ خبر سینے میں شور مچاتی پھر رہی تھی، جیسے سینے میں گڑی پھانس تھی جسے صفحہ قرطاس کے حوالے کر کے میں نے سکون کا سانس لیا ہو۔  
اس کثیر الاشاعت ماہنامے میں نام آنا بذات خود ایک

اک حشر سا ہوا تھا میرے دل میں اے شکیب  
کھولی جو کھڑکیاں تو ذرا شور مچا گیا  
جی بالکل یہی احساسات تھے شکیب جلالی والے مدتوں

افسانے بہت پسند ہیں۔ تارڑ صاحب کی ”پیار کا پہلا شعر“ اور علیم الحق حق کی تمام کتابیں، محی الدین نواب کو جنونیوں کی طرح بڑھا، بشری رحمن کا ناول، خوب صورت اور عصمت چغتائی کا ”سوداگی“، واجدہ مجسم گو، پسندیدہ نہیں مگر ان کی کتاب ”کیسے کانوں رات اندھیری“ بہت بہترین ہے۔ ہاشم ندیم جدید ادب میں اچھا اضافہ ہیں۔ مشتاق یوسفی کا رواں طرز بیاں کمال کا ہے۔ اے حمید اور ابن انشاء بلاشبہ بلند پایہ راٹر، عظیم لوگ۔ پسندیدہ کتابوں میں غور کیا تو شاعری کی کتابیں زیادہ نکلیں اور جاوید چودھری کے کالم بھی۔

شہر میں کتابوں کی نمائش لگے تو مجھے بتانے سے گریز کیا جاتا ہے اور اگر میں بک شاپ جاؤں تو گھر والے واپسی کا انتظار نہیں کرتے (بابا)

5۔ لکھنے کی بھی مجھے پڑھنے کی طرح اتنی عادت ہے کہ سودا سلف کی پرچی سے لکھ کر دن کا آغاز کرتی ہوں اور بچپن سے ڈائری لکھ رہی ہوں۔

لکھنے کے علاوہ پڑھنا، خواب دیکھنا فورٹ مشغلہ ہے۔ ان کے بعد بیکننگ اور کوکنگ ہے۔ مشورہ دینا فیری میں یہ بھی بہت پسند ہے۔ ان کے بعد باری آتی ہے کمپیوٹر کی۔ کمپیوٹر پر وقت ضائع کرنا بھی ایک مشغلہ ہے۔ میں گھر کا کیرا ہوں۔

زندگی کے معمولات نہایت سادہ ہیں۔ بچے ماشاء اللہ اب کچھ بڑے ہو گئے ہیں۔ ان کی پرورش، پھر گھر کے روٹین کے کام۔ وقت پر اللہ کے حضور حاضری دینا اور فجر کے بعد کچھ دیر ترجمہ کے ساتھ قرآن کی تلاوت کرنا پسندیدہ ترن ہے۔ (اللہ سب کو توفیق دے)

تعلیم کے نام پر بارہ جماعتیں ہیں۔ ہم بی اے، بی اے کرتے رہے اور اماں اباباہہ بیاہ کرتے رہے۔ جی ہاں، ہمیں ایف اے کے رزلٹ کے آتے ہی سرال نامی یونیورسٹی میں بھیج دیا گیا تھا۔ جہاں زندگی نام کی ایک کتاب رکھی تھی اور مزے کی بات کہ ہر صفحہ خالی تھا۔ اس کو خود ہی پُر کرنا تھا آج تک کرتے آ رہے ہیں تجربات کے فلم سے

یا رب میرے سکوت کو نغمہ سرائی دے  
زخم ہنر کو حوصلہ لب کشائی دے  
شرخن سے روح کو وہ آشنائی دے  
آنکھیں بھی بند رکھوں تو رستہ بچھائی دے  
سمیرا عثمان گل

اعزاز ہے۔ عادتاً ”رسالہ کھول کر دیکھا“ اپنا نام پایا، کمائی بڑھ کر تصدیق کی، آنکھیں اُبل پڑیں سانس رک سی گئی، صبح سارا گھر محو استراحت تھا اور میں کمرے میں اکیلے ہی بھٹکے ڈال رہی تھی۔ پھر ربیعہ (سٹش) کو فون کر کے اطلاع دی اور پھر مبارک یادیں بھیں اور ہم تھے کھٹا کھٹ مہربان سبب جز کی برسات تھی۔

2۔ نہیں جی، سوچا بھی نہ تھا اتنی پذیرائی کا اور اتنی جلدی شائع ہونے کا بھی۔ پر اپنے لفظوں پر یقین تھا بہر حال کہ دل سے نکلے تھے اور سچے تھے اور آپ! آپ ہمیشہ کہتی ہیں کہ بھیج دیں کمائی تو آپ کے دیے حوصلے نے کام دکھایا۔

3۔ میرا پہلا پھل درود سے تعارف، میرا پہلا پیار، میری مصنفہ نگہت سیماجی، مجھے آج کہنے دیجئے کہ محبت کی مصنفہ، کرب، نار سالی، ہجر اور پھر درود کی ایسی ایسی کمائیاں کہ الفاظ کم ہیں ان کی تعریف کے لیے، میں ان کی شہادتانی ہوں، نگہت سیماون اینڈ اوٹلی، ان کے بعد نسیم سحر قریشی اور ساجدہ حبیب ہیں، نسیم سحر قریشی کے لیے کیا کہوں، آج مجھے موقع ملا ہے کہ میں ان کو خراج تحسین کے چند الفاظ کہہ سکوں۔ ساجدہ آپا کی ”پیش“ پڑھی اور سارہ غنی اور حسنین زیدی کی محبت نے پہروں اداس رکھا۔ عنیزہ سید کے ساتھ حیرت کی وسعتوں میں سفر کیا اور بیاباں میں غنظر لالہ کو سینکڑوں بار پڑھا، رضیہ جمیل آپا کی ”بدریا برس گئی اس بار“ کی عائنہ بھی نہیں بھولی۔ پھر ایک نایاب مصنفہ ہیں، غزالہ نگار اور کرنی۔ نجانے کیوں لکھتا چھوڑ دیا انہوں نے اور ہمارا کو کب بخاری نے بھی۔ شکر ہے کہ آسیہ رزاقی ابھی لکھ رہی ہیں۔ اللہ انہیں سلامت رکھے۔ یہ کیا لوگ ہیں۔ میں اکثر اوقات ان کے لیے دعا کرتی ہوں۔ حرف نگینہ، لفظ لفظ موتی! جن کو پڑھ کر زندگی سے پیار ہو جائے وہ لوگ۔

4۔ ادارہ خواتین کے علاوہ! جی ہاں میں نے بہت سارا اردو ادب چاٹ رکھا ہے، میری امی کہا کرتی تھیں کہ مجھے پڑھنے کا ہوکا ہے۔ واقعی میں نے اس کم عمری میں راجہ گدھ، علی پور کا ایل پڑھی کہ بڑے ہو کر دوبارہ یہ کتابیں پڑھنا پڑیں۔ مجھے سب اربوں کو پڑھنے کا موقع ملا ہے۔ ڈپٹی صاحب سے لے کر ڈاکٹر نوٹس بٹ تک بلا تخصیص اور پسند مجھے فکشن ہے۔ سفر نامے بھی پڑھے، ابراہیم جلیس، احمد ندیم قاسمی اور اشفاق احمد اور غلام عباس کے



1 پہلی تحریر میرا ایک ناول تھا "اک خواب جو ہمارا تھا" کے نام سے، بھجواتے ہوئے بس ڈر ہی لگ رہا تھا کہ جانے شائع ہوگی یا نہیں، کیونکہ اس سے قبل میرے کزن میں پانچ افسانے اور ایک ناول شائع ہو چکا تھا لیکن میرے بھائی کا کہنا تھا تمہیں راسخرتب تسلیم کروں گا جب خواتین میں کچھ شائع ہو۔ تو میں نے اگلا ناول شائع میں بھیج دیا۔ سننے میں آیا کہانی رنجیکٹ ہو گئی۔ مجھے بے حد افسوس ہوا لیکن میں نے سوچا چلو اسے کزن میں بھیج دیجی ہوں چند روز بعد کزن میں کال کی تو ارم نے کہا "میں میری کوئی کہانی نہیں ملی انہوں نے خواتین والوں سے معلوم کیا تو پتا چلا انہوں نے تو اس ماہ کے شائع میں لگا دی ہے۔"

میں نے تصدیق کے لیے شائع میں فون کھڑکایا، امتل آپا سے بات ہوئی تو انہوں نے کہا "آپ کی کہانی کے دوٹ زیادہ ہو گئے تھے سو ہم نے لگا دی ہے۔ بس پھر میرا دل چاہا بھگڑے ڈالوں، میں نے سب کو فون کر کے بتایا اور اپنے بھائی سے کہا "اب تو مانتے ہو نا۔" وہ پھر سر تسلیم خم کر گئے رہ گیا۔

اور میری جو خوشی تھی وہ ایسی تھی کہ کپڑے نکالنے کے لیے میں فریج کھولے کھڑی تھی اور جب فریج سے سالن لینے کے لیے اسی نے بھیجا تو میں صندوق کھول کر کھڑی ہو گئی (بابا)

بس سارا دن الٹے سیدھے کام ہوتے رہے۔  
2 مجھے امید نہیں تھی کہ اس کہانی کو اتنا پسند کیا جائے گا لیکن قارئین نے اس کہانی کو اس ماہ کی Best تحریر کہا تو بہت اچھا لگا۔ اس ماہ شائع میں 14 خطوط شائع ہوئے تھے جن میں سے گیارہ خطوط میں بہت ہی جوش و خروش اور والمانہ انداز میں اس کہانی کی تعریف ہوئی تھی۔

اور میں گھر میں سب کو باری باری وہ خطوط پڑھ کر سنا رہی تھی۔ قارئین کا شکریہ جنہوں نے پسند کیا اور سراہا۔  
3 جب میں نے خواتین کے پرچے خریدنے شروع کیے وہ عمیرہ احمد، فائزہ افتخار، نمرہ بخاری، فاخرہ جبین، راحت جبین، رفعت سراج، رخسانہ نگار، فرحت اشتیاق، آمنہ ریاض، تنزیلہ ریاض، نایاب جیلانی، نادیہ جمالتیر، درشن سلیم، نگہت سیماء، حفیظہ سید اور عالیہ بخاری خاص طور پر شازیہ چوہدری (مرحومہ) کا دور تھا اور ان سب کو آج بھی پڑھنا بے حد اچھا لگتا ہے۔ خاص طور پر نمرہ بخاری

اور فائزہ افتخار بہت مزے کا لکھتی ہیں۔ نادیہ نے "نوسیم" کے بعد لکھنا چھوڑ دیا۔ مجھے افسوس ہوتا ہے جب کوئی قاری بہن ان کا ذکر تک نہیں کرتی۔

نادیہ اور درشن واپس آجاؤ۔  
4 میں خواتین، شعاع کے علاوہ کسی بھی مصنف کو نہیں پڑھتی۔ اتنا ٹائم ہی نہیں ملتا۔ بیٹی کے آنے سے بہت مصروف ہو گئی ہوں۔ خیر شادی سے قبل بھی میں کسی مصنف کو نہیں پڑھتی تھی۔ پسندیدہ کتاب ایک ہی ناول آج تک کہانی شکل میں پڑھا ہے "دل دیا دلیر" بہت اچھا لگا۔ اب سوچتی ہوں کہ کیا میں پڑھنی چاہوں۔ "راج گدھ" پیار کا پہلا شعر کی بڑی تعریف سن رہی ہے قارئین سے، موقع ملا تو یہ دونوں ناول ضرور پڑھوں گی ان شاء اللہ۔

5 مشاغل کچھ خاص نہیں ہاں سونا اور خوب سارا سونا میرا من پسند مشغلہ ہے۔ اس کے علاوہ موڈ ہو تو نصرت فتح علی، نور جہاں کو سنتی ہوں میوزک کا بڑا شوق ہے مجھے، لیکن یا تو سید ہو یا پھر دیوانگ۔ روز و شب کے متعلق کیا بتاؤں۔ صبح بارہ بجے اٹھتی ہوں کیونکہ میری دختر رات دو بجے سوتی ہے۔ پہلے ناشتہ کرتی ہوں پھر گھر کے کام صفائی وغیرہ اس کے بعد عنایہ سوتی ہے تو میں لکھنے یا پڑھنے بیٹھ جاتی ہوں اور اٹھ جائے تو شام کا کھانا بناتی ہوں۔ چھ بجے عثمان کام سے آجاتے ہیں تو بس ٹی وی چلتا ہے ساتھ عنایہ کی شرارتیں اس کی چند لفظوں پر مشتمل باتیں انجوائے کرتے ہیں۔ آٹھ بجے ہم کھانا کھاتے ہیں اس کے بعد میں کچن صاف کرتی ہوں اور پھر چھپ کر رسالہ پڑھتی ہوں۔ جی ہاں! میں نے سوچا نہیں تھا کہ کبھی چھپ کر رسالہ پڑھنا پڑے گا۔ نہ کبھی امی نے پابندی لگائی نہ بھائی نے نہ بہنیں شوہر نے، لیکن یہ ہماری ننھی گڑیا اس کو ہر وہ چیز چاہیے ہوتی ہے جو ممانے ہاتھ میں پکڑ رکھی ہو تو مجھے رسالہ چھپا کر پڑھنا پڑتا ہے۔

ایک بجے تنگ میں بڑے صبر سے جاگتی ہوں پھر جکر لگا لگا کر نو نمز سنا کر اور تھک تھک کر بمشکل دو بجے تک اس شرارتی چڑیا کو سلاتی ہوں اور بس پھر نیند اور میں۔  
تعلیم کچھ خاص نہیں ہے۔ گریجویشن کیا ہوا ہے۔ آخر میں تمام قارئین کو سلام اور دعائیں۔

### مصلح نوشین

1 واہ کس قدر خوب صورت سوال۔ مجھے اس سوال

کے لیے بالکل بھی نہیں سوچنا پڑا۔ جو کہوں گی سچ کہوں گی سچ کے سوا کچھ نہیں کہوں گی کے مصداق "آج قارئین کے لیے سچائی یعنی نو آموز مصنفین کی اس عدالت میں صرف دل کی باتیں ہوں گی اور حقیقت سے پردہ اٹھایا جائے گا۔"

پہلی تحریر میں نے چاند نگر کے بیٹوں پرچوں میں سب سے پہلے شائع میں آج سے چھ سال پہلے جب میں نے نیا لکھنا شروع کیا تھا، بھیجی تھی۔ مزے کی بات مابدولت نے تو نہ اپنا فون نمبر بھیجنا اٹھایا لیکن لکھا۔ احساسات۔ تھوڑی سی بھی ندوس نہیں تھی۔ بہت خوش اور رجوش سی تھی۔ اگلے ماہ ہی شائع میں اس تحریر کے لگنے کا یقین

تھا مگر ایسا نہ ہوسکا۔ وجہ مجھے چھ سال بعد معلوم ہوئی۔ امتل کی محبت کہ انہوں نے جب میں نے چار سال کے بعد دوبارہ لکھنے کی شروعات کی تو انہوں نے مجھ سے رابطہ ہوتے ہی میرے اس ناول کا پوچھا جو میں نے آج سے چھ سال پہلے بھیجا تھا اور جسے میں بھول بھال چکی تھی کیونکہ میرا خیال تھا کہ تحریر ناقابل اشاعت ٹھہری تھی۔

جب میری تحریر شائع ہوئی تو میں بے یقین تھی۔ اپنی دوستوں کو بتایا کہ چھ سال بعد میری تحریر شائع میں لگی ہے تو انہیں یقین ہی نہیں آتا تھا۔ میں اس حوالے سے خوش نصیب ہوں کہ میری پہلی تحریر ہی سلیکٹ ہو گئی تھی شائع بھلے بہت دیر سے ہوئی۔ شائع کے صفحات پر اپنا جگہ کا نام دیکھ کے میں دنوں مسرور رہی تھی۔

2 بالکل بھی امید نہیں تھی کہ اتنی پذیرائی ملے گی کہ میرا ایک ہی ناول مجھے نامور بنا دے گا۔ ادبی حلقے اور انٹرنیٹ پر میری کتاب لمحہ جاں گسل کو بے پناہ پذیرائی مل رہی ہے اور جب اکیڈمی آف لیٹرز اسلام آباد کے چیئرمین کی مجھے کال آئی۔ اور جب انہوں نے ذاتی طور پر میرے کام کی تعریف کے ساتھ مجھے بہت بڑے انعام سے بھی نوازا۔ میرے لیے بحیثیت راسخرتب اس بل سے زیادہ اہم اور خوشی کا بل وہ ہوتا ہے جب میری تحریر خواتین ڈائجسٹ میں چھپتی ہے یا اس میں چھپنے کے لیے منتخب ہوتی ہے۔ کیونکہ جتنے باذوق اور سمجھ دار قارئین شائع خواتین اور کزن کو نصیب ہیں شاید ہی کہیں اور دستیاب ہوں۔ جو اس قدر عمیق گہرائی سے مطالعہ کرتی ہیں کہ بعض دفعہ حیرت ہوتی ہے۔

3 میں خواتین ڈائجسٹ کی ہر مصنفہ کو بڑے ذوق و شوق

سے پڑھتی ہوں چاہے وہ سینئر ہو یا نو آموز۔ ذاتی اور بڑا پختہ خیال ہے کہ ہر تحریر میں کچھ نہ کچھ سیکھنے کے لیے موجود ہوتا ہے مگر کچھ ایسی بھی راسخرتب ہیں جن کی تحریریں سیدھا دل پراثر کرتی ہیں۔ ان میں سرفہرست نمرہ احمد، سمیرا حمید، فرحت اشتیاق، راحت، فاخرہ جبین، عمیرہ احمد اور نزہت شبانہ حیدر اور سائرہ رضا ہیں جن کی تحریر میں نام دیکھ کے سب سے پہلے پڑھتی ہوں، نمرہ احمد سے تو مجھے خاص محبت سی ہے۔ وہ لگ بھگ میری ہی اتج کی ہیں مگر ان کی ذہانت مطالعہ و مشاہدہ بہت وسیع اور گہرا ہے۔ جو دیگر کی طرح مجھے بھی ان کا گرویدہ کرتا ہے۔

4 میرے پاس ہر مہینے چھوٹے بڑے کئی رسائل آتے ہیں۔ اس لیے بہت سی مصنفین ہر ماہ پڑھنے کو مل جاتی ہیں۔ کسی ایک کا نام لینا مشکل ہے۔ کتابوں میں لا حاصل (عمیرہ احمد) اگلے لوگ (مفتی ممتاز) عبداللہ (ندیم ہاشم)۔ مصحف (نمرہ احمد) اس کے علاوہ بھی بہت سی ہیں۔

5 لکھنے کا ہی پرار وقت نہیں ملتا۔ گھر کا کام میں خود ہی کرتی ہوں۔ چھوٹے چھوٹے تین اور چار سال کی عمر کے دو بچے ہیں جو سارا دن کتنی کا ناچ نچائے رکھتے ہیں۔ زندگی کے روز و شب ویسے ہی ہیں جیسے کسی بھی گاؤں کی خاتون خانہ کے ہو سکتے ہیں۔ فجر کی نماز کے ساتھ ہی دن کا آغاز ہوتا ہے۔ ادائیگی نماز کے ساتھ ہی گھر کی صفائی و ستھرائی کر لیتی ہوں پھر آرام سے فریش ہو کے ہم سب اکٹھے ناشتہ کرتے ہیں یعنی میں میرے وہ اور ہمارے دو عدد پیارے بچے۔

پچن کی صفائی کے بعد میرے سارا وقت لکھنے اور پڑھنے کا ہوتا ہے۔ گھر سے باہر بہت کم نکلتی ہوں۔ گھر کے اندر میری دنیا بہت وسیع ہے اور ہر آن میری یہی کوشش ہوتی ہے کہ کچھ نہ کچھ لکھ لوں لکھنے کے معاملے میں میرے شوہر بہت زیادہ سپورٹ کرتے ہیں جب مجھے لکھنا ہو تو وہ بچوں کو اپنے ساتھ باہر لے جاتے ہیں۔ ایسے میں یکسوئی کے ساتھ لکھ پاتی ہوں۔ تعلیم کے بارے میں کیا بتاؤں۔ ایف ایس سی سائیکالوجی کیا ہوا ہے۔ یقیناً "ایم ایس سی بھی کرتی اگر میری انٹر کے فوراً" بعد شادی نہ ہو چکی ہوتی۔ اب ارادہ ہے کہ دوبارہ پڑھائی بھی شروع کروں۔ میں خواتین ڈائجسٹ کی سینئر نامور مصنفین کی فہرست میں



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں:-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رٹریوم ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریخ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ پیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریخ
- ☆ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

کتابوں کو میں نے پڑھا اور بار بار پڑھا اور آج بھی جب فرصت ملے تو لے کر بیٹھ جاتی ہوں۔ وہ زلف و زنجیر اور مولانا رومی کی مثنوی شریف ہے۔ یہ ایسی کتب ہیں جنہیں میں نے جب جب پڑھا میری پیاس میں اضافہ ہی ہوا۔ ہر دفعہ ایک نیا مفہوم، ایک نیا مطلب آشکار ہوتا ہے۔ خیر۔ یہ کتابیں تو علم کا ایسا سمندر ہیں جن میں ڈوبنے والے کا ابھرنے کو من نہیں کرتا۔

5 نہیں جی! یوں کہئے کہ گہر داری کے علاوہ ہمارا مشکل لکھنا ہے۔ گہر کی ذمہ داری سر کھانے کی فرصت نہیں دیتی۔

صبح نماز کے بعد دونوں بیٹوں کی اسکول کی تیاری۔ ان کی روانگی کے بعد محض ایک گھنٹہ میرا اپنا ہوتا ہے۔ اس کے بعد گہری کی سوئیاں بھاگتی چلی جاتی ہیں۔ صفائی کے لیے صفائی والی آتی ہے، مگر کچن کلی طور پر میں خود ہی دیکھتی ہوں۔ صفائی ستھرائی کا خطبہ ہے۔ لہذا کام والی کے جانے کے بعد خود بھی کئی جگہوں پر ہاتھ مارتی ہوں، شام کی صفائی اس کے علاوہ ہے۔ شام کی ایک اور بڑی مصروفیت بچوں کا ہوم ورک اور میری تین ماہ کی گڑیا ”حرم فاطمہ“ جو آج کل میری فل ٹائم ڈیوٹی ہے۔ رات کو جلدی بستر لیٹ جاتی ہوں۔ ساڑھے نو بجے تک سب کام ختم کر کے بچوں کو سلا کر خود بھی سکون سے بیڈ پر بیٹھ جاتی ہوں۔ جی چاہے تو مطالعہ کرتی ہوں یا پھر یہی وقت ہوتا ہے جب کچھ ٹھوڑا بہت لکھ لیتی ہوں۔ ساتھ ساتھ میاں جی سے باتیں بھی کرتی ہوں۔ میں نے اور میرے شوہر نے گہری کی دی نہیں رکھا ہوا۔ لہذا فلموں، ڈراموں سے کوئی شغف نہیں۔

وہ تو 2004ء میں ایم اے انگلش کی ڈگری لی تھی۔ مگر پھر کبھی اسے ہوانگانے کے لیے بھی نہیں نکالا اور اب تو لگتا ہے اصل سبجیکٹ تینوں بچے ہیں۔ جن میں مجھے فل مارٹس لینے ہیں ان شاء اللہ اپنے بچوں کے ساتھ بیٹھ کر کارٹونز دیکھنا مجھے بہت پسند ہے اور حرم فاطمہ سے باتیں کرنا بھی۔ بس! فی الحال تو میری روز کی روٹین یہی ہے۔ آئندہ کا پتا نہیں۔ ارادہ تو ادب کے میدان میں جھنڈے گاڑنے کا ہے۔ بابا! اور خواہش ہے کہ نمو احمد جیسا لکھ سکوں، کمال لڑکی ہے! خوش رہیے فی امان اللہ!

بہت جلد اپنا نام دیکھنا چاہتی ہوں۔ کیونکہ صاحب کتاب ہونے کے باوجود بھی میں خود کو مصنفہ نہیں سمجھتی۔ سمجھ لوں گی، اگر خواتین کی بہترین مصنفین میں شمار ہو گئی تو۔

ام طیفور۔ گوجرانوالہ

1 سب سے پہلے تو میں شعاع خواتین اور کرن کا بے حد شکریہ ادا کروں گی جن کی بدولت مجھے ناچیز کی ایک مصنفہ کی حیثیت سے پہچان ملی۔ جب میری تحریر ”عقی جی حنیج“ شائع ہوئی تو کتنی دیر تو میں بے یقینی کی کیفیت میں گہری ڈائجسٹ کو گھورتی رہی تھی۔ سیدھی سی بات ہے مجھے قطعاً امید نہیں تھی کہ میری پہلی کوشش ہی کامیاب ٹھہرے گی۔ زندگی کے کچھ پل بے حد انمول ہوتے ہیں تو بس سمجھ لیجئے کہ وہ بھی ویسا ہی ایک خوب صورت پل تھا جس نے مجھے بے پایاں مسرت سے نوازا۔

2 توقع تو مجھے بالکل نہیں تھی کہ مجھے اتنی پذیرائی نصیب ہوگی، مگر مقام حیرت کہ سب سے پہلے تو امتل جی نے ہی تعریفی کلمات سے نوازا۔ بعد ازاں ریحانہ جی سے بات ہوئی تو انہوں نے بھی اچھے الفاظ میں تعریف کی اور باقی رہے گھر والے تو مجھے بے تحاشا شاباشی دینے والوں میں سب سے پہلے میرے ابو جی ہیں جن کے پاس میری ہر تحریر والا ڈائجسٹ موجود ہے۔ وہ بالکل ایسے ہی خوش ہوئے تھے جیسے میرا لکھا ان کے اپنے ہاتھ کا کمال ہو۔ ان کے بعد باقی تمام افراد خانہ اور میرے شوہر۔ سب ہی نے مجھے شاباش لازمی دی تھی۔

3 اوہو۔۔۔ خواتین کی سینئر مصنفین کے بارے میں کیا کہوں کہ چھوٹا منہ اور بڑی بات۔ سب ہی بہترین لکھتی ہیں اور میں نے سب ہی سے کچھ نہ کچھ سیکھا ہے۔ آج کل سائرہ رضا کو بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔۔۔ آسیہ رزاقی بھی فیورٹ ہیں۔ رخسانہ نگار، تنزیلہ ریاض، آمنہ ریاض۔ ایک طویل فہرست ہے۔ سب ہی ایک سے بڑھ کر ایک ہیں اور مجھے ان سب کو پڑھنا اچھا لگتا ہے۔

4 شادی سے پہلے تو محض ڈائجسٹوں وغیرہ میں ہی کچھ رہتے تھے، مگر شادی کے بعد میرے شوہر کے مذہبی رجحان نے مجھ میں بے حد پلاؤ پیدا کیا۔ میرے شوہر کے پاس دینی کتب کا ایک بیش قیمت ذخیرہ ہے جن سے میں بھی گاہے بگاہے فیضیاب ہوتی ہوں۔ لیکن سب سے زیادہ جن



عینہ سید

## جنگل کا لہجہ

میرا خیال ہے میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ ہم اب اس کے پیچھے جارہے ہیں نہ ہی اس کی کوئی بات کر رہے ہیں۔ "بلال سلطان کا لہجہ اور بات ابراہیم کے لیے حوصلہ افزا ہرگز نہیں تھی۔

"لیکن انکل! میں نے بتایا کہ یہ لڑکی تو کسی ہی آپ سے ملنا چاہتی ہے۔" اس نے منہ نہ کرنا چاہی۔

"تمہارا کیا خیال ہے؟ میں بہت فارغ ہوں جو جب کوئی مجھ سے ملنا چاہے میں اس ملنے کے لیے Available (درستیاں) ہو جاؤں۔" وہ سخت اور خشک لہجے میں بولے۔

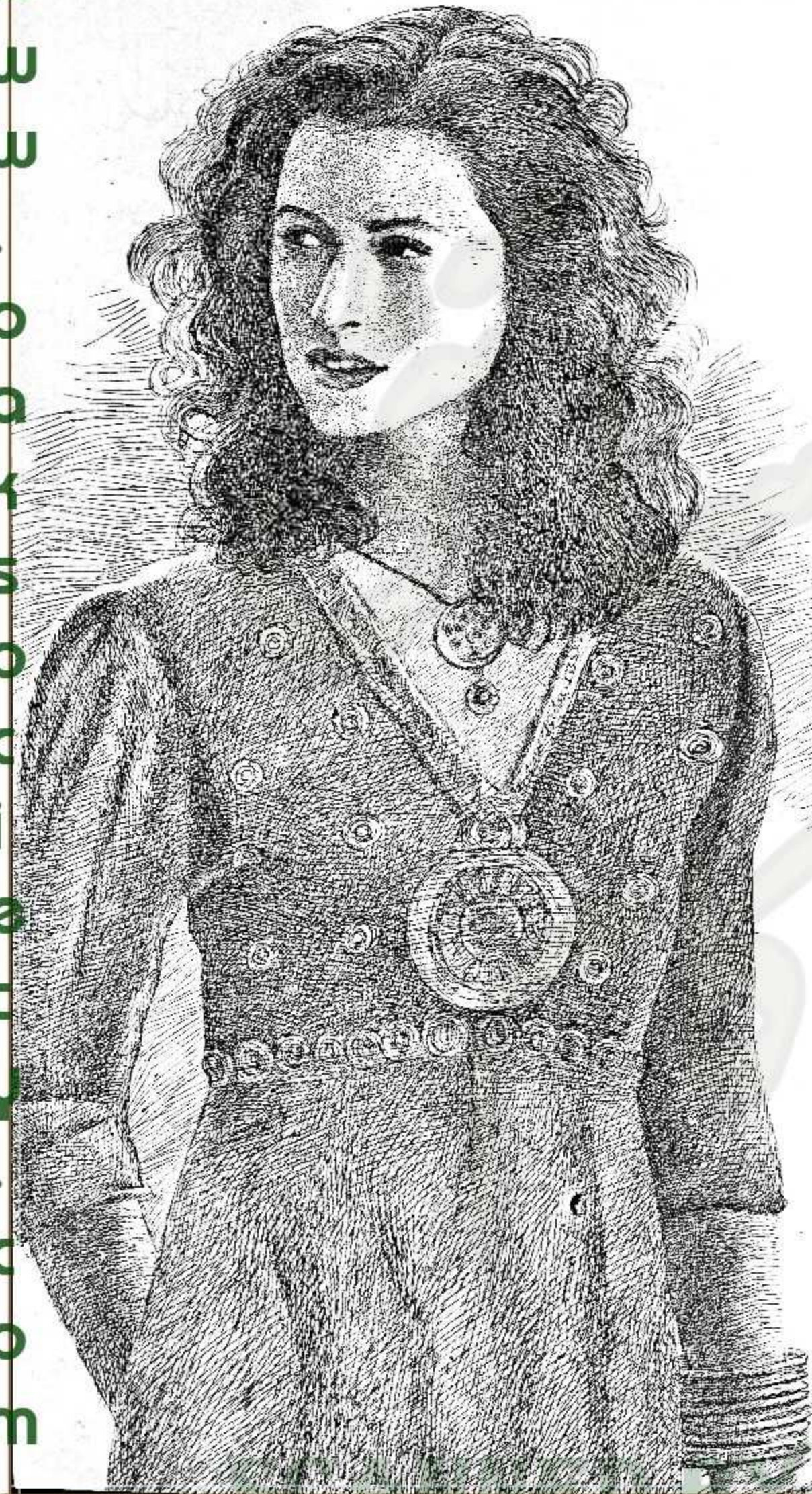
"نہیں ہرگز نہیں انکل! میں جانتا ہوں کہ آپ بہت مصروف رہتے ہیں۔" ابراہیم نے زبان پھیر کر اپنے خشک ہونٹوں کو تر کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن کیا ہے کہ اسے میں اپنے مان پر لایا تھا۔" اس نے ایک جذباتی وار کھینچنے کی کوشش کی۔ "میں نے ہی اسے یقین دلایا تھا کہ انکل میری بات کو اون کرتے ہیں کیونکہ مجھے وہ اپنے بیٹے جیسا ہی سمجھتے ہیں۔"

—۲۷—  
ستائیسویں قسط

"اس نے اچھا کیا مگر اس نے بہت اچھا نہیں کیا۔"

سارہ نے اپنی سناپی تفصیل کے جواب میں بلال سلطان کی بات سنی اور اس پر غور کیا۔

"مطلب؟" اسے ان کی بات سمجھ میں نہیں آئی تھی۔





”مطلب یہ کہ تمہیں اس ٹوٹی ہوئی حالت سے اٹھا کر لانا اور تمہارا علاج کرانا، تمہیں یہاں اکاموڈیٹ کرنا بہت اچھا قدم تھا، مگر اس اچھے جسٹس کو ایڈوکیٹ کیوں بنادیا اس نے۔“

”ایڈوکیٹ مطلب؟“ سارہ نے اب بھی سمجھ نہ سکتی تھی۔ ”جیسے ہوئے حیرت سے انہیں دیکھا۔“

”اس نے یہ سب یوں کیوں کیا جیسے کوئی غلط کام کر رہا ہو۔ جسے دنیا کی نظروں سے چھپانا ضروری ہے، یوں جیسے کسی خفیہ مشن کو سرانجام دے رہا ہو جس سلسلے میں سیکرٹری ضروری ہو۔“

”آپ کا خیال ہے اسے اپنے اس کام کے بارے میں دنیا کو بتانے کے لیے ڈھول بجانے چاہیے تھے۔“ سارہ نے کہا۔

”نہیں ڈھول بجانے کی ضرورت نہیں تھی۔ تمہاری ری پبلکیشن کے لیے اسے چاہیے تھا، تمہیں کراؤڈ سے دور نہ رکھنا، تمہیں صحت مند سرگرمیوں میں مصروف کر دینا۔“

”کیا اس کے اکثر معاملات اسی طرح سیکرٹ نہیں رہے۔ ماہ نور والے معاملے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ اس نے اس کو بھی خفیہ رکھا۔“ سارہ کو خود بھی معلوم نہیں تھا کہ اس نے یہ بات کیوں کہی تھی۔

”خیر، ماہ نور کا معاملہ مختلف تھا، ماہ نور اس کے دل کا معاملہ تھی اور دل کے معاملات اکثر دل میں ہی رکھے جاتے ہیں۔“

”نجانے کس کس سمت سے کانچ کے ٹکڑے اڑ کر سارہ کے دل میں آپوست ہوئے تھے۔“

”ماہ نور اس کے دل کا معاملہ تھی۔“ اس نے عجیب سی ٹیپ محسوس کرتے ہوئے سوچا ”اور میں۔ میں کیسا معاملہ تھی۔“ ذہن میں سوال تھا اور چہن مزید بڑھ گئی۔

”تم انسانیت کا معاملہ تھیں۔“ بلال سلطان نے جیسے اس کے ذہن کا سوال پڑھ لیا تھا۔ ”احساس کا معاملہ تھیں۔ تمہارے سلسلے میں اسے زیادہ حیا ہونا چاہیے تھا۔ جتنا وہ رہا۔“

”اس سے زیادہ حیا۔“ سارہ کے چہرے پر تلخی پھیلی۔ ”آپ شاید جانتے نہیں کہ اس نے مجھے کس ناز و نعم سے رکھا۔ آپ نے کسی گود کے بچے کو عمر اور وقت کے ساتھ پروگریس کرتے نہیں دیکھا ہوگا۔ آپ نے اپنے بچوں کی پروگریس کے بھی کئی حصے مس کر دیے ہوں گے، سعد نے میری پروگریس کا کوئی حصہ بھی مس نہیں کیا، اس نے گود کے بچے کی طرح مجھے دن بدن آگے بڑھنا سکھایا ہے، ساری کی گمراہیوں میں جا کرے ایک زخمی دل کو اس نے کس طرح امید کی کرن کو فالو کرنا سکھایا ہے، میں جانتی ہوں زندگی ایک تنگ سرنگ کی مانند تھی، سعد نے میرے پیچھے کھڑے ہو کر اس تنگ سرنگ میں اپنی روشنی میرے آگے بکھیر دی، اور میں نے اس تنگ سرنگ سے باہر کھلی فضا تک آنے کا سفر اسی روشنی کے سنگ طے کیا ہے۔ میرے یہ الفاظ چند لمحوں کے اندر میرے منہ سے ادا ہوئے، جبکہ حقیقت میں یہ سفر چند لمحوں میں نہیں، کئی سالوں میں طے ہوا، یہ میرے ہاتھ دیکھ رہے ہیں آپ!“

اس نے اپنے ہاتھ سامنے پھیلائے۔ جو شدت جذبات سے لرز رہے تھے۔

”یہ بے جان تھے، یوں جیسے چینی کی گڑیا کے ہاتھ ہوں، ہاتھوں کے محض خطوط جن میں خون تھا نہ جان یہ میری باؤں اور یہ ٹانگیں۔“ اس نے اپنے پیر آگے بڑھائے۔ ”ان کی ہڈیاں نجانے کہاں کہاں سے ٹوٹی تھیں اور ان کا گوشت کہاں کہاں سے پھٹا، پکلا اور ادھر اٹھا، مجھے کوئی ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کے لیے شانے پر اٹھا تا تو یہ ٹانگیں کئی پتنگ کی طرح اس کے دامن بائیں نکلتی تھیں۔ یہ میری گردن اس کے منہ کے پیچھے، میری ریڑھ کی ہڈی اس کے منہ کے پیچھے، میرے جسم کا گوشت، رگیں اور ہڈی، کچھ بھی ایسا نہیں تھا جو سلامت تھا، بس ایک جان تھی جو باقی تھی، کس میں وہ صبر اور حوصلہ تھا، کس میں ہمت تھی کہ ان سب کی روفوگری کرنا بیٹھ کر۔“

اس نے بلال کی طرف دیکھ کر سوال کیا۔ ”یہ صرف اسی کا حوصلہ تھا، یہ صرف وہی کر سکتا تھا، اتنی خاموشی سے اتنے سکون سے اتنے صبر سے جیسے دائیں ہاتھ سے دیا جائے اور بائیں ہاتھ کو پتہ نہ چلے، وہ اس حکم کی تعمیل کا عملی نمونہ بنا میرے چاک ہوتے جسم کو پھر سے پرانی شکل میں واپس لانے کی کوشش میں سرگرداں رہا۔ یوں کہ آپ تک کو پتہ نہ چلا، آپ جو اس کے باپ تھے جان نہ سکے کہ بیٹا کس کام میں دن رات لگا ہوا ہے۔ میری موجودہ صورت حال اس کے ظرف اور حوصلے کی دین ہے، سارا اور آپ کہتے ہیں کہ اس نے اس کام کو ایڈوکیٹ بنائے رکھا۔ آپ بتائیں آپ میں حوصلہ ہے ایسے ایڈوکیٹ کرنے کا اتنا صبر اتنی ہمت اتنا ظرف۔“

وہ چھوٹی سی نحیف نزار لڑکی ان کے سامنے بیٹھی ان سے سوال کر رہی تھی، وہ ان کے بیٹے کی وکیل تھی اور اپنے دلائل دے رہی تھی۔ وہ اس کی نیکی کا نیک فطرتی کا کرشمہ تھی جسے وہ لالچالی لاپرواہ خود پسند اور بے نیاز کہتے رہے تھے۔

”دنیا میں لاکھوں کروڑوں انسان بستے ہوں گے صاحب!“ اب کے وہ سیاہی مائل گندمی رنگت زرد رو، کچھڑی بالوں والی ادھیڑ عمر عورت بولی۔ ”مگر ان کروڑوں انسانوں میں سعد سلطان، صرف ایک ہے۔“ اس نے شہادت کی انگلی کھڑی کرتے ہوئے کہا اس کی انگلی کے ساتھ ساتھ آواز بھی شدت جذبات سے۔ ”کانپ رہی تھی۔“

”ہمارے لیے کم سے کم ہمارے لیے سعد سلطان صرف ایک ہے اس دنیا بھر میں۔“

بلال نے اس عورت کی طرف غور سے دیکھا جس کا جسم محنت کا عادی محسوس ہوتا تھا اور بولتے ہوئے جس کے دانت چھوڑتے بھورے پڑتے موڑھے صاف نظر آتے تھے۔ ”بلو، ہون سرکس کے کسی کرتادھرتا کے دل میں رحم نہ آیا کہ برسوں تک سرکس شوکی جان بنی رہنے والی اپنی جان پر کھیل کر کھوڑے، بیر شیروں کے ساتھ خطرناک کرتب دکھانے والی، بلو، ہون سرکس کے لیے لاکھوں کمانے والی، بلو، ہون سرکس کی شہزادی پر یا رانی۔ جب چھ انچی بار پر پیر کے انگوٹھے کی نوک ٹھیک سے نہ جھننے کی وجہ سے سر کے بل پتھر لیے فرش پر گر کر تو اسے اٹھانے کو اسٹریچر ہی منگوا لیتے کوئی فرسٹ ایڈ ڈینے والا ہی کال کر لیتے تھوٹے پھوٹے خون، کھیرتے اس جسم کو کپڑے کی چادر میں ڈال پوٹلی بنائے اٹھالے گئے اور اگلے لمحے بتیاں روشن کر کے دوبارہ سے شو شروع کر دیا۔“

یسی آنٹی کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

”بے حسی کی ایک انتہا یہ بھی ہوتی ہے صاحب جو میں نے آپ کو سنائی اور اسی انتہا سے دل والے احساس والے، دوسروں کے غم میں رونے والے جنم لیتے ہیں، بے حسی کی اسی انتہا سے سعد سلطان جنم لیتے ہیں صاحب۔ آپ تو جانتے ہی نہیں شاید کہ کس کے باپ ہو، آپ کو تو لگتا ہے معلوم ہی نہیں کہ آپ کے گھر میں سعد نے نہیں سعد کے روپ میں کسی فرشتے نے جنم لیا تھا، مجھے یقین ہے کہ جب وہ فرشتہ دنیا میں آیا ہوگا احساس محبت اور ہمدردی کی تیلیوں نے اس کی آنکھوں کو چوم کر اس کی آنکھیں کھولی ہوں گی، نیکی، نیک دلی، نیک فطرتی کے جگنوؤں نے اس کے دل کو اپنی روشنی سے منور کیا ہوگا، جب ہی تو اس نے دنیا کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور دل سے مصروف عمل ہوا۔“ یسی کی آنکھوں سے آنسو تو اتارے سے بے جا جارہے تھے۔

بلال سلطان کو یاد کرنے پر بھی یاد نہیں آ رہا تھا کہ وہ زندگی میں کتنے سالوں کے بعد اس روز دم بخود ہوئے تھے، اپنے ذہن میں عادتاً ”جمع تفریق کرتے وہ اس دم بخودہ جانے والی کیفیت میں بیٹھے یسی کی بات سن رہے تھے۔“

”ہمیں نہیں معلوم ہماری اس محدود دنیا سے باہر سعد سلطان کون ہے۔“

یسی آنٹی نے اس طرح رونے پر اپنی آنکھوں میں بے اختیار اندھے آنسوؤں کو روکتے ہوئے کہا ”ہمیں



صرف اتنا معلوم ہے کہ ہماری اس محدود دنیا کے اندر وہ کسی فرشتے کی مانند ہمارے پاس آتا رہا اور اپنے خوش و خرم کو گھماتا ہماری ہر ضرورت پوری کرتا رہا۔ میری بیماری معذوری پر مبنی ہوئی اور معذوری محتاجی کے راستے پر چل پڑی، میری محتاجی کو اپنے دو مضبوط ہاتھوں اور محبت بھرے شانے کا سہارا دے کر ایک طویل راستے پر چلتے خود انحصاری کے موڑ پر مجھے موڑتا وہ فرشتہ میرے لیے کل دنیا ثابت ہوا، اسے نتیجے کے متفی یا مثبت ہونے کی پروا تھی نہ ہی اس بات کی کہ کتنا وقت لگے گا اس کے اندر صرف ایک لگن تھی، ایک جذبہ تھا۔ ایسی لگن اور ایسا جذبہ جو ناممکن کو مجبور کر دیتا ہے کہ وہ ممکن ہو جائے اور آپ دیکھ لیتے ہیں یہ میں ہوں، میرا آج جو آپ کے سامنے ہے۔

وہ سیدھی ہو کر بیٹھتے ہوئے بولی اس کے شانے اوپر کواٹھے ہوئے تھے اور جسم بالکل سیدھا تھا۔ وہ بلال سلطان کو دکھانا چاہتی تھی کہ وہ پہلے سے کتنی بہتر تھی۔

”ہوں۔“ کچھ لمحوں کے مزید توقف کے بعد انہوں نے پلکیں جھپکیں۔

”کیا تم واپس سرکس رنگ میں جانا چاہو گی؟“ انہوں نے ایک بار پھر اس سے سوال ہی کیا تھا۔

”شاید یہ اب ممکن نہیں۔“ سارا نے بے تاثر لہجے میں کہا۔

”ممکن ناممکن کی تو ابھی بات ہی نہیں ہو رہی، ابھی تو بات چاہنے یا نہ چاہنے کی ہو رہی ہے۔“

”چاہنے یا نہ چاہنے کا تعلق بھی ناممکن اور ممکن سے براہ راست ہوتا ہے۔“

”مگر چاہتے یا نہ چاہنے کی بات کرو۔“ انہوں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اگرچہ میں اب بوڑھا ہو رہا ہوں، مگر سعد سلطان کا بھی باپ ہوں، وہ جذبہ جو ناممکن کو مجبور کر دیتا ہے کہ وہ ممکن ہو جائے مجھ میں بھی کچھ ایسا کم نہیں۔“

وہ کہہ رہے تھے اور اب کے سارا خان عرف پریارانی دم بخود بیٹھی ان کی بات سن رہی تھی۔

\*\*\*

اس روز اس نے آنکھیں کھول کر اپنے ارد گرد موجود چہروں کو دیکھا تھا۔ اس کے ذہن نے اسے بتایا تھا کہ وہ سب اجنبی چہرے تھے، مگر ان کا کام ایک ساتھ وہ بیمار کو دوا دینے والے طبیب تھے اور ان میں سے چند ان طبیبوں کے مددگار بھی تھے۔ اس نے آنکھیں کھول کر سامنے نظر آنے والے چہروں کے خدو خال کی ناانوسیت پر دکھ محسوس نہیں کیا تھا، وہ بس اتنے میں ہی خوش تھا کہ اسے انسانوں کے چہرے دکھائی دے رہے تھے اور اس کی بصارت کسی نقصان سے محفوظ تھی۔

اس روز صبح کے اس وقت کے بعد جب اس نے وہ اجنبی چہرے دیکھے تھے نجانے کتنے دورانیہ کا وقفہ آیا تھا جس میں ذہن اور آنکھوں پر حاوی غنودگی کو شکست دینے کے بعد اس نے ایک بار پھر آنکھیں کھولی تھیں۔ اس کے دائیں طرف موجود اس پر جھکے دو چہرے اس کے یوں دیکھنے پر مسکرائے تھے جو اب میں اس کے ہونٹ بھی پھیلے تھے یا نہیں اسے بتا نہیں چلا تھا اگرچہ اس نے جواباً ”مسکرائے کی کوشش کی تھی پھر اس نے اپنی گردن کو بائیں طرف موڑنے کی کوشش کی تھی اپنی نظروں کو موڑ کر زاویہ بنانے کی کوشش کی تھی اور اس کے ذہن نے ایک زوردار جھٹکا کھایا تھا۔ اس کے بائیں طرف موجود دو چہروں میں سے ایک چہرہ ناانوس اور اجنبی ہرگز نہیں تھا۔ اس کی نظریں اس چہرے پر گڑی رہ گئیں، پہلے ان میں حیرت اتری اور پھر اسے ایک ٹک دیکھتے ہوئے شاید کئی سوال آئے اس کے بعد ایک بار پھر اس کی آنکھیں بوجھل ہوتے ہوئے دھیرے دھیرے بند ہو گئی تھیں۔

”اس نے مجھے دیکھا اس نے مجھے پہچان لیا۔“ بائیں طرف کھڑی اس لڑکی نے جس کے چہرے کو وہ ایک ٹک دیکھتا رہا تھا مسرت سے کھنکھاتی آواز میں کسی سے کہا تھا۔

”اس کا مطلب ہے اس کے حواس کام کر رہے ہیں۔“ ایک دوسری آواز نے کہا تھا۔

\*\*\*

”کہاں تو تمہیں سراج سرفراز کی شکل سے بھی چٹھی کہاں اس کے بچے کی ماں بننے کی خوش خبری پر ہواؤں

میں اڑی پھر رہی ہو؟“

”اس کے بچے کی ماں بننے کا اضافہ نہ کرو تو بہتر ہے، مجھے ماں بننے کی خبر سن کر خوشی ہو رہی ہے جس وقت سے

خبر آئی ہے اپنا آپ شہزادوں جیسا لگ رہا ہے۔“

”سراج سرفراز کا اضافہ کیے بغیر خبر دھوری ہے نا شہزادی صاحبہ اس کا اضافہ کیسے نہ کرو۔“

”اونسوں۔ دو گھڑی پوری طرح خوش تو ہو گئے۔“

”ضرور خوش ہو لو، میں نے لال کھولی سے برنی منگوائی ہے اسپیشل خان محمد کے ابا سے کہہ کر جی بھر کر میٹھا

کھاتے ہوئے خوشی منانا۔“

”ہائے میرے منہ میں تو ابھی سے پانی بھر آیا۔“

”اچھا یہ بتاؤ لڑکی کی خواہش ہے کہ لڑکے کی؟“

”دونوں میں سے کوئی بھی ہو جائے، مجھے تو بس ماں بننے کی خبر کی خوشی ہے عمر گزر گئی دو سروں کی مبارک بادیاں

گاتے ہوئے اللہ اللہ کر کے خود پر یہ وقت آیا ہے کہ میں بچہ جنوں اور کوئی اور مبارک بادیاں گائے۔“

”اچھا اللہ خیر کا وقت لائے نہ ہوتا سراج سرفراز تو کیسے آتا یہ وقت نہ بتاؤ۔“

”اے وہی سراج سرفراز پھر سے بچ میں آج بتا ہی دو کہ تمہیں مجھے تنگ کرنے میں کیا مڑا ملتا ہے۔“

”تمہیں تنگ نہیں کرتی یا دلاتی ہوں کہ سراج سرفراز سے۔ اب تمہاری زندگی جڑی ہے اس کی وفاداری

اور تابع داری ہی میں تمہاری دنیا اور آخرت کا سامان ہے شوہر کی عزت نہ کرنے والی عورتوں سے جنم بھری

ہو گی قیامت والے دن۔“

”توبہ ہے تم نے تو ہولا ہی دیا مجھے۔“

”میں ہولاؤں گی تو تمہاری گھر میں آئے گا نا!“

”اچھا۔ ٹھیک ہے ویسے یہ سچ میں نہیں آتا کہ ہمارے مالک مکان نے کیوں خاموشی اختیار کر رکھی ہے نہ

کرائے کا مطالبہ کرتا ہے نہ ہی ملنے پر بد اخلاقی سے پیش آتا ہے۔ کہیں یہ مکان ہی تو ہمارے نام نہیں لگا رہا پکا

پکا۔“

”اتنا وہ فیاض اسے کرایہ مل جاتا ہو گا تا تم پر۔ اسی لیے نہیں بولتا۔“

”فرشتے دے جاتے ہیں کیا کرایہ ہمارے پاس تو ہانڈی روٹی چلانے کے میسے نہیں ہوتے۔ ارے یاد آیا تم نے

کل کپتار کیا بھاؤ منگوائی تھی۔ نئی سبزی توبہ منگوائی ہوئی ہے۔ تم نے کیسے منگوائی؟“

”میرا دل چاہ رہا تھا کپتار کھانے کو اس لیے منگوائی۔“

”وہ تو ٹھیک ہے، مگر کپتار منگوانے کو میسے کدھر سے آئے تھے؟“

”اللہ نے بھیجے تھے میں نے خرچ کر لیے۔“

”کمال ہے اللہ ہم پر کچھ زیادہ ہی مہربان نہیں ہو گیا آج کل کمائی کے نام پر چند دھیلے اور کرایہ بھی پہنچ جاتا

ہے گھر کی ہانڈی بھی کرائی ہونے لگی۔“

”تم بس شکر ادا کیا کرو اپنے رب کا۔“



”رے ہاں وہ تو ادا کرتی ہی رہتی ہوں۔ یہ بتاؤ آج کیا چڑھانا ہے؟“

”بگھارے بیٹنگن بکاؤ، خوب کھانا ڈال کر۔“

”رے واہ زبان ابھی سے مزالینے لگی، مگر ایک بات تو بتاؤ دو جے جی سے تو میں ہوئی ہوں۔ عنوان تمہارے لگ رہے ہیں، نت نئے کھانے کھانے کو دل چاہنے لگا ہے، کھائی کھانے کی باتیں ہو رہی ہیں۔ مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے میرا نہیں تمہارا بھاری ہوا ہے۔“

”مذاق مت کرو، مجھ بے چاری کا پیر کیسے بھاری ہو گا اب تم تو جانتی ہو۔“

”رے ہاں جانتی ہوں اچھا اب چلتی ہوں سبزی منگوانے۔“

”ہاں جاؤ۔“

”ہائے میرے ربا، ہم لٹ گئے۔“

”کیا ہوا؟“

”جگلی سے لڑکا بھاگتا آیا ہے، کہتا ہے سراج سرفراز کو کسی نے چھرا مار دیا، خون میں لت پت پڑا تھا۔ محلے والے اٹھا کر اسپتال لے گئے ہیں۔“

”ہائے یہ کیا ہو گیا، رے کسی سے پتا تو کرواؤ ہوا کیا۔“

”روئے دھونے کی آوازیں۔“

\*\*\*

”تمہارے فون پر ایم ایم ایس ایکٹیویٹ ہے یا نہیں۔“ ماہ نور نے اس سے پوچھا تھا۔

”ہاں ایکٹیویٹ ہے، میرا فون تصویریں وصول کر لیتا ہے۔“

”میں تمہیں ایک تصویر بھیج رہی ہوں مل جائے تو بتانا۔“

”ہاں ضرور۔“

چند لمحوں بعد ماہ نور کی بھجوائی تصویر محمد رضوان الحق کی نظروں کے سامنے تھی۔

”یہ سارہ خان کی تصویر ہے، سارہ خان جسے پریارانی بھی کہا جاتا تھا، بلیو ہیون سرکس کی شہزادی پریارانی۔“

ماہ نور نے تصویر کے ساتھ بھیجے پیغام میں لکھا تھا۔

محمد رضوان الحق ایک ٹک اس لڑکی کی تصویر کو دیکھ رہا تھا جسے اس نے بلیو ہیون سرکس کے کرتادھرتاؤں کی برین واشنگ کی دھول میں ایک بار کھودیا تھا۔

\*\*\*

اس کے قریب ہی کہیں سے ٹک ٹک اور گھر گھر کی ہلکی آوازیں آتی تھیں، کبھی یہ آوازیں ٹوں ٹوں کی آواز میں بدل جاتی تھیں۔ اس نے آوازوں کے سنگنز کو وصول کیا۔

”یہ کسی قسم کی مشینوں سے آنے والی آوازیں ہیں، یوں جیسے اسپتال میں مریضوں کے جسم کے مختلف اعضاء کی حالت جانچنے والی مشینوں کی آوازیں ہوں۔“ اس کے دماغ نے ان آوازوں کو ایک درست اندازے میں تبدیل کیا تھا۔ زندگی کی طرف لوٹنے میں اس کی رفتار خاصی تیز اور حوصلہ افزا تھی۔

\*\*\*

”کھاری! تم کیوں ایسے چپ چاپ ہو گئے ہو میرے بچے، سعدیہ بتا رہی تھی، تمہارا کھانا پینا بھی بہت کم ہو گیا

”کیا بات ہے میرے بچے؟“ آپا رابعہ نے اس روز پیغام بھیج کر کھاری کو گھر بلوایا تھا اور اس کی کمزور پڑتی صحت دیکھ کر خود بھی حیران رہ گئی تھیں۔

”کچ نہیں، بھین جی، مینوں کی ہوتا ہے۔“ وہ سر جھکائے بیٹھا تھا، وہ ان سے نظریں ملانا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اسے ڈر تھا اس کی نظروں میں بھین جی کے لیے جو شکوے اور گلے تھے وہ نظریں ملانے پر بھین جی پر آشکار ہو جائیں گے جبکہ جد ادب کا تقاضا تھا کہ ایسا نہ ہو پائے۔

”لگتا ہے تم نے مہمان بی بی اور چوبدری صاحب کی بات دل سے لگالی ہے۔“

”نہیں بھین جی، میں شیدائی بندہ ہاں، میں دل نال کس راپ لگانی ہے وہ بات، شیدائیاں دے دی کدی دل ہوندے نیں۔ اس نے ہنوز سر جھکائے کہا، اس کی نظریں اپنی مٹی ہوئی بے پالش پشاوری چپل کی ٹوک پر جمی تھیں۔

”ادھر دیکھو کھاری! میری طرف دیکھو۔“ اب کے آپا رابعہ نے قدرے رعب دار آواز میں کہا۔

”کیا تم مجھ سے بھی ناراض ہو، ناراض ہوتا؟“

کھاری نے ان کی بات کا جواب نہیں دیا۔

”دیکھو کھاری!“ آپا رابعہ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ”مگر تم اس بات پر ناراض ہو کہ میں نے بھی تمہاری بات کا یقین نہیں کیا تو تم کو شاید اندازہ نہیں میرے پاس تمہاری بات کے یقین نہ کرنے کی وجوہات بھی ہیں۔“

”بھین جی! میں کی آکھیا اے، میں نے کج دی نہیں آکھیا۔“ کھاری نے ابھی بھی نظریں اوپر نہیں اٹھائی تھیں۔

”دیکھو کھاری! مجھ سے زیادہ کون سمجھ اور جان سکتا ہے کہ سعد سلطان، کیلا بچہ ہے اپنے والدین کا اس کا کوئی اور بھائی تھا ہی نہیں۔ اس کی ماں کے ہاں اس کے بعد کسی اور بچے کے ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، سعد کا باپ اس کی ماں کو چھوڑ کر کب کا بھاگ چکا تھا۔“

”بھین جی!“ اب کے کھاری نے پہلی بار سراٹھایا تھا۔ گلاں کرن لگیں تو گلاں (باتیں) تو مجھے بھی وڈی آتی ہیں۔ اس کے انداز میں طنز کی کاٹ تھی۔

”ہاں تم بتاؤ۔ کیا بات ہے؟“ آپا رابعہ نے تحمل سے کہا۔

”ابھی تو یہ بات کفرم ہی نہیں ہوئی کہ وہی سعد ہے جو آپ سمجھی تھیں، کیا ماہ نور باجی نے آپ کو پیغام بھیجا کہ کفرم ہو گیا، وہی سعد ہے۔“

آپا رابعہ کھاری کی دلیل کے صدقے جانے کو بے چین ہوئیں، مگر پھر خود پر قابو پاتے ہوئے اسی تحمل سے بولیں۔

”نظر اور عقل دونوں ہی اکٹھے دھوکا نہیں کھاسکتیں کھاری اور نظر اور عقل سے اوپر میرا وجدان ہے، جو کہتا ہے یہ وہی سعد ہے مجھے کسی کفرمیشن کی ضرورت ہے ہی نہیں۔“

کھاری نے آپا رابعہ کے پُر یقین انداز کی طرف دیکھا اور اس کا دل پسلیوں میں کہیں مزید دب گیا۔

\*\*\*

”میں درد محسوس کر رہا ہوں، کہاں یہ مجھے پتا نہیں۔“

اس کے منہ سے ادا ہوئے الفاظ اس کے قریب کھڑے لوگوں نے سنے بھی تھے اس کے منہ سے ادا ہونے والا



ایک ایک لفظ واضح تھا اور الگ الگ بھی، ان لوگوں نے اس کے منہ سے نکلنے والے الفاظ کو سنا تھا اور ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائے تھے گوان میں سے کوئی ایک بھی ان الفاظ کا مفہوم نہیں سمجھ پایا تھا کیونکہ ان کے پاکستانی مریض نے یہ الفاظ اپنی زبان میں کہے تھے۔ وہ سمجھ نہیں پائے تھے مگر ان کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ اس کی قوت گویائی بھی پرقرار تھی۔

”تم یہاں کیسے آگئیں؟“ چوبیس گھنٹوں کے وقفے کے بعد دوبارہ گویا ہوا تھا اور اس بار اس نے یہ الفاظ اپنے سامنے کھڑی اس لڑکی سے کہے تھے جسے ایک بار پہلے دیکھ کر اس کی نظروں میں شناسائی جھلکی تھی۔

”کیسے کیا مطلب؟“ وہ لڑکی خود کو مخاطب کیے جانے کی سرت سے سرشار اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی تھی۔

”یہاں مجھے ہی تو ہونا چاہیے تھا تمہارے پاس تمہارے بہت قریب۔“

وہ شاید اس کی بات سن کر مسکرایا تھا اور اس نے آنکھیں موند لی تھیں۔

”اے شکر خدا! میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا، معجزے رونما ہوتے ہیں، وہ یونہی رونما ہوتے ہیں۔“ اس کی سماعت نے سنا تھا وہ لڑکی نجانے کس سے مخاطب یہ الفاظ کہہ رہی تھی۔



اس کے فون پر سردار چاچا کی کال آئی تھی۔ اس نے بے تابی سے کال وصول کرتے ہوئے فون کان سے لگایا تھا۔

”اسلام علیکم چاچا کیا حال ہے، کدھر تھے آپ اتنے عرصے سے میں آپ کو کال کر کے تھک چکی، میسج بھی کتنے سارے کیے، کوئی جواب ہی نہیں۔“ اس نے تیزی سے کہا تھا۔

”آرام سے آرام سے پتہ چلے گا۔“ جواب میں سردار چاچا کی مخصوص کھنکھاتی ہوئی آواز سننے کو ملی۔ ”تمہیں پتا تو ہے میں ملک میں نہیں ہوں، نمبر رومنگ پر نہیں تھا، اسی لیے تمہاری کالز مجھے نہیں ملیں اب رومنگ پر نمبر کروایا ہے تو تمہارے اتنے سارے میسج مل ہی گئے، جب ہی فون کیا، خیر تو ہے۔“

”نہیں چاچا خیر کدھر ہے؟“ اس نے آہستہ آواز میں کہا۔ ”چاچا! یہ تو بتائیں کہ آپ نے سعد کو کھاری کے بارے میں کیا بتایا تھا جو وہ ایک دم ہی گاؤں سے کہیں چلا گیا تھا۔“ اس کا سانس تیز ہو رہا تھا۔

”ہیلو۔ کیا کہہ رہی ہو؟ ایک تو آواز بھی ٹھیک سے نہیں آرہی۔“

”ہیلو سردار چاچا میں پوچھ رہی تھی کہ سعد کو کھاری۔“ اس نے بلند آواز میں کہا۔

”نوں ٹوں۔“ دوسری طرف سے فون بند ہو گیا اور اس کا سوال ادھور رہی رہ گیا تھا۔

”مائی گاؤں۔“ اس نے جھنجھلا کر کہا اور خود سے سردار چاچا کا نمبر ملانے لگی۔ اب اسے دوسری طرف فون بند ہونے کی اطلاع موصول ہو رہی تھی۔

”کیا مصیبت ہے؟“ اس نے جھنجھلا ہٹ کے مارے فون بند کر دیا۔

”کوئی کلیو نہیں مل رہا، کوئی راستہ نہیں سوچ رہا، سب سوالوں کے جواب میں خاموشی، سب زبانیں خاموش پھرے گم ہو چکے ہیں!“ اسے اپنی بے بسی پر رونا آنے لگا تھا۔

اس نے اپنی آنکھوں میں اٹتے آنسوؤں کو جھٹکا اور یاد کرنے کی کوشش کی کہ وہ ”بلال سلطان“ کو کیسا چیلنج دے کر آئی تھی۔ بلال سلطان کی یاد آتے ہی اسے سعد کا آئی فون اور اس میں محفوظ فائلز یاد آگئیں۔ جنہیں اس نے ایک بار دیکھا اور پڑھا تھا اور اس کے بعد وہ ایک طوفانی محبت کا احساس ملنے پر جذباتی بھی ہو چکی تھی اور جنونی

بھی، ان فائلز کو اس نے دوبارہ اس لیے نہیں کھولا تھا کہ وہ جانتی تھی دوبارہ ان پر نظر پڑنے سے اس کا ارادہ اس کا چیلنج بھرا انداز اور اس کی کوشش ٹوٹ کر ریزہ ریزہ بھی ہو سکتی تھی۔ مگر وہ وقت کا کوئی ایسا لمحہ تھا جس میں اسے لگا کہ اسے بغیر کسی احساس وجذبے کے ایک بے تاثر دل کے ساتھ اس فائل کو دوبارہ پڑھنا چاہیے جس میں سعد کے اعترافات موجود تھے۔ اس نے اٹھ کر اپنے وارڈ روم کی دراز سے وہ آئی فون نکالا اور سعد کی یادداشتوں کی فائل ڈھونڈ کر کھولی۔

”میں تمہیں تمہارے چاچا چوبدری سردار سے سنی وہ بات نہیں بتاؤں گا ماہ نور! جس کو سننے کے بعد مجھے کھاری کے غیر اہم وجود کی اہمیت کا علم ہوا۔“

فائل کے مندرجات پڑھتے پڑھتے ایک بار پھر وہ ان الفاظ کو پڑھ کر بری طرح چونکی تھی۔

”کھاری کے غیر اہم وجود کی اہمیت کا علم۔“ اس نے ایک بار پھر غور کرنے کی کوشش کی۔

”سردار چاچا نے آخر اسے کھاری کے بارے میں کیا بتایا ہو گا؟“

”مہ نور باجی! مینوں آپ وی تہاڑے نال ایک ضروری کم اے (ماہ نور باجی مجھے بھی آپ سے ایک ضروری کام ہے)۔“ اسے یاد آیا وہ کیسے منت بھرے انداز میں اس سے کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر اس نے سنی ان سنی کر دی تھی۔

”اے کھاری!“ اس نے اپنا فون اٹھا کر اس پر کھاری کا نمبر ملایا۔ چند سیکنڈز کے وقفے کے بعد اس پر بھی آپریٹر کی مخصوص آواز ابھری۔

”ہم معذرت خواہ ہیں آپ کا ملایا ہوا نمبر اس وقت بند ہے۔“

”یا اللہ۔۔۔ یہ کیا تماشہ ہے؟“ اس نے فون بند کر کے ایک بار پھر پھینک دیا۔ ”جدھر منہ کرتی ہوں وہیں رابطہ بند ہے۔ یہ کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ۔“ وہ کڑھنے لگی تھی کچھ دیر۔ یونہی کڑھتے رہنے کے بعد اس نے سعد کے آئی فون کی طرف توجہ کر لی۔

”نور فاطمہ کی جھونپڑی ایک تنبیہ کی علامت تھی یا کسی نئے سبق اور تجربے کی، میں اس معاملے پر غور کرنا اور سوچنا ہی نہیں چاہتا تھا، لیکن تمہارے لیے میرے دل میں یہ خواہش ضرور ہے کہ کوئی فقیر چند کے سولنگ کے ساتھ تاحد نظر، نظر آنے والے سرسبز کھیتوں کے درمیان بنی اس کچی کوٹھری میں ضرور جاؤ۔“

پڑھتے پڑھتے ماہ نور سانس لینے کو رکھی۔

”وہ کیوں چاہتا تھا کہ میں وہاں جاؤں، وہ کیوں چاہتا تھا کہ میں سکون اور طمانیت کے اس احساس کو محسوس کروں۔“ اس نے ایک بار پھر سوچنا چاہا۔ ”کون ہے نور فاطمہ؟ اور اس کی جھونپڑی میں ایسا کون سا خزانہ دبا ہے جس نے اس کو اتنا اہم بنا رکھا ہے۔“

”میں تمہیں فضل حسین اور میمونہ آئنٹی سے ملاقات میں ملنے والی معلومات اور فلز اظہور کے سینے میں ان کی طرح گڑے دکھ کا احوال بھی نہیں سناؤں گا۔“

انگلی لائیں اور بھی الجھا دینے والی تھیں۔ ماہ نور نے ان پر بھی غور کرنے کی کوشش کی۔ اس کا ذہن بند تھا، مگر پھر سوچنے کی مسلسل کوشش کے دوران یکایک جیسے اس کے ذہن میں روشنی کا جھماکا سا ہوا اسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے یہ الجھا دینے والے جملے محض جملے نہیں وہ کلیوز تھے جن کو حل کرتے کرتے۔ وہ کسی منزل پر پہنچ جائے گی۔ اسے لگا سعد نے جیسے دانستہ یہ جملے اس کے لیے لکھے تھے جو اگر کبھی وہ پڑھ لے تو اس کو رکھ دھندے کو حل کرنے کے لیے کہ وہ کیوں یہاں سے بھاگ نکلا اس کے مددگار ثابت ہوں۔

آئی فون میں محفوظ وہ فائل اس کے لیے ایک نیا عزم ثابت ہونے لگی تھی۔



”کھاری سردار چچا اور فاطمہ بفضل حسین اور میمونہ، غلڑا ظہور۔“ وہ اپنے طور پر جگسا پزل کے ایسے ٹکڑے جوڑنے میں مصروف ہوئی جن کا بظاہر آپس میں کوئی تعلق بننا دکھائی نہیں دیتا تھا۔

”جگسا پزل سے جتنی مجھے چڑھی اتنا ہی تم مجھے اسے حل کرنے پر لگائے ہو۔“ کچھ دیر بعد اس نے اپنے دل میں بسی اس شبیہ کو مخاطب کرتے ہوئے سوچا۔

”کتنے برے ہونا تم۔“ اس نے دل میں موجود شبیہ سے کہا۔ ”میرے سب اپنے مجھ سے چھڑایے اور خود بھی میرے نہیں بنے اب تک اس کا شکوہ بجاتا تھا، مگر سننے والا وہاں موجود نہیں تھا۔“

”بس تو پھر طے ہے کھاری سے بات ہو جاتی ہے تو بہت ٹھیک ہے اگر بات نہ ہوئی تو پھر دوسرے نمبر پر غلڑا ظہور سے ملنا ہے۔ اگرچہ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ وہ کہاں سے بیچ میں ٹپک پڑیں اتنی تو وہ کھڑوس ہیں ان سے ملنا آسان کام تھوڑی سی مگر یہ فضل حسین اور میمونہ اتنی کون ہیں۔“ ان دو ناموں پر آکر وہ ایک بار پھر انکلی۔

”خیر دیکھتے ہیں۔“ کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد اس نے سر جھٹکا اور فون اٹھا کر ایک بار پھر کھاری کو کال کرنے لگی۔ اس کا مطلوبہ نمبر ہنوز زندہ تھا۔



”تم جانتے ہو تم زندہ ہو اور میرے سامنے موجود ہو۔“ وہ لڑکی اس سے مخاطب تھی جس کا چہرہ اتنے سارے اجنبی چہروں میں جانا پہچانا تھا۔

”تمہیں اندازہ نہیں کہ تم کتنے بڑے حادثے سے گزر کر زندہ بچے ہو تم میرے لیے کسی معجزے کی عملی تفسیر ہو اور مجھے تم سے شدید محبت ہے مجھے تم سے اس لیے بھی محبت ہے کہ اس اجنبی ملک میں تم نے اپنے تپے کے لیے میرا نام منتخب کیا میں تم سے اس لیے بھی محبت کرتی ہوں کہ تم جب ہوش خرد کی دنیا سے بے گانہ تھے وہ میں تھی صرف میں ہی تھی جو تمہارے لیے دعا کر رہی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارا زندہ بیچ جانا میری دعاؤں ہی کے مثبت جواب کا معجزہ ہے جبکہ میں تو یہ عہد کر چکی تھی میری دعاؤں کا جواب جو بھی آئے۔ میں شکوہ کروں گی نہ ہی آہ وزاری۔“

وہ ایک ٹک اسے دیکھتے ہوئے دلچسپی سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اسے اس کی ایک بات سمجھ میں آرہی تھی اور شاید اس کی باتیں سنتے ہوئے اس کے چہرے پر مسکراہٹ بھی تھی۔

”ڈاکٹر نے کہا ہے کہ اب تم کروٹ بدل کر پہلو کے بل بھی لیٹ سکتے ہو اور اپنے منہ سے کھاپی سکتے ہو۔“ وہ کہہ رہی تھی۔ ”اگر ایسا ہے تو بھلا کھانے کے سے انداز میں اپنے جڑے ہلا کر دکھاؤ، دکھاؤ تو سہی۔“ اس نے منت بھرے انداز میں کہا تھا۔

جواب میں اس نے ذرا سا مسکرا کر اپنے منہ اور جڑوں کو حرکت دینے کی کوشش کی تھی۔ ”آہ“ اس کے منہ سے اس کوشش کے نتیجے میں بے اختیار آہ کی آواز نکلی تھی۔ مسلسل حرکت نہ کرنے کے سبب اس کے اعضا سخت پڑنے لگے تھے اور اب انہیں جنبش میں لانے کی کوشش اسے تکلیف دیتی تھی۔

”درد ہو رہا ہے؟ اس کی آہ سن کر وہ بے چینی سے اس پر جھکی تھی۔ ”درد ہوتا ہے تو مت کرو کوشش۔ رہنے دو ڈاکٹر خود ہی اس کا کچھ حل نکال لیں گے۔“ وہ نرم ہاتھوں سے اس کے رخساروں کی ہڈیاں اور جڑے کی بیرونی جلد سہلانے لگی تھی اس کے ہاتھوں کی نرمی محسوس کر کے اسے ایک عجیب سی راحت محسوس ہونے لگی تھی۔

”تمہارا شیوہ بڑھ گیا ہے۔“ اس نے اس کے رخسار پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”کیا تم شیوہ کروانا چاہو گے کہو

تو میں اسپتال کی تمام خدمات کو بلا لوں۔“

اس نے سر کے اشارے سے اثبات میں جواب دیا تھا۔

”تمہاری آنکھوں کی سوجن اور نمی کم ہو رہی ہے۔“ اس کے جواب پر خوش ہوتے ہوئے اس نے اس کی آنکھوں کو انگلیوں کی پوروں سے سہلاتے ہوئے کہا تھا۔ ”ویسے تم ہو بہت عجیب تمہارے بارے میں کوئی بھی قیادہ لگانا مشکل کام ہے اب بتاؤ بھلا اگر تمہیں ڈائیونگ کی الفب بھی نہیں آتی تو تم سے کس نے کہا تھا دیر ڈیل چل دو چھٹیاں گزارنے کو لندن میں کیا کم تفریح موجود تھی۔“

”نادید!“ اس کی سب باتوں کو غور سے سنتے رہنے کے بعد وہ پہلی بار بولا تھا۔ اس کا چہرہ سہلائی وہ اپنا نام پکارے جانے پر بری طرح چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

”جیسے بھی تم سے شدید محبت ہے۔“ اس نے کمزور آواز میں رک رک کر الفاظ ادا کیے تھے اس کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا تھا۔

”اور مجھے بھوک محسوس ہو رہی ہے۔ مجھے کچھ کھانا ہے، مگر کوئی محلول نہیں مجھے کوئی ٹھوس چیز کھانی ہے۔ اگر تم اپنے ہاتھ سے کھلاؤ تو۔“ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے وہ آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔

”ہاں!“ ساکت کھڑے اسے دیکھتے دیکھتے وہ چونک کر بولی تھی۔ ”ہاں ہاں ضرور۔“ وہ خوشی سے پاگل ہوتی ادھر ادھر دیکھنے لگی تھی وہ کیا چیز تھی جو وہ اپنے ہاتھوں سے اسے کھلانے والی تھی۔ وہ اپنی مدد کے لیے ڈاکٹر کی طرف بھاگی تھی۔

اور کچھ ہی دیر بعد اپنے بھائی کے سینے پر نینکوں پھیلانے وہ اپنے ہاتھوں سے نیم ٹھوس۔ م م سیال ولیہ کھلا رہی تھی۔ اور رک رک کر چیخ چیخ ولیہ کھاتا ہوا اس کی طرف دیکھتے وہ سوچ رہا تھا۔ اس سے پہلے کی آخری ملاقات میں اس نے کہا تھا۔

”ہو سکتا ہے آنے والے وقت میں تم میرا خیال رکھ رہی ہو اور میں تمہاری مدد کا محتاج ہو جاؤں۔“

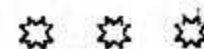


”غلڑا ظہور ایک گمنام مصور اور مجسمہ ساز ہیں چار کول اور و صلی پر گوچے اور پنسل کلر ان کا خصوصی میڈیم ہے، منی ایچ کی بھی ماہر ہیں اور ایک مقامی آرٹ اکیڈمی میں منی ایچ سکھاتی ہیں۔ آج کل بنی گالہ میں رہائش پذیر ہیں نہایت ہی کم آمیز اور گوشہ نشین شخصیت ہیں۔ ان سے ان دنوں ملاقات ناممکن ہے کیونکہ اکیڈمی سے چھٹی پریس اور ان کا گھر بند ہے وہ اس وقت کہاں موجود ہیں کسی کو معلوم نہیں ہاں ان کا فون نمبر مندرجہ ذیل ہے۔“

بلاال سلطان نے اپنے فون کی اسکرین پر خود کو موصول ہوا یہ طویل پیغام پڑھا اور گہرا سانس لیتے ہوئے بھیجا گیا نمبر محفوظ کر لیا۔

”غلڑا ظہور!“ اس نام کو دل میں دہراتے ہوئے انہیں بہت سے پرانے منظر یاد آرہے تھے۔

بیلو! ہاں یہ نمبر تمہیں دے رہا ہوں اس کو ٹریس کرو او نمبر کا مالک یا مالکہ اس وقت کہاں موجود ہے مجھے پتا کروا کر فوراً اطلاع کرو۔“ اس کے لمحے خود کو فون پر کسی سے کہتے سن رہے تھے۔



اس کے حافظے میں محفوظ رہ جانا بھی حیران کن بات تھی۔ بنی گالہ کی طرف ڈرائیو کرتے ہوئے اسے بہت سی



پرانی باتیں بھی یاد آ رہی تھیں اور بہت سی نئی سوچیں بھی ذہن کو الجھائے دے رہی تھیں۔  
فلز کا گھر ایڈریس معلوم ہوتے ہوئے بھی اسے بہت آسانی سے نہیں ملا تھا۔ اور جب بالا خر گھر مل گیا تو اس کے لیے مایوسی کی انتہا بنا وہ گھر اپنے گیٹ پر فٹل ڈالے خاموش کھڑا تھا۔ فٹل نظر آ رہا تھا مگر وہ بار بار کال بیل پر ہاتھ رکھتی اور گیٹ کو جھنجھوڑ کر اس پر دستک دینے کے بے معنی عمل میں تقریباً پندرہ منٹ مصروف رہی تھی۔  
”ہیلو!“ پھر اس نے ایک نو عمر لڑکے کو دیکھا جو سائیکل کے پیڈل چلاتا اس کے قریب سے گزر رہا تھا اور اس کے ہیلو کہنے پر رک کر اس دیکھنے لگا تھا۔

”یہیں کہیں رہتے ہو کیا؟“ اس نے اس لڑکے سے سوال کیا تھا۔ ”نہیں!“ اس نے سائیکل سے اتر کر اپنی پی کیپ اتارتے ہوئے جواب دیا۔  
”اوہ!“ ماہ نور مزید مایوس ہوئی۔

”یہاں پر رہتا نہیں مگر پچھلے ڈیڑھ مہینے سے ساتھ والی کوٹھی میں رنگ و روغن کا کام کر رہا ہوں رات کو بھی ادھر ہی پر رہتا ہوں ہم لوگ ٹھیکے پر کام کر رہے ہیں۔“ لڑکے نے بتایا۔

”اچھا! ماہ نور کو کچھ امید بندھی۔“ تو پھر اس گھر میں جو خاتون رہتی ہیں ان کو دیکھا ہے کبھی۔“  
”یہ گھر۔“ لڑکے نے گھر کے گیٹ پر نظر ڈالی۔ ”یہ گھر تو جب سے ہم لوگ ادھر آئے ہیں بند ہی پڑا ہے کبھی ساتھ والی کوٹھی کی چھت سے اس میں جھانکیں تو ایسا لگتا ہے یہ کوئی بھوت بنگلہ ہے گھاس بڑھی ہوئی ہے ہر طرف سوکھے پتے کاغذ گرد بکھرے ہوئے ہیں دیواروں پر کھنی بیکیں ادھر ادھر ہر طرف پھیل گئی ہیں مجھے تو اس گھر کو دیکھ کر خوف آتا ہے آپ نے خریدنا تو نہیں یہ گھر؟“

لڑکا باتوں کا ماہ نور کی طرف سے کوئی جواب نہ آنے کے باوجود سرگوشی کے سے انداز میں بولا۔

”نہ خریدیے گا جی یہاں بکے بھوت رہتے ہیں۔“

”اچھا ٹھیک ہے تمہیں یو۔“ ماہ نور نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

لڑکا دوبارہ سائیکل پر سوار ہو کر پیڈل چلاتا سیٹی پر کسی مشہور گانے کی دھن بجاتا وہاں سے چلا گیا۔ اور فضا میں پھر پہلے کا سا سکوت طاری ہو گیا۔ ماہ نور نے ایک مرتبہ پھر گھوم کر فلز اظہور کے گھر کے فٹل لگے گیٹ کی طرف دیکھا اور فضا میں چھائے سکوت کو محسوس کرنے لگی جس کو کبھی کبھار درختوں پر بیٹھے پرندوں کی آوازیں توڑتی تھیں اور پھر وہی سکوت چھا جاتا تھا۔



”اچھا اب بتا ہی دو کہ ویرڈل میں سکی انگ کا آئیڈیا کیسے سوچا تمہیں؟“ نادیا نے چھوٹے ٹکڑوں میں کٹے سیب کا ایک ٹکڑا کانٹے میں پھنسا کر اسے کھلاتے ہوئے پوچھا۔

”میں نے کبھی کم ہی کوئی کام سوچ سمجھ کر کیا ہے۔“ وہ اس ٹکڑے کو بچوں کی طرح اگلے دانتوں سے چباتے ہوئے نجی آواز میں بولا اس کی آوازیں ابھی نقاہت تھی اور وہ زیادہ دیر بولتے رہنے سے قاصر تھا۔

”پہلے کبھی سکی انگ کی بھی تم نے بھلا؟“ نادیا نے پلیٹ میں رکھے ٹکڑوں کو کانٹے سے بکھیرتے اور پھر سمیٹتے ہوئے پوچھا سعد کو کوئی چیز کھلانے میں کتنا ہی وقت لگ جاتا تھا وہ نیم ٹھوس چیز کو بھی نگلنے میں وقت لگاتا تھا۔ جبکہ یہ تو بہت چھوٹا ہی سہی تازہ سیب کا ٹکڑا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اسے اگلا ٹکڑا کھلانے میں وقت لگے گا۔

”بتاؤ تو پہلے کبھی سکی انگ کی بھی تم نے؟“ اس نے اپنا سوال دہرایا۔ وہ کچھ دیر منہ میں رکھے سیب کے ٹکڑے کو چبا تا رہا اور پھر بدقت اسے نگل کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”میں نے اس کے بارے میں بہت بدبھلا تھا۔ اس لیے میں نے سوچا میں یہ کر سکتا ہوں۔“  
”پاگل ہو تم!“ نادیا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اس کو صرف پڑھ کر تو نہیں کیا جاسکتا۔ اس کو دیکھنا پڑتا ہے پریکٹس کرنی پڑتی ہے۔“

”تم نہیں جانتیں پہلے میں جو کام ایک آدھ دن کی پریکٹس کے بعد کرتا تھا وہ ہو جاتا تھا۔“ سعد نے سر جھکا کر کہا اور یہ بات مکمل کرنے میں اسے تین منٹ لگے تھے۔

”پہلے میں ہلستا تھا شاید اس لیے۔“ پھر اس نے سر اٹھا کر کہا۔ نادیا اس کی بات کا جواب دیے بغیر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اسپتال کے مریضوں والے نیلے لباس میں ملبوس سفید بیڈ شیٹ پر سفید ہی نرم تکیوں سے ٹیک لگائے بیٹھا اس کا وہ بھائی شاید دنیا کا خوبصورت ترین لڑکا تھا کم از کم اسے تو ایسا ہی لگ رہا تھا۔

”اچھا ہوا تم نے شیو کرالیا۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔ ”اور بال بھی ترشوا لیے۔ میں شرط لگا کر کہہ سکتی ہوں کہ اگر کبھی کسی فیشن سے متاثر ہو کر تم بال بڑھانا چاہو تو تم ذرا بھی اتھم نہ لگو گے۔“ اس کی بات کے جواب میں وہ مسکرا دیا۔

”یوں تم بہت اچھے لگ رہے ہو Lean tanned اور Slim۔“ مسکرائی۔ ”میں سچ بتاؤں مجھے ان تینوں لفظوں کے بارے میں معلوم نہیں۔ انہیں اردو میں کیا کہتے ہیں۔ میں اردو کے صرف سیدھے سیدھے لفظ بول سکتی ہوں۔ اتنے ہی جتنے میمونہ آئی نے مجھے سکھائے اور جنہیں میں نے اتنے برسوں میں اجنبی ملکوں کی اجنبی زبانوں کے لفظوں میں کھونے نہیں دیا۔“ اپنی بات مکمل کر کے وہ خود ہی قہقہہ لگا کر ہنس دی۔ اس نے دیکھا۔ سعد پوری دلچسپی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور وہ مسکرا بھی رہا تھا۔

”تم نے مجھے حیران کر دیا۔“ پھر وہ رک رک کر بولتے ہوئے کہنے لگا۔ ”شاید تم میری زندگی کی سب سے بڑی حیرت بن کر میرے سامنے آئی ہو۔ اس نے کہا۔ ”تمہارا یہ اسکارف میری بصارت کی حیرت ہے اور جس روانی سے تم قرآنی آیات کا ورد کرتی ہو وہ میری سماعت کی حیرت ہے۔“

نادیا نے مسکراتے ہوئے اس کی بات سنی اور آنکھیں میچ کر کھولتے ہوئے بولی۔ ”یہ سیب تم کو ختم کرنا ہے ڈاکٹر بال کا خیال ہے تم کا بلی کا شکار ہو رہے ہو۔ تم اپنے جبروں کو حرکت دینا ہی نہیں چاہتے۔ جب ہی نیم سیال نیم ٹھوس چیزیں کھانے کو ترجیح دیتے ہو پس اب باتیں مت بناؤ اور کھانے کی طرف توجہ دو۔“

”کیا اس اسپتال والے مجھے یہاں سے بھی فارغ بھی کریں گے؟“ اس نے نادیا کی بات پر غور نہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”کیوں تمہیں شک ہے کیا؟“ نادیا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”شاید!“ وہ تھوڑا سا لپچے کھسک کر نیم دراز ہو گیا۔ ”نادیا! مجھے بتاؤ۔ میری حالت کیسی ہے؟ کیا میری کوئی چوٹ ایسی ہے جو مجھے چلنے پھرنے سے یا کسی اور کام سے معذور کر دے۔“

”یہ خیال تمہیں کیوں آیا؟“ نادیا پہلے سے بھی زیادہ چونکی۔ ”کیا ڈاکٹر نے تمہیں کچھ کہا ہے۔“

”نہیں۔“ وہ تکیے پر سر رکھتے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”در اصل وہی تو ہیں جو مجھے کچھ بتاتے نہیں ہیں سڈا کنڑوں کا پراسرار رویہ ہی تو میرے دل میں وہم ڈال رہا ہے۔“

”ایسا کچھ نہیں ہے سعد!“ نادیا نے پلیٹ میز پر رکھ کر اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ ”بھوت صرف تمہارے سر پر آئی تھی۔ سر کی چوٹ کے بارے میں ہی خطرہ تھا کہ وہ تمہارے پورے جسم یا جسم کے کچھ حصوں کو مفلوج کر سکتی تھی۔ لیکن اب ایسا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ کیا تمہیں اپنی حیات اپنے قابو میں محسوس نہیں ہوتی۔“

”ہوتی ہیں۔“ وہ بدستور چھت پر نظریں جمائے بولا۔ ”لیکن ابھی میں اٹھ کر بیٹھا نہیں میں خود اٹھ سکتا“



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ ٹائمہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں:-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رٹریوم ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریخ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ پیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریخ
- ☆ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

ہوں چل سکتا ہوں اپنے کام کر سکتا ہوں یا نہیں یہ بتاؤ اور پلیز مجھے کسی اندھیرے میں رکھنے کی کوشش مت کرنا؟

”میں ایسا نہیں کروں گی۔“ نادیا نے اس کے سر کے بال سہلائے۔ ”تمہیں تھوڑی فزیو تھراپی کی ضرورت پڑسکتی ہے بس۔ صرف ایک خطرہ سر کی چوٹ تھا اور تم اس سے نکل چکے ہو۔“

”میں اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ میں آنے والے وقت کے لیے ذہنی طور پر تیار ہونا چاہتا ہوں۔“ وہ ابھی بھی چھت پر نظریں نکالتے بول رہا تھا۔ ”مجھے معلوم ہے جسمانی معذوری انسان کے دل و دماغ پر کیا اثر کرتی ہے وہ کیسی کیسی باتیں فرض کرنے لگتا ہے۔“

”میری سمجھ میں تمہاری بات نہیں آرہی۔“ نادیا نے واقعی کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔ ”تم نے یہ کیسے فرض کر لیا کہ وہ سب تمہارے ساتھ ہوگا جو تم کہہ رہے ہو۔“

”بس یونہی۔“ وہ نرمے پن کے ساتھ بولا اور پھر اس نے آنکھیں موند لیں۔

”تم ایسے نہیں سو سکتے، سب ختم کرنا ہوگا۔“ نادیا نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

”میں تھک گیا ہوں نادیا! مجھے آنکھیں بند کر کے خاموشی سے لیٹنا ہے۔“ سعد کا لہجہ اچانک اجنبی ہونے لگا۔

\*\*\*

”پلیز سردار چاچا! آپ میری بات سن لیں پہلے دعا سلام بعد میں ہو جائے گی۔“ غلڑا ظہور کے بند گھر سے مایوس ہو کر واپسی پر راستے میں ہی اس کے فون پر ایک بار پھر سردار چاچا کی کال آگئی تھی۔ اس نے تیزی سے فون آن کیا اور کان سے لگا کر چھوٹے ہی بولی۔

”ہاں تو بیٹا جی! بولو میں سن رہا ہوں۔“ سردار چاچا کی جان دار آواز سنائی دی۔

”چاچا! آپ نے اس روز سعد کو کھاری کے بارے میں کیا بتایا تھا جس روز وہ اچانک فارم ہاؤس سے چلا گیا تھا۔“ وہ تیزی سے بولی تھی۔

”تمہیں کس نے بتایا کہ میں نے اسے کھاری کے بارے میں کچھ بتایا تھا؟“ سردار چاچا جیسے چونک گئے تھے۔ ”چاچا! میں اس وقت اسلام آباد میں ہوں اور سعد اسلام آباد ہی میں رہتا ہے۔“ ماہ نور نے سگنل پر گاڑی روکتے ہوئے کہا۔

”اگر تم وہاں سعد سے ملتی ہو اور اس نے تمہیں یہ بتایا ہے کہ میں نے اسے کھاری کے بارے میں کچھ بتایا تھا تو یہ بھی تو بتایا ہوگا کہ میں نے اسے کیا بتایا؟“

”فہ چاچا پلیز! وہ جھنجھلائی۔“ ”اگر بتا ہوتا تو آپ سے کیوں پوچھتی۔“

”تم ایسا کرو سعد سے ہی پوچھ لو، وہ بہتر بتا سکتا ہے کہ کھاری کے بارے میں کچھ معلوم ہوتے پر وہاں چانک فارم ہاؤس سے کیوں بھاگ نکلا۔“ سردار چاچا نے کچھ بتانے سے ہچکچا رہے تھے۔

”چاچا! سعد اس شہر میں نہیں ہے، وہ فارم ہاؤس سے آنے کے فوراً بعد ہی یہاں سے کسی کو کچھ بتائے بغیر کہیں چلا گیا تھا اس کے تو باپ کو بھی خبر نہیں کہ وہ کہاں چلا گیا۔“

”اوہ۔۔۔ اچھا! چاچا کا رد عمل فوری تھا۔“ اسے شاید ایسا ہی کرنا چاہیے تھا شاید وہ پہلے ہی سے بہت کچھ جانتا تھا۔

”چاچا پلیز! مجھے بھی بتادیں کہ وہ کیا بات تھی وہ میرے لیے ایک ادھورا پیغام چھوڑ گیا ہے کہ سردار چاچا نے اسے کھاری کے بارے میں کچھ بتایا تھا۔ پلیز چاچا! اس سے پہلے کہ کال کٹ جائے آپ مجھے بتادیں۔“ وہ روہانسی



ہونے لگی۔ جواب میں فون پر خاموشی چھا گئی۔  
”ہیلو ہیلو چاچا! آپ میری آواز سن رہے ہیں نا۔“ اس کے دل میں ڈر پیدا ہونے لگا کہ کال پھر سے کٹ گئی تھی۔

”میں نے اسے جوتایا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ کھاری سعد کا سگا بھائی ہے۔“  
سردار چاچا کی آواز اریس پر یوں ابھری جیسے سات سمندر پار سے آ رہی ہو اور اس کے بعد اس کے کان میں لگے ہنڈ فری ریسور پر ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔  
”ٹنگ۔ کیا؟“ ماہ نور کے منہ سے بمشکل الفاظ نکلے۔

”نوں نوں۔“ دوسری طرف رابطہ منقطع ہو چکا تھا اور اس بھری پُری کشادہ سڑک پر جیسے سناٹا چھا گیا تھا۔  
”میں نے اسے جوتایا اس کا مطلب یہ تھا کہ کھاری سعد کا سگا بھائی ہے۔“ اسے لگا اس کے چاروں طرف سے ایک ہی آواز لپک کر اس کی سماعت سے ٹکرا رہی تھی۔  
”میں تمہیں تمہارے چاچا چوہدری سردار سے سنی وہ بات نہیں بتاؤں گا ماہ نور! جس کو سننے کے بعد مجھے کھاری کے غیر اہم وجود کی اہمیت کا علم ہوا۔“  
”مہ نور باجی! مینوں آپوی تہاڈے نال اک ضروری کم اے۔“

”مہ نور باجی! میری وی تے سن لو۔“  
”کھاری کا غیر اہم وجود اور اتنا اہم۔“ اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا اور وہ سنی ہوئی باتوں پر یقین کرنے کی کوشش میں ایک ٹنگ صاف شفاف سڑک پر نظریں جمائے ساکت بیٹھی تھی۔  
اسے اس محویت سے اس کی گاڑی کے پیچھے قطار میں لگی گاڑیوں کے بجتے ہارن نے باہر نکالا۔ ٹریفک سگنل کی جی سبز ہو چکی تھی اور اسے خبر نہیں ہوئی تھی۔ اس نے کچھ پر پاؤں رکھ کر گاڑی کو پہلے گتھو میں ڈالا اور ایکسپلیٹر پر پاؤں رکھتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔  
”کھاری سعد کا سگا بھائی ہے۔“ آواز ابھی بھی اس کی سماعت میں گونج رہی تھی۔  
”وہ پہلے سے جانتا تھا۔“

”وہ وحشت کے عالم میں فارم ہاؤس سے بھاگ نکلا۔“  
”آپا راجہ کے مطابق سعد اپنے والد کا اکلوتا بیٹا ہے اور آپا راجہ سعد کی والدہ کی قریبی دوست تھیں۔“  
”آپا راجہ کے مطابق سعد کی امی کا انتقال ہو چکا۔ پھر کھاری کہاں سے آیا بلال سلطان کی کسی بات سے کیوں اندازہ نہیں ہوتا کہ سعد کے علاوہ بھی وہ کسی کے باپ ہیں جبکہ سعد نے اسے بتایا تھا کہ اس کی کوئی سوتیلی بہن بھی تھی۔“

”یہ کیا اور کیسا گورکھ دھند ہے۔ کھاری سعد کا سگا بھائی ہے، ناممکن ضرور سردار چاچا کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہوگی اور اسی غلط فہمی کا انہوں نے سعد کو بھی شکار کر دیا۔“ اس نے سر ہلاتے ہوئے سوچا۔  
”بلال سلطان! پھر اسے یکدم خیال آیا۔“ کیوں نہ ان ہی سے جا کر پوچھ لیا جائے۔“  
”اونہوں!“ اس نے اپنے ہی خیال کو رو کر دیا۔ ”جتنے وہ مشغور آدم بے زار اور انا پرست انسان ہیں ان کے پاس جا کر کچھ پوچھنا بہت بڑی حماقت ہوگی۔“

”لیکن اس کے علاوہ چارہ ہی کیا ہے۔ اس انکشاف کے جس کے حقیقت ہونے کے چانسز نہ ہونے کے برابر ہیں۔ بلال سلطان سے بڑا گواہ کون ہوگا؟“ کچھ لمحوں کے بعد اس نے خود کو سمجھانے کی کوشش کی۔  
”مگر ان کا وہ طنز اور چیلنج بھرا انداز۔ اسے بلال سلطان کا چہرہ یاد آیا۔“ اس کا سامنا کون کرے گا۔ جس شخص کو

سعد جیسے بیٹے کے غائب ہو جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر اس کا کوئی اور بیٹا کھاری؟ اسے ایک بار پھر یاد آیا۔ ”نہیں کیسی غیر منطقی سی بات ہے کہ کھاری سعد سلطان کا بھائی ہے۔ کہیں کوئی مماثلت ہے ہی نہیں۔“  
اس نے ایک مرتبہ پھر سردار چاچا کا نمبر ملایا نمبر بند جا رہا تھا۔ اس نے کھاری کا نمبر ملایا اس نمبر پر تیل جاری تھی۔ چند لمحوں کے بعد کھاری کی آواز فون پر ابھری۔  
”ہیلو!“ آواز بچی اور دبلی ہوئی تھی۔

”ہیلو کھاری! یہ میں ہوں ماہ نور! اس نے گاڑی روڈ سائیڈ پر کھڑی کرتے ہوئے کہا۔  
”آہو مہ نور باجی! میں سیان (پہچان) کیا ہوں۔“ وہ اسی بچی اور دبلی ہوئی آواز میں بولا۔  
”کھاری! اس روز تم مجھے کوئی ضروری بات بتانا چاہ رہے تھے نا مجھے افسوس ہے اس روز میں مصروف تھی اور جلدی میں تھی۔ تمہاری بات سن نہیں سکی۔ پلیز اب بتاؤ کیا کہنا تھا تمہیں؟“  
”کچھ بھی نہیں کہنا تھا مہ نور باجی!“ اس کی آواز میں افسردگی تھی۔ ”کھاری تے انا مور اتے شیدا ئی اے (کھاری تو تباہینا) بے سمجھ اور پاگل ہے (کھاری دی باتیں پر غور نہ کریا کرو۔“  
”ہائے کھاری!“ ماہ نور کے دل کو کھاری کے لہجے کی بے چارگی اور یاسیت محسوس کر کے دکھ ہونے لگا۔ ”کیا ہوا؟ تم خیریت سے تو ہوتا؟“

”ہاں جی مہ نور باجی! خیر ہی خیر اے۔“ وہ اسی لہجے میں بولا ڈھور ڈھور اور میرے جیسے لوگ ایک برابر نہ ان کے دل پہ چوٹ لگدی اے نہ میرے جیسوں کے دل پر۔ بس کہیں ٹانگ بازو ٹوٹ جائے تو درد سے چلاتے پھرتے ہیں۔“  
”کھاری!“ ماہ نور ٹھٹک سی گئی کھاری جیسا ہنستا کھیلتا ہلکی پھلکی گفتگو میں کبھی کبھار گہری بات کر جانے والا‘ میلیوں ٹھیلوں، کھیل تماشوں کا شوہن اور ایسی یاسیت بھری ہاؤس کن باتیں۔  
”مجھے بتاؤ۔ کیا ہوا ہے تمہارے ساتھ؟“ اسے کھاری کی فکر ہو گئی تھی۔ ”کیا سعد یہ سے کوئی جھگڑا ہو گیا یا پھر فارم ہاؤس پر کسی نے تمہیں ستایا ہے۔“

”نہیں مہ نور باجی!“ وہ ایک سرد آہ بھرتے ہوئے بولا۔ ”جو لوگ مقدر اس کے ستائے ہوئے ہوتے ہیں انہیں کوئی اور کیوں ستائے گا۔“

”ایک منٹ کھاری!“ ماہ نور نے فون ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرنے کے بعد دوسرے کان سے لگایا۔ ”دیکھو میں تو تمہاری مہ نور باجی ہوں ناں تمہاری دوست ہوں میں مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے؟ اس کے لہجے میں نرمی تھی محبت تھی اور لگاؤ بھی۔  
”میں تو کب سے کہہ رہا ہوں مہ نور باجی! اے دنیا ہوتی اے ناں اس دونوں پاسے کانٹے ہوندے ہیں اے اوھر سے بھی کانٹے ہیں اے اوھر سے بھی۔“

ماہ نور کے لہجے کی اپنائیت محسوس کر کے وہ ذرا سا کھلا۔ ”چوہدری صاحب اور ان کی مہمان بھی کھاری کے ساتھ مذاق کرتے ہیں اور کھاری جسے جاتا ہے وہ بھی کھاری کا مذاق اڑاتا ہے۔“  
”سردار چاچا نے تم سے کون سا مذاق کیا کھاری!“ ماہ نور نے اپنے بال کانوں کے پیچھے اڑتے ہوئے پوچھا۔  
”کچھ نہیں مہ نور باجی!“ وہ سرد آہ بھر کر بولا۔ ”کوئی بات نہیں سارے کھاری ناں دل پشوری کرتے ہیں تو بھی خیر ہے انہیں خوش ہو لین دیو کھاری کا کیا جاتا ہے۔“

”وہ مائی گاڈ کھاری!“ ماہ نور نے اسٹیرنگ پر رکھے بازو پر اپنا سر ٹکیتے ہوئے کہا۔ ”ایسا بلیک موڈ ایسی حسرت بھری باتیں۔“



”چھ ماہ نور باجی اجازت دیو! وہ لوڈ کرانا اسے گاڑی پر شاہاں پر رہی ہے۔ دیر ہو جائے گی“ اچھا جی رب را کھا۔ ”کھاری کی آواز آئی اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتی کھاری فون بند کر گیا تھا۔  
”یا اللہ یہ سب کیا ہے؟“ ماہ نور کا ذہن پریشان ہونے لگا تھا۔ اس نے کچھ دیر سوچنے کے بعد رضوان الحق کا نمبر ملایا۔

”ہیلو! پہلی ہی ٹھنٹی پر کال ریسیو کر لی گئی تھی۔

”رضوان! میں ماہ نور بات کر رہی ہوں۔“

”جی میں نے پہچان لیا۔“ وہ نرمی سے بولا، ”شکر کا مقام تھا کہ اس کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔“

”تمہیں وہ تصویر مل گئی تھی نا؟“ ماہ نور نے پوچھا۔

”ہاں مل گئی تھی۔“ وہ بے تاثر لہجے میں بولا۔

”تم اس کو جانتے ہو نا؟ اس کو پہچانتے ہو نا؟“

”وقت بہت آگے بڑھ چکا ہے تم! بہت سے چہرے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔“ یہ ایک غیر واضح جواب تھا۔

”گویا تم نے اسے نہیں پہچانا؟“ ماہ نور کو مایوسی ہوئی۔ ”میں سمجھی تم اس کے والے جاپانی مسخرے ہو۔“

”کیا اس نے خود آپ کو بتایا کہ اس کا کوئی جاپانی مسخرہ ہوا کرتا تھا؟“ دوسری طرف سے اسی سنجیدہ آواز میں پوچھا گیا تھا۔

”نہیں۔ اس نے نہیں بتایا، کسی اور نے بتایا تھا۔“ ماہ نور نے سادگی سے کہا۔

”کیا کوئی اور بھی ہے جو جانتا ہے؟“ ایک مبہم سی بات پوچھی گئی۔

”پتا ہے کیا میں تمہاری بات کا تفصیلی جواب پھر کسی وقت دوں گی۔ ابھی تو مجھے یہ پوچھنا ہے کہ کیا تم جانتے ہو“

کھاری کیوں پریشان ہے۔“ ماہ نور کو فون کرنے کا مقصد یاد آگیا۔

”کیا کھاری نے آپ کو بتایا کہ وہ پریشان ہے؟“

”نہیں، لیکن اس کی باتوں سے مجھے لگا وہ پریشان ہے۔“

”شاید اس کے ساتھ کسی نے کوئی بُرا مذاق کیا تھا اس نے اس مذاق کو دل پر لے لیا۔“ رضوان نے کہا۔

”اور وہ بُرا مذاق کیا تھا؟“ ماہ نور نے بے تابی سے پوچھا۔

”کسی نے اسے کہا کہ وہ ان باؤ صاحب کا سگا بھائی ہے، جو اس کی شادی پر آپ کے مہمان بن کر آئے

تھے۔“ رضوان الحق کہہ رہا تھا۔

”زن زن زن! ماہ نور کی سماعت پر جیسے پتھر برسنے لگے تھے۔

”جس نے بھی ایسا کیا اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ رضوان کہہ رہا تھا۔ ”کھاری معصوم اور بھولا بھالا

انسان ہے، وہ اس مذاق کو سچ سمجھا، بے چارہ بے شناخت تھا اسے لگا اسے شناخت ملنے والی ہے بعد میں اسے سب

کہنے لگے کہ یہ مذاق تھا بہت دُور ہارٹ ہوا بے چارہ۔“

”کس نے کہا کہ یہ مذاق تھا؟“ ماہ نور جیسے خواب میں بولی تھی۔

”کھاری کی مدد مان لائے۔ اس کی بوائف نے وہ دونوں شاید باؤ صاحب کے بیک گراؤنڈ سے ویسے بھی واقف

تھیں پہلے سے، بے چارہ کھاری بہت ہرٹ ہوا۔“ رضوان بتا رہا تھا۔

”اور یہ مذاق کیا کس نے تھا؟“

”کھاری کے چوہدری صاحب اور ان کے پاس مہمان آئی کسی خاتون نے، وہ کہہ رہا تھا۔“

”سروار چاچا نے!“ ماہ نور ادھر ادھر دیکھتے ہوئے ایک ایک لفظ پر غور کر رہی تھی۔ ”مہمان خاتون! یہ سراہا تھا

نہیں آیا تھا۔

”میں اب اجازت چاہوں گا۔ میرے شو کا وقت ہو گیا ہے، مگر آپ لاہور میں ہیں اس وقت تو کبھی میرا شو ضرور

دیکھنے آئیے گا، میلہ جڑاغاں پر ہمارا سرکس آج کل ادھر ہی ہے۔“

وہ کہہ رہا تھا لیکن ماہ نور سن نہیں رہی تھی۔ اس کا ذہن صرف اسی ایک انکشاف پر اٹک کر رہ گیا تھا، کھاری

سعد سلطان کا بھائی تھا۔

کتنی ہی دیر سوچتے رہنے کے بعد کوئی سرا نہ ملنے پر اس نے سر جھٹکتے ہوئے باہر دیکھا اور چونک گئی۔

نجانے کب سے وہ وہاں گاڑی پارک کیے کھڑی تھی۔ باہر اندھیرا پھیل رہا تھا اور سڑک کے درمیان کسی پرندے کی

طرح پر پھیلائے اپنے اسٹینڈر پر کھڑے برقی لمپے روشن ہو چکے تھے۔

”مجھے بلال سلطان سے ملنا ہی ہو گا۔“ اس نے دل میں سوچا۔ ”یہ جو گوسپ ہر طرف پھیلا ہوا ہے، اس کی

حقیقت کو پانا ہی ہو گا۔ بے چارہ کھاری۔“ اسے کھاری کا خیال آ رہا تھا۔ ”سروار چاچا کو اس سے ایسا بھونڈا مذاق

نہیں کرنا چاہیے تھا۔ وہ ایسا ہرٹ کر دینے والا مذاق کرتے تو نہیں، لیکن کیا پتا موج مستی میں آکر کر دیا ہو، جب

ہی تو سعد بھی اپنے باپ سے یوں بدگمان ہو کر یہاں سے چلا گیا۔ اللہ کچھ مذاق کتنے منگے ثابت ہوتے ہیں۔“

مختلف سڑکوں پر گاڑی دوڑاتے وہ مسلسل اسی ایک نقطے پر سوچے چلی جا رہی تھی۔

سعد سلطان کے گھر جانا یوں کہ سعد سلطان کے وہاں ہونے کا امکان صفر سے بھی کم ہو، کیسا اذیت ناک تجربہ

ہو سکتا تھا۔ یہ صرف ماہ نور جان سکتی تھی اور اگر بلال سلطان سے ملاقات ہو پاتی تو اسے ان کے کیسے پہچانتے

ہوئے طنز بھرے سوالات کا سامنا کرنا پڑ سکتا تھا۔ وہ یہ بھی جانتی تھی مگر تجسس اور اچھن دو ایسی چیزیں تھیں جو کسی

بھی دوسری سوچ پر حاوی ہو چکی تھیں۔

بلال سلطان کے گھر کے گیٹ پر موجود مستعد باوردی گارڈز نے شاید اسے اس لیے پہچان لیا تھا کہ چند روز پہلے

وہ بلال سلطان کے ساتھ ہی یہاں آئی تھی۔ گھر کے منجمنٹ اسٹاف کے ہیڈ مسٹر رازی سے اس کے لیے خصوصی

اجازت پھر بھی مانگی گئی تھی۔ اور جب اس کی گاڑی گیٹ سے اندر داخل ہوئی تو اس نے دیکھا گیٹ دے پر مسٹر

رازی خود اسے خوش آمدید کہنے کے لیے موجود تھے۔

”شکر، عزت رہ گئی۔“ اس نے سوچا اور گاڑی سے باہر آگئی۔

”مجھے بلال صاحب سے ملنا ہے، اگرچہ میری ان سے اپنا نشست پہلے سے طے شدہ نہیں ہے۔“ اس نے

رازی کو بتایا تھا۔

”اتفاق کی بات ہے باس آج کل باقاعدگی سے ڈنر گھر ہی پر کر رہے ہیں۔“ رازی خوش دلی سے مسکراتے ہوئے

اسے ہمراہ لیے رہائشی عمارت کی طرف بڑھا۔

”سو۔ ان کی گھر آمد ایک آدھ گھنٹے میں متوقع ہے، امید ہے آپ باس کے ساتھ ڈنر میں شریک ہونا پسند کریں

گی۔“

وہ کہہ رہا تھا اور وہ اس کے ساتھ ماربل کی چکنی سیڑھیاں احتیاط سے چڑھتے ہوئے بہت کچھ سوچ رہی تھی۔

رہائشی عمارت کے اندر داخل ہونے کے لیے جیسے ہی وہ لابی میں داخل ہوئی اسے ایسا لگا اور جاتی سیڑھیوں کے

قریب اسے ایک ایسا چہرہ نظر آیا تھا جسے وہ جانتی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ اس مانوس چہرے کو دوبارہ دیکھتی وہ چہرہ

نظروں کے سامنے سے ایک دم غائب ہو گیا۔

”یہ یہاں ابھی کوئی کھڑا تھا؟“ اس نے بے اختیار رازی کو مخاطب کرتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف اشارہ

کیا۔ ”بھی نہ جانے کہاں غائب ہو گیا۔“



”ہا ہا ہا! رازی کا جان دارا قلعہ لالی میں گونجا۔“ کوئی بھوت بریت یہاں موجود نہیں میں آپ کو یقین دلاتا ہوں۔ ہاں ہو سکتا ہے کہ آپ نے میم سیمی کو یہاں کھڑے دیکھا ہو جب میں آپ کو ریسیو کرنے کے لیے باہر نکل رہا تھا اس وقت وہ یہاں کھڑی وان کو کی story night کے اس ریلنگ کا کوہست غور سے دیکھ رہی تھیں۔“ رازی نے لالی کی دیواروں پر بھی مختلف ہینٹنگز میں سے ایک کی طرف اشارہ کیا۔

”میم سیمی! ماہ نور نے جیسے کچھ نہ سمجھتے ہوئے رازی کی طرف دیکھا۔“

”میم سیمی! ایک مہمان ہیں جو آج کل یہاں ٹھہری ہوئی ہیں۔“ رازی نے کہا۔ ”اصل وہ مس سارہ خان کی کیرئیر ہیں۔“ مس سارہ خان جو آج کل ہماری وی آئی پی گیسٹ ہیں، کیا آپ انہیں جانتی ہیں مس سارہ خان وی انکریپٹ؟“

”سارہ خان! ایک نئے انکشاف نے ماہ نور کا ذہن بالکل ہی ماؤف کر دیا۔“

”جی ہاں۔ سارہ خان۔ دراصل وہ کسی حادثے کا شکار ہو کر رنگ میں جانے کے قابل نہیں رہی تھیں۔ اس نے ان کے لیے دینی سے خصوصی فزولو تھراپسٹ ہار کیا ہے اور ان کے لیے یہ پیچھے والے حصے میں اسٹیشن پر ٹیکس روم اور رنگ بھی بنوایا جا رہا ہے ایک آدھ ہفتے میں وہ شاید چانتا جا رہی ہیں رزی ہینٹنگ اور پر ٹیکس سیشن کے لیے بہت اچھی لڑکی ہے سارہ خان۔ مس ماہ نور کیا آپ ان سے ملنا پسند کریں گی۔ چلیں پہلے میں آپ کو پر ٹیکس روم اور رنگ دکھاؤں بہت زبردست انٹیر ہے اس نے سب ایکوہمنٹ باہر سے منگوایا ہے، کسی بھی پروفیشنل پر ٹیکس روم اور رنگ سے زیادہ ایکویڈ ہے یہ سیٹ اپ۔“ رازی لالی سے اندر جانے کے بجائے باہر نکلنے لگا۔

”نہیں پلیز۔“ اس کی ضرورت نہیں پھر کبھی سنی۔ اس نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ”مجھے دیر ہو رہی ہے مجھے یاد آیا۔ میں نے کسی کو ٹائم دیا ہوا ہے میں پھر کسی دن آجاؤں گی بلال صاحب سے ملنے۔“

وہ تیزی سے کھلے دروازے سے باہر نکلی دروازے کے پٹ پر ہاتھ رکھے کھڑا رازی اسے دیکھا رہ گیا۔ جس تیزی سے باہر نکلی تھی اسی تیزی سے چلتی ڈرائیوے پر کھڑی اپنی گاڑی کی طرف بڑھ رہی تھی۔

”مس ماہ نور!“ اسے یوں جاتے دیکھ کر رازی بھی تیزی سے اس کی پیچھے لپکا تھا مگر وہ اس کے خود سے قریب پہنچنے سے پہلے ہی گاڑی میں بیٹھ کر اسے بیک کرتی گیٹ تک پہنچ چکی تھی جب تک رازی گیٹ تک پہنچا وہ گاڑی گیٹ سے باہر نکال لے گئی تھی۔ رازی نے اس کی گاڑی کے ٹائروں سے اٹھتی ہلکی گرد اور انجن کے دھوئیں کو دیکھا اور دیکھا ہی رہ گیا اسی دم ایک اور گاڑی گیٹ سے اندر داخل ہوئی اور اس میں موجود شخص کچھ فاصلے پر جا کر گاڑی روکنے کے بعد گاڑی سے باہر نکلا۔

”ہیلو رازی! ادھر کھڑے ہو خیریت ہے؟“ آنے والے نے پوچھا۔

”مسئلہ ہو گیا مسٹر ابراہیم!“ رازی اس شخص کی طرف بڑھا۔

”کیا ہوا؟“ ابراہیم رازی سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولا۔

”یہ مس ماہ نور تھیں جو باس سے ملنے آئی تھیں۔“ رازی ابراہیم کو بتا رہا تھا اور ان کے بارے میں باس کی خصوصی ہدایت یہ ہے کہ یہ جب آئیں انہیں وی وی آئی پی پروٹوکول دیا جائے۔ جب ہی تو انہیں ریسیو کرنے میں خود ہار آیا۔ لیکن یہ اندر جاتے جاتے اچانک مڑ کر واپس چلی گئیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیوں۔“

”اچھا!“ ابراہیم نے گیٹ کی طرف دیکھا۔ ”کیا کہہ کر گئی ہیں؟“

”کچھ بھی نہیں۔“ رازی نے شانے اچکائے۔ ”میں انہیں مس سارہ خان کے بارے میں بتا رہا تھا اور ان کے زیر تعمیر رنگ کے بارے میں اچانک بولیں انہیں کوئی کام یاد آگیا۔ وہ پھر کبھی آئیں گی۔ میرے کچھ سمجھنے سے

پہلے ہی یہ جاہ جا۔“

”ہوں!“ ابراہیم نے رازی کی بات پر غور کرتے ہوئے گہرا سانس لیا۔ ”ویری اسٹریٹ!“

اس نے رازی کی طرف دیکھا۔ ”بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔“

”مجھے بھی۔“ رازی نے منہ بتاتے ہوئے کہا۔ ”صوفی سے ڈسکس کروں گا وہ بہت سمجھ دار ہے۔ ضرور اس سے کوئی کلیو مل جائے گا۔“ وہ مسکرا کر کہہ رہا تھا۔



”ڈاکٹر کے پاس سے بھی ہو آئی چپک کر کے اس نے چھوٹی چھوٹی کتنی ہی گولیاں دے دی ہیں، بہت ہی صبح سویرے ایک گولی کھا لیا کرو سارا دن مثلی نے کی شکایت نہیں ہوگی مگر گولی کھانے کے بعد نیند آئی شروع ہو جاتی ہے اور جسم کچا کچا پھر بھی ہوتا رہتا ہے۔“

”ارے تم کیسی عورت ہو رابعہ! شوہر تمہارا زخم زخم ہوا پڑا ہے۔ تمہیں اپنے جسم کے کچے پکے ہونے اور ڈاکٹر کی گولیوں کی پڑی ہے۔“

”اسی کی خاطر تو رات رات بھر جاگتی ہوں۔ اے بی! میں تو سچ بتاؤں مجھے اس لاہور شہر سے ہی ڈر لگنے لگا اب تو اتنی بی دشتی بھی کوئی پالتا ہے کبھی جس بھی کوئے میں چلے جائیں گے اس شہر کے وہ کم بخت ہمارا پیچھا کرتا پہنچ جائے گا۔ تم جانو میرا تو داغ سوچ سوچ کر شل ہوا جاتا ہے کہ سراج سرفراز جیسے بے ضرر انسان کی جان لے لینے میں تو اس نے کوئی کسر چھوڑی نہیں ہمارا تمہارا کیا ہوگا، کم بخت کو معلوم نہیں کہ جس کی خاطر ادھر ادھر چھڑے لہراتا پھرتا ہے وہ تو کب کی صورت گنوائے نہ طلا فن نہ رائڈ نہ ہی سما گن بنی زندگی کے بس دن گزارے جا رہی ہے اب اس دشتی میں وہ کیا نکالے گا اور۔“

”میں تو تم کو بچ میں کئی بار کہہ چکی تھی۔ سراج سرفراز کو پکڑو اور یہاں سے چلی جاؤ بی بی تمہاری فیملی بڑھنے والی ہے۔ آنے والی کتنی جان کا کیا تصور کہ ہماری طرح آج ہے کل نہیں جیسی زندگی گزارے اور پھر وہ خونی قاتل جنونی چھڑے لہراتا ہر دم سولی کی طرح سر پر ٹنگا رہتا ہے۔ زخم مندمل ہونے لگے ہیں۔ سراج سرفراز کے ہاتھ کرکڑا ہوتا ہے تو اسے بولو جو لو کر لی مل رہی ہے کر لے چند دن پیش امام صاحب کی شاگردی میں گزار لے، دین، حکمت کی باتیں اور خطابت سب سیکھ جائے گا۔ نکل جاؤ یہاں سے تمہارے بی بی جان بچا کر۔“

”ہاں! اب تو میں بھی یہ ہی سوچ رہی ہوں میں تو بہت ڈر گئی ہوں بی بی! جو تھوڑا بہت اسباب ہے، باندھو یہاں سے چلتے ہیں۔“

”چلتے ہیں نہیں تمہارے نکل چلو یہاں سے بس۔“

”تمہیں ادھر ہی چھوڑ کر نکل چلیں، داغ ٹھکانے پر تو ہے تمہارا؟“

”تم سمجھتی کیوں نہیں میں ہی تو سارے فساد کی جڑ ہوں جہاں میں ہوں گی وہاں ہی پر تو وہ قاتل جنونی طفیلا لڑ آ دھمکے گا۔ مجھے لگتا ہے میرے ابایا اماں کی بددعا بن کر چمٹ گیا ہے میری جان کو اور مرتے دم تک وہ میری جان نہیں چھوڑنے والا، مجھ تک رسائی نہیں ملتی تو بے چارے سراج سرفراز جیسوں کی شامت بلانے پر مل جاتا ہے، بس تم سراج سرفراز کے زخم جتنے ہونے تک اپنا کوئی بندوبست کر لو میری بہن۔“

”اور تم کیسی ادھر کیا کرو گی؟“

”جب تک سانس ہیں ادھر پڑی جیسے جاؤں گی، بچپوں کو ناٹھو پڑھاتی رہوں گی، تمہیں معلوم تو ہے اس کے عوض محلے کی بیبیال عزت بھی ملتی ہیں اور دال روٹی کا بندوبست بھی ہو جاتا ہے۔ کیوں یوں حیرت سے کیوں



دیکھ رہی ہوں سوچ رہی ہوں کب کبھی سوچا تھا کہ تم سے زندگی میں کبھی جدا ہونا پڑے گا۔ ایک پل کی جدائی برداشت نہیں مگر کیا کروں یہ پیٹ کی اولاد ہے۔ جس نے دل کے رنگ ڈھنگ ہی بدل دیے ہیں۔ سراج سرفراز شوہر تو کبھی جی کو بھایا نہیں مگر سراج سرفراز باپ بننے والا ہے۔ دل چاہتا ہے آنے والی اولاد کے لیے کمائے بھی اور اس کی چھاؤں بھی بنے مجھے معاف کرنا میری بہن! میرا من اپنے لیے تو خواہش کرنا کبھی کاچھوڑ چکا میرے سیلانی ماں باپ خاندان مجھے ایک نقطے کی طرح یہاں چھوڑ کر خود لکیر بنا، تنجانے کتنے کوسوں دور کا سفر کرنا کہ ہر پہنچ چکا ہو گا۔ بس اب تو سراج سرفراز اور اس کی اولاد ہی میرا خاندان ہے نا۔

”میں سب جانتی ہوں۔ مجھے ہر بات کا اندازہ ہے۔ جب ہی تو کہہ رہی ہوں بھاگ نکلو یہاں سے۔“

”اور جو وہ آگیا تم اکیلی کی خبا کر تو۔“

”اگر تو میری موت اس کے ہاتھوں لکھی ہے تو مجھے اس سے کوئی بچا نہیں سکتا، لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو وہ مجھے دس جنم لے کر بھی مار نہیں سکتا۔“

”بھلا اس سے کوئی پوچھے تم نے کب اس سے عاشقی معشوقی کے وعدے وعید کیے تھے جو بے وفائی کا الزام دھرتا ہے تم پر اور تمہاری اور اس تمہارے کسی لگنے کی جان کا دشمن ہوا پھر تا ہے۔ وہ تو دیکھنا بھاگ گیا جان بھاگ کر جس کی خاطر تم نے اس موئے کی دشمنی مول لے لی شکل صورت سے گئیں آواز گونوائی گھر ٹھکانا گنوا یا چھروں کے سائے میں لرزتی زندگی گزار رہی ہو اور اسے پروا تک نہیں بچنے کی شکل دیکھنے کو ترس رہی ہو اور وہ بے وفا بچہ لیے چپت ہوا پھر تا ہے۔“

”تم سے کتنی بار کہا ہے اسے بُرا مت کہا کرو میرے دل کو تکلیف پہنچا کر تمہیں کیا ملتا ہے۔“

”اللہ جانے تمہارا دل کس چیز سے بنا ہے جو اس پر لٹا لوٹ ہی گیا۔ اندھا ہو کر نہ اس کی بے وفائی کھلتی ہے اسے نہ ہی اس کا یوں چلے جانا برا لگتا ہے تمہیں۔“

”اس کے موضوع کو بس رہنے دو تم اور آج ہی جا کر پیش امام صاحب سے ملو وہ کیا کہتے ہیں سراج سرفراز کے لیے۔“

”ہاں جاؤں گی۔ مگر یاد رکھنا دل پر بڑا بھاری پتھر رکھنا پڑے گا مجھے۔“

”کوئی بات نہیں کبھی رکھنے پڑی جاتے ہیں دل پر پتھر۔“

”تمہیں کیسے اکیلی چھوڑوں گی؟“

”یہ سوچ کر کہ میں اکیلی نہیں ہوں میرے ساتھ میرا اللہ ہے۔“

”اللہ تو بری گھڑی میں بھی ساتھ ہی ہوتا ہے۔“

”اس کی ذات پر جگتیں کسویں تا تو سیدھی جہنم میں جاؤ گی۔“

”لکیرے ادھر بھی جہنم لکیرے ادھر بھی جہنم لی لی! تم تو مجھے جہنم سے ہی ڈرا ڈرا کر رہو گی۔“

”بس ناک کی سیدھ کا سیدھا راستہ ادھر بھی جہنم ادھر بھی جہنم ایک صراطِ مستقیم ایک راہِ ہدایت پکڑ لو ناک کی سیدھ کا سیدھا راستہ تمہاری بیڑی پار لگ جائے گی ان شاء اللہ یوں منہ بنا کر کیا دیکھ رہی ہو۔“

”صراطِ مستقیم پاک سرزمین اور سب شادیاں ہے نا۔“

”پھر جگت سوچیں تمہیں اللہ جانے تمہارے اندر کی میراث کب مرے گی۔“

”شاید کبھی نہیں۔“

وہ مریضوں کے بستر سے ٹانگیں لٹکا کر بیٹھا تھا اور پھر آنگٹ شوز پہن کر پاؤں پر بیٹھے بیٹھے دیاؤ ڈالتا تھا، ہسپتال کی نرس اس کے ہاتھ میں آنگٹ اسٹک تھماتی تھی اور وہ اس کا میٹل بینڈ بازو میں کس کر اس پر دیاؤ ڈالتا، اس کا سہارا لیتا اٹھ کر کھڑا ہوتا تھا۔ مسلسل لیٹے رہنے سے اس کی ٹانگوں کی ہڈیوں کو جیسے قفل سالگ گیا تھا اور پیروں پر وزن ڈالنا مشکل لگتا تھا مگر وہ چار دن کی مشق کے بعد ٹانگیں اور پیر پھلنے لگے تھے۔

اس کی ریڑھ کی ہڈی کسی بھی ضرب سے محفوظ رہی تھی۔ کیونکہ گرتے وقت اس کی کمر اس جگہ جاکئی تھی جہاں برف قدرے نرم اور بھر بھری تھی۔ وہ سر کے بل گر کر اچھلا تھا اور پھر کمر کے بل اس نرم بھر بھری برف پر جا کر گر اٹھا۔ ڈاکٹر حادثے کے اس زاویے کو بھی معجزہ قرار دیتے تھے۔

”کھوپڑی کا یوں بچ جانا حیرت انگیز ہے۔ کوما کی حالت صرف خون کے بیرونی بہاؤ کے بجائے اندر ہی جم جانے سے ہوئی۔ تمہارا وہ دوست بہت سمجھ دار تھا۔ جس نے تمہیں ایر ایمبولینس کے ذریعے یہاں لے آنے کا خطرہ مول لیا۔“ اس کے ایک ڈاکٹر نے اسے بتایا تھا۔

”میرا وہ دوست۔“ کتنے ہی دنوں کے بعد اسے یاد آیا تھا اور اسی شام جب نادیاہ اس کے لیے گلاب کا گلہ دستہ اور بیکن سوپ لیے اس کو دیکھنے آئی اس نے اس سے پہلا سوال یہ ہی کیا تھا۔

”میرا دوست و دوں زادے وہ کہاں گیا؟“ نادیاہ نے سنا۔ اس کی آواز صاف ہو رہی تھی اور الفاظ کی ادائی کی رفتار بھی نارمل ہو رہی تھی۔

”اسے واپس جانا تھا۔ اس کی چھٹی ختم ہو چکی تھی۔ وہ تمہیں یہاں اسپتال پہنچانے اور تمہاری پہلی سرجری کی کامیابی کے تیسرے دن ہی چلا گیا تھا۔“ نادیاہ نے جتنی گلابوں کا گلہ دستہ شیشے کے شفاف جار میں لگاتے ہوئے کہا۔

”اس کے بعد اس نے رابطہ نہیں کیا اس نے کبھی میرا پوچھا نہیں۔“

”وہ اکثر پوچھتا ہے۔“ نادیاہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی تھی۔

”وہ ایک بہت اچھا انسان ہے۔ بہت پیارے دل والا۔“ سعد نے کہا اور نادیاہ سے ایک پڈنگ مانگی۔

”کیا وہ تم سے بھی اچھا انسان ہے۔ تمہارے دل سے زیادہ پیارا دل ہے اس کا؟“ نادیاہ نے ایک چھوٹی پلیٹ میں پڈنگ کا ایک چھوٹا سا حصہ رکھ کر اسے پکڑایا۔

”میں۔“ وہ کھاتے کھاتے رک کر بولا۔ ”میں اچھا انسان کہاں ہوں میرا دل بھی اچھا نہیں۔“

”تمہارا دل بہت پیارا ہے۔ یہ اور بات کہ وہ فارغ نہیں ہے۔ و دوں کا دل فارغ ہے۔ خالی کمرے کی طرح۔ اگرچہ وہ تمہارے دل کی طرح بہت پیارا نہیں۔“ نادیاہ نے پھول ترتیب دینے کے بعد سعد کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”تمہیں کیسے اندازا ہوا کہ اس کا دل فارغ ہے۔“ وہ پڈنگ کھاتے ہوئے بولا۔

”جو چند دن تمہارے لیے امید اور یاس کے درمیان میں نے اور اس نے اسپتال میں اور اس سے باہر گزارے ان دنوں میں شاید وہ میرے غم کی شدت اور رونے دھونے کی رفتار کو کم کرنے کے لیے مجھے بہت سی باتیں سنا رہا۔ وہ بھی مضطرب تھا۔ اس لیے وہ ان باتوں پر بہت بولا اور جب ہم بہت بول رہے ہوتے ہیں تو ہمیں خود بھی بتا نہیں چلتا کہ سننے والے پر ہم کہاں کہاں سے ظاہر ہو رہے ہیں۔“

”اچھا۔“ سعد نے گہرا سانس لیا اور پلیٹ سائڈ ٹیبل پر رکھ دی۔ ”نادیاہ کیا و دوں نے میرا سامان تمہارے حوالے کر دیا تھا؟“

”ہاں۔ سب کا سب۔“ نادیاہ نے سر ہلایا۔ ”تمہارے ٹریولرز چیک تمہارا علاج کروانے میں معاون ثابت



ہوئے۔  
 ”میں بھی پوچھنے والا تھا۔“ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا اور نادیدہ کی طرف دیکھنے لگا۔  
 ”نادیدہ! جب میں آخری بار تم سے ملا تھا اس وقت حالات اور تھے بہت مختلف، لیکن اب وہ پہلے سے حالات نہیں ہیں اگر میں بالکل ٹھیک بھی ہو گیا تو شاید مجھے اپنی گزراؤ وقت کے لیے کام کرنا ہو گا۔“  
 نادیدہ اس کی بات سن کر زور سے ہنس دی۔ وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔  
 ”کیا یہ اس صدی کا سب سے بڑا لطیفہ نہیں؟“ نادیدہ نے بمشکل اپنی ہنسی روکتے ہوئے کہا۔ ”بلال سلطان کا بیٹا، سعد سلطان اپنی گزراؤ وقت کے لیے کام کرے گا۔ ہم چھوٹے موٹے انسانوں کو لپھوٹے موٹے کام۔“  
 ”میں سنجیدہ ہوں نادیدہ۔“  
 ”میں بھی سنجیدہ ہوں سعد! وہ اپنی ہنسی پر قابو کر کے بولی۔ ”میں نے دودن سے کہا کہ میں کسی طرح تمہارے حادثے کے بارے میں ڈنڈی کو اطلاع کرنی ہوں۔ اس نے مجھے صاف منع کر دیا۔ وہ کہنے لگا کہ ایسا کر کے میں تمہاری رخصت ہوتی روح کو تکلیف دوں گی۔“  
 ”اس نے ٹھیک کہا۔“ سعد نے بدستور سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ”مگر میں واقعی مرجاتا اور تم ایسا کرتیں تو مجھے یقیناً بہت تکلیف ہوتی۔“  
 ”لیکن ابھی تو تم زندہ ہو سندرست ہو رہے ہو، بلکہ تقریباً سندرست ہو چکے ہو۔“ نادیدہ نے کہا۔  
 ”اس لیے تو کہا ہے کہ اب کام کروں گا۔“  
 ”اور ڈنڈی سے رابطہ نہیں کرو گے؟“ نادیدہ نے سوال کیا۔  
 ”نہیں۔“ وہ سختی سے بولا۔  
 ”کیوں؟“ نادیدہ کے لہجے میں احتجاج تھا۔  
 ”بتاؤں گا میں تمہیں ضرور بتاؤں گا۔“ وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔  
 ”اور کیا تم ماہ نور سے بھی رابطہ نہیں کرو گے؟“ نادیدہ کے اس سوال نے اسے صحیح معنوں میں جھٹکا لگایا تھا۔ اس نے چونک کر نادیدہ کی طرف دیکھا تھا۔  
 ”تم نے میری کچھ دیر پہلے کسی بات پر غور نہیں کیا شاید میں نے کہا تھا تمہارا دل بہت پیارا ہے۔ اگرچہ وہ فارغ نہیں۔“ نادیدہ کا انداز حنائی کا سا تھا۔  
 ”میں سمجھ سکتا ہوں کہ دودن زادے واقعی بہت بولتا رہا۔“ وہ سامنے دیکھتے ہوئے بولا۔  
 ”میں نے بتایا تھا نا کہ بہت۔“ نادیدہ مسکراتی تھی۔  
 ☆ ☆ ☆  
 ”بہت روٹی تھی بے چاری رابعہ یہاں سے جاتے ہوئے۔ مجھے اکیلے چھوڑ دینے کا تصور ہی نہیں کر پارہی تھی وہ۔ تڑپ تڑپ کر روٹی تھی۔ جاتے جاتے لوٹ آتی تھی دس بار تو دہلیز سے لپٹ لپٹ کر روٹی۔“  
 ”اس کا خاندانی پیشہ ہے دوسرے کو یقین دلاؤ نا کہ اس سے اہم کوئی نہیں۔ چاہے رو کر یقین دلائے، چاہے ہنس کر، چاہے صاحب سلامیاں گا کر، چاہے گالیاں بک کر۔“  
 ”بہت بری بات ہے۔ تم اسے بہت کمتر سمجھتے ہو۔“  
 ”میں اسے کمتر نہیں کہہ رہا اس کے جینہائی خواص بیان کر رہا ہوں۔ جن سے مل کر اس کی حیثیت ترکیبی وجود میں آئی اور پھر جس پر اس کی پیدائش ہوئی۔“

”وہ بھی تم سے بہت بدگمان مگنی ہے یہاں سے، حساب برابر ہوا اللہ جانے کتنے کو سنے دیتی ہوگی تمہیں دل میں میرے سامنے تو سنانے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔“  
 ”مجھے حسرت ہی رہے گی کہ اس کی زبان میں اپنا شجرہ سنتا۔ یقیناً“ مجھے خبیث ابن خبیث قرار دیتی ہوگی وہ دل میں۔“  
 ”تم بڑے مسرور دکھائی دیتے ہو اس کے چلے جانے پر؟“  
 ”ہاں بہت اچھا ہوا جو وہ دونوں چلے گئے اب میں چوروں کی طرح تمہارے پاس آنے کے بعد کم از کم اس گھر میں تو چوروں کی طرح نہیں رہوں گا نا۔ تمہارے ساتھ کھل کر رومانس تو کر سکوں گا نا۔“  
 ”ارے ہٹو۔ پہلے ہی تمہارے رومانس نے ایک بار پھر مجھے دوسرے جی سے کر دیا۔ خود کو چوروں کی طرح چھپائے پھرتی رہی رابعہ سے اللہ اتنی شرم آئی تھی کہ اگر اسے شبہ ہو گیا تو کیا کہوں گی اس سے۔“  
 ”ابھی تو ابتدائی دن ہیں اسے شبہ کیسے ہوتا۔“  
 ”میں جو اس کے ساتھ بیٹھ کر کھٹی اور چٹ پٹی چیزیں ہڑپ کرنے کو بے چین رہتی تھی تو وہ کئی بار ہنس کر پوچھتی تھی کہ کہیں اس کی طرح میں بھی تو دو۔ جی سے نہیں ہو گئی اور پھر خود ہی اپنے سوال کے بے تکے پن پر ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتی تھی۔“  
 ”اسے تو خیر مننے اور بدھائیاں دینے کا بہانہ چاہیے ہوتا ہے۔ اچھا ہوا جو وہ لوگ چلے گئے۔ ایک تو ہر وقت کے جان کے خطرے سے بچ جائیں گے، دوسرا تم سکون سے یہ وقت یہاں گزار سکو گی۔“  
 ”لیکن جوں جوں دن گزرے گے راز عیاں ہوتا جائے گا محلے والے جواب اکثر۔ آنے جانے لگے ہیں۔ کیا کیا نہ قیاس کریں گے۔“  
 ”میں کو شش کر رہا ہوں کسی اور جگہ مکان لے لوں اس سے بہتر نہ سہی مگر تمہارے لیے کافی ہو گا، نئی جگہ، نئے لوگ ہوں گے وہاں تم یہ عرصہ آرام سے گزار لیتا، پھر میں بھی اکثر آتا جاتا رہوں گا، سراج پر جو طیلے نے حملہ کیا ہے اس کے بعد یہ جگہ بھی محفوظ نہیں رہی۔“  
 ”تم ایسا کیوں نہیں کرتے، مجھے اپنے ساتھ پنڈی ہی لے جاؤ۔ ادھر نئے محلوں اور نئے مکانوں سے میں بھر پائی۔“  
 ”پنڈی میں ایک کمرے میں شفٹ ہو گیا ہوں دوبارہ سے ایک مکان ہے جس کا ایک ایک کمرہ نوکری دار لڑکوں نے کرائے پر لے رکھا ہے۔ سعد کو فضل حسین کی بیوی کے حوالے کر رکھا ہے۔ وہ وہاں محفوظ ہے۔ میں پیسہ جمع کرنے میں لگا ہوا ہوں جو تمہاری دعا اور اللہ کے فضل سے اچھا خاصا آ رہا ہے۔ دن میں ایک وقت کا کھانا کھانا ہوں، تاکہ زیادہ سے زیادہ جمع کر سکوں، تمہارے علاج کے لیے اپنا مکان بنانے کے لیے ان سب راحتوں کے لیے جو میں نے تمہارے لیے سوچ رکھی ہیں۔“  
 ”آخر کب تک یوں ہی اپنی جان کو ہلکان کرتے رہو گے، خود کو دیکھو، کتنے کمزور ہو چکے ہو، آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ چکے ہیں۔ کپڑے جو پہنتے ہو کھس رہے ہیں، نہ ڈھنگ سے دھلے ہوتے ہیں، نہ ڈھنگ سے استری ہوئے ہوتے ہیں۔ اللہ جانے کیا اور کیا کھاتے ہو، بچے کو نہ ماں کا ساتھ میسر ہے، نہ باپ کی شفقت، اللہ جانے کن غیروں میں مل رہا ہے۔“  
 ”تم کیا سمجھتی ہو، میں سب کیفیات کو سمجھتا نہیں ہوں بھلا، کیا میرا دل ایک گھر، ایک چھت، بیوی، بچے کا ساتھ، سکون کی زندگی، آرام کی روٹی کے لیے نہیں ترستا، تمہیں کیا سناؤں کہ کیسے کیسے خواب دکھائی ہیں۔ مجھے میری تشنہ کام آرزوئیں، لیکن پھر خود کو تسلی دیتا ہوں۔ سمجھا لیتا ہوں۔ جہاں اتنا صبر کیا وہاں اب تو بس کچھ ہی دیر



باقی ہے۔ پھر وہ سب کچھ ہمارا ہو گا جو ہم چاہتے ہیں۔ نجانے کیوں مجھے لگتا ہے یہ جو آنے والا بچہ ہے یہ میرے لیے بہت ہی سعد ثابت ہونے والا ہے۔ میں تصور ہی تصور میں اسے اپنی گود میں کھیلتا اپنے سینے پر چڑھتا محسوس کرتا ہوں۔ سچ کہوں تو یہ فیلنگز سعد کی دفعہ نہیں تھیں شاید اس لیے کہ اس وقت مزاج زیادہ ہی لالباہلی اور غیر ذمہ دارانہ تھا۔

”ارے والد میرے سعد سے زیادہ سعد کیا ثابت ہو گا آنے والا میرے سعد کو تو ماں کی بد قسمتی لڑگئی ورنہ جیسا وہ سعد ہے اور کون ہو گا اتنا خوب صورت کہ جو دیکھے گود میں لے لینے کی خواہش کرنے لگے۔“

”ہاں یہ تو ہے۔ حضرت ہیں بہت خوش شکل ماشاء اللہ میں تو اسے نظر بھر کر دیکھتا بھی نہیں کہ کہیں میری ہی نظر نہ لگ جائے۔“

”ہائے کیسے خوش قسمت ہو اسے دیکھ تو لیتے ہو مجھے دیکھو رات دن تڑپتی ہوں اس کے لیے۔“

”کچھ دن اور بس میری جان فقط کچھ ہی دن اور۔“

”سب سمجھتی ہوں مگر انسان ہوں کیا کروں؟“

”چھایہ سب چھوڑو میں بتاؤں آج میں دو دن سے تقریباً بھوکا ہوں شاید کل ایک دو ٹوسٹ کھائے تھے چائے کی بھونٹی پیالی کے ساتھ۔ بہت بھوک لگ رہی ہے کھانا نہیں کھلاؤ گی کیا۔“

”ہاں۔ ہاں کیوں نہیں آج صبح سے منڈیر پر بیٹھا کواراگ الاپ رہا تھا۔ میرا دل کتنا تھا تم آؤ گے اسی لیے تو تمہاری پسند کا کھانا بنالیا۔ چاہت اور محبت کے ساتھ۔“

”کیا بنایا؟“

”خندوں کا دلمہ اور مکھڑی حلوہ۔“

\*\*\*

اس نے اس وسیع ہال پر چاروں طرف نظر دوڑائی۔ کیا تھا جو نہیں تھا اس ہال میں ہر ساز اور اونچائی کی بارز فوم کے گدے رنگز باز اور بریکس لیڈز اس ہال کی چھت میں کنسیلڈ روشنیاں جگمگا رہی تھیں اور صفر سے شروع کر کے انتہائی نقطے تک کی مشقوں کی تمام سہولتیں ان روشنیوں میں چمک رہی تھیں۔

ماہر فزپو تھراپسٹ کا ایک گروپ تھا جو دن میں دو بار اسے ضروری ورزشیں کراتا تھا اور ماہر ڈاکٹرز کی ایک ٹیم تھی جو اس کی رگوں پٹھوں اور ہڈیوں کا علاج کر رہی تھی۔ اس کی خوراک ہیلسنڈ ڈانٹ کی اعلا ترین مثال قرار دی جاسکتی تھی۔ سینے کو اچھے سے اچھا لباس کھونے کو بہترین گاڑی میرو تفریح کے مواقع۔ وہ یقیناً ایک فیری لینڈ میں داخل ہو چکی تھی۔ بلیو ہون سرکس کی شہزادی پر یارانی نے گویا اپنا تیسرا جنم لیا تھا۔

دنوں میں اس کا رنگ روپ جسمانی اور ذہنی صحت میں بہتری آنے لگی تھی۔ اسے ورزش کے لیے بہترین جم میسر تھا اور پریکٹس کے لیے بہترین رنگ ایک مستعد اور ذمہ دار عملہ صرف اس کی خدمت کے لیے متعین کر دیا گیا تھا۔ اس ونڈر فل فیری لینڈ میں داخلے کے بعد وہ اور سیسی آئی ششدر رنگ سی ہو چکی تھیں۔

کہاں وہ ہر چیز سے بے دخل ہو جانے کے خدشے سے دوچار تھیں۔ کہاں وہ مری کے مضافات میں چوروں کی طرح ایک چھوٹے سے فلیٹ میں زندگی گزارتے گزارتے جیسے لائٹ لائٹ میں لا کر کھڑی کر دی گئی تھیں اور یہ سب اسی شخص بلال سلطان کی وجہ سے ممکن ہوا تھا۔ جسے اپنے اس چھوٹے سے فلیٹ میں موجود دیکھ کر اس دن کو اپنے آرام کا آخری دن گردانتے ہوئے اس نے اور سیسی آئی نے دل کھول کر انہیں دل کی باتیں سنائی تھیں۔

بلال سلطان جو سعد سلطان کا باپ تھا۔ سعد سلطان جس نے سارہ خان کو تڑپ تڑپ کر مرتے ہوئے بستر

مرگ سے اٹھایا تھا اور اس کے دم توڑتے وجود میں بساط بھر جان ڈال دینے میں کامیاب ہوا تھا۔ اس کی زندگی قدرت کا تحفہ اور سعد سلطان کی نیک فطرتی کامیجڑہ تھی۔

سعد نے بچوں کی طرح اس کی حفاظت کی تھی اور جون بڑا تھا اس کی صحت کی بحالی کے لیے کرتا رہا تھا۔ بغیر کچھ بجائے بغیر کسی تشویر کے مگر اس کی بساط محدود تھی یا پھر وہ تشویر ہی کے خوف میں مبتلا تھا جو اس نے سارہ خان کو دنیا سے چھپا رکھا تھا۔ وہ خود اپنی زندگی میں کتنا بے سکون اور مضطرب تھا اس نے سارہ خان کو بے سکونی اور اضطراب سے بجائے رکھا تھا۔ اسے کس وجہ سے سب کچھ چھوڑ کر جانا پڑا تھا۔ مگر جاتے جاتے بھی وہ سارہ خان کے لیے زندگی کے سب اہتمام کر گیا تھا۔

اور اب یہ بلال سلطان تھے جن کی بساط کا فورم بڑا اور استطاعت زیادہ تھی۔ وہ بیٹے کی پوشیدہ نیکی کو لائٹ لائٹ میں لے آئے تھے اور ان کی کاوشوں کی دسترس بھی بڑی تھی جب ہی تو ایک طویل عرصے کی جدوجہد کے بعد پاؤں پاؤں چلنے کے قابل ہوئی۔ سارہ خان دونوں میں پریکٹس بارز پر چڑھنے کے قابل ہونے لگی تھی۔

”میرے ہاتھ۔“ اس نے اپنے ہاتھ اپنی نظروں کے سامنے پھیلاتے ہوئے سوچا۔ ”اس کی ہتھیلیاں گلابی ہونے لگی تھیں اور نسوں کی کھنچاؤ دور ہو رہی تھی اور میری ٹانگیں۔ اس کی ٹانگیں جیسے جان پکڑنے لگی تھیں۔“ کیا کبھی میں نے سوچا تھا کہ میں کبھی اس بچہ پر چڑھاؤں گی۔ اس کا دل تشکر سے بھر گیا۔

”لیکن کیا اس مقام تک پہنچنے کا کوئی امکان ہوتا ہے جو سعد سلطان میری زندگی میں نہ آتا۔“ سعد کی ایک بساط بھر نیکی۔ چلتے چلتے روشنی کا کیسا مینارہ بن گئی کیسی نیت تھی اس کی اور کیسا ارادہ جس میں برکت ہی برکت پڑتی تھی۔ وہ سعد کی محبت تھی جس نے مجھے بستر سے اٹھایا وہ اس کی لگن تھی جس نے مجھے دوبارہ سے قدموں پر چلایا اور یہ سعد سے اس کے باپ کی محبت ہے جو مجھے دوبارہ ایک نارمل زندگی کی طرف لوٹا رہی ہے۔

”یا خدا ایسا۔“ پھر اس نے اوپر لکھا۔ ”یہ کیسے تیرے سلسلے ہیں۔ ایک بے نام و نشان بچی کو بلیو ہون سرکس کے پالنے میں ڈال دیا اور پھر ایک قریب المرگ لڑکی پر سعد سلطان کی نظر ڈال دی۔ اس سارے سلسلے میں کس کو کیا عطا ہوا۔ یہ کون کھلکھولیت کر سکتا ہے مگر تیری عظمت تیرے کرم اور تیرے رحم کی انتہا کیا ہے یہ تو مجھ ایسی کوتاہ نظر پر بھی عیاں ہو گیا۔“

”یہ سب۔“ دوبارہ اس وسیع ہال پر نظر ڈالتے ہوئے اچانک اسے خیال آیا۔ ”مگر یہ سب بلال سلطان میرے لیے کر سکتے ہیں تو ماہ نور کا اس گھر میں کیا مقام ہو گا جسے بلال سلطان اپنے بیٹے کے دل کا معاملہ کہتے ہیں۔ مگر ماہ نور ہے کہاں۔ وہ یہاں کیوں نہیں آتی اس نے تو کبھی مجھ سے بھی رابطہ نہیں کیا۔“ وہ سوچ رہی تھی۔

\*\*\*

”آپ تو بہت جلد گھبرا گئیں بی بی صاحب ابھی تو ایک پڑاؤ بھی ٹھیک سے عبور نہیں ہوا۔“ اختر نے اپنے سامنے چٹائی پر بیٹھی ماہ نور سے کہا۔

”مجھے لگتا ہے یہ میرے بس کا کام نہیں ہے سائیں جی یا پھر میں ہی کم عقل ہوں میں ہی ان پلانر (ill-planner) ہوں۔“ ماہ نور نے بچی آواز میں کہا۔

”یہ آپ ہی کے تو بس کا کام ہے بی بی صاحب! اختر مسکرایا۔“ آپ کو اور اک ہی نہیں کہ آپ کیسی سینٹرل پوزیشن پر کھڑی ہیں۔“

”مجھے طفلانہ تسلیاں مت دیں سائیں جی میں جان گئی ہوں کہ میں ایک سراب کے پیچھے بھاگ رہی ہوں۔“ ماہ نور کے لہجے میں مایوسی تھی۔



”آپ کا مسئلہ گمان اور اتنا ہے بی بی صاحب اس پر قابو پالیں تو راستہ تو صاف ہی صاف ہے اگرچہ گمان اس راستے کا جزو لازم ہے جس پر آپ چل رہی ہیں مگر اتنا تو اس راستے کے پاس نہیں پھنکتی اتنا تو اس جذبے کی قائل ثابت ہوتی ہے جو آپ کے دل میں گھر کیے بیٹھا ہے۔“

”گمان کیا مطلب؟“ ماہ نور نے سوالیہ انداز میں دیکھا۔

”آپ سامنے کا منظر دیکھ کر اپنی من مرضی کے قیام لگانا چھوڑ دیں بی بی صاحب منظر کے پار بھی دیکھا کریں کبھی کبھی پس منظر میں ہی اصل منظر بس رہا ہوتا ہے پیش منظر نظر کا دھوکا ہوتا ہے۔“

”میری سمجھ میں آپ کی باتیں شاید نہیں آسکتیں۔“

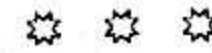
”غور کرنے کی عادت ڈالیں۔ آپ سے میں نے عرض کی تھی ہے تو مشکل مگر یہ راستہ صرف آپ کا ہے آپ کو طے تو کرنا ہی پڑے گا۔“

”میں بہت پریشان ہوں سائیں جی عجیب و غریب انکشافات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔“

”ان ہی انکشافات سے گھبرا کر تو باؤ صاحب فرار حاصل کر گئے تھے انہیں بھی پیش منظر نے دھوکا دے دیا۔

جب ہی تو گمان کی بھول بھلیوں میں پھنس گئے اور اتنا پھنسے کہ نہ نور فاطمہ کی جھونپڑی میں رات بھر کا قیام کام آیا نہ ہی شربت کے گھونٹ آپ سے میری درخواست ہے گمان سے بچ جائیں ان کو قابو کر لیں اور پس منظر میں جھانکنے کی عادت ڈال لیں۔ آپ کی نیا پار لگ جائے گی پھر دل بھی آپ کا ہو گا۔ دل والا بھی جس ایک ذرا فہم پر باتھ ڈالنے کی بات ہے۔“

اختر نرم لہجے میں کہہ رہا تھا اور نجانے کیوں ماہ نور کو اپنے اندر ہلچل مچاتی بے چینی سکون پذیر ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔



مولوی سراج فراز بچوں کو ناظرہ کا سبق دینے کے بعد صف پر اکیلے بیٹھے نیاز محمد کے گھر سے آنے والے ناشتے کا انتظار کر رہے تھے چند دن سے ان کے معمول میں کچھ فرق آگیا تھا۔ وہ گھر سے نہار منہ صبح نور کے ترکے ہی مسجد آجاتے تھے اپنے معمول کے فرائض سے فارغ ہوتے تو نیاز محمد کے گھر سے ان کے لیے ناشتہ آجاتا۔ مولوی صاحب کو اتنی صبح آتے دیکھ کر نیاز محمد نے جس کا گھر مسجد کے ساتھ ہی متصل تھا خود ہی یہ خدمت اپنے سر لے لی تھی اور مولوی صاحب کو تو یہ معمول بہت ہی راس آیا تھا۔

رابعہ بیگم نے کچھ عرصے سے چوہدری سردار صاحب کے ہاں سے آنے والی سوغاتوں کو واپس موڑنا شروع کر دیا تھا۔ ان کے خیال میں چوہدری صاحب کے ہاں بی بی بیابنے کے بعد اب ان کا ان سوغاتوں پر کوئی حق نہیں بنتا تھا اور اسی کے ساتھ مولوی صاحب کے گھر میں بننے والے ناشتے پر عجیب سی مسکینی چھا گئی تھی۔

معمول کی سوکھی روٹی کے ساتھ کبھی کبھار رات کا بچا ہوا سالن کھانے کو مل جاتا تھا، لیکن اکثر سوکھے اچار کے ساتھ ہی ناشتے پر رُخا دیا جاتا۔ وہ دلی گھی میں تلے پرائے مکھن، دہی اور شکر تو جیسے خواب ہونے لگے تھے ایسے میں قدرت نے خود ہی نیاز محمد والا انتظام کر کے جیسے مولوی صاحب کے دن پھیر دیے تھے نیاز محمد تلے پرائیوں کے ساتھ کبھی انڈوں کا آلیٹ، کبھی سوچی کا حلوہ، تو کبھی موٹی بالائی کی تہ والا دہی معہ شکر کے بھجوا دیتا تھا۔ ساتھ میں لسی جس پر تانہ مکھن بھی تیرتا تھا۔

”سبحان اللہ۔ اس کی قدرت ہے سب فاقہ کشی سے بال بال بچا لیا اس نے۔“ مولوی صاحب آنکھیں بند کیے نیاز محمد کے ناشتے کا تصور کرتے ہوئے جھوم رہے تھے جب اپنے قریب آہٹ سن کر انہوں نے فوراً

”آپ بھی کھول دی تھیں۔ نظرس نیاز محمد کے بیٹے کے ہاتھوں اپنی طرف بڑھاتے ناشتہ دان کی منتظر ہوئیں۔ جس کے نہ آنے پر انہیں نظرس اٹھا کر دیکھنا پڑا تھا۔ ان کی توقع کے بالکل برعکس ان کے سامنے ان کا اکلوتا داماد افتخار احمد عرف کھاری کھڑا ان سے بیٹھنے کی اجازت طلب کر رہا تھا۔“



”اس نمبر کی مالک خاتون جن کا نام فلزا ولد محمد ظہور احمد ہے اس وقت لاہور کی ایک آرٹ گیلری میں موجود ہیں۔ وہ گزشتہ کئی دن سے لاہور شہر ہی میں ٹھہری ہوئی ہیں۔ ان کی جائے قیام شہر کا ایک معروف فائیو اسٹار ہوٹل ہے جہاں وہ چوہدری سردار نامی کسی شخص کی مہمان کی حیثیت سے رہ رہی ہیں۔ گزشتہ ماہ وہ ان ہی چوہدری سردار صاحب کے فارم ہاؤس جو منڈی پور کے قریب واقع ہے بھی مہمان کی حیثیت سے ٹھہر چکی ہیں۔“

بلال سلطان نے خود کو ملنے والی معلومات کو دھیان سے سنا اور آنکھیں سیکڑتے ہوئے اس پر غور کرنے لگے۔

”سرا! سی دور ان رازی کمرے میں داخل ہوا۔ رازی چند منٹ پہلے ان سے ملاقات کی اجازت لے چکا تھا۔

”ہاں بولور رازی کوئی خاص بات؟“ انہوں نے رازی کی طرف دیکھا۔

”سرا! میں نے سارہ خان اور میم سیمی کے کنفرنڈ ٹکٹ ان تک پہنچا دیے ہیں۔ صوفی ان کے ساتھ سفر کرے گی۔“ رازی نے کہا۔

”ہاں۔ یہ بہت اچھا ہے گا، صوفی خاصی سمجھ دار لڑکی ہے۔ وہ بہت اچھی طرح سب معاملات ہینڈل کر سکتی ہے۔“

”تیس باس۔“ رازی بیوی کی تعریف سن کر خوش ہوتے ہوئے بولا۔

”دور یہ تمہاری بھی خوش قسمتی ہے۔“ بلال نے اس پر چوٹ کرتے ہوئے کہا جسے رازی نے نظر انداز کر دیا۔

”اور سرا! ایک اور اہم بات بھی بتائی تھی آپ کو۔“

”ہاں بولو۔“

”سرا! کل رات مس ماہ نور آپ سے ملنے کے لیے یہاں آئی تھیں۔ ان کی آمد کی اطلاع ملتے ہی میں خود انہیں گیٹ پر ریسیو کرنے گیا۔ باقی لوگوں کو بھی الرٹ کر دیا گیا تھا۔ آپ کی ڈنر پر متوقع آمد کے پیش نظر میں اس وقت

تک انہیں انٹرین کرنے کے لیے نشست گاہ کی طرف لا ہی رہا تھا کہ ان کا ارادہ اچانک بدل گیا اور وہ کسی اور سے ملاقات کا وقت ہو جانے کا بتا کر واپس پلٹ گئیں۔ میں نے انہیں روکنے کی بہت کوشش کی مگر انہوں نے نہیں سنا۔ میں تو بلکہ انہیں مس سارہ خان کا رنگ اور پریکٹس روم دکھانے کی دعوت بھی دے رہا تھا مگر میری بات سنتے ہی یکدم ان کا ارادہ بدل گیا۔“

رازی نے اپنی بات سنا کر روتے روتے باس کی طرف دیکھا۔ اسے پوری امید تھی ماہ نور کے یوں چلے جانے پر

باس سخت ناراض ہوں گے اور سخت ست سنا میں گے، لیکن اس کی توقع کے برعکس باس کے چہرے پر مسکراہٹ

پھیل رہی تھی۔ ایک شرارت بھری مسکراہٹ۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ)



## حیابخاری



اس ایک ماہ میں ہمارے گھر میں۔ "داور نے حتی الامکان اپنے لہجے کو منذب رکھنے کی کوشش کی تھی۔ ورنہ وہ کس قدر غصے میں تھا اس کی سرخ آنکھوں اور لال چہرے سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔

"جب یوں کھڑے کھڑے تم میری اتنی بے عزتی کر سکتے ہو تو ردا کے ساتھ تم کیسا ملوک رکھتے ہو گے" میں بچی ہوں جو نہ سمجھ سکوں۔ "گلزار بیگم ہاتھ نچلاتے ہوئے بولیں۔ ردا ان کے ساتھ لگ گئی۔ رونے میں مزید تیزی آگئی۔

"داور! تم باہر چلو۔" جہاں آرا کو اسی میں عالیت لگی کہ فی الحال ان سب کو الگ لے جا کر سمجھایا جائے۔

"ہاں ہاں۔ لے جاؤ۔ تمہارا ہی تو سبق ہے۔ ہو بیٹے کی خوشی تم سے دیکھی نہیں جاتی۔ ارے تم جیسی مائیں بیٹوں کو سہرا باندھتی ہی کیوں ہیں اگر اس کی خوشی برداشت نہیں کر سکتیں تو۔" گلزار کی بات پر جہاں وہ منہ کھولے رہ گئیں۔ وہیں داور ضبط سے ہونٹ کاٹنے لگا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں گلزار! میں تو۔" انہوں نے صفائی دینی چاہی کہ انہوں نے ہاتھ اٹھا کر ٹوک دیا۔

"بس بس۔ یہ ڈرامے صرف بیٹے کے سامنے ہی کرو تم۔ میں ان اداکاروں میں آنے والی نہیں۔"

"آئی پلیز!" داور کی برداشت جواب دے مٹی۔

جہاں آرا نے فوراً اس کا بازو پکڑ کے اسے قابو میں کیا

داور کے کمرے سے آتے شور میں مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اور جہاں آرا کی پریشانی بھی اسی قدر بڑھ رہی تھی۔ صرف داور کی ہی نہیں بلکہ اس کی ساس اور بیوی کی آواز بھی کافی واضح تھی۔ محلے والوں کا سوچ سوچ کر انہیں اندر رہی اندر شرمندگی گھیر رہی تھی۔

ان کی بہو ردا نے سویرے داور سے ماں کے گھر جانے کی فرمائش کی تھی۔ داور جلدی میں تھا سو اس کی بات ان سنی کر کے آفس کے لیے نکل گیا۔ ردا نے نہ صرف اس کے جانے کے بعد خوب شور مچایا۔ بلکہ فون کر کے ماں کو بھی بلوایا۔ اور رورور کے ان کو ساری بات بتائی۔ جہاں آرا اسے سمجھاتی ہی رہ گئیں۔

شام کو تھکا ہارا داور گھر آیا تو ردا اور اس کی ماں تو جیسے اس کی پیشی کے لیے تیار بیٹھی تھیں۔ کمرے میں جاتے ہی دونوں ماں بیٹی نے اسے خوب سنائیں۔ تھکا ہوا داور کچھ وقت تو خاموشی سے سنتا رہا۔ مگر اسے بھی غصہ آگیا۔ اور اب وہ بھی ان کے مقابلے پر آگیا تھا۔

ساتھ والے گھروں کی عورتیں چھتوں پر چڑھ چڑھ کے تماشا دیکھنے لگیں۔ جہاں آرا دھڑکتا دل لیے کھلے دروازے سے اندر چلی آئیں۔

"ارے خدا کی پناہ! ابھی تو ایک ماہ نہیں ہوا تم لوگوں کی شادی کو اور ابھی سے میری بیٹی کو اتنا کچھ سنا پڑ رہا ہے۔" جہاں آرا کو دیکھتے ہی گلزار بیگم مزید تیز ہوئیں۔

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں آپ سے آنٹی! کہ ذرا ہمیں بھی تو پتا چلے بھلا کیا کیا سہ لیا آپ کی لاڈلی نے



تھا۔  
”بس۔ میں نے فیصلہ کر لیا۔ روا! تم سب سامان  
پیک کرو اپنا۔ اب اس گھر میں تم ہی قدم رکھو گی  
جب اس گھر کو تمہاری قدر ہوگی۔“ گلزار بیگم کی بات  
پہ داور ایک غصیلی نگاہ روا پہ ڈالتا ہر نکل گیا۔ اور پھر  
جہاں آرا کے لاکھ روکنے کے باوجود وہ دونوں نہیں رکی  
تھیں۔

وہ تڑھال سی برآمدے میں پڑی چارپائی پہ آکر  
سرتھلے بیٹھ گئیں۔ ڈرائنگ روم سے نکلتے داور نے  
ایک اداس سی نگاہ اپنی ماں پر ڈالی۔ اور بیرونی دروازے  
کی طرف بڑھ گیا۔

”اُمی۔ دروازہ بند کر لیں۔ میں رات تک آجاؤں  
گا۔“ وہ کہہ کر باہر چلا گیا مگر جہاں آرا وہاں ہوتیں تو  
سنیں۔

\*\*\*

”آپ بات کی نزاکت کو کیوں نہیں سمجھ رہے۔“  
اماں نے پٹھن زدہ لہجے میں کہا تو وہ جو دروازے کے  
قریب سے گزر رہی تھی۔ ٹھنک کے رک گئی۔  
”بات کی نزاکت کو تم نہیں سمجھ رہیں عفت بیگم!  
جہاں آرا میری اکلوتی اولاد ہے۔ اس کے لیے میں کچھ  
بھی کر سکتا ہوں۔ وہ مجھ پہ بھاری نہیں۔“ بابا نے دو  
ٹوک لہجے میں کہا۔

”میں مانتی ہوں۔ وہ آپ کو بے حد عزیز ہے۔ آپ  
اس کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ مگر اس کا گھر تو بریاد  
نہیں کر سکتے ناں۔“ اماں کی بات پر جہاں بابا چونکے  
تھے۔ وہیں دروازے کی اوٹ سے لگی جہاں آرا کا دل  
بھی کانپ گیا۔

”پہلی اس کی شادی کو دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ اور  
بجائے اسے اپنے گھر میں خوش دیکھنے کے آپ اسے  
اپنا پاس رکھنے کا سوچ رہے ہیں۔“ اماں بولتی رہیں۔  
”بیٹیاں کسی پہ بوجھ نہیں ہوتیں لیکن یہ ایک  
حقیقت بھی ہے اور شریعت بھی کہ بیٹیاں اپنی اپنے

گھر میں ہی لگتی ہیں۔ میں مانتی ہوں کہ جہاں آرا کی  
ساس کو اتنا سخت رویہ نہیں رکھنا چاہیے تھا مگر قصہ  
ہمارا بھی ہے جہاں آرا کے بابا اگر آپ مجھے اسے گھر  
مگر ہستی سکھانے دیتے تو آج اسے ان مسائل کا سامنا  
نہ کرنا پڑتا۔ ماں باپ کی سب سے بڑی غلطی یہی ہوتی  
ہے کہ بیٹیوں کو دواغ تو کر دیتے ہیں مگر انہیں یہ سمجھانا  
بھول جاتے ہیں کہ ان کا اصل گھر شادی کے بعد ان کا  
سرال ہی ہوتا ہے۔ چھوٹی موٹی لڑائیاں تو ہر جگہ ہوتی  
رہتی ہیں۔ نو مہینے پیٹ میں پالنے والی ماں بھی تو غصے  
میں کبھی ہاتھ بھی اٹھا لیتی ہے تو ساس کی ذرا سی گری پر  
اتنی اتائیوں۔ پھر میں جانتی ہوں۔ آذر بہت اچھا لڑکا  
ہے اور اس کے گھر والے بھی۔ چھوٹی سی رنجش ہے  
اسے دلوں کا میل نہ بنائیں۔ میں خود جہاں آرا کو  
سمجھاؤں گی اور اس کی ساس سے بھی بات کروں گی۔  
دیکھئے گا سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ابھی آذر کا فون آیا  
تھا۔ شام کو لینے آئے گا وہ جہاں آرا کو۔ آگے آپ کی  
مرضی۔“

اماں بات ختم کر کے چپ ہو گئیں۔ بابا نہ جانے کیا  
سوچ رہے تھے۔ وہ بھی چپ چاپ دروازے سے ہٹ  
گئی۔

\*\*\*

”اماں! بابا نے کیا سوچا؟“  
اماں آذر کے آنے سے پہلے ہی اس کی خاطر  
مدارت کی تیاری میں لگی ہوئی تھیں کہ اچانک جہاں  
آرا نے ان کو پیچھے سے پکارا۔ انہوں نے مڑ کر ایک نظر  
اس کے پریشان چہرے پر ڈالی۔ اور دوبارہ کباب بنانے  
لگیں۔

”یہ اہم نہیں بیٹا کہ بابا نے کیا فیصلہ کیا۔ اہم بات یہ  
ہے کہ تم نے کیا فیصلہ کیا۔“ انہوں نے کبابوں کی  
پلیٹ فریزر میں رکھی اور سنک میں ہاتھ دھوئے  
لگیں۔ جہاں آرا شلٹ سے ٹیک لگائے انہیں  
دیکھتی رہی۔ وہ ہاتھ دھو کر اس کے پاس چلی آئیں۔

”جہیں یاد ہے جہاں آرا! میں گھر کے کام کاج سے  
متعلق جب تمہیں ڈانٹا کرتی تھی تو تم ہمیشہ اپنے بابا کو  
دھمکا دیتا کرتی۔ اگر اس وقت انہوں نے بھی  
تمہیں سمجھایا ہوتا مجھے سمجھانے دیا ہوتا تو آج تم یہ  
ریشالی نہ دیکھتیں۔ لیکن پتا ہے تم سے سب سے بڑی  
غلطی کیا ہوئی۔ تم نے چھوٹی سی بات کو ایٹھ بنا لیا۔ اور  
ایٹھ جتنی جلدی کری ایٹھ ہوتے ہیں اتنی ہی دیر لگتی  
ہے انہیں حل کرنے میں۔ اگر تم اسے معمولی بات  
سمجھ کر نظر انداز کر دیتیں تو آج پر سکون سی اپنے گھر  
بیٹھی ہوتیں، لیکن سچ کہوں تو ایسی چھوٹی چھوٹی بات کو  
ایٹھ بنانے میں تمہارے بابا کا بھی کردار ہے۔ تمہیں  
اب پہلے کی طرح ہر بات ان سے شیئر نہیں کرنا  
چاہیے بیٹا! تم ٹھنڈے دماغ سے اب پہلے خود سوچو  
اور اگر کسی مسئلے کا حل نہ نکال سکو تو مجھ سے شیئر  
کر لو۔ مگر یوں چھوٹی سی بات پہ جھگڑ کر میکے چلے آنا یا  
ماں باپ کو دخل اندازی پہ مجبور کرنا ٹھیک نہیں ہوتا  
بیٹا!“

انہوں نے اپنے ہاتھوں کے پالے میں اس کا چہرہ  
تھامتے ہوئے پیار بھرے لہجے میں کہا تو وہ رو دی۔ واقعی  
اس سے بہت بڑی غلطی ہو گئی تھی۔

اور پھر وہ اس کی آخری غلطی تھی۔ اس دن جب بابا  
کو راضی کر کے وہ آذر کے ساتھ واپس چلی گئی تو دوبارہ  
کبھی اس نے اپنے گھر کی بات گھر سے باہر نہ نکالی  
تھی۔ جیسی بھی صورت حال ہوتی وہ محبت اور ہمت  
سے ہینڈل کر لیتی۔ اپنی ماں کی ایک نصیحت باندھ لینے  
سے اس کی زندگی آسان تر ہوتی چلی گئی اور اس کا گھر  
خوشیوں کا گوارہ بن گیا۔

لیکن آج اتنے سالوں بعد وہی چھوٹی سی غلطی ان  
کی بہو کر بیٹھی تھی۔ اور بد قسمتی یہ تھی کہ اس کی ماں  
جہاں آرا کی ماں کی طرح اسے سمجھانے کے بجائے  
چھوٹی سی بات کو بڑھا رہی تھی۔

وہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ جب بیٹیاں ماں باپ کا  
گھر چھوڑ کر دوسرے گھر جاتی ہیں تو یہ ان کے لیے

زندگی کی ایک نئی شروعات ہوتی ہے۔ اور بالکل اسی  
طرح جیسے بچپن میں انہیں بے انتہا نگہداشت کی  
ضرورت ہوتی ہے۔ قدم قدم پہ انہیں سمجھانا پڑتا  
ہے بالکل ویسے ہی شادی کے بعد ناگھر اور ان کی ذمہ  
داریوں کو سمجھنے اور ان سے نبھنے کے لیے بھی انہیں  
ایک بہترین دوست اور رہنما کی ضرورت ہوتی ہے۔  
لیکن جس قسم کا رویہ روا کی امی نے ان کے گھر دکھایا تھا  
اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ روا کی مدد تو دور کی بات  
الٹا اس معاملے کو بڑھا سکتی تھیں۔

انہیں اپنا گھر بہت عزیز تھا اور اپنا بیٹا اپنے گھر سے  
بھی زیادہ اسی لیے انہیں اپنی بہو بھی عزیز تھی۔ وہ  
صرف ایک چھوٹی سی بات پہ یوں اپنے بیٹے کا گھر اجڑتا  
نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ نہ ہی بیٹے ہوگی پریشانی ان سے  
پرداشت ہو رہی تھی۔ انہیں گلزار بیگم سے اب کسی  
قسم کی کوئی توقع نہ رہی تھی۔ انہوں نے تو الٹا معاملے کو  
سنگین بنانے کی کوشش کی تھی۔ اور وہ داور سے بھی  
بات کرنا نہیں چاہتی تھیں۔ کیونکہ جس قدر غصے میں  
وہ تھا اس سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ مزید بگڑ جاتا۔

”مجھے خود روا سے بات کرنی ہوگی۔ امی نے مجھے  
سمجھایا تھا کہ شادی کے بعد بچپن کا سرال ہی ان کا  
اصل گھر ہوتا ہے۔ ان کی حقیقی جائے پناہ اور ساس  
سراسر کے ماں اور باپ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

سرال اور میکے کا فرق میں ختم کروں گی۔ میں روا کو  
وہ سب سمجھاؤں گی جو میری ماں نے مجھے سمجھایا تھا۔  
اپنی پوری کوشش کروں گی کہ میری طرح ہی روا پہلی  
ٹھوکر پہ ہی سنبھل جائے۔ اور یہ غلطی اس کی بھی  
آخری غلطی ثابت ہو۔ اللہ میرے داور اور روا کو ہمیشہ  
خوش رکھے۔“

وہ سوچتے ہوئے کچن کی طرف چل دیں۔  
”اور پھر مجھے اماں کا قرض بھی تو اتارنا ہے۔ اس  
سے بہتر موقع بھلا اور کیا ہو سکتا ہے۔“ دل ہی دل میں  
مطمئن ہو کر فیصلہ کرتے ہوئے وہ رات کا کھانا بنانے  
لگیں، ایک مرتبہ پھر سے خوشیوں بھرے گھر کی نئی  
امید لیے۔





شیطان کیوں بنا؟ پختہ عمر کی بنیادی عاصروں فیروزہ کا سر  
گود میں رکھے تڑپ رہی ہے۔ اس کی بیٹی اور اپنی بیٹی  
جیسی فیروزہ کے لیے  
پختہ عمر کی عاصروں کبھی چھوٹی عمر کی فیروزہ تھی۔ جب  
وہ بیس سال کی تھی تب۔ جب وہ اس کی اکلوتی  
بھابی بنی تھی تب سے پہلے خاص کر۔  
وہ گھرے سانولے رنگ کی تھی۔ اور یتیم تھی۔  
اپنے بڑے کنبے کا بوجھ اٹھاتے اٹھاتے اس کی اتنی عمر

زمین میں دھنس دھنس گئی۔ اپنی بیٹی سے نظریں  
ہٹاتے بجاتے، اس کی نظریں عاصروں تک آکر مجسم  
انجام بن چکی تھیں۔  
عافیہ عاصروں پر اپنی نظریں گاڑے اندر ہی اندر  
دھنس رہی تھی۔ اپنی بیٹی کے سرہانے سے پھوٹی  
موت کے پرندے کی پھر پھر اڑتے اڑتے دھار رہی تھی۔  
پر اب دیر ہو گئی تھی۔ اعمال کے پرندے کے پروں  
پر اس نے سیاہی پھیر دی تھی۔ حضرت انسان ملا متی

سمیرا احمد

## حسار

اس کی بیٹی آنکھیں نہیں کھول رہی تھی۔ تین  
بھائیوں کی اکلوتی بہن۔ فیروزہ۔ لیکن تین بیٹوں کی  
اکلوتی ماں کی آنکھیں کھل سی گئی ہیں۔ اسی بیٹی کی ملا  
اس کے پیروں کی طرف کھڑی ہے، ساکت خاموش  
اسی بیٹی کی اماں جانی اس کے سرہانے بیٹھی باؤلی سی  
ہو رہی ہے۔

”فیروزہ۔“ اس کی اماں جانی نے چیخ ماری۔  
”میں۔“ بھابی! جلدی فون کریں ڈاکٹر کو۔  
دیکھیے اسے کیا ہوا ہے، یہ ایسے کیسے اسے کیا ہوا ہے،  
بھابی۔ فیروزہ! ایک پاگل دوسری پاگل کو جھنجھوڑ  
رہی تھی۔

تیسرا صحیح دماغ بشران دونوں کو دیکھ رہا تھا۔  
خاموش۔ جواب الجواب۔

خون کی ایک لکیر اس کی ناک سے بھی نکل رہی  
تھی۔

نقص کی ایک لکیر اس کے نفس پر بھی پھری تھی۔  
فیروزہ کے دماغ کی روایتاً ”کل رات غلط سمت  
بھاگی دوڑی ہوگی۔“

غلطی کی طرف۔ نا سمجھی کی طرف۔ لاعلمی  
سے۔

اس کی ماما کی رو بھی بھاگی دوڑی تھی۔ غلطی۔  
غلط۔ گناہ کی طرف۔

”فیروزہ!“ ماں اس کا سر گود میں رکھ کر اسے چوم  
رہی تھی، اسے مار رہی تھی، اس کے کانوں کے پاس  
چلا رہی تھی۔

”فیروزہ!“ ماما جانی جواب الجواب کھڑی دلدل ہوتی

رات کی رم زہ (وحشت ناک) جھولی میں  
دیو قامت مجسمہ نفس کو دھاند کر فلک پاش قہقہے لگا رہا  
تھا۔

رم زہ شب فلک تا خاک نام نہاد انسانوں کے چار  
اطراف رقصاں تھی۔

اتر کر گھوم رہی تھی۔  
گھوم کر لیٹ رہی تھی۔

اور بجھ کر بھل کر بھڑک رہی تھی۔  
کیونکہ اسی رات عاصروں کی چیخ گھر کے کونے کونے

میں پھیل کر کائنات کے ذرے ذرے کو گواہ بنا رہا تھا  
لا رہی تھی۔

کیونکہ یہ عاصروں ہی تھی جو فیروزہ کی اماں تھی۔  
اور یہی عاصروں تھی جو صاحب اولاد نہ ہو سکی تھی۔

کیونکہ وہ شادی شدہ نہ ہو سکی تھی۔  
عافیہ نے اپنی لاڈلی اکلوتی بیٹی کے منہ سے خون کی

ایک پتلی لکیر نکلتے دیکھی تو اس کے اندر ایک دم سے  
وحشت کا ریل کاوند پھاند کر اسے پیچھے بہت پیچھے کی  
طرف دھکیلنے لگا۔

جیسے دلدل کا سوتا پھوٹا ہو۔ جو اتنی آہستگی  
سے اتنے توازن سے گہرے پاتال میں لے جاتی ہے

کہ دھنسنے والے کو خبر ہی نہیں ہوتی کہ وہ اندر ہی اندر  
دھنس رہا ہے یا دلدل کو اپنے ساتھ لیے اوپر اٹھ رہا

ہے۔  
فیروزہ ہوش تھی۔ بے ہوش تھی یا۔

اس یا کے آگے بہت کچھ تھا۔ اس یا کے پیچھے بھی  
بہت کچھ تھا۔



ہو گئی لیکن شادی نہ ہوئی۔ پھر اس سے آٹھ سال چھوٹے "آٹھ جماعتیں پاس گاؤں کے رہائشی کار شہر آتا تو شہر کی نوکری یافتہ لڑکی کو اس کی ماں نے گاؤں کے رہائشی سے بیاہ دیا۔ فرقان دراز قد اور خوب صورت تھا، بس وہ پینڈو تھا۔ سیدھا سادہ تھا اور سیدھی سادی ہی اس کی چھوٹی بہن تھی۔ "عاصرو"

ان کی ماں عاصرو کی پیدائش سے فوت ہوئی تھیں اور باپ جب عاصرو دس سال کی ہوئی تو فرقان کو ایک گھر سنبھالنے والی چاہیے تھی بس۔ اسے عافیہ کے گھرے سانولے رنگ سے مطلب تھا نہ اس کی عمر سے۔ گاؤں کا گھر بکوا کر عافیہ انہیں شہر لے آئی۔ دونوں کچھ ایسے تھے کہ جو ریڈیو پر سن لیا وہی سچ۔ جو اخبار میں پڑھ لیا وہی سچ۔ یہ سچ اور سچ ان کے لیے عافیہ بن گئی۔ شہر والی تھی۔ بہت پڑھی لکھی تھی اور عقل مند تو بہت ہی زیادہ تھی۔

فرقان پشوریل پپ پر نوکری کرنے لگا اور عافیہ پھر سے آفس جانے لگی۔ گاؤں میں عاصرو باقاعدگی سے اسکول جاتی تھی۔ گاؤں چھوڑا تو اسکول بھی چھوڑا۔ عافیہ نے کہا کہ وہ اگلے سال اس کا اسکول میں داخلہ کروادے گی، لیکن اگلے سال کیا کسی بھی سال اس کا داخلہ نہ ہو سکا کیونکہ اس کی بھابھی سچ اور سچ تھی اور وہ بے چاری سی عاصرو اگر وہ اسکول جاتی تو گھر کے کام کون کرتا۔ عاصرو ہی صبح ان دونوں کو ناشتا بنا کر دیتی تھی۔ برتن، صفائی، دوپہر کا کھانا وہ سب بڑی پھرتی سے کرتی۔ بن ماں کے پلی تھی۔ چودہ سال کی عمر سے ہی اسے سب کرنا آتا تھا۔

عافیہ آفس سے تھکی آتی تو آکر سو جاتی۔ شام میں عاصرو سبزی بنا دیتی، دل چاہتا تو عافیہ سالن بنا لیتی ورنہ سالن "آٹا روٹی عاصرو سب خاموشی سے کئے جاتی۔ اس "سب کرنے میں" اسے اسکول بھیجنے کی غلطی کون کرتا؟

"بھابھی سال گزر گیا؟" وہ آئے دن بڑی آس سے سوال کرتی۔ "نہیں۔" وہ جھٹ کہتی۔

دونوں گاؤں کے رہائشی سیدھے سادے نہ انہیں ایڈمیشن منتھ کا پتا تھا نہ شہری اسکولوں کے قواعد و ضوابط کا۔

"اسے اسکول داخل کروادو عافیہ!" ایک دن فرقان نے کہا جب بار بار کہنے لگا تو ناچار عافیہ اسے اسکول لے گئی، پر نپل نے عاصرو کے سامنے کہا۔

"ایڈمیشن تو نہیں ہو سکتا۔" عاصرو کو کیا بات سمجھ میں آئی عافیہ نے ہی سمجھائی کہ پر نپل صاحبہ کہہ رہی ہیں کہ تم گاؤں کے اسکول سے پڑھ کر آئی ہونا تو گاؤں کی پڑھائی یہاں نہیں چلتی۔ انہیں تمہارا ٹیسٹ لینا ہو گا اور وہ ٹیسٹ سال بعد نہیں پورے دو سال بعد ہو گا۔

"دو سال بعد بھابھی۔ دو سال مطلب؟" "اگلے سے اگلے سال ہو گا ٹیسٹ۔" "میری تو تین جماعتیں رہ جائیں گی بھابھی۔" "میں کیا کر سکتی ہوں۔ بس اب یہی ہوتا ہے یہاں۔"

عاصرو پھر سے دو سال کے لیے انتظار میں جا پڑی۔ فرقان سے کہہ دیا پر نپل نے انگلش میں کچھ سوال جواب کیے تھے عاصرو نے ان کے جواب نہ دیے۔ انہوں نے کہا "فی الحال گھر میں پڑھاؤ اور عاصرو سے کچھ نہ پوچھنا۔ اس کا دل چھوٹا ہو گا۔"

فرقان کتابیں لایا کہ عاصرو گھر میں رہ کر پڑھو۔ چند دنوں بعد عافیہ نے کتابیں اٹھا کر رکھ دیں کہ "چھوٹا جاذب پھاڑوے گا جب اسکول جاو گی تو نکال لینا۔" عافیہ آفس جاتی رہی۔ وہ جاذب کو سنبھالتی۔ اس کا فیڈر بنائی اسے کھلاتی، بسلاتی اور تھک کر اس کے ساتھ ہی سو جاتی۔

اگلے سال حماد آگیا۔ عاصرو کے پاس اب دو بچے ہو گئے۔ عافیہ اپنے میکے والوں کے سامنے فخر سے کہتی۔

"میرے بچے میرے پاس نہیں آتے اور عاصرو کے پاس سے نہیں جاتے خیر سے بہت پیار کرتی ہے ان کی پھوپھو جانی ان سے۔ ہے کوئی عاصرو جیسی پھوپھی

کسی اور کے پاس۔"

عاصرو اپنی تعریف سن کر پھولے نہ ساتی۔ خاص کر شہری کھانے کھانے والوں اور ٹانگ پر ٹانگ، جما کر بڑے بڑے صوفوں پر بیٹھنے والوں کے سامنے تو اسے لگتا کہ اس کی زندگی کا حاصل وصول ہو گیا۔ وہ اور بھاگ بھاگ کر جاذب اور حماد کے کام کرتی۔ ماسی آتی، گھر کی صفائی کر جاتی اور وہ دونوں بچوں کو دیکھتی۔

دو سال گزرے۔ تین بھی گزر گئے۔ درمیان میں جب جب وہ اسکول کا سوال کرتی بھابھی کچھ یوں جواب دیتی اسے۔

"عاصرو! یہ سرکاری اسکولوں کے استاد بہت مارتے ہیں۔ میری اماں کے اوپر ساتھ والی خالہ کی نواسی کے بازو کی بڑی توڑ دی۔ یہ شہر سے ناپسند یہ سب ہوتا ہے۔ کوئی کسی کو کچھ کہہ نہیں سکتا۔"

"یہ جو اسکول ہوتے ہیں نا گندی سندھی زمینوں پر بناتے ہیں۔ خاص کر قبرستانوں کی زمین پر۔ اور یہاں جنوں، چڑیلوں کے سائے ہوتے ہیں۔ ابھی پچھلے ہفتے اخبار میں خبر آئی کہ ایک بچی کی لاش ملی اسکول کے ہاتھ روم سے۔ ایک بچی چھت سے گر کر اپنی دونوں ٹانگیں بڑوا بیٹھی۔ ایک کا اندھیرے میں کسی بلانے گلا دیا۔ تڑپ تڑپ کر بچی مر گئی۔ اگلے دن لاش اسکول کے بند گٹر سے ملی۔ میرا تو دل کانپ جاتا ہے یہ سوچ کر کہ تو بھی اسکول جائے گی۔ میرے بس میں ہو تو کبھی اپنی پیاری عاصرو کو اسکول نہ جانے دوں۔ یہ شہروں کے اسکول مان سے تو موت اچھی ہے۔"

بے چاری عاصرو سسم سسم جاتی۔ فرقان کو یاد آتا تو کہتا۔

"عاصی! تو کیوں نہیں جاتی اسکول۔ کتنی بار کہہ چکا ہوں اپنی بھابھی کے ساتھ جا اور داخلہ لے لے۔"

وہ صاف کہنے لگی۔ "مجھے نہیں جانا بھائی جان! اسکول۔ نہیں پڑھنا

مجھے۔"

نہ وہ گئی نہ وہ پڑھی۔ وہ بڑی ہوتی گئی۔ گھر اور بچے سنبھالتی رہی۔ تین بھتیجیوں کی پھوپھو جانی بن گئی۔ چوبیس سال کی ہو گئی۔ فرقان قطر چلا گیا۔ عافیہ نے ہی بھیبھا۔ اسے بڑا گھر چاہیے تھا۔ گاڑی لینی تھی اسے۔

\*\*\*

نفس کی کلائی تھامے کاش کبھی تو انسان ذرا کی ذرا رک کر دیکھے کہ وہ نفس کے ساتھ کس راستے پر بھاگتا چلا جا رہا ہے۔

کبھی ایک لحظے کے لیے وہ سر جھکا کر اپنے پیروں کے نشانات پر تو غور کرے کہ وہ کس پاتل کی طرف جا رہے ہیں۔

کبھی تو وہ سر اٹھا کر آسمان والے کو دیکھے اور اس کی

مانے۔ "پر انسان گھٹائے کا سودا ہی کرنے والوں میں سے ہے۔"

اس کا سودا۔ "عاصرو" بستر پر آکر لگا کر رہی ہے۔ اس کا گھانا "فیروزہ بستر پر بے حس ہوتا جا رہا ہے۔ اور کبھی تو انسان اپنے "سودے" اور اپنے "گھٹائے" کے بارے میں سوچے۔ کبھی تو۔

وہ آفس جاتی۔ ورنہ سیر پائے کرتی رہتی۔ یہاں جاؤں جا۔ گھر کی طرف سے مکمل بے فکری۔ اس کی زندگی اب ہی تو سہل ہوئی تھی، زندگی سے اب ہی تو اس نے لطف لینا شروع کیا تھا۔ پہلے ذمہ داریاں تھیں اور شادی نہ ہو سکنے کا خوف۔ اب جو ذمہ داریاں تھیں، وہ عاصرو کی تھیں۔ اس کے پاس میسے تھے، اچھے ملبوسات تھے، وہ زیورات پہن کر تختوں باتیں کرتی رہتی کافی کامگاہ تھیں لے کر، اسے پروا تک نہ ہوتی کہ اس کے بچے سوئے ہیں یا نہیں انہوں نے کھانا کھایا ہے ٹھیک سے کہ نہیں۔

فرقان کے فون پر فون آتے۔

"کوئی رشتہ نہ کھائے کوئی رشتہ آیا؟"

فرقان کے فون پر فون آتے۔

"کوئی رشتہ نہ کھائے کوئی رشتہ آیا؟"



”دیکھا تھا۔ عافیہ کو پسند بھی کر گئے۔ لڑکا چری لکھا۔“

”لڑکے کی دکان ہے اپنی الیکٹرونکس کی۔ لڑکا شراب پیتا ہے۔ کردار بھی بہت خراب ہے۔“

”اچھے رشتے کہاں ملتے ہیں اتنی جلدی۔ دیکھ تو رہی ہوں۔ ہزار لوگوں کو کہہ رکھا ہے اور کیا کروں۔“

سال بعد فرقان آیا۔ رشتے والی کو بلایا۔ عافیہ نے اسی رشتے والی کو الگ سے بلایا۔ ”کہنا لڑکی بی اے پاس ہے۔“

”لیکن لڑکی کا بھائی تو کہہ رہا ہے کہ یہ چھ سات پاس ہے۔“

”جو کہا ہے وہ کرو آپا! بس یہی کہہ کر رشتہ دیکھا۔“

آپا بی اے پاس کا کہہ کر بڑھے لکھے خاندان کو لے آئی۔ لڑکی انہیں پسند آگئی۔ بات پکی ہو گئی۔

بعد ازاں انہیں کہیں سے پتا چلا کہ لڑکی پانچ پاس بھی نہیں۔ متنگنی ٹوٹ گئی۔ جب متنگنی ہوئی تو فرقان واپس چلا گیا کہ واپسی پر شادی ہوگی۔ وہ وہاں اچھے خاندان کو دینے کے لیے جیہز اکٹھا کرتا رہا۔ یہاں رشتے آتے رہے۔ بنتے گئے۔ ٹوٹے گئے۔ کبھی لڑکا جواری نکل آتا۔ کبھی شرابی کوئی شادی شدہ ہوتا۔

کسی کے چار چھ بچے ہوتے۔

گاہے بگا ہے۔ بھابھی عافیہ مند عاصرو کو پاس بٹھائے سچ گپ کرتی رہتی۔

”میرے بس میں ہوتا تو کبھی شادی نہ کرتی۔ ابھی بھی کہاں کر رہی تھی میری اماں نے زبردستی کر دی۔“

”کیوں بھابھی؟“

”ذالالت ہے عاصی۔ نری ذالالت۔ بددعا ہے عورت کو شادی۔ بچہ ہے جس میں دم گھٹتا ہے نہ عورت مرتی ہے نہ جیتی ہے لعنت کا طوق ہے یہ۔“

”ہائے بھابھی! کیوں؟“

”جوئی کی نوک پر رکھتا ہے شوہر۔“

”فرقان بھائی جان تو بہت اچھے ہیں بھابھی!“

”مجھ سے پوچھ، کتنے اچھے ہیں۔ گھونگھٹ

اٹھاتے ہی تیرے بھائی نے میرے منہ پر تھوک دیا تھا۔ کتنا دوزخی، لعنتی مچھل۔ اور کیا بتاؤں۔ کیا نہیں کہا مجھے۔ ہزار بار دھتکارا ہے مجھے۔ کہتا ہے میں ہوں ہی اسی لائق۔ میرا رنگ۔ میری شکل سب خدا نے ہی بنائی ہے ناعاصی۔ پر ان مردوں کو کون سمجھائے۔ انہیں تو حوریں چاہئیں۔ اسی لیے تو ہر دوسری عورت کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ مجھے تو تیرے لیے ڈر لگتا ہے عاصی! تیری تو آنکھ پر سورج گرہن بھی ہے۔ یہ اتنا بڑا سیاہ دھبہ۔ تیرا شوہر نجانے کیسے کیسے تھو کے گا تجھ پر۔“

عاصی سیاہ دھبے جیسی سیاہ ہو جاتی۔

”فرقان بھائی جان۔ وہ تو ایسے نہیں تھے بھابھی!“

”وہ بھائی ایسا نہیں۔ باپ ایسا نہیں، پر شوہر ایسا ہی ہے عاصی۔! سارے شوہر ایسے ہی ہوتے ہیں؟“

”سارے بھابھی؟“

”ہاں ساری۔ میری چھوٹی بہن جس کی شادی میں تم بھی گئی تھیں۔ شادی کے پہلے ہی دن شوہر نے چٹیا پکڑ کر سردیوار سے دے مارا۔ کئی دن ہوش میں نہیں آئی تھی۔ اماں تو بات ہی چھپاتی رہیں۔“

”بھابھی۔ رخشندہ آپا تو اتنی اچھی ہیں۔ اتنی خوب صورت۔“

”یہ مرد ذات ایسی ہی ہوتی ہے۔ اس کے شوہر نے کہا۔ میرے جوتے صاف کر دو۔ اس نے صرف اتنا کہا۔ ابھی تھوڑی دیر میں کر دیتی ہوں۔ کہتا فوراً“

کیوں نہ کیسے۔ اتنا مارا اتنا مارا۔ کہ کیا بتاؤں۔ اور کیا کیا بتاؤں تجھے۔ مجھے تو وحشت ہوتی ہے۔“

وحشت عاصرو کو بھی ہونے لگتی۔ اس کا دم سا گھٹنے لگتا۔ سالوں سے بھائی کے گھر کی چار دیواری میں ہی رہتی رہی تھی۔ نہ دنیا دیکھی تھی نہ دنیا داری۔ اس کی چت بھی بھابھی تھی پٹ بھی۔ وہ کیسے راز (پہلی کہنے والی) بھابھی کی رمز جان جاتی۔

سم سم جاتی۔ دہلی دہلی رہتی۔

گاہے بگا ہے بھابھی تیرے چھوڑتی رہتی۔

”میری کولیگ کی بہن کی شادی ہوئی تھی پچھلے

مہینے۔ خداد شمن کو ایسے دن نہ دکھائے جو اس کی بہن نے دیکھے۔ ہفتے کے اندر اندر طلاق دے دی۔

طلاق سے پہلے کمرہ بند کر کے چڑے کی پیلٹ سے مارا۔ کہتا تھا بد کردار ہے۔

”کسی لڑکے کے ساتھ چکر تھالڑکی کا؟“

”چکر کر کچھ نہیں تھا۔ پانچ وقت کی نمازی تھی تمہاری طرح۔ دنیا کا پاک باز سے پاک باز مرد بھی شک سے پاک نہیں ہو ناعاصی۔ اپنے بھائی کو ہی دیکھ لو۔ جب فون کرتا ہے، ہزار ہزار سوال پوچھتا ہے۔

کیا میں نہیں جانتی۔ شک کرتا ہے مجھ پر۔ کہاں گئی تھیں۔ کس کے ساتھ تھیں۔ اور اپنے بھائی سے ذکر نہ کرنا۔ مجھے بہت گندی گندی گالیاں دیتا ہے۔ بہت دل دکھتا ہے میرا۔ کاش میں نے شادی نہ کی ہوتی۔ اندر سے نو مرچکی ہوں میں۔“

عاصرو فون پر بھی اپنے بھائی سے بات کرنے سے کترانے لگی۔

”بھائی کا فون آیا ہے۔ تجھے بلا رہا ہے بات کر لے۔“ سنتے ہی اس کا رنگ سیاہ ہو جاتا۔ فرقان اتنی باتیں کرتا رہتا اور وہ ہوں ہاں کر کے بھاگنے کی کرتی۔ رہ رہ کر یہی خیال ستا کہ اس کا بھائی ایسا گندا ہے کہ عافیہ جیسی نمازی بیوی کو گالیاں دیتا ہے۔

نمازی بھابھی نت نئے قصے، کہانیاں اسے سناتی رہتی۔ وہ رات رات بھر نہ سو سکتی۔

”میری دور کی ایک خالہ ہیں۔ ان کی بیٹی کو اس کے شوہر نے جلا ڈالا تو بے! بڑا کھرا مچا تھا عاصی۔ کسی چھوٹی سی بات پر میاں بیوی میں جھگڑا ہو گیا۔ اور اس نے دوپٹے کے بل دے کر پہلے اس کا گلہ دیا، جب مر گئی تو تیل چھڑک کر آگ لگا دی۔ بس کچھ نہ پوچھو۔ عاصی! میں تو دہل گئی۔ بس دعا کرتی ہوں تیری کبھی شادی نہ ہو، اگر میری کوئی بیٹی ہوتی تو قسم سے کبھی اس کی شادی نہ کرتی، مرجاتی اسے اس عذاب میں نہ ڈالتی۔“

اس عذاب میں پھر عاصرو بھی کیوں جاتی۔

فرقان آیا، پھر سے عاصرو کے رشتے کے لیے دوڑ

دھوپ کرنے لگا۔

”یہ دیکھ سیرے بھائی نے رات مجھے مارا ہے۔“

”کیوں مارا بھائی نے؟“ وہ نئے سرے سے سم گئی۔

”وہی شک۔ رات کو اپنے بھائی سے فون پر بات کر رہی تھی۔ کہتا ہے کہ کوئی اور تھا۔ میرا سردیوار پر دے مارا۔“

”مجھ پر بھی کرتے ہیں شک؟“

”تو تو بہن ہے۔ تیرا شوہر کرے گا تجھ پر۔ لکھ لکھ لکھ۔ ہائے میرا تو جوڑو جوڑو دکھ رہا ہے۔“

”میں شادی ہی نہیں کروں گی بھابھی۔“ پہلی بار اس نے اعلان کیا۔

”تیرے بھائی کو کون سمجھائے۔“

فرقان نے ایک رشتہ ڈھونڈ نکالا۔ عاصی کی عمر زیادہ ہوتی جا رہی تھی۔ اب رشتے ملنے میں بہت مشکل ہوتی تھی۔

عاصی کو، سسٹریائی دورے پڑنے لگے، کہتی جاتی۔

”مجھے شادی نہیں کرنی۔ مجھے بچالو۔ مجھے بچالو۔“

بچا نا کون۔ جسے بچانا تھا، وہ تو ڈوب رہا تھا۔

فرقان بہت پریشان رہنے لگا۔

”کیا ہوا ہے عاصی کو۔ یہ کیوں کرتی ہے ایسے؟“

”پتا نہیں کیا، الٹا سیدھا سوچتی رہتی ہے۔ کوئی آپ کا چچا کا بیٹا تھا۔ اس کی شادی ہو گئی تو کہتی ہے اسے پسند کرتی تھی۔“

”وہ تو چھوٹا تھا عاصی سے۔ لیکن اگر تمہیں بتا دیتی تو میں چچا سے بات کر لیتا۔ اب تو اس کی شادی ہو گئی ہے۔“

”شاید اسی کا روگ پال لیا ہے عاصی نے۔“

”پر شادی تو کرنی ہے ناعاصی کی۔ ویسے ہی اتنی عمر ہو گئی۔“

جب جب کوئی رشتہ آتا، عاصرو کو دورے پڑنے لگتے۔ اس کی حالت اور سے اور بگڑنے لگی۔ عافیہ



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ تمامہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ پیریم کوالٹی، ہائر کوالٹی، کپریٹڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل رینج
- ☆ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا
- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریزیوم ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر ویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↩ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↩ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

”تم خود کہہ دو اپنے بھائی سے۔“  
”مجھے بھائی سے ڈر لگتا ہے بھابھی۔“  
”ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ شادی ہو گئی تو روز ڈرو گی۔ ہمت کرو۔ پھر نہ کہنا مجھے۔ سمجھا رہی ہوں اب۔“

جب کبھی کوئی ملنے جلنے والا اس کی شادی کی بات کرتا اس کا سارا خون جیسے نچر سا جاتا۔ سر چکرانے لگتا۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ بار بار کر رونے کو چاہتا۔ سوچ سوچ کر وہ ڈھانچہ بننے لگی۔ باہر بیٹھا فرقان الگ پریشان تھا جو چھ مہینے بعد آتا تھا وہ پہلے ہی آگیا۔ بالا ہی بالاسب تیار ہوا کرتے لگا۔ شادی کی تاریخ رکھ دی اور نکاح سے ٹھیک ایک ہفتہ پہلے اس نے چوہے مار گولیاں کھالیں۔ فرقان دم بخود رہ گیا۔ یہ کیا ہو گیا۔ اسپتال میں پاگلوں کی طرح ادھر ادھر بھاگتا رہا۔

اس کی جان بچ گئی۔  
اس کی شادی ٹوٹ گئی۔  
اس کی عمر بڑھتی گئی۔ وہ فیروزہ کی اماں جانی بن گئی۔  
اگر تخلیق سے عورت کی تکمیل ہوتی ہے تو اس نے اپنی تکمیل فیروزہ سے کر لی۔  
عاصرو فرقان کی اکلوتی بہن ایک اکلوتی ہی رہ گئی۔

\*\*\*

عافیہ غیورہ کی اکلوتی ماما عیش پسندی میں گھر گئی۔  
عاصرو کی مامی آوازیں کائنات سے گواہوں کے گواہ اٹھا کر لارہی ہیں۔

”یہ کیا ہو گیا؟“ وہ پوچھ رہی ہیں۔  
”یہ جواب ہے۔“ وہ بتا رہی ہیں۔  
”یہ کیسا عذاب ہے؟“ وہ دیل مانگ رہی ہیں۔  
”کس نے کہا یہ عذاب ہے۔ یہ تو بھگتان ہے۔“  
فیروزہ نے ایک بھی آواز کا جواب نہیں دیا۔ اس نے ایک بار بھی آنکھیں کھول کر دنیا کی رنجینی کو نہیں دیکھا۔ فی الحال وہ آنکھیں موندے پڑی ہے۔  
فرقان نے باہر بہت کھلیا۔ عافیہ نے نیا بنگلہ لے

کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس بھی بھیجا۔ عافیہ ڈاکٹر کو اپنی من پسند کمائیاں سنا کر دوالے آئی۔ عاصرو وہ دوا کھاتی رہی۔

ساتھ ساتھ چھوٹے موٹے قصے کمائیاں عافیہ اس کے گوش گزار کرتی رہی، کچھ اس لیے بھی زیادہ کہ وہ تیسرے بیٹے کے۔ سات سال بعد پھر سے ماں بنی تھی۔ فیروزہ کی ماں۔

عافیہ نے فیروزہ کو عاصرو کی گود میں دیا۔ ”آج سے یہ تمہاری ہے۔“

عاصرو نے آج تک لڑکے ہی پالے تھے اور وقت گزرنے کے ساتھ مردوں سے اس کا دل پراہونے لگا تو وہ جازب، حماد، احمد سے بھی دور ہونے لگی۔ اس کے ذہن میں یہی خیال آتا کہ ہیں تو یہ بھی مستقبل کے شوہر ہی ناں۔ عورت کو جوئی کی نوک پر رکھنے والے پہلی بار لڑکی ملی تو وہ جیسے مکمل سی ہو گئی۔ اسے اپنی ہم جنسوں سے ہی محبت تھی۔ فیروزہ کے لیے اس کی محبت جنون کی حد تک بڑھنے لگی۔

فرقان قطر میں کسی کو دیکھ کر پسند کر چکا تھا۔ رشتہ بھی پکا کر چکا تھا۔

”فرقان نے پھر سے اپنے جیسے کسی شکی کو تمہارے لیے پسند کر لیا ہے۔“

”آپ ان سے کہتیں کیوں نہیں کہ مجھے شادی نہیں کرنی۔“

”میں تو یہی چاہتی ہوں۔ یہ گھر ہے۔ کتنا سکون ہے یہاں۔ نہ کوئی مارنے والا، نہ گالیاں دینے والا، نہ کوئی ذلیل کرنے والا۔ فیروزہ تمہارے پاس ہے۔ اچھا کھاتی ہو، پھنسی ہو۔ شوہر کی مار تو نہیں کھانی پڑتی نا۔ لیکن تمہارے بھائی کو تمہارا سکون پیارا نہیں ہے۔“

”بس بھائی سے کہہ دیں بھابھی مجھے شادی نہیں کرنی۔“ وہ اس نو مولود بچے کی نظر آنے لگتی جو آسمان پر بجلی کی چمک دیکھ کر سسم گرنے لگی تھی۔ روتا رہتا ہے۔ چچی پھر چمکتی ہے، وہ پھر سے روتا ہے، کوئی اختیار ہی نہیں۔



لیا۔ چوکیدار اور ڈرائیور بھی آگئے۔ دو کام والیاں بھی۔ لیکن فیروزہ کی دیکھ بھال عاصرو نے ہی کی۔

عافیہ کے پرس میں پیسوں کی جگہ کریڈٹ کارڈ نے لے لی۔

فیروزہ اسکول آتی جاتی، سوتی جاتی، کھاتی، کھیلتی، صرف اپنی اماں جانی کے ساتھ۔ اماں جانی اس کے منہ میں نوالے بنا بنا کر رکھتی۔ ایک اسے کھلاتی، ایک خود کھاتی۔

دونوں ایک دوسرے کا دم چھلا بن گئیں۔

عاصرو کہتی ”سو جاؤ فیروزہ!“ فیروزہ اگلا سوال نہ کرتی اور جھٹ آنکھیں بند کر لیتی۔ اب قیامت آئے یا طوفان۔ یہ آنکھیں اماں جانی کے کہنے پر ہی کھلیں گی۔

عاصرو کہتی ”فیروزہ! تمہیں کلاس میں فرسٹ آنا ہے۔“ فیروزہ اس وقت تک اپنے بیوٹر کی جان نہ چھوڑتی جب تک فرسٹ آنے جتنا بڑھ نہ لیتی۔

عاصرو اسے اسکول چھوڑنے جاتی اسکول سے لے کر آتی اور رات کو نہ جانے کون کون سی کہانیاں سنا کر سلا دیتی۔

لوگ کہتے ”فیروزہ تو عاصرو کی بیٹی ہے“ خود فیروزہ یہی کہتی۔ عافیہ کو اس سے فرق نہیں پڑتا کہ لوگ کیا کہتے ہیں۔ اس نے ایک آرام دہ سہل۔ اپنی مرضی کی زندگی گزار رہی تھی۔ اسے کوئی ذمہ داری اٹھانی نہیں پڑی تھی کبھی۔ وہ خود کو خوش قسمت سمجھتی تھی۔ اس نے اپنی بہنوں اور دوستوں کو بھی یہی مشورے دیے تھے کہ اپنی زندگیوں کو اپنی مرضی میں کرو اور گھرانے کے سپرد نہ کرو۔ لیکن وہ اس کی طرح اتنی کامیاب نہیں ہو سکی تھیں، ایک تو ان زندگیوں کی مائیں حیات تھیں، دوسرا وہ عاصرو جیسی نہیں تھیں جس کے لیے ایک بھابھی ہی ”بچ بچ“ تھی بس۔

تو چاروں بچے عافیہ کے ہی تھے۔ لیکن انہیں پال عاصرو نے دیا تھا۔ بیٹے اسے پھوپھو جانی کہتے۔ بیٹی اماں جانی۔ کیا فرق پڑتا تھا۔ بڑا بھی تو وہ صرف، فرق نہ رہا۔ کبھی کبھی عافیہ تھوڑا سا چڑ جاتی، جب فیروزہ ہر وقت

عاصرو کے ساتھ ہی چپکی رہتی۔ خاندان کی کسی تقریب، شادی بیاہ میں پیٹے تو وہ جاتی ہی نہ، لیکن اگر عافیہ سختی کرتی تو وہ چلی جاتی، لیکن عاصرو کے ساتھ ہی چپکی رہتی۔

عاصرو دلہن کے پاس جائے گی تو ہی فیروزہ جائے گی۔

عاصرو پھولوں کی پلیٹ لے کر استقبال کے لیے کھڑی ہوگی تو ہی وہ کھڑی ہوگی۔

اور تو اور عاصرو لب اسٹک لگائے گی۔ بال کھولے گی تو ہی وہ لب اسٹک لگائے گی بال کھولے گی۔

اگر وہ عاصرو کی ساری باتیں مانتی تھی تو عاصرو بھی اس کی مانتی تھی۔ دونوں سوال اندر جواب تھیں ایک دوسرے کے لیے۔ فیروزہ اپنی ہم عمر لڑکیوں کے ساتھ تو تھوڑا بہت گھل مل جاتی، لیکن ہم عمر لڑکیوں سے بالکل نہیں۔

عافیہ اسے اچھے کالج میں داخل کروانا چاہتی تھی۔ لیکن فیروزہ نے داخلہ نہ لیا۔ کالج کو انجکشن تھا۔ وہ اپنے بھائیوں سے بھی دور بھاگتی، ہر وقت ان سے چڑی رہتی۔

”تم ہو ہی ایسے۔“ اکثر وہ ان پر طنز کرتی۔ جاذب پڑھنے کے لیے باہر چلا گیا۔ حماد بھی پیچھے ہی چلا گیا۔ احمد سے بات کرنا فیروزہ پسند نہ کرتی نہ اسے یہ پروا ہوتی کہ جاذب اور حماد اسے فون کیوں نہیں کرتے۔ یا وہ اتنے سالوں سے گھر کیوں نہیں آئے۔ یہ سب باتیں عافیہ نے بہت دیر میں محسوس کیں۔

جب۔ جب۔ جب۔ اس کی بہن نے اپنے بیٹے کے لیے فیروزہ کا ہاتھ مانگا۔ وہ گھر آئی۔ مٹھائی لائی اور باقاعدہ رشتہ مانگ گئی۔ سالوں سے دونوں بہنوں نے یہی طے کر رکھا تھا۔

سالوں پہلے جو طے کیا تھا۔ سالوں بعد وہ ہونہ سکا۔ مٹھائی کے ٹوکے اٹھا کر فیروزہ نے باہر پھینک دیے۔ ایک دھماکا ہوا۔ ایک دور لوٹ کر واپس آیا۔ اختتامیہ ڈرامے کے پردے اٹھائے گئے۔

ابھی شادی تھی۔ فرقان کو بھی سو جھوٹ بچ کہہ کر خاموش رہنے کے لیے کہا تھا اور نکاح سے دو دن پہلے رات کو فیروزہ نے احمد اور عافیہ کی باتیں سن لیں۔ جو وہ نکاح کی تیاری کے سلسلے میں کر رہے تھے۔

اسے یہ سب بھی بعد میں پتا چلا۔ نکاح والے دن صبح سویرے جب وہ اٹھی ملازم نے کہا۔

”کچن میں تو نہیں چوہے نہیں ہیں، بانی گھر میں بھی کہیں نہیں دیکھے۔ آپ نے دوائی کیوں منگوائی۔“

چوکیدار کہہ رہا تھا کہ وہ بتانا بھول گیا کہ اسٹور والے نے کہا تھا کہ جہاں دوا رکھو وہاں سے ٹھیک چوبیس گھنٹے بعد اٹھا ضرور پتی ہے۔

رات کے کھانے کے بعد ملازم اس کے پاس آیا۔ ”کون سی دوا؟“ اس نے مصروف انداز میں پوچھا۔ ”چوہے مار دوا۔“ جو آپ نے منگوائی تھی کمروں کے لیے۔

آدھی رات کو اسے یاد آیا کہ چوہے والی دوا، چوکیدار، ملازم یہ سب کیا تھا۔ کیا تھا۔ وہ اپنے کمرے سے عاصرو کے کمرے کی طرف بھاگی۔

”فیروزہ کہاں ہے؟“ آج کل فیروزہ اسی کے ساتھ سو رہی تھی۔

”فیروزہ۔ وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ گیارہ بجے تک تو میرے ساتھ ہی سوتی رہی۔ پھر۔“

”فیروزہ!“ عافیہ نے وہیں کھڑے کھڑے چیخ ماری۔ عاصرو نے عافیہ کی شکل دیکھی اور انجانے پن سے ہی سسم کراٹھ کر فیروزہ کے کمرے کی طرف بھاگی۔ عاصرو کی دوڑ عافیہ کی دوڑ سے کہیں زیادہ تھی۔ عاصرو نے فیروزہ کے کمرے کے دروازے کو دھکا دیا۔

ابھی شادی تھی۔ فرقان کو بھی سو جھوٹ بچ کہہ کر خاموش رہنے کے لیے کہا تھا اور نکاح سے دو دن پہلے رات کو فیروزہ نے احمد اور عافیہ کی باتیں سن لیں۔ جو وہ نکاح کی تیاری کے سلسلے میں کر رہے تھے۔

اسے یہ سب بھی بعد میں پتا چلا۔ نکاح والے دن صبح سویرے جب وہ اٹھی ملازم نے کہا۔

”کچن میں تو نہیں چوہے نہیں ہیں، بانی گھر میں بھی کہیں نہیں دیکھے۔ آپ نے دوائی کیوں منگوائی۔“

چوکیدار کہہ رہا تھا کہ وہ بتانا بھول گیا کہ اسٹور والے نے کہا تھا کہ جہاں دوا رکھو وہاں سے ٹھیک چوبیس گھنٹے بعد اٹھا ضرور پتی ہے۔

رات کے کھانے کے بعد ملازم اس کے پاس آیا۔ ”کون سی دوا؟“ اس نے مصروف انداز میں پوچھا۔ ”چوہے مار دوا۔“ جو آپ نے منگوائی تھی کمروں کے لیے۔

آدھی رات کو اسے یاد آیا کہ چوہے والی دوا، چوکیدار، ملازم یہ سب کیا تھا۔ کیا تھا۔ وہ اپنے کمرے سے عاصرو کے کمرے کی طرف بھاگی۔

”فیروزہ کہاں ہے؟“ آج کل فیروزہ اسی کے ساتھ سو رہی تھی۔

”فیروزہ۔ وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ گیارہ بجے تک تو میرے ساتھ ہی سوتی رہی۔ پھر۔“

”فیروزہ!“ عافیہ نے وہیں کھڑے کھڑے چیخ ماری۔ عاصرو نے عافیہ کی شکل دیکھی اور انجانے پن سے ہی سسم کراٹھ کر فیروزہ کے کمرے کی طرف بھاگی۔ عاصرو کی دوڑ عافیہ کی دوڑ سے کہیں زیادہ تھی۔ عاصرو نے فیروزہ کے کمرے کے دروازے کو دھکا دیا۔



تنزیلہ ریاض

عہدِ اُست

نور محمد برطانیہ میں رہائش پذیر ہے اور لوٹن کی جامع مسجد میں موزن ہے۔ پیسے والا اور خوب دل والا ہے۔ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتا ہے۔ جس کا ایک کمرہ ایک عربی طالب علم اپنے دوست کے ساتھ شیئر کرتا ہے جبکہ دوسرے کمرے میں اس کے ساتھ ایرانی زن العابدین رہتا ہے۔ اسے اپنے ایرانی ہونے پر فخر ہے۔ وہ برطانیہ میں اسٹڈی ویزے پر جاب کرتا ہے۔ سخت محنتی ہے مگر پاکستان میں موجود بارہ افراد کے گنے کی کفالت خوش اسلوبی سے نہیں کرپا رہا۔ مسجد میں پاکستان سے آئے کسی مہمان کی آمد کی اطلاع پر نور محمد بہت گھبراتا ہے۔

عمر شہروز کا کزن ہے جو اپنی فیملی کے ساتھ انگلینڈ میں مقیم ہے۔ وہ لوگ تین چار سال میں پاکستان آتے رہتے ہیں۔ عمر اکثر اکیلا بھی پاکستان آجاتا ہے۔ وہ کافی منہ پھٹ ہے۔ اسے شہروز کی دوست امانہ اچھی لگتی ہے۔ شہروز کی کوششوں سے ان دونوں کی منتگنی ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر زارا شہروز کی سادہ مزاج منگیتر ہے۔ ان کی منتگنی بڑوں کے فیصلے کا نتیجہ ہے۔ ان دونوں کے درمیان محبت ہے لیکن شہروز کے کھنڈرے انداز کی بنا پر زارا کو اس کی محبت یقین نہیں ہے۔

اس کے والد نے اسے گھر پر پڑھایا ہے اور اب وہ اسے بڑی کلاس میں داخل کرانا چاہتے ہیں۔ سر شعیب انہیں منع کرتے ہیں کہ ان کا بچہ بہت چھوٹا ہے۔ اسے چھوٹی کلاس میں ہی داخل کروائیں مگر وہ مصر رہتے ہیں کہ انہوں نے اپنے بچے پر بہت محنت کی ہے۔ وہ بڑی کلاس میں داخلے کا مستحق ہے۔ سر شعیب اسے بچہ پر ظلم سمجھتے ہیں مگر اس کے باپ کے اصرار پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ وہ بچہ بڑی کلاس اور بڑے بچوں میں ایڈجسٹ نہیں ہو یا ما۔ اس کا لرشپ حاصل کرنے والے

مُکمل ناول



Saba



اس بچے سے حیرت انگیز طور پر نیچر اور فیلوز میں سے بیشتر واقف ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ اس کے باپ کی طرف سے غیر نصابی سرگرمیوں میں حصہ لینے پر سخت مخالفت ہے۔

وہ خواب میں ڈر جاتا ہے۔  
73ء کا زمانہ تھا اور روپ نگر کا علاقہ۔

میرے شعور کا آغاز بیس سے ہوتا ہے۔ چار او میری دوست مجھ سے نفرت کا اظہار کرتے ہوئے وہ کہتی ہے۔ تم ہاس مجھے کھانے والے ہو۔ میں انڈیا میں اپنے گریڈ پیرنس (دادا اور دادی) کے ساتھ آیا تھا۔ میرے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ ہم برطانیہ کے رہنے والے تھے۔ گریڈ پیرنس کسی پروجیکٹ کے سلسلے میں آئے تھے۔ گریڈ پیرنس نے یہاں کو جنگ سینٹر کھول لیا تھا۔ چار او ہمارے ہاں پڑھنے آتی تھی۔ اس نے کہا تھا۔ ماس مجھے کھانے والے کسی کے دوست نہیں بن سکتے۔ وہ وفادار نہیں ہو سکتے۔ میں نے گریڈ پیرنس کو بتایا تو انہوں نے مجھے سمجھایا 'قدرت نے ہمیں بہت محبت سے تخلیق کیا ہے اور ہماری فطرت میں صرف محبت رکھی ہے۔ انسان کا اپنی ذات سے اخلاص ہی اس کی سب سے بڑی وفاداری ہے۔ عمر کے مٹنے توڑنے پر زار انے شہروز کو فون کر کے بلایا تھا۔ شہروز نے آکر عمر سے بات کی تو دونوں میں جھگڑا ہو گیا۔ اس کی کلاس میں سلیمان حیدر سے دوستی ہو جاتی ہے۔ سلیمان حیدر بہت اچھا اور زندہ دل لڑکا ہے۔ سلیمان کے کہنے پر بڑھائی کے ساتھ ساتھ کھیل میں بھی دلچسپی لینے لگتا۔ وہ اپنے گھر جا کر امی سے بیٹ کی فرمائش کرتا ہے تو اس کے والد یہ سن گیتے ہیں 'وہ اس کی بری طرح پٹائی کر دیتے ہیں۔ ماں بے بسی سے دیکھتی رہ جاتی ہیں۔ پھر اس کے والد اسکول جا کر منع کر دیتے ہیں کہ سلیمان حیدر کے ساتھ نہ بیٹھایا جائے۔ سلیمان حیدر اس سے ناراض ہو جاتا ہے اور اسے ایثار مل کہتا ہے۔ جس سے اس کو بہت دکھ ہوتا ہے۔

امامہ کی والدہ شہروز کو فون کرتی ہیں۔  
کلاس میں سلیمان حیدر پہلی پوزیشن لیتا ہے۔ پانچ نمبروں کے فرق سے اس کی سیکنڈ پوزیشن آتی ہے۔ یہ دیکھ کر اس کے والد غصے سے پاگل ہو جاتے ہیں اور کمرہ بند کر کے اسے بری طرح مارتے ہیں۔ وہ وعدہ کرتا ہے کہ آئندہ رنگوں کو پینٹنگ کو ہاتھ نہیں لگائے گا 'صرف بڑھائی کرے گا۔  
اس کے والد شہر کے سب سے خراب کالج میں اس کا ایڈمیشن کراتے ہیں۔ تاکہ کالج میں اس کی غیر حاضری پر کوئی کچھ نہ کہہ سکے اور اس سے کہتے ہیں کہ وہ گھر بیٹھ کر پڑھائی کرے۔ باہر کی دنیا سے اس کا رابطہ نہ ہو۔ اس کا کوئی دوست نہیں ہے۔

شہروز کے سمجھانے پر عمر کو عقل آ جاتی ہے اور وہ اپنے والد کو فون کرتا ہے۔  
اس شخص کے شدید اصرار پر نور محمد اس سے ملنے پر راضی ہو جاتا ہے۔ وہ اس سے دوستی کی فرمائش کرتا ہے۔ نور محمد انکار کر دیتا ہے 'لیکن وہ نور محمد کا پیچھا نہیں چھوڑتا ہے۔ وہ نور محمد کی قرأت کی تعریف کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس نے نماز پڑھنا نور محمد سے سیکھا ہے۔ پھر وہ بتاتا ہے کہ اسے نور محمد کے پاس کسی نے بھیجا ہے۔ نور محمد کے پوچھنے پر کہتا ہے۔ خضر الہی نے بھیجا ہے۔

روپ نگر سے واپس برطانیہ آنے پر گریڈ پیرنس کا انتقال ہو جاتا ہے اور گریڈ پیرنس میں دلچسپی لینے لگتی ہیں وہ مجھ سے کہتی ہیں کہ میں اپنی امی سے رابطہ کروں۔ وہ مجھے امی کے ساتھ بھجوانا چاہتی ہیں۔ میرے انکار کے باوجود وہ امی کو بلوالیتی ہیں اور مجھے ان کے ساتھ روانہ کر دیتی ہیں۔  
میری کالج میں طلحہ اور راشد سے واقفیت ہو جاتی ہے۔

پوٹھی قسط

"یہ محبت بھی بڑی ہی ذلیل و خوار کر دینے والی ہے۔"

اس لمبی سی سرنگ سے باہر نکلتے ہوئے اس نے آٹا ر سوچا تھا۔ سفر تھا کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ اسے لاہور سے لندن کی ڈائریکٹ فلائٹ نہیں ملی تھی۔ سو سب سے پہلے وہ قطر پہنچی تھی جہاں جہاز کو شلم سیر ہونا تھا 'اس کے بعد قاہرہ جہاں بارہ گھنٹے کا قیام اس کے لیے ایک ڈراؤنے خواب سے کم نہیں تھا اور اب وہ لندن کے ہتھوڑا ایر پورٹ کے چھٹے ٹرمینل پر اتار دی تھی 'اترنا بھی کیا تھا بس جہاز سے باہر آگئی تھی۔

"سنا تھا جہاں میں سیڑھیاں بڑھیاں بھی ہوا کرتی تھیں۔ شاید پچھلے وقتوں کا قصہ ہو گا۔"

وہ جب جہاز میں سوار ہوئی تھی تو سوچا تھا۔ تب ذہن بھی تروتازہ تھا اور وہ خود بھی 'لیکن اب ایک لمبے سفر نے اسے بے حد چڑچڑایا تھا۔ ہتھوڑا ویسا نہیں تھا جیسا دوستوں نے بتایا تھا 'انٹر میٹ پہ دیکھا تھا یا اخباروں میں پڑھ رکھا تھا وہ اس سے کہیں بڑھ کر تھا 'برشکوہ 'بلند وبالا اور کسی قدر ہیبت ناک۔ اسے چکنے فرش پر ہینڈ کیڑی گھسیٹتے ہوئے پہلی بار وطن سے دوری اور تنہائی کا احساس ہوا اور ساتھ ہی عمر احسان پر بے حد غصہ آیا۔ اچھا بھلا وہ اسے خود لینے آئے والا تھا پھر نجانے کیسے اس کی چھٹیاں ایک مسئلہ بن گئیں اور اسے حکم ملا کہ وہ اکیلی رخصت ہو کر سرسرا چلی آئے۔ حالانکہ نکاح کے بعد سے تین سالوں تک وہ عمر کو یہی یاد رکھتی رہی تھی کہ وہ خود اسے لینے پاکستان آئے گا تو وہ آئے گی ورنہ وہیں بیٹھی رہے گی اور عمر کا وعدہ بھی یہی تھا کہ ولینس اکیلی سرسرا آئی اچھی لگتی ہیں بھلا۔ مگر اس مگر کے بعد بظاہر سب ختم ہو جاتا تھا۔

"یار! سمجھنے کی کوشش تو کرو۔ میں نہیں آسکتا۔"

اس مگر کے بعد وہ گہری سانس بھرتا تھا۔ ایسی گہری سانس کہ امامہ چاروں شانے چت ہو جاتی تھی۔ اس

کی خاموشی کا لامعہ اٹھا کر عمر کا اصرار بڑھنے لگا۔  
"میں نے تین سال سے تمہیں نہیں دیکھا۔ میں تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں نہیں آسکتا تمہیں لینے اس سال۔" مگر ڈیڈی بھی یہی پلان کر رہے ہیں کہ فیکسٹ ایئر چلیں گے۔ وہ اس سال حج کے لیے سعودیہ جانا چاہتے ہیں اور وہاں سے پاکستان وزٹ کریں گے۔ میں اور انتظار نہیں کر سکتا یا۔ میں تھک گیا ہوں۔ پلیز تم آ جاؤ۔"

یہ عمر کے الفاظ نہیں ہوتے تھے بلکہ کوئی جنت منتر ہوتا تھا جو اچھی بھلی امامہ اتفاق علی کو چڑیا بلبل کو کل ٹائپ کوئی برنہ بنا دیتے اور اس کا دل چاہتا کہ وہ اڑ کر عمر کے پاس چلی جائے۔ گزشتہ تین سالوں میں عمر احسان نے اس کو اتنا چاہا تھا 'اتنی محبت دی تھی کہ وہ نہیں رہی تھی کچھ اور بن گئی تھی۔ وہ جو دوستوں پہ ہنسا کرتی تھی کہ محبت بھی بھلا کوئی کرنے والا کام ہے اور وہ جو برلا کہا کرتی تھی کہ عورت چاہنے نہیں چاہے جانے کے لیے سید اکی گئی ہے اس کا کہنا تھا کہ جیسے کشتی دریا پر راج کرتی ہے تو قائم رہتی ہے۔ اگر دریا کشتی پر راج کرنے لگے تو کشتی کا کچھ نہیں بچتا وہ ڈوب جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح جب عورت مرد سے محبت کرتی ہے تو وہ ختم ہو جاتی ہے فنا ہو جاتی ہے۔

عمر احسان کے ساتھ نکاح کے چند بولوں نے اسے واقعی فنا کر دیا تھا۔ ابتدا میں اس نے بھی ڈوبتی کشتی کی طرح بچاؤ کی کوششیں کی تھیں 'پھر جب بس نہیں چلا تو وہ عمر کی محبت میں پور پور ڈوب گئی تھی۔

"اللہ کے کاموں میں انسانوں کا کیا دخل۔" وہ فخریہ انداز میں فریڈز کے سامنے اپنی محبت کو تسلیم کر لیتی تھی۔

اس نے اپنی انگلی میں پڑی پلاٹنم کی انگوٹھی کو گزشتہ تین سالوں میں کبھی خود سے علیحدہ نہیں کیا تھا۔ نکاح کے بعد عمر نے یہ انگوٹھی خود اس کی انگلی میں پہنائی تھی۔ حالانکہ تب وہ بہت خفا تھی۔ وہ انگوٹھی پہننا چاہتی تھی نہ نکاح کرنا چاہتی تھی۔ اسے یہ شخص جیون سا بھی کے طور پر پسند ہی نہیں تھا۔ وہ پہلے دن



سے اس سے سخت متنفر تھی اور پھر جب وہ منگنی کے بعد جھگڑا کر کے اس سے انگوٹھی واپس لے گیا تھا اس نے تب ہی امی سے کہہ دیا تھا کہ وہ اس قصے کو بھول جائیں۔ وہ یہ شادی نہیں کرے گی، لیکن اس کے باوجود نجانے امی نے کیا جادو چلایا تھا کہ عمر کے ابو نے اس کے ابو کو فون پر فون کرنا شروع کر دیے تھے۔

”ہم چاہتے ہیں بچوں کا نکاح کر دیا جائے۔ بعد میں پھر زور عمو آسانی سے بن جائیں گے۔“

اس کے ابو تو پہلے ہی ایسے معاملات میں غلبت پسند واقع ہوئے تھے سو فوراً ”یہ مطالبہ مان لیا گیا۔ امائمہ کو بعد میں عمر نے بتایا تھا کہ اس کے ابو نے یہ مطالبہ عمر کی فرمائش پر کیا تھا۔

نکاح کے چند دن بعد عمر لندن چلا گیا تھا۔ جانے سے پہلے وہ ایک بار امائمہ کو ڈنر پر لے گیا تھا۔ اس ڈنر سے واپسی پر بھی امائمہ امی سے سخت خفا ہوئی تھی، وہ پہلے ہی نکاح کے لیے کسی طور پر راضی نہیں تھی۔ وہ امی کے اصرار پر عمر کے ساتھ گئی تھی اور واپس آکر اس نے امی کے سامنے عمر کو ”بونگا“ قرار دیا تھا اور گزشتہ تین سالوں میں اسی بونگے نے نجانے اس پر کیا سحر بھونکا تھا کہ وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئی تھی۔

”یہ محبت بھی بڑی ذلیل و خوار کر دینے والی شے ہے۔“

یہ محبت ہی تو تھی کہ وہ یوں اکیلی اتنی دور سفر کر کے آگئی تھی ورنہ عمر اس کی خاطر ملازمت چھوڑنے کو تیار تھا۔ یہ اس کا تصور ہی تو تھا جس نے اسے اکیلے سفر کر دینے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کے ابو نے کہا بھی تھا کہ وہ اگلے سال اپنے ساس مسر کے ساتھ جائے تو بہتر ہے۔ مگر امی نے کہا تھا کہ بہتر ہے کہ وہ اپنے شوہر کے پاس جائے، کیونکہ وہ خود بھی حج کے لیے جانا چاہتے تھے سو امائمہ کی رخصتی شوہر اور سرالیوں کے بغیر ہو گئی تھی۔ یہ کوئی ایسی انسانی بات بھی نہیں تھی۔ بہت سے بیرون ملک مقیم پاکستانی خاندان ایسے ہی شادی بیاہ رہ جانے کی عادی ہیں سو وہ بھی بہت اعتماد سے تن نہایاں تک آگئی تھی۔

مسلمان وغیرہ سمیٹ کر اور ساری کارروائیوں سے فراغت کے بعد اسے ویننگ لاؤنج میں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا تھا۔

”ویلم ٹومائی ورلڈ۔“ کوئی بہت دھیمی آواز میں گنگنایا تھا۔ وہ فوراً اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ عمر اس کے مقابل آگیا تھا۔ امائمہ نے ایک نظر ہی اس کی جانب دیکھا۔ پھر اس کے چہرے سے اشتیاق و بے چینی کی پھوٹی روشنیوں سے جھجک کر نظریں جھکا لیں محبت کا سنہار رنگ سیاہ آنکھوں پر اتنا حاوی تھا کہ ہر چیز جھلکتی ہوئی محسوس ہونے لگی تھی۔ ایک شخص جسے وہ نہ جانے کون کون سے ناموں سے پکارا کرتی تھی۔ اب ایسے سامنے کھڑا تھا کہ اس سے زیادہ جبرہ شاید کبھی کوئی نظریں نہ آیا ہو۔ وہ کیسا لگ رہا تھا، یہ کوئی امائمہ کے دل سے پوچھتا۔ چہرے پر ہلکی داڑھی جیسے بہت دن سے شیونہ کی ہو ڈارک گرین ہالی نیک جرسی اور بلیو جینز میں وہ امائمہ کو بے حد کھل انسان لگا۔ ایسا انسان جس کی ہر ایسی کسی بھی عورت کے لیے خوش قسمتی کا باعث بن سکتی تھی۔

یہ وہی چہرہ تھا جو چند سال قبل اس کے لیے ڈفر، بونگا اور لٹو تھا اور اب۔ یہ عمر نہیں تھا جو بدل گیا تھا بلکہ یہ امائمہ تھی جس کی کاپی لپٹ گئی تھی۔

”اسلام و علیکم۔“ اس کو بھرپور استحقاق سے دیکھتے ہوئے عمر نے سلام میں پل کی تھی اور اس کی جانب ہاتھ بڑھایا تھا۔ وہ جھجک تو رہی تھی مگر ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے اعتماد سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

”یہ تو کام نہیں چلے گا یا ر!“ اس نے بے شاشت سے مسکراتے ہوئے اس کو اپنے بازوؤں کے حلقے میں لیا تھا۔ وہ ساکت رہ گئی۔ لمحے بھر کا کھیل تھا۔ اب وہ اس کا ہاتھ تھامے اسے می ڈیڈی سے ملوا رہا تھا اور امائمہ خود کہاں تھی۔ یہ بتا نہیں۔ شاید ہوا بن کر آسمانوں میں جھوم رہی تھی۔ خوشبوؤں کے باغوں میں منڈلا رہی تھی یا شاید سانس بن کر کسی کے وجود میں سا گئی تھی۔ محبت مجسم موجود ہوتی تو شاید سرمستی کے

عالم میں رقص کرنے لگتی۔ محبت واقعی فانی عالم ہے۔ کون کہتا ہے محبت کی طبیعت میں بچپنا ہے۔ غلط۔ محبت کی طبیعت میں بڑھاپا ہے، سکھڑاپا ہے، قوت ہے، طاقت ہے، علم ہے، عمل ہے اور سب سے بڑھ کر معجزہ ہے۔ یہ زمین پر بیٹھے آسمان دکھا سکتی ہے، آسمان پر بیٹھ کر زمین دکھا سکتی ہے۔

یہ رب نہیں ہے۔ یہ رب کی عطا ہے، اس کا کرم ہے اس کی جزا ہے۔

ایک ایسی چیز جو من و سلوئی نہیں ہے، مگر روح کی بھوک مٹا دیتی ہے۔

ایک ایسی چیز جو بغیر نہیں ہے، مگر پیغمبروں کی سی کرامات دکھا سکتی ہے۔

ایک ایسی چیز جو ظلم نہیں ہے، مگر پتھر کو ہیرے اور ہیرے کو پتھر میں بدل سکتی ہے۔

ایک ایسی چیز جو قرآن نہیں ہے، مگر دل کے جزدان میں لپیٹ کر رکھتی جاتی ہے۔

”محبت۔“ کن لہ کون۔ کی عملی تفسیر۔ اللہ کی دنیا والوں کے لیے ایک باصلاحیت نعمت۔

محبت۔ فقط۔ محبت۔

اگلی صبح اس کی زندگی کی ایک خوب صورت صبح تھی۔ آنکھ تو کھل گئی تھی۔ مگر ذہن پر ابھی بھی نیند کا غلبہ تھا۔ سوئے ہوئے اعصاب کو جگانے کے لیے اسے کافی محنت کرنی پڑ رہی تھی۔ لمبے سفر کی تھکان اور پھر تاخیر سے سونے کے باعث اس کی نیند پوری نہیں ہو پائی تھی۔ وہ مزید سوتا چاہتی تھی۔ اس کے پورے وجود پر کسل مندی طاری تھی۔ لیکن اعصاب خوابیدہ ہونے کے باوجود اسے احساس دلا رہے تھے کہ اسے بیدار ہو جانا چاہیے۔ گھر سے دوری کا احساس لا شعور میں کہیں دبا بیٹھا تھا۔ ذہن منتشر تھا۔ اس لیے بھی آنکھیں پوری طرح کھل نہیں پاری تھیں۔ آنکھوں کو ہٹھکا کر اس نے نیند کو بھگانے کی کوشش کی، پھر گری، جمایا لیتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گئی تھی، تب ہی اسے احساس ہوا کہ وہ کسی کی نظروں کے حصار میں ہے۔ اسے یک دم یاد آیا کہ وہ کمرے میں اکیلی نہیں

ہے۔ سو فوراً ہی اپنا آپ سمیٹتے ہوئے وہ کمرے میں سکر سی گئی تھی۔

عمر بالکل اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی یہ حرکت عمر کی نظروں سے محفوظ نہیں رہی تھی۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ امائمہ کے چہرے پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔

”گڈ مارننگ۔ مزید سونے کی اجازت نہیں ہے میم!“ وہ بڑے مگن سے انداز میں اس کی جانب بڑھا تھا۔ امائمہ جھجکتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گئی، پھر ٹانگیں سمیٹ کر اس کے لیے جگہ بنائی تھی۔ اسے جھجک سی محسوس ہو رہی تھی۔ کوشش کے باوجود وہ اپنا اعتماد بحال نہیں کر پا رہی تھی۔

”میں تھوڑی دیر اور سو جاؤں۔ پلیز!“ جب کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو یہی کہہ دیا عمر نے ساختہ ہنس دیا۔

”یہ بات میری طرف دیکھ کر بھی تو کسی جاسکتی ہے۔“ وہ اسے زچ کر رہا تھا۔

امائمہ نے بدقت آنکھیں اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔ وہ چند سیکنڈ زہی اس کی جانب دیکھ پائی تھی، پھر اس نے اپنا سر ان آنکھوں کے سامنے سرنگوں کر دیا تھا۔

”کیا ہوا؟“ وہ اب اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔

”عمر! مجھے کنفیوژمٹ کرو پلیز۔“ اسے خود اپنی کیفیت پر الجھن ہونے لگی تھی۔ وہ گزشتہ تین سالوں سے عمر کے خواب دیکھ رہی تھی۔ دن بھر میں وہ ایک دوسرے کو لاتعداد ایس ایم ایس کرتے تھے رات کو وہ اکثر انٹرنیٹ پر باتیں کرتے رہتے تھے اور ویک اینڈز پر عمر اس کو لمبی لمبی کالز کرتا تھا۔ بلکہ جھگڑتا۔ بھی تھا کہ وہ اس کی وجہ سے کچھ روپے جمع نہیں کر پاتا اور اس کی تنخواہ فون کالز میں ہی ختم ہو جاتی ہے اور اب نجانے کیا جادو ہوا تھا کہ منہ سے لفظ ہی نہیں نکل رہے تھے۔

”میں تمہیں کنفیوژمٹ نہیں کر رہا یا۔ میں تو ایک اچھا سا گانا یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہوں جو میں تمہیں دیکھ کر گاسکوں۔ تم بہت خوب صورت ہو امائمہ اور اللہ کا شکر ہے کہ میری ہوس مجھے شروع سے یقین تھا



وہ بستر سے نکل آئی تھی۔

\*\*\*

”ہم می لوگوں کے ساتھ بھی تو رہ سکتے ہیں عمو!“  
امامہ نے ایک بار پھر بے چارگی سے کہا تھا۔ اسے یہ گھبراہٹ پسند نہیں آئی تھی۔ یہ گھر تھا بھی نہیں بلکہ ایک ڈربا نما سی چیز تھی جسے دیکھ کر وہ ہکا بکا رہ گئی تھی۔ اس نے سن رکھا تھا کہ لندن میں لوگ بہت چھوٹے چھوٹے گھروں میں رہتے ہیں، لیکن اسے اندازہ نہیں تھا کہ گھراٹے چھوٹے بھی ہو سکتے ہیں۔ ایفڑ میں ان کا یہ ڈربا دراصل ایک بڑے گھر کی انیسویں ٹائپ چیز لگتی تھی۔

یہ تو پہلے ہی طے شدہ تھا کہ وہ لوگ الگ رہیں گے۔ امامہ کے پاکستان سے آنے سے پہلے عمر اس گھر کو فرشتہ کر چکا تھا۔ بلکہ اس نے بہت سی چیزیں امامہ سے پوچھ پوچھ کر خریدی تھیں۔ تب امامہ بھی بہت پر جوش ہوئی تھی۔ لیکن اب جب لندن آمد کے ایک ہفتے بعد وہ باقاعدہ اس گھر شفٹ ہوئے تھے تو امامہ کا مزاج کافی خراب ہو گیا تھا۔ یہ ایک عجیب طرز کا گھر تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی کچن تھا۔ جس کا دروازہ لاؤنج میں کھلتا تھا۔ لاؤنج بہت کشادہ بھی نہیں تھا اور بہت تنگ بھی نہیں تھا۔ لاؤنج سے ہی ایک دروازہ باہر کی جانب کھلتا تھا۔ لاؤنج سے ہی سیڑھیاں اوپر کی جانب جاتی تھیں جو ایک چھوٹی راہ داری پر ختم ہوئی تھیں۔ جس کے سامنے والا کمرہ ان کا بیڈ روم بن گیا تھا۔ بیڈ روم میں باتھ روم تھا اور عمر نے اسے بتایا تھا کہ بعض لوگوں کے بیڈ روم کے ساتھ باتھ روم نہیں ہوتا اور انہیں کچن اور باتھ روم کے لیے ایک جگہ استعمال کرنا پڑتی ہے۔ اس کی بات سن کر امامہ نے شکر ادا نہیں کیا تھا۔ بلکہ اسے عجیب ناگواری کا احساس ہوا تھا۔ اسے اپنا باتھ روم بھی کچھ خاص پسند نہیں آیا تھا۔

چھوٹا سا باتھ روم تھا۔ ایک طرف ٹوائلٹ تھا اور دوسری جانب واشنگ مشین رکھی ہوئی تھی۔ کھڑے ہونے کے لیے بمشکل جگہ تھی۔

کہ میں بہت خوش قسمت ہوں۔“  
”یہ تعریف امامہ کے لیے نئی بات نہیں تھی وہ اکثر کھلے دل سے اس کی تعریف کرتا تھا اور خود کو خوش قسمت قرار دیتا تھا، لیکن اس طرح اس کے منہ سے اسی کے سامنے بیٹھ کر یہ سب سننا امامہ کو ایک نئی خوشی۔ ایک نئے احساس سے دوچار کر رہا تھا۔ عمر اگر خود کو خوش قسمت سمجھتا تھا تو امامہ اس لمحے خود کو خوش قسمت ترین سمجھ رہی تھی۔ وہ عمر کو چاہنے کے باوجود کبھی نہیں بتا پائی تھی کہ وہ اپنے آپ کو اس کی محبت پا کر کتنا معتبر محسوس کرتی ہے یا یہ کہ اگر وہ عمر کو خوب صورت لگتی ہے تو عمر بھی اس کے لیے خوب صورت ترین مرد تھا۔

”اسے واقعی سو تو نہیں گئی ہو؟“ اس کی خاموشی سے عمر بھی سمجھا تھا۔ وہ منہ اٹھا کر ایک بار پھر اس کی جانب دیکھنے لگی۔

”تم خود ہی تو کہہ رہے ہو کہ مزید سونے کی اجازت نہیں ہے۔“ وہ منہ بسور کر بولی تھی۔

”تم سونا چاہتی ہو؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔ امامہ نے جھٹ ابات میں گردن ہلائی۔

”اوہ نہ۔ بد ذوق۔ میں نے سوچا تم کہو گی۔“ بات ادھوری چھوڑ کر وہ کھڑا ہو گیا۔ امامہ بات مکمل ہونے کا انتظار کرتی رہی، جب وہ کچھ نہ بولا تو پوچھنے لگی۔  
”کیا؟“ عمر اس کی بات پر مسکرایا پھر بولا۔

”اب ہر بات بچوں کو بتانے والی بھی نہیں ہوتی۔“ اس کا انداز اتنا ذوق معنی تھا کہ امامہ سے دوبارہ اس کی جانب دیکھا ہی نہیں گیا۔

”اب دوبارہ سو مت جانا۔ فریش ہو جاؤ میں تمہارے لیے چائے لاتا ہوں۔ چلو چلو اٹھو ہری اپسے سب ناشتے کے لیے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“

وہ امامہ کو ریلیکس کرنا چاہتا تھا، سو تاکید کرتا کمرے سے باہر نکل گیا، جبکہ وہ کہنا چاہتی تھی کہ وہ خالی پیٹ چائے پینے کی عادی نہیں ہے۔ لیکن عمر نے اتنی محبت سے کہا تھا کہ وہ زہر بھی پی سکتی تھی۔ عمر کے جاتے ہی

امامہ کے سامنے اس کے ساس، مسر ظاہر کر چکے تھے کہ وہ چاہتے ہیں عمر اور امامہ ان کے ساتھ رہیں، عمر عمر نہیں مانتا۔ پہلے امامہ بھی دل ہی دل میں راضی تھی۔ مگر پھر یہ گھر دیکھ کر اسے احساس ہوا تھا کہ بہتر ہے کہ ان کے ساتھ رہ لیا جائے۔ سو وہ چاہتی تھی۔ عمران کی بات مان لے۔ وہ لوگ بھی نزدیک ہی رو مفرڈ میں رہتے تھے۔ ان کا ذاتی گھر تھا۔ وہ گھر دو بیڈ کا تھا جہاں اس کے ساس، سرور اور عمید رہتے تھے۔ می نے امامہ سے کہا تھا کہ اگر وہ عمر کو رضامند کیا تو بخوشی اس گھر میں ان کے ساتھ رہ سکتی ہے، لیکن عمر راضی نہیں تھا۔

وہ امامہ کو صاف کہہ چکا تھا کہ وہ الگ ہی رہے گا۔ سو وہ آج ہی یہاں شفٹ ہو گئے تھے۔ عمر۔ اس کی آمد سے بھی پہلے می کے ساتھ مل کر گھر سیٹ کر چکا تھا۔ ضرورت و سہولت کی ہر چیز اس نے پہلے ہی خرید کر رکھی ہوئی تھی۔ لیکن کوئی بھی چیز امامہ کے دل کا ملال کم نہیں کر رہی تھی۔

”ہم ابو کے ساتھ کیوں نہیں رہ سکتے عمر؟“ سوال گھوم پھر کر ایک ہی نقطے پر مرتکز تھا۔

وہ دونوں لی وی لاؤنج میں فلور کشنز پر بیٹھے تھے۔ اس کمرے میں فریج کے نام پر ایک لی وی ٹرائی تھی اور ایک طرف دیوار میں ریک نصب تھا جبکہ ایک کونے میں کارز ٹیبل بھی دھری تھی۔ کارپٹ کے اوپر عین درمیان میں بڑا خوب صورت سا پینٹ کیا گیا تھا۔ فلور کشنز کے کورز اس کے رنگ کے مناسبت سے خریدے گئے تھے۔ کمرے میں تمام آرائشی چیزیں بہت خوب صورت اور اچھے ذوق کو ظاہر کرتی تھیں۔ کشنز سے لے کر پردوں تک جو اس کمرے میں موجود کھڑکی نما چیز پر لٹکایا گیا تھا۔ کوئی بھی چیز رنگ، سائز یا خوب صورتی کے لحاظ سے بد ذوق کو ظاہر نہیں کرتی تھی، لیکن کشادگی کا یہ عالم تھا کہ دو لوگ بھی وہاں زیادہ لگتے تھے۔ امامہ نے پاکستان میں بڑے بڑے گھر ہی دیکھے تھے۔ اس کا اپنا گھر بھی کافی بڑے رقبے پر پھیلا تھا اور انتہائی خوب صورت بنگلوں میں شمار ہوتا تھا۔ یہی

وجہ تھی کہ یہ گھر اس کی ناک کے نیچے نہیں سا رہا تھا۔ ”میں ان کے ساتھ نہیں رہ سکتا، کیونکہ ایک میان میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں۔“  
اس نے کان میں انگلی گھما کر اسے کھجایا تھا۔ وہ کچھ دیر قبل نما کر نکلا تھا اور اب لیپ ٹاپ لے کر بیٹھا تھا۔ کل سے اس کا آفس شروع ہو رہا تھا۔ امامہ کی وجہ سے اس نے ایک ہفتہ کی چھٹیاں لی تھیں۔

”تم ان کو اتنا ناپسند کیوں کرتے ہو۔ آج بتا ہی دو مجھے۔“  
”کم آن امی۔ ناپسند کیوں کروں گا۔ بس میری بٹی نہیں ہے ان کے ساتھ۔“ وہ لیپ ٹاپ کا پاور بٹن دبا رہا تھا۔

امامہ نے اس کے چہرے کی جانب دیکھا۔ وہ جانچنا چاہتی تھی، مگر کیا؟  
”لیکن کیوں۔ کوئی خاص وجہ؟“ اس کے لہجے میں عجیب سے شکوک تھے۔ عمر نے حیران ہو کر اس کا چہرہ دیکھا۔

”تنی نفرت کیوں کرتے ہو اپنے ابو سے؟“ اس کے لہجے میں اب کی بار صرف شک نہیں تھا۔ بے چارگی بھی تھی۔

”اوہ میڈم! جذباتی کیوں ہو رہی ہو۔ نفرت کیوں کروں گا ان سے۔ میرے ابو ہیں وہ۔“  
”ان کے ساتھ ایک گھر میں رہنے میں کیا مسئلہ ہے پھر نہیں۔“ وہ ابھی بھی وہی انگلی تھی۔ عمر نے گہری سانس بھری۔

”ہم ان کے ساتھ کیسے رہ سکتے ہیں۔ یہاں سب اپنے اپنے گھروں میں رہتے ہیں۔ پیرئس کب تک بچوں کو اپنے ساتھ رکھیں۔“

عمر نے بہت نرم لہجے میں کہا تھا۔ اس نے لیپ ٹاپ بند کر کے امامہ کی جانب رخ کر لیا تھا۔

”ہم برٹش نہیں ہیں عمو۔ ہمارے یہاں بچے مرتے دم تک پیرئس کے ساتھ ہی رہتے ہیں۔“ وہ ناک چڑھا کر بولی تھی۔ عمر نے سارے لاؤنج کا جائزہ لیا۔



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ٹھیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریزیوم ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریٹخ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ پیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریٹخ
- ☆ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

**WWW.PAKSOCIETY.COM**

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

ماشاء اللہ اس کا بے بی بھی ہے ان کو بھی کم از کم ایک روم تو دینا ہو گا نا۔ مجھے تو یہ بالکل اچھا نہیں لگے گا کہ ہماری وجہ سے مئی کو پر ایلم ہے۔

وہ بہت ملازمت سے اس پر اپنا برطانوی موقف واضح کر رہا تھا۔ اما تم نے فقط گردن کو ہلایا۔ اس نے اس سچ پر واقعی نہیں سوچا تھا۔ عمر کو اس کا بچھا بچھا انداز دیکھ کر دکھ ہوا۔

”میری جان! اتنا پریشان مت ہو۔ میرا یقین کرو، سب کچھ جلد ہی ٹھیک ہو جائے گا ابتدا میں تھوڑی مشکل ہوگی، مگر پھر آہستہ آہستہ تم عادی ہو جاؤ گی۔ ابھی مجھے اپنی گاڑی ملنی ہے۔ میرے پاس گاڑی بھی نہیں ہے۔ میری جاب اور سیکری بہت اچھی ہے، مگر تم منگائی بھی تو دیکھو، کس تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ زندگی کی چھوٹی چھوٹی سہولتیں پانے کے لیے بڑی بڑی سہولتوں کو انور کرنا پڑ رہا ہے۔“ وہ خود بھی مجھے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ اما تم کو افسوس سا ہوا۔

”مجھے پتا ہے مئی کو بھی اچھا نہیں لگا کہ ہم ان کی بات مان کر ان کے ساتھ نہیں رہ رہے، مگر وہ خود بھی جانتی ہیں کہ صورت حال کتنی خوف ناک ہو چکی ہے۔ میں اب بچہ تو نہیں ہوں کہ سارا بوجھ ان پر ڈالے رکھوں۔ میرے پیر میں نے بہت محنت کی ہے۔ تب یہ مقام حاصل کیا ہے۔ جب ہم چھوٹے چھوٹے سے تھے تب سے انہیں ایسے ہی کام کرتے دیکھ رہے ہیں۔ پیلا یعنی میرے دادا نے بہت چاہا کہ ڈیڈی پاکستان آکر رہیں وہاں ان کا اچھا خاصا بزنس تھا، مگر ابو کہتے تھے کہ وہاں میری تعلیم کی قدر نہیں، سو میں یہاں ہی رہوں گا۔ مئی نے بہت عرصہ جاب کی اپنی خواہشوں کو مارا اور ضرورتوں کو انور کیا، تب ہمیں جا کر زندگی کی یہ شکل بنی ہے۔ اب عمیر رہ گیا ہے۔ وہ کسی اچھے انسٹی ٹیوٹ سے ڈگری لینا چاہتا ہے اس کا ایک ہی جنون ہے۔ اسے انجینئرنگ کرنی ہے۔ اس کی اسٹڈیز بہت مشکل ہے۔ وہ ہم تینوں بہن بھائی میں سب سے زیادہ ذہین ہے۔ ابو کی بچت اس پر خرچ ہو تو زیادہ اچھا ہے نا۔ میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

”تمہیں کچھ بھی اچھا نہیں لگتا؟“ اس کے لہجے سے تاسف جھلکنے لگا تھا۔

”ایسی بات نہیں ہے عمر۔ سب کچھ بہت اچھا ہے، مگر سب کچھ بہت چھوٹا چھوٹا ہے۔ کچن میں بمشکل دو لوگ اکٹھے کھڑے ہو سکتے ہیں۔ ہاتھ روم میں ایک بندہ بھی ٹھیک سے کھڑا ہونے تو یہی بڑی بات ہے اور وہ جو واشنگ مشین ہے اس میں تو دو جینز ڈالو تو تیسرا کپڑا ڈالنے کی گنجائش نہیں رہے گی۔ ہر چیز دیکھ کر تھکن کا احساس ہوتا ہے۔ اسی لیے میں کہہ رہی تھی کہ ہم ابو کے ساتھ رہ لیتے ہیں۔ ان کا گھر کشادہ تو ہے۔“ وہ اس کے گھٹنے پر ہاتھ رکھے بہت آس سے کہہ رہی تھی۔ عمر نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تھا۔

”ان کے ساتھ رہنے کا خیال دل سے نکال دو۔ ہمیں یہیں رہنا ہے۔ تمہیں اگر یہ گھر پسند نہیں آیا تو میں کوئی اور جگہ تلاش کر لوں گا، مگر وہ بھی ہو گا ایسا ہی۔ مطلب چھوٹا اور تنگ۔ پاکستان جیسا گھر تو یہاں میں بڑھاپے میں بھی انور نہیں کر سکوں گا۔“

”ابو کہہ رہے تھے، اگر ہم ان کے ساتھ رہیں تو پیسے بچ سکتے ہیں۔“ اس کا موقف نہیں بدلا تھا۔

”وہ مجھے بھی یہی کہہ رہے تھے۔ وہ مجھے مسائل سے بچانا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں میں ان کے ساتھ رہوں، مگر یہ بھی تو سوچو کہ ان کے ساتھ رہنے پر وہ کتنے پراہلزم میں آجائیں گے۔ ان کے پاس بھی تو دو بیڈ روم کا گھر ہے۔ ایک ان کے استعمال میں ہے ایک میں اور عمیر شیر کرتے تھے اب یہ تو اچھا نہیں لگتا کہ میں عمیر کو کہوں کہ وہ سنگ روم میں شفٹ ہو جائے اور اپنا بیڈ روم ہمیں دے دے۔ یہ پلان مئی نے دیا۔ جسے میں نے قبول نہیں کیا۔ ابو کہتے ہیں وہ ڈرائنگ روم ہمیں دے دیتے ہیں۔ اوکے ہم ڈرائنگ روم لے لیتے ہیں تو وہ گیسٹ جو ہمارے گھر آتے ہیں۔ ان کو کہاں بٹھائیں گے۔ لاؤنج میں۔ چلو اوکے ان کو سنگ روم میں بٹھالیا تو جو صبا ہر سال گرمیوں میں یہاں آتی ہے اس کا کیا کریں۔ اب تو



وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔ امانہ نے اس کے ایک ایک لفظ کو بغور سنا تھا اور اسے اس کی ساری باتیں سن کر احساس ہوا تھا کہ وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ وہ لاابالی سا لڑکا جو تین سال پہلے اسے ملا تھا۔ کتنا سمجھ دار ہو چکا تھا۔ اسے زندگی کو طریقے سے گزارنے کا سلیقہ آچکا تھا۔ امانہ نے اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ نکال کر اس کے گھٹنے پر رکھا، پھر اپنا سر وہیں ٹکا دیا۔

”پریشان ہو گئی ہونا؟“ وہ اسے تسلی دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ امانہ نے سر اس کے گھٹنے سے اٹھایا تھا۔ اس کے پاس ایک آئیڈیا تھا۔

”عمر! میں بھی تو جواب کر سکتی ہوں نا؟“

”جی نہیں۔ شکریہ۔ مجھے بتا ہے تم کر سکتی ہو مگر مجھے اچھا نہیں لگے گا۔ میں نے ساری زندگی می کو جاب کرتے دیکھا ہے۔ میں اسکول سے آتا تھا تو کبھی گھر میں می نظر نہیں آتی تھیں۔ میں عمیر اور صبا کے لیے کھانا گرم کرتا تھا۔ انہیں کھانا تھا۔ ان کا خیال رکھتا تھا۔ تم کیا چاہتی ہو کہ جب میں آفس سے آؤں تب بھی یہی صورت حال ہو۔“

وہ قطعیت سے کہہ رہا تھا۔ امانہ کو یہ بات وہ پہلے بھی بتا چکا تھا کہ وہ نہیں چاہتا کہ امانہ جاب کرے اور یہ بات پہلے ہی بحث کی گنجائش سے نکل چکی تھی۔

”اب پلیز اس ٹاپک پر اتمام سوچو۔ صورت حال اتنی خوف ناک نہیں ہے جتنی تم نے تصور کر لی ہے۔ سب کچھ آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گا۔“

وہ پہلے اسے ڈراتا تھا، پھر تسلی دینے لگتا تھا۔ امانہ چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی، پھر اس نے گہری سانس بھری تھی۔ عمر نے اپنی ٹانگیں پھیلا کر اس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا تھا۔ وہ ملاحت سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا۔ اسے احساس تھا کہ وہ پریشان ہو گئی۔

”ہاں۔ ان شاء اللہ۔ آئی ایم ساری عمر میں نے تمہیں پریشان کر دیا۔“ محبت کرنے والوں کی یہی مجبوری ہوتی ہے۔ وہ ایک دوسرے کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے۔

”سوری تو مجھے بولنا چاہیے۔ تم کیوں اہسکیو ز کر رہی ہو۔“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

”تم بھی اہسکیو ز مت کرو۔ میں بلاوجہ تکرار کر رہی تھی۔ اب میری آنکھیں کھل گئی ہیں۔“ وہ مسکرا کر بولی تھی۔

”اچھا۔“ عمر بھی مسکرایا، پھر اس کی دائیں آنکھ کے کنارے کو نرمی سے چھو کر بولا۔

”آؤ۔ ان کو بند کرنے کا انتظام کروں۔“

☆ ☆ ☆

اس نے بہت جلد خود کو حالات کے مطابق ڈھال لیا تھا۔ نہ صرف ڈھال لیا تھا بلکہ وہ بہت جلد ہر چیز کو خوش دلی سے قبول کرنے میں لگ گئی تھی۔ بہت ساری باتیں تھیں جو عمر نے اسے نہیں بتائی تھیں۔ لیکن وہ خود ہی سمجھ گئی تھی اور جب سمجھ گئی تھی تو اس کی شکایات خود بخود دور ہونے لگی تھیں۔ اسے بہت جلد انداز ہو گیا تھا کہ ان کا گھر بے شک بہت چھوٹا سا تھا، لیکن وہ ایک اچھے علاقے میں رہ رہی تھی۔ اس کے ساتھ رہنے والوں کے دل اتنے کشادہ تھے کہ گھر کی تنگی محسوس بھی نہیں ہوتی تھی۔

عمر اسے بے پناہ چاہتا تھا تو ساس، سر بھی اس کی بہت قدر کرتے تھے۔ ویک اینڈز وہ زیادہ تر ان ہی کے یہاں گزارتے تھے۔ ویسے بھی دونوں گھروں میں زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ امانہ وہاں اکیلی بھی آجایا کرتی تھی۔ عمیر بھی اسے بڑی بہنوں کی طرح ٹریٹ کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ ویسے بھی وہ بڑا بڑھا کو سا لڑکا تھا۔ کتابوں سے نکلتا تو انٹرنیٹ پر پروجیکٹ اور تھیسز وغیرہ میں مگن رہتا، مگر فرصت ملنے پر وہ اس کے پاس بیٹھتا تھا اور اپنے برٹش لمبے میں اس سے پنجابی میں باتیں کرتا تھا۔ امانہ ان سب کا رویہ دیکھتی تو امی کی بصیرت اور جہاں دیدہ نظر کو داد دیتی نہ تھکتی۔ اسے امی کے فیصلے پر بجا طور پر فخر محسوس ہوتا تھا۔

”ایک وقت آئے گا امانہ! کہ تم خود کو دنیا کی خوش

قسمت ترین عورت سمجھا کر گئی۔“ جب عمر اس سے انگوٹھی اپس لے گیا تھا تو امی نے اس کی وکالت میں کہا تھا۔ امی ہمیشہ اسے مطمئن کرنے کی خاطر دلیلیں اکٹھی کرتی رہتی تھیں۔ جب تک اس کا دل عمر کی جانب مائل نہیں ہو گیا تھا وہ اس سے ڈھیروں باتیں کرتی رہتی تھیں۔ وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسے موضوع تلاش کرتیں کہ جن میں خود بخود عمر یا اس کے گھر والوں کا ذکر آجاتا اور پھر وہ اکثر اسے باور کرواتا تھیں کہ وہ بہت خوش قسمت ہے اور اب وہ واقعی ان کے اس دعوے پر ایمان لے آئی تھی۔ عمر کی محبت ہی قابلِ قدر نہیں تھی، بلکہ وہ اس کی عادتوں کی بھی گرویدہ ہو گئی تھی۔

وہ اسے ناشتے کھانے کے لیے کبھی بھی جگا کر نہیں کہتا تھا۔ وہ اگر سو رہی ہوتی تو وہ اپنا ناشتہ خود بنالیتا تھا، کھانا بھی مائیکرو ویو اوون میں گرم کر لیتا تھا۔ بلکہ بعض اوقات وہ امانہ کے لیے بھی یہ سب کام کر دیتا تھا۔ امانہ اس کے ذاتی کام کر دیا کرتی تھی۔ کبھی اس کے کپڑے استری کر دیتی یا الماری ٹھیک کر دیتی تھی، لیکن وہ اس چیز کے لیے امانہ کا اتنا شکر گزار ہوتا کہ وہ دل ہی دل میں شرمندہ ہوتی رہتی۔ اسے گیلاتولینہ بستر پر پھینکنے کی عادت تھی، نہ ہی وہ میلے کپڑے ادھر ادھر پھیلاتا تھا۔ اپنی ڈی ڈی ڈی اخبار، آفس کی فائلز ہر چیز سمیٹ کر رکھتا تھا۔ لیکن ویک اینڈز پر وہ ایک بالکل مختلف عمر کے روپ میں نظر آتا۔ وہ ہر کام میں امانہ کی مدد کرنے کی کوشش کرتا۔ وہ گروسری کے لیے اسٹھے جاتے تھے گھر کی کوئی مرمت کرنی ہوتی یا بیک یارڈ میں لگی گھاس کی جھاڑ جھنکار کرنی ہوتی وہ فنانٹ سب کام کر لیا کرتا تھا۔ امی لوگ کی طرف جا کر بھی اس کی یہی رویہ رہتی۔ وہ ابتدا میں بہت حیران ہوتی تھی اور اسی حیرانی کا اظہار اس نے عمر کے سامنے بھی کر دیا تھا۔

”اس میں ایسی کوئی انوکھی بات نہیں ہے کہ تم اتنی حیرانی کا اظہار کرو۔ میں بالکل اپنے ابو کے جیسا ہوں۔ وہ بھی میری امی کے ساتھ ہمیشہ اتنے ہی لونگ اور کیئرنگ رہے ہیں۔ ایسی باتوں پر جھجکتے نہیں ہیں

ہم ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی تو اپنے کام اپنے ہاتھوں سے کرتے تھے۔ میں کیا کرتا ہوں جس کی کمی تو کرتا ہوں۔ اپنا کام ہی تو اپنے ہاتھوں سے کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔“

عمر نے امانہ کے استفسار پر عام سے لہجے میں کہا تھا اور اس نے سچ کہا تھا۔ واقعی ابو بھی ایسے ہی تھے۔ وہ اپنا کھانا ختم کر کے نہ صرف پلیٹ کچن میں رکھ کر آتے تھے، بلکہ اپنے حصے کے برتن بھی دھوتے تھے۔ اسی طرح ویک اینڈز کی چائے عمیر کے ذمے تھی جسے وہ بخوشی بنایا کرتا تھا۔

ان کی دیکھا دیکھی امانہ نے بھی امی کے ساتھ کچن کی ذمہ داریاں بانٹ لی تھیں۔ وہ سلاڈ کے لیے سبزیاں چوپ کر دیتی تھی۔ سینڈویچز کی فلنگ کر دیتی تھی۔ اوون میں بیک ہوتے کھانوں کو چیک کر لیا کرتی تھی۔ کچن کے تمام شیفٹ اور کیمینٹس کی تفصیلی صفائی وہ ہر ویک اینڈ پر کیا کرتی تھی۔

امی کی کمر میں در در رہتا تھا، سو وہ ان کے گھر آتے ہی ویکووم اور جھاڑن لے کر صفائی میں جت جاتی۔ قرینہ اور سلیقہ تو ان سب میں تھا، مگر پھر بھی امانہ صفائی ستھرائی کے دوران اپنی مہارت دکھا دیتی۔ اسے احساس تھا کہ اس کی ساس بے حد سگھڑ ہیں، سو وہ ان سے سیکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ وہ امی کی سخت ٹریننگ میں گزشتہ تین سالوں میں کوفتوں سے لے کر بریانی اور رس ملائی سے لے کر کھیر تک ہر چیز بنانا جان گئی تھی، لیکن وہ لوگ ایسا کھانا کم کھاتے تھے۔ پاشا، نوڈلز، اسنیم چکن، پزایا پھر بہت سادہ سینڈویچز یا پھر ڈارک براؤن چاکلیٹ کیک کو ویلا کسٹرو کے ساتھ سجا کر کھانا انہیں بریانی پلاؤ سے کہیں زیادہ مرغوب تھا۔

سو امانہ کو کچن میں بھی زیادہ وقت نہیں دینا پڑتا تھا۔ غرض یہ کہ امانہ کی زندگی ایسی تھی کہ لڑکیاں جس کے خواب دیکھا کرتی ہیں۔ خوشیوں کے جھولے جھولتے کیسے چھ ماہ گزر گئے، پتا ہی نہیں چلا۔

☆ ☆ ☆

”تم نے ناشتا کیا یا نہیں۔ آؤ۔ کب سے اٹھے



ہو تمہیں اتنا سست بنا رکھا ہے تمہاری گرینی نے تمہیں کافی نہیں بنا سکتے تھے اپنے لیے۔

میری مٹی اکتائے ہوئے انداز میں تیز تیز ہاتھ چلا رہی تھیں۔ بچن کی حالت عجیب بہتر تھی۔ ویسے سارا گھر ہی دبلیا کر رہے ہی بے ترتیبی کا رونا روتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ مگر بچن کچھ زیادہ ہی نکھر اہوا تھا۔ فریج اور کیمینٹس خالی جبکہ شیلٹ اور درمیانی کاؤنٹر بھرے ہوئے تھے۔

گرینی کہتی تھیں کہ مٹی بد سلیقہ عورت ہیں اور یہ بات مٹی کے انداز سے ظاہر ہو رہی تھی۔ وہ سفید ہاتھ گاؤں میں ملبوس تھیں۔ ان کے بالوں سے پالی کے قطرے ٹپک رہے تھے جو کاؤنٹر پر دھرے برتنوں میں گر رہے تھے۔ مگر انہیں پروا نہیں تھی۔ ان کا چہرہ کل کی نسبت کچھ پھیکا مگر خوب صورت دکھاتا تھا۔

مجھے ان کے بچن کو دیکھ کر اپنے ویک فیلڈ والے فارم ہاؤس کا بچن یاد آیا اور مٹی کو دیکھ کر گرینی کی یاد آئی۔ مٹی کو گرینی والی نفاست چھو کر بھی نہیں گزری تھی۔ میرا دل ان کی یاد سے پوچھل ہونے لگا۔ میں مٹی کے اس گھر میں ایک رات گزار چکا تھا اور یہ رات بہت بھاری تھی۔ میرے پاس اس خوف ناک رات کو بیان کرنے کے لیے الفاظ بھی نہیں ہیں۔ میں رات بھر روتا رہا تھا۔ اتنا اکیلا پن زندگی میں پہلے کبھی نہیں سما تھا میں نے۔

اکلایا واقعی بڑا سیایا ہوتا ہے۔ یہ انسان کی ذات کو راس نہیں آتا۔ تنہائی کا خوف موت کے خوف سے بڑا ہوتا ہے۔ ایک رات کی تنہائی نے میرے کس بل نکال دیے۔

اس رات نے مجھ پر تنہا ہونے کے نئے معنی واضح کیے تھے۔ ”تنہا“ ہونا یہ نہیں ہوتا کہ آپ کے پاس کوئی نہیں ہے۔ تنہا ہونا دراصل یہ ہوتا ہے کہ سب آپ کے پاس ہیں، لیکن آپ کا کوئی نہیں ہے۔ مجھے رات بھر یہ احساس رہا کہ جیسے میں ایک چھوٹی کشتی میں سوار ہوں اور سمندر عبور کرنے کی کوشش کر رہا ہوں اور میرے سب دوست احباب ایک بڑے

”بحری جہاز“ میں مجھے دیکھتے ہوئے، مجھ پر ہنستے ہوئے میرے پاس سے گزر گئے ہیں۔ یہ تھا میرا اکیلا پن۔

”کافی بنانا زیادہ مشکل نہیں ہے۔ شوگر، کیم، دودھ ملاؤ۔ کافی تیار ہے۔ اتنا سا کام تو تم خود کر لیتے۔ میرے انتظار میں بیٹھے رہنے کی کیا ضرورت تھی۔ آئندہ ایسا مت کرنا۔“ انہوں نے بڑے آگے رکھتے ہوئے ناگواری سے کہا۔ میں کاؤنٹر کے گرد ایک اونچے سے غیر آرام دہ اسٹول پر بیٹھا تھا۔ بچن میں ایک طرف دو کرسیاں اور میز بھی پڑی تھیں، لیکن مٹی نے مجھے وہاں بیٹھنے کو نہیں کہا تھا۔

میں نے وہیں بیٹھنے کا فیصلہ کر کے بڑے اپنے مزید آگے کر لی۔ اس میں کافی کا ایک مک اور ایک کے چند ٹکڑے تھے۔ میں نے حیران ہو کر ان کا چہرہ دیکھا۔ کیا انہیں اتنا بھی احساس نہیں تھا کہ میں کتنا بھوکا تھا۔ میں نے کل دوپہر سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ سفر میں مجھ سے کچھ کھایا نہیں جاتا تھا اور گھر آکر بھی مٹی نے مجھے پوچھا ہی نہیں تھا کہ مجھے کھانے کو کچھ چاہیے یا نہیں۔ اب مجھے بہت بھوک لگ رہی تھی اور وہ مجھے کھانے کو کیا دے رہی تھیں۔ میری تو آنکھیں بھی بھوک سے خشک ہو گئی تھیں۔

”آپ نہیں آئیں گی؟“ میں نے عادت کے مطابق پوچھا تھا، کیونکہ مجھے اور گرینی کو اکٹھے ناشتہ کرنے کی عادت تھی۔ انہوں نے پہلے اپنی پرکشش گرے آنکھیں پھیلا کر دیکھا تھا، پھر ناگواری ان کے چہرے پر پھیل گئی۔

”سارے زمانے کے لیے ہلکان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس سے ناکامی کے سوا کچھ نہیں ہوتا اور دنیا میں صرف زندہ رہنا اہم نہیں ہوتا کامیابی سے زندہ رہنا اہم ہوتا ہے۔“

انہوں نے لفظ کامیابی پر زور دیا، پھر اپنا بایاں ہاتھ اوپر کر کے مجھے دکھایا۔ اس میں کافی کا مک تھا۔ وہ مجھے بتا رہی تھیں کہ وہ اپنے لیے کافی لے چکی ہیں۔

”ایک بات یاد رکھنا۔ کامیابی تب ملتی ہے جب انسان سب سے پہلے اپنے بارے میں سوچے۔ میں

اپنے پیٹ کا خیال تم سے بہتر رکھ سکتی ہوں، اس لیے جو کام تم بہتر طریقے سے کر ہی نہیں سکتے۔ اس کے بارے میں سوچ کر اپنا وقت ضائع کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔“

انہوں نے اپنی بات پوری کر کے کافی کا گھونٹ بھرا اور پھر اپنے کمرے کی طرف چل دیں۔ میں نے تذبذب کے عالم میں اپنا کپ اٹھایا اور دائیں ہاتھ میں کیک کا پیس لے کر کھانا شروع کیا۔ وہ کیک سخت باسی اور بد مزہ سا تھا۔

مجھے ویک فیلڈ کے اصول ترک کرنے میں مشکل پیش آرہی تھی۔ وہاں کبھی میں ناشتے کی میز پر اکیلا نہیں بیٹھا تھا۔ گرینی اس بات پر اصرار کرتی تھیں کہ کھانے کی میز پر گھر میں جتنے افراد بھی ہوں موجود ہوں۔ ان کے پڑھائے ہوئے سبق یہاں فرسودہ اور غیر ضروری محسوس ہونے لگے تھے۔ مٹی کے گھر کے اور ان کے اپنے سب اصول گرینی سے مختلف تھے۔

گھر پہنچ کر انہوں نے ایک کمرے کی طرف اشارہ کر کے کہا تھا کہ جب تک میرے لیے کچھ بندوبست نہیں ہو جاتا میں یہ کمرہ استعمال کر سکتا ہوں۔ اس کے بعد میں اس کمرے میں ہی رہا تھا اور اب صبح باہر آیا تھا۔ وہ دو بیڈ کا گھر لگتا تھا۔ یہاں گندگی اور بے ترتیبی بہت زیادہ تھی جو پہلی نظر میں ہی محسوس ہو جاتی تھی۔ کیک کے سوکھے سلائسز اپنے اندر منتقل کرتے ہوئے میں ادھر ادھر بھی نظر ڈال رہا تھا۔

یہ کوئی غیر ارادی فعل نہیں تھا۔ میں دراصل کھاتے ہوئے اس کیک کی طرف نہیں دیکھنا چاہتا تھا، کیونکہ ایسا کرنے پر شاید میں انہیں کھا نہیں پاتا۔ میرے سامنے مٹی نے جو کیک رکھا تھا، اگر گرینی نے مجھے دیا ہوتا تو میں منہ بھی نہ لگاتا، لیکن ثابت ہوا کہ بھوک بے شرم ہوتی ہے اس کی کوئی اتنا نہیں ہوتی۔

میں خاموشی سے اپنا ناشتہ ختم کرتا رہا۔ ایک ”دو“ تین سب سلائسز ختم ہو گئے تھے اور بھوک ابھی باقی تھی۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ مٹی سے مزید کچھ کھانے کے لیے مانگ سکتا۔ میں نے کیک کے بعد کافی

ختم کی اور ٹرے کو سنک میں رکھ دیا۔ میں نے نشوونما تلاش کرنے کی کوشش کی۔ تاکہ میں کاؤنٹر کو بھی صاف کر دوں، مگر وہاں موجود نہیں تھے یا شاید مجھے نظر نہیں آئے۔ میں نے کاؤنٹر پر گرانا دیدہ کچرا ہاتھ سے صاف کیا اور اسے بھی بچن سنک میں بھاڑ دیا، کیونکہ مجھے وہاں ڈسٹ بن بھی نظر نہیں آیا تھا۔ میں واپس ابھی اسی جگہ بیٹھا ہی تھا کہ مٹی دوبارہ نازل ہوئیں۔

”تم ابھی تک یہی بیٹھے ہو۔ اتنی سستی اچھی نہیں ہوتی۔ تمہاری عمر کے بچے تو بہت پھرتیلے ہوتے ہیں۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھنے سے وقت بھی ضائع ہوتا ہے اور توانائی بھی۔ وہ ادھر دیکھو، مشین پڑی ہے۔ تم یہاں ہال میں اورو۔ اور اپنے روم میں صفائی ستھرائی کر لو۔ اپنی چیزوں کو ترتیب دے لو۔“

انہوں نے مجھے دیکھا، ”ٹوکا“ اگلا حکم دیا اور واپس اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ ایک سانس، دو نظریں، چند سیکنڈز اور اتنے لفظ۔ وہ تو بہت پھرتیلی عورت تھیں۔ میں اٹھ کر اس سمت کے کیمین کو کھولنے لگا جہاں مٹی نے اشارہ کیا تھا۔ چند لمحوں بعد میں اس جگہ پر دیکھو، مشین کو واپس اس کے کیمین میں رکھ کر دھری گرسیدھی کی تھی کہ مٹی کی آمد ہوئی۔

وہ اب تک سک سے تیار تھیں۔ نیوی بلیو، ٹوکا ڈائس والی فراک کے ساتھ بلیک ہائی ہیل شو پینے مٹی ایک گلیس، چونکا دینے والی شخصیت کی حامل خاتون لگ رہی تھیں۔ ان کے بال کھلے اور چہرہ کھلا ہوا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر سراپنے والے انداز میں مسکرائیں، مجھے ذرا حوصلہ ہوا تھا۔

”تم بہت اچھے لڑکے ہو۔“ انہوں نے میری تعریف کی تھی۔ اسی دوران میں نے مٹی والے کمرے میں سے کسی کو باہر کی سمت آتے دیکھا۔ وہ سیاہ بالوں اور براؤن رنگت والا اونچے قد کاٹھ کا شخص تھا۔ اس نے ملگجاسا لباس پہن رکھا تھا جس پر سلو میں پڑی تھیں۔ اس شخص کی چال متوازن تھی۔ میری نظروں کو اس جانب پھرا کر مٹی نے بھی ادھر دیکھا تھا۔

”تم اٹھ گئے روڈی۔“ وہ مسکرائی تھیں۔



”یہ روڈی ہے۔“ انہوں نے اس شخص کا تعارف کروایا پھر اس کی جانب دیکھ کر بولیں۔  
”روڈی۔ یہ بلی ہے۔ میرا کزن۔ اس کے مئی“  
ڈیڈی مرچکے ہیں۔ اب میرے ساتھ رہے گا۔“  
”کزن۔“ میری آنکھیں پھیل گئی تھیں میں نے چونک کر مئی کا چہرہ دیکھا۔ وہ مسکرا رہی تھیں۔

\*\*\*

”ڈنگ ڈنگ۔“ ڈور بیل کی آواز کسی بد صورت بوڑھی جادوگر کی کہہ سکتے تھے کی صورت میرے کانوں میں پڑی تھی۔ میں ہال کے لیڈر کاؤچ پر منہ پہ کشن دھرے لیٹا تھا۔ نجانے کب میری آنکھ لگ گئی تھی۔ اس لیے میں بیل کی آواز پر ہڑبڑا سا گیا۔  
ایک لمحے کے لیے میں سمجھ نہیں پایا کہ یہ کیا ہوا ہے کیونکہ میں نے ابھی تک اس گھر میں رہتے ہوئے ڈور بیل کی آواز سنی تھی نہ ہی کبھی کسی کے لیے دروازہ کھولا تھا۔ اس گھر میں کوہو اور اس کے پارٹنر کے علاوہ کوئی نہیں آتا تھا۔ جبکہ ان دونوں کے پاس ڈپلی کیٹ چالی ہفتہ وقت موجود ہوتی تھی۔ سو وہ بیل نہیں بجاتے تھے۔ میں یہ سب سوچتا ہوا دروازہ کھولنے کے لیے آیا تھا۔

”کون ہو تم؟ یہاں کیا کر رہے ہو؟ پیچھے ہٹو۔ اندر تو آنے دو مجھے۔“ وہ جو کوئی بھی تھیں اخلاقیات سے بالکل عاری تھیں۔ انہوں نے پہلے جھٹکے میں مجھے اور دوسرے جھٹکے میں دروازے کو ہٹا کر قدم اندر رکھا تھا۔ اوائل اکتوبر کے دن تھے دروازے کی جھری سے روشنی کی چھری لکیر بن بلائے اندر آرہی تھیں اور میرے پاؤں سے بعل گیر ہونے کی کوشش میں مصروف تھیں۔ ان خاتون سے زیادہ مجھے وہ لکیر بھلی لگی تھی۔

”میں نے پوچھا کون ہو تم؟ اب بتاؤ گے یا یونہی اپنے پاؤں کی طرف دیکھتے رہو گے۔“ وہ چلا کر پوچھ رہی تھیں۔ ان کا حلیہ بھی بڑا چیخا چلاتا سا تھا۔ گرا میک اپ بھرکیلا لباس اور غراتا ہوا لہجہ۔ وہ اتنا چیخ کر

بول رہی تھیں کہ ان کے بولنے سے ان کے بھورے جھٹکے بال بال بھی مرتعش ہوتے لگ رہے تھے ان کا چہرہ خوب صورت مگر کرخت تھا اور ان کی آواز کرخت مگر خوب صورت تھی۔  
”میں کوہو کا کزن ہوں۔“ میں نے بے بسی سے چور لہجے میں کہا۔

اتنے دن ہو گئے تھے مجھے یہاں رہتے ہوئے اور یہ پہلا موقع تھا جب میں کسی کو اپنے منہ سے اپنے اور مئی کے رشتے کے بارے میں بتا رہا تھا۔ مئی نے مجھے اپنے حلقہ احباب میں کزن کہہ کر متعارف کروایا تھا بلکہ وہ پہلے دن اس بات پر غصہ کر رہی تھیں کہ میں انہیں ”مئی“ کیوں کہتا ہوں سواب میں انہیں ان کے اسی نام سے بلاتا تھا جو ان کے دوستوں میں عام تھا۔ ہمارے درمیان زیادہ بے تکلفی نہیں تھی لیکن بیوں کے ساتھ جو ایک احترام روا رکھا جاتا ہے۔ مئی نے مجھے اس سے بھی آزاد کر دیا تھا۔ سواب وہ میرے لیے صرف میری کزن تھیں۔ کوہو۔

”کیا۔ کوہو کے کون ہو تم؟“ وہ ایک بار پھر غرائیں۔ میں جو ذرا پر اعتماد ہونے کی کوشش کر رہا تھا ان کی آواز پر پھر لڑکھڑا گیا۔

”کزن۔ کزن ہوں۔ کوہو کا۔ کس سے ملنا ہے آپ کو؟“

”لو شٹ اپ۔ مجھے یہ مت بتاؤ کہ تم میری بھانجی کے کزن ہو اور میں تم سے پہلی مرتبہ مل رہی ہوں۔“ وہ آگے بڑھ کر ہال کی جانب چلنے لگی تھیں۔ میں ان کے پیچھے پیچھے تھا۔

”تم مجھ سے پوچھ رہے ہو مجھے کس سے ملنا ہے۔ اس گھر کی مالکین ہوں میں۔ سمجھے تم۔“ انہوں نے مڑ کر میری جانب انگلی کر کے کہا تھا۔ مجھے اس صورت حال سے بڑی کوفت سی ہوئی۔ میری بلا سے جو بھی تھیں مجھے کوئی غرض نہیں تھی۔

”جی۔ میری معلومات میں اضافہ کرنے کے لیے بڑا شکریہ۔“ میں نے جذبات کو قابو میں رکھ کر کہا تھا۔ انہوں نے ہاتھ میں پکڑا بیگ درمیانی میز پر رکھا تھا

اور پھر سر سے لے کر پاؤں تک میرا طنزیہ نظروں سے جائزہ لیتا تھا۔

”اب مجھے یقین آگیا کہ تم کوہو کے کزن ہو سکتے ہو۔ وہ بھی تمہاری طرح بے حد بد لحاظ ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ مجھے اس بھروسے پر بھی آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔“

”نہیں بچے۔ اپنا شکریہ بجا کر رکھو۔ ابھی بہت مواقع آئیں گے اسے ادا کرنے کے۔ میں اتنی جلدی نہیں جانے والی یہاں سے۔“

انہوں نے بالکل میرے انداز میں میری بات کا جواب دیا اور پھر کاؤچ پر ڈھیر ہو کر اشارے سے میز پر پڑی کرسل باسکٹ پکڑنے کا کہا۔ میں نے خاموشی سے وہ باسکٹ انہیں پکڑا دی۔ اس میں میری پسندیدہ بھی ہوئی مونگ پھلیاں تھیں۔ انہوں نے اسے ٹونگنا شروع کر دیا۔ میں انہیں وہیں بیٹھا چھوڑ کر اس کمرے میں آگیا جسے میں اتنے دن سے بطور بیڈ روم استعمال کر رہا تھا۔ یہاں رہتے ہوئے مجھے بہت دن ہو گئے تھے لیکن زندگی جیسے وہیں اس ٹرین کے ڈبے میں کھڑی رہ گئی تھی۔ عین اسی مقام پر جب میری مئی کے ارادے ان کے اس جملے کے ذریعے مجھ تک پہنچے تھے۔

”مجھے ٹرین کا سفر اس لیے پسند ہے کہ اس میں کوئی ”یوٹرن“ نہیں ہوتا۔ انسان کو یوٹرن لینے کے لیے خود ٹرن لینا پڑتا ہے۔ میری زندگی گزارنے کی فلاسفی بالکل ٹرین کے جیسی ہے۔ میں یوٹرن نہیں لے سکتی لے ہی نہیں سکتی۔ ٹرین کی طرح۔“

انہوں نے جو بھی کہا تھا سچ کہا تھا۔ مجھے ان کے ساتھ رہنے کے لیے ایک یوٹرن نہیں لینا پڑا تھا بلکہ ہر گھنٹے بعد وہ مجھ سے اس کی توقع کرتی تھیں۔ میں خود کو موڑتے موڑتے اتنا مڑ چکا تھا کہ بعض اوقات مجھے اپنی پچھلی زندگی ایک خواب لگتی تھی۔

چند مہینوں میں ہی اپنے گھر کے کئی بڑے چھوٹے کام انہوں نے میرے ذمے لگا دیے تھے۔ کچن کی صفائی ستھرائی اپنا ناشتا بنانا ڈسٹنگ کرنا لائڈری دیکھنا۔ میں سب کر لیتا تھا۔ کوہو نے مجھے کسی اسکول میں داخل

نہیں کروایا تھا وہ مجھے اگلے سال کے لیے رجسٹر کروانا چاہتی تھیں سو وہ خود جس اسکول میں اسٹنٹ ٹیچر کے طور پر کام کر رہی تھیں وہیں مجھے بھی لے جاتی تھیں۔ وہ جان کیس فائونڈیشن کے تحت چلنے والا ایک کنڈرگارٹن تھا۔ تیرہ سال کے بچے کے لیے وہاں کوئی گنجائش نہیں تھی لیکن کوہو کو کوئی پروا نہیں تھی۔ کوہو نے میرے لیے اجازت لی تھی لیکن میری اجازت نہیں لی تھی۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی ان کے ساتھ جاتا تھا۔ میں ویک فیلڈ میں بہت اچھے اسکول میں جاتا تھا۔ میں بڑھالی میں بہت اچھا تھا اور غیر نصابی سرگرمیوں میں آگے آگے رہتا تھا لیکن یہاں اہلیڈ گیٹ میں سب ختم ہو گیا تھا۔ گرینی اس بات پر مطمئن تھیں کہ میں اپنی ماں کے ساتھ رہ رہا ہوں لیکن انہیں اس بات کی پروا نہیں تھی کہ میں کس طرح رہ رہا ہوں۔ کسی کو بھی اس کی پروا نہیں تھی۔

میں نے بھی انہیں زیادہ یاد کرنا چھوڑ دیا تھا۔ مجھے کسی کی ”یاد“ کو کاٹنا ہوا جو تانے کی عادت تھی بھی نہیں کہ ہر اٹھتے قدم کے ساتھ درد تکلیف میں اضافہ ہوتا چلا جائے۔ میں حالات کو اپنے مطابق نہیں بنایا تھا، سو میں نے اب خود کو حالات کے مطابق بنانا شروع کر دیا تھا جس میں سرفہرست یہ اقدام تھا کہ میں اپنے کام سے کام رکھتا۔ اب بھی ان خاتون کو جو خود کو کوہو کی انٹی کہتی تھیں ہال میں چھوڑ کر آگیا تھا۔ وہ خاتون کچھ زیادہ ہی ضدی تھیں۔ انہوں نے مجھے دس منٹ بھی اکیلا نہیں رہنے دیا تھا۔

”اے لڑکے۔ کہاں مر گئے ہو۔؟ یہاں آؤ۔“ وہ پکار رہی تھیں۔ میں ان کی بات سننے کے لیے واپس ہال میں آگیا۔

”کچھ کھانے کو ہے تو لے کر آؤ۔“ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے حکم دیا۔

وہ باسکٹ اب خالی تھی جو میں انہیں تھما کر گیا تھا۔ میں ان کی رفتار پر حیران ہوتا ہوا کچن میں آیا تھا۔ وہاں کل میں نے بسکٹ رکھے تھے لیکن وہ مجھے کسی کیبنٹ میں نظر نہیں آئے۔ میں اس بات پر مزید حیران ہوا۔

میں نے بھی انہیں زیادہ یاد کرنا چھوڑ دیا تھا۔ مجھے کسی کی ”یاد“ کو کاٹنا ہوا جو تانے کی عادت تھی بھی نہیں کہ ہر اٹھتے قدم کے ساتھ درد تکلیف میں اضافہ ہوتا چلا جائے۔ میں حالات کو اپنے مطابق نہیں بنایا تھا، سو میں نے اب خود کو حالات کے مطابق بنانا شروع کر دیا تھا جس میں سرفہرست یہ اقدام تھا کہ میں اپنے کام سے کام رکھتا۔ اب بھی ان خاتون کو جو خود کو کوہو کی انٹی کہتی تھیں ہال میں چھوڑ کر آگیا تھا۔ وہ خاتون کچھ زیادہ ہی ضدی تھیں۔ انہوں نے مجھے دس منٹ بھی اکیلا نہیں رہنے دیا تھا۔

”اے لڑکے۔ کہاں مر گئے ہو۔؟ یہاں آؤ۔“ وہ پکار رہی تھیں۔ میں ان کی بات سننے کے لیے واپس ہال میں آگیا۔

”کچھ کھانے کو ہے تو لے کر آؤ۔“ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے حکم دیا۔

وہ باسکٹ اب خالی تھی جو میں انہیں تھما کر گیا تھا۔ میں ان کی رفتار پر حیران ہوتا ہوا کچن میں آیا تھا۔ وہاں کل میں نے بسکٹ رکھے تھے لیکن وہ مجھے کسی کیبنٹ میں نظر نہیں آئے۔ میں اس بات پر مزید حیران ہوا۔

میں نے بھی انہیں زیادہ یاد کرنا چھوڑ دیا تھا۔ مجھے کسی کی ”یاد“ کو کاٹنا ہوا جو تانے کی عادت تھی بھی نہیں کہ ہر اٹھتے قدم کے ساتھ درد تکلیف میں اضافہ ہوتا چلا جائے۔ میں حالات کو اپنے مطابق نہیں بنایا تھا، سو میں نے اب خود کو حالات کے مطابق بنانا شروع کر دیا تھا جس میں سرفہرست یہ اقدام تھا کہ میں اپنے کام سے کام رکھتا۔ اب بھی ان خاتون کو جو خود کو کوہو کی انٹی کہتی تھیں ہال میں چھوڑ کر آگیا تھا۔ وہ خاتون کچھ زیادہ ہی ضدی تھیں۔ انہوں نے مجھے دس منٹ بھی اکیلا نہیں رہنے دیا تھا۔

”اے لڑکے۔ کہاں مر گئے ہو۔؟ یہاں آؤ۔“ وہ پکار رہی تھیں۔ میں ان کی بات سننے کے لیے واپس ہال میں آگیا۔

”کچھ کھانے کو ہے تو لے کر آؤ۔“ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے حکم دیا۔

وہ باسکٹ اب خالی تھی جو میں انہیں تھما کر گیا تھا۔ میں ان کی رفتار پر حیران ہوتا ہوا کچن میں آیا تھا۔ وہاں کل میں نے بسکٹ رکھے تھے لیکن وہ مجھے کسی کیبنٹ میں نظر نہیں آئے۔ میں اس بات پر مزید حیران ہوا۔



کوہو کو کھانے پینے سے زیادہ رغبت نہیں تھی۔ وہ جاگنگ کرتی تھی پتہ جاتی تھی یوگا کرتی تھی اور جو وقت بچ جاتا تھا اس میں فائے کرتی تھی۔ اس کے بوائے فرینڈ کو میں صرف ویک اینڈ پر ہی دیکھ پاتا تھا تو بسکٹ کہاں چلے گئے تھے اسی دوران مجھے داخلی دروازہ کھلنے کی آواز آئی تھی۔ میں باہر آگیا۔ وہاں بسکٹ کے پیکٹ کا خالی رہ پڑا ہوا تھا۔ کوہو کی آنٹی بہت ندیدی خاتون تھیں۔

”کون آیا ہے ملی؟“ کوہو کی آواز بھی ساتھ ہی سنائی دی تھی۔ کوہو نے داخلی دروازے کے پاس پڑے سفری بیگ کو دیکھ کر پوچھا تھا۔ ان کی آواز میں حیرانی سے زیادہ پریشانی محسوس ہوئی تھی مجھے یاہر کے دروازے سے ہال کے اندر تک نگاہ پڑتی تھی۔ کوہو نے بھی بیگ کو دیکھنے کے بعد دوسری نظر کاؤچ میں دھنسی ہوئی خاتون پر ڈالی تھی۔ میں نے ان کے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگوں کو دیکھا۔ ان کی پیشانی پر تو ریاں نمایاں ہوئیں اور اپنا اثر چھوڑے بغیر غائب ہو گئیں۔ انہوں نے اپنے سن گلاسز اور ہیٹ کو میز پر رکھ دیا۔

”آپ آئی ہیں۔“ گہری سانس بھری پھر بولیں۔ ”واپسی ہو گئی آپ کی؟“ کوہو کا انداز طنز تھا۔ ان خاتون نے گردن گھمائی اور مسکرائیں۔ ”کیا بہت یاد کرتی رہی ہو مجھے۔ سننے میں کافی اچھا لگ رہا ہے۔“

”اوہ کم آن وینڈی آنٹی۔ اتنا پوز مت کیجئے۔ ایکٹریس آپ نہیں میں ہوں۔“ ان کے چہرے پر ناگواری بڑھی تھی۔ آنٹی وینڈی نے قہقہہ لگایا۔ انتہائی مصنوعی اور چڑا دینے والا قہقہہ۔

”میں ایکٹریس نہیں ہوں مگر ایکٹریس کی آنٹی تو ہوں نا۔ کیا میں نہیں ہوں؟“

کوہو نے سر جھٹکنا جیسے اس لایعنی بحث سے چڑ رہی ہو۔

”تم یہاں سے جاؤ ملی۔“ کوہو نے ان کی جانب سے نگاہ ہٹا کر مجھے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ مجھے ویسے بھی

اس صورت حال سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں سکون سے اپنے کمرے کی طرف بڑھا تھا۔

”اے رگو۔ کدھر جا رہے ہو۔ ذرا رکو۔“ یہ وینڈی آنٹی تھیں۔

”اس سے کیا کام ہے آپ کو؟“ کوہو نے جیسے غرا کر کہا تھا۔ وہ اپنی آنٹی کے بجائے مجھے گھور رہی تھیں۔

”یہ کون ہے۔ میں چاہتی ہوں مجھے اس سے متعارف کروایا جائے۔ یہ خود کو تمہارا کزن کہہ رہا ہے۔ اتنا پلا پلا یا کزن کہاں سے آیا تمہارے پاس۔“ وہ آنکھیں گھما گھما کر اپنا موقف بیان کر رہی تھیں۔

”آنٹی وینڈی۔۔۔ اس معاملے سے آپ کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ آپ اپنے کام سے کام رکھیے۔“ کوہو نے جھٹکے سے اپنے ہائی ہیل شوز اتارے تھے جو باری باری دور جا کرے تھے پھر وہ خود بھی تن فن کرتی دور پنچن والی سائیڈ چلی گئیں۔ ان کی بڑبڑاہٹ واضح نہیں تھی۔ آنٹی وینڈی میری جانب مڑیں۔

”میں وینڈی والس ہوں۔ تمہاری کوہو کی آنٹی۔ تم کون ہو؟“ یہ سوال مجھ سے کیا گیا تھا۔ اب میں پہلی دفعہ غصہ دلادینے والے تذبذب کا شکار ہوا تھا۔

”میں کچن سے آپ کے لیے کافی لینے گئی تھی۔ زہر لینے نہیں۔ تھوڑا تھوڑا برتن۔ میں آپ کو آپ کے سوالوں کا جواب دیے بغیر مروں گی نہیں اور آپ کو بھی مرنے نہیں دوں گی۔ اور تم کیوں کھڑے ہو اب تک یہاں۔ دفع ہو جاؤ اپنے کمرے میں۔“ وہ دو کافی کے ٹک ہاتھ میں لیے باہر آئی تھیں۔ مجھے زندگی میں اتنی بے عزتی کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ میں نے دونوں خواتین کے رویے پر لعنت بھیجی اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

”یہ میرا کمرہ استعمال کر رہا ہے۔ میرا کمرہ مجھ سے پوچھے بغیر اسے کیوں دیا گیا؟ یہ میرا دوسرا سوال ہے اور میرا پہلا سوال یہ ہے کہ۔ یہ کون ہے؟“

ان کی آواز نے میرا تعاقب کیا تھا۔ مجھے کوہو کے

روئے پر غصہ تو آیا تھا مگر نجانے کیوں میں دروازے کے پاس جا کر رک گیا اور کمرے کے اندر جانے کے بجائے وہیں رک کر سننے لگا کہ وہ میری بابت اپنی آنٹی کو کیا بتاتی ہیں۔

”یہ میرا اور باب ۵ بیٹا ہے۔ ویک فیلڈ سے آیا ہے۔ اب یہ میرے ساتھ رہے گا۔“

کوہو کی آواز میں شکست خوردگی سی تھی۔ مجھے آنٹی وینڈی پر رشک آیا کہ کوئی تو ایسا تھا جو کوہو کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر سکتا تھا۔

”میں اسے تمہاری بد قسمتی سمجھوں؟“ کافی دیر بعد آنٹی وینڈی کی آواز آئی تھی۔

”نہیں۔۔۔ بے وقوفی۔“

”اوہ کم آن کوہو۔ ایک ہی بات ہے۔ بے وقوفی ہی وقت گزرنے کے بعد بد قسمتی بن جاتی ہے۔“ آنٹی وینڈی کے ہنکارا بھرنے کی آواز آئی تھی۔

”یہ آپ کے ساتھ ہوا ہو گا وینڈی آنٹی۔ میری بے وقوفی میری خوش قسمتی بن جائے گی۔ کچھ سال کی بات ہے۔“

پہلی بار کوہو کی آواز میں عجیب سا رنگ چھلکا تھا۔ میں تھوڑا سا اور آگے ہوا تاکہ کوہو کی آواز مزید بہتر طریقے سے مجھ تک پہنچ سکے۔

”ایسے دعوے تو تم پچھلے کئی سالوں سے کر رہی ہو ڈیر کوہو۔“

”یہ دعوے نہیں ہے آنٹی۔ یہ اطلاع ہے۔“ وہ ہنسی بھی تھیں۔

”یہ اطلاع تو مجھے گھر کے اندر قدم رکھتے ہی مل گئی تھی کہ تم آج کل ماں کی ڈیوٹی سرانجام دے رہی ہو۔“

آنٹی وینڈی کا انداز بوڑھی چالاک جاوہر گریوں کا سا تھا۔ اپنی بات مکمل کر کے اب وہ ہنس رہی تھیں۔

”یہ صرف اطلاع نہیں ہے۔ یہ خوش خبری بھی ہے۔“ کوہو کا لہجہ بہت پر سکون سا تھا۔

”میں نے اگر تمہیں پالنا نہ ہوتا تو اس خوش خبری پر ضرور مبارک باد دیتی تمہیں لیکن میں چونکہ تمہاری

اس چالاک لومڑیوں والی خصلت سے واقف ہوں اس لیے مجھے حقیقت بتاؤ۔ یہ لڑکا بھلے تمہارا بیٹا کیوں نہ ہو بغیر اپنی کسی غرض کہ تم ان چکروں میں کبھی نہ پڑو۔“

”آنٹی وینڈی! اپنی کھوپڑی پر اور مجھ پر ترس کھائیں اور براہ مہربانی اپنے آنے کی وجہ بتائیں۔“ میری طرح کوہو بھی اس لایعنی بحث سے اکتانے لگی تھیں۔

”تمہیں بتا ہے کہ میں تمہارے پاس کیوں آیا کرتی ہوں۔“ وہ پہلی دفعہ بہت مطمئن سی لگی تھیں۔ اس کے بعد چند لمحے خاموشی چھائی رہی اور پھر آنٹی وینڈی کی تڑپتی ہوئی آواز آئی۔

”مجھے بے وقوف سمجھتی ہو۔ یہ فائبر ہنڈرڈ پاؤنڈز دے کر جان چھڑا رہی ہو مجھ سے۔“

”ایسی غلطی میں کیسے کر سکتی ہوں۔ آپ کو بے وقوف سمجھتی ہوتی تو اب تک آپ سے جان چھڑا چکی ہوتی۔ اب تک آپ کو بھگت رہی ہوں۔ اسی بات سے میرے دل میں اپنی اہمیت کا اندازہ لگالیں۔“

”تمہارے دل میں میری اہمیت میری اپنی محنت کی وجہ سے ہے اور چونکہ تم جانتی ہو کہ میں بہت قیمتی ہوں سو تم مجھے دو ہزار پاؤنڈ دے دو۔“

”کیا آ۔ آ۔ آ۔“ کوہو چلائی تھیں۔

”کوہو میرے پاس ضائع کرنے کے لیے صرف وقت ہی ہے اور تمہارے پاس وقت بھی ہے اور دولت بھی۔“

”وینڈی آنٹی۔ میں محنت کرتی ہوں۔ گھر بیٹھے پیسے نہیں ملتے مجھے آپ کی طرح۔“ کوہو نے ان کی بات کاٹ دی تھی۔

”میرے شوہر کی ہینشن ملتی ہے مجھے جبکہ تمہیں تمہارے شوہر کا ترکہ ملنے والا ہے۔ اب مجھے جھٹلانا نہیں مجھے سب پتا ہے۔ یہ اپنا لڑکا جو تم ویک فیلڈ سے لائی ہوئی یہ اسی بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ بالآخر بڈھی کے ساتھ تمہارے معاملات بخیریت انجام پائے ہیں۔ بڈھے کے بعد تو ویسے بھی اب کوئی بڑی رکاوٹ رہی نہیں تھی۔ بڈھی نے کیا آفر دی ہے تمہیں اس جھنجھٹ میں پڑنے کی۔ سچی سچی بتا دو۔“



آئی کا اشارہ یقیناً ”گریڈ اور گریڈی کی طرف تھا۔ یہ میری سمجھ میں آگیا تھا لیکن کوہو اور گریڈی کے درمیان کوئی معاملات بھی طے ہوئے تھے اس کا مجھے ذرا بھی احساس نہیں تھا۔ کوہو مجھ سے کم بات کرتی تھیں لیکن گریڈی نے بھی مجھے یہاں بھیجنے کے لیے جذباتی بلک میلنگ کا سہارا ضرور لیا تھا لیکن کسی قسم کی ڈیل کے متعلق تو کوئی بھٹک نہیں پڑی تھی مجھے۔ میں اور بھی چوکس ہو کر ان دونوں کی باتیں سننے لگا۔

”اس نے مجھے کوئی آفر نہیں دی اور جہاں اتنی خبریں تھیں آپ کے پاس وہاں آپ کو یہ کیوں نہیں پتا چل سکا کہ بدھی نے اپنے پرانے عاشق سے شادی کر لی ہے۔“

کوہو کے الفاظ نے ان کی آنٹی کو توتا نہیں ہلایا تھا یا نہیں مگر مجھے ضرور ہلادیا تھا۔ مجھے لگنے والا یہ جھٹکا اتنا شدید تھا کہ میں چند لمحوں کے لیے جیسے سن ہو گیا۔ گریڈی سے میں نے کبھی یہ توقع نہیں کی تھی کہ وہ مجھ سے جھوٹ بولیں گی۔ وہ بے شک شادی کرتیں لیکن مجھ سے چھپاتی تو نہیں۔ کیا واقعی یہ وہی گریڈی تھیں جن کے ساتھ میں نے زندگی کے تیرہ سال گزارے تھے۔ میری زندگی اگر کوئی فیوری ٹیل ہوتی تو میں سوچتا کہ شاید گریڈی کو کسی بد صورت جن نے خوفناک جادو کرنی سے بدل دیا ہے لیکن ظاہر ہے ایسا نہیں تھا۔ میری آنکھیں پانی سے لالہ بھرے لگیں۔ مجھے رونا آ رہا تھا۔ یہ سب میرے ساتھ ہی کیوں ہو رہا تھا۔

مجھے کوہو اور ان کی آنٹی کی گفتگو میں کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ میں بہت سارا رونے کے لیے اپنے کمرے میں آگیا۔

”تمہیں میگی نے کچھ نہیں بتایا۔ اپنے اور میرے بارے میں اوپر بیل۔ وہ تمہیں سررازدہ بنا چاہتی ہوگی۔ وہ ایسی ہی ہے۔ سوٹ زندگی کے چھوٹے چھوٹے لمحوں کو خوش گوار بنانے کے لیے وہ ایسی حرکتیں کرتی رہتی ہے۔“

مسٹر ایرک بہت خوش گوار موڈ میں تھے۔ مجھے بہت رات کو ویک فیلڈ فون کرنے کا موقع ملا تھا۔ میں

کوہو کی غیر موجودگی کا یقین کر کے اپنے کمرے سے نکلا تھا۔ میں غلت کا شکار تھا مگر دوسری جانب مسٹر ایرک نے فون اٹھایا تھا اور یقیناً ”غلت میں نہیں تھے گریڈی کی بابت پوچھنے پر وہ بتا رہے تھے۔ ان کا لہجہ ایسا تھا جیسے مجھے جڑا رہے ہوں۔ اتنی رات گئے اپنے فارم ہاؤس کے فون پر ان کی آواز سن کر ہی مجھے یقین آگیا تھا کہ کوہو اور ان کی آنٹی گریڈی کے متعلق جو باتیں کر رہی تھیں وہ سب سچ تھیں۔ میں اپنے کمرے میں بند ہو کر بہت روچکا تھا اور اب میرا خیال تھا کہ مجھے مزید رونا نہیں آئے گا لیکن میں غلط تھا۔ میرا اندازہ درست نہیں تھا۔ تیرہ سال کا کوئی بھی بچہ اپنے متعلق درست اندازے لگا بھی تو نہیں سکتا۔

”مجھے گریڈی سے بات کرنی ہے مسٹر ایرک۔ میں نے گہری سانس بھر کر گلوگیر لہجے میں کہا تھا۔ انہوں نے قہقہہ لگایا۔

”مجھے گریڈی کا کوئی ٹیک مین۔ میں اور میگی اب مسٹر اور مسز بن چکے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تمہیں اس خبر سے بہت خوشی ہو رہی ہوگی۔ میگی میرے لیے بچن سے بننے کو کچھ لینے گئی ہے۔ میگی جلدی آؤ۔ تمہارے لیے فون ہے۔“

وہ بہت پر جوش ہو رہے تھے۔ میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں نے مزید کچھ کہنے بغیر فون بند کر دیا۔ مجھے اب زندگی بھر ان سے کوئی بات نہیں کرنی تھی۔ میں نے کاؤچ کی پشت سے اپنا سر نکال دیا جو رونے رہنے کی وجہ سے بہت بھاری ہو رہا تھا لیکن دل پر اس درد کا بوجھ نہیں تھا۔ اصل بوجھ اس درد کا تھا جو مجھے اپنی ذات سے وابستہ لوگوں کی لا تعلقی کی وجہ سے سہا پڑ رہا تھا۔ بہت دیر تک میں ایسے ہی بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ سوچنے کے لیے اب سچا بھی کیا تھا۔ میں زندگی کب گزار رہا تھا؟ زندگی مجھے گزار رہی تھی تو جو کام میں کر رہی نہیں رہا تھا اس کے متعلق سوچنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔

یہ وہ پہلا سبق تھا اس رات کا جس رات نے مجھے سکھایا تھا کہ ”رشتے“ آپ کی ذات سے اہم نہیں

ہوتے۔ پہلے آپ کی ذات ہوتی ہے اس کے بعد باقی چیزیں ہوتی ہیں۔ یہ وہ پہلی طاقت کی گولی تھی جو میں نے نگلی تھی۔ اسی طاقت کی گولی کو صبر کہتے ہیں شاید۔ میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ مجھے بھوک ستا رہی تھی۔ میں آپ کو ”بھوک“ کی فطرت کے بارے میں ایک عجیب بات بتاتا ہوں۔ یہ تب ظاہر ہوتی ہے جب آپ ”صبر“ کرتے ہیں اور تب ختم ہو جاتی ہے جب آپ ”شکر“ کرتے ہیں۔ میں ثابت قدمی سے اٹھا اور بچن کی جانب چل دیا۔ میں ”صبر“ کر چکا تھا اور ”شکر“ کرنا چاہتا تھا۔



اگلے کئی دن طلحہ اور راشد اس سے خفا رہے۔ انہوں نے اگرچہ اس سے بات چیت بند کی تھی نہ اس کے ساتھ بیٹھنا چھوڑا تھا لیکن ان دونوں کے رویے میں ایک عجیب سا کھنچاؤ آگیا تھا۔ وہ اسے نظر انداز کرتے ہوئے آپس میں زیادہ باتیں کرتے تھے۔ اس کے نوٹس یا کتابیں شیئر کرنے کے بجائے وہ کسی اور لڑکے سے یہ چیزیں مانگ لیتے، لیکن اس سے ایک بال پوائنٹ یا ڈالی گرامز ڈرا کرنے کے لیے ایک چل تک مانگنے کے روادار نہ رہے تھے۔

یہ سب چیزیں اسے بہت بری طرح ہرٹ کر رہی تھیں۔ وہ بھی اگر باقاعدگی سے کلج جا رہا ہوتا یا اس کا حلقہ احباب اب دونوں کے علاوہ کسی اور دوست پر بھی مشتمل ہوتا تو شاید ان دونوں کے انداز اس کے لیے قابل برداشت ہوتے مگر اب تو ان دونوں کی اس ذرا سی خفگی سے ادھ مٹا ہوا جا رہا تھا۔ وہ انہیں بلا وجہ مخاطب کرنے کی کوشش کرتا، ان کی ہر بات پر مسکراتے کی کوشش کرتا اور ان کے کئے بغیر ان کی جنرل بکس بنانے کے لیے تیار ہو جاتا، مگر وہ سرد مہری جوان دونوں کے انداز میں آتی جا رہی تھی وہ کسی طور پر ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔

ان دونوں کو خوش کرنے کے لیے اس نے بے حد ڈرتے ڈرتے ابو سے ایک مرتبہ پھر دوستی کے نام پر

ایک اجازت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ ”وہی ہوا نہ جس کا مجھے ڈر تھا۔“ اس کے ابو سننے ہی بھڑک اٹھے۔

”میں نے کہا تھا کہ کلج یا اکیڈمی کو تفریح کی جگہ مت سمجھنا۔ تم سمجھتے ہو میں کلج میں پہنچ گیا۔ اب بس ہر کام کی آزادی ہے۔ پڑھائی کی کوئی فکر نہیں دوستوں میں وقت برباد کرنے کا شوق۔ یہ دوست کچھ نہیں دیں گے تمہیں۔ خبردار جو دوبارہ مجھ سے ایسی کوئی بات کی۔ میں اب دوبارہ سنوں کہ تم نے کسی دوستی کو اتنا آگے بڑھایا کہ نوٹ گھر آنے جانے تک پہنچ جائے۔“

وہ ہمیشہ دو ٹوک لہجے میں نصیحت کرتے تھے۔ ان کے یہاں کبھی کسی دلیل کی گنجائش نہیں ہوتی تھی۔ یہ ہندو نصیحت اسے ہمیشہ سر جھکا کر آنسو پینے پر مجبور کر دیتے تھے۔ لیکن پہلی بار اس نے سر جھکایا تھا نہ اس کی آنکھوں میں کی چمکی تھی۔ وہ چند لمحے خالی خالی نظروں سے ابو کی جانب دیکھتا رہا۔ ابو کے لہجے میں ہی نہیں ان کے چہرے کے نقوش میں بھی ایک سختی اور درشتی تھی۔ اس نے ان کے چہرے سے نظریں ہٹالیں۔ وہ ان کے چہرے کی جانب نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

وہ کمرے سے ہی باہر نکل آیا تھا۔ ابو کی ڈانٹ نے پہلی بار اسے خوف زدہ نہیں کیا تھا۔ دوستوں کی خفگی اسے زیادہ ڈرا رہی تھی۔ لیکن چند دن بعد ان دونوں کا رویہ اس کے ساتھ خود بخود ٹھیک ہو گیا تھا۔ سرد مہری کی برف پکھلنے لگی تھی، مگر اب اس کا دل چاہنے لگا تھا کہ وہ دونوں اس کو اسی طرح ٹریٹ کریں جیسے وہ ایک دوسرے کو کرتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو اکثر اپنے گھروں میں مدعو کرتے تھے۔

انہوں نے اس کو بتایا تھا کہ وہ دونوں شاپنگ ایک ساتھ کرتے تھے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے جتنا قریب تھے ظاہر ہے یہ قربت اس کے ساتھ پیدا کرنے کے لیے ضروری تھا کہ وہ اکیڈمی کے علاوہ بھی ان کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا جس کی اجازت اس کے ابو کبھی نہیں



دیتے، بلکہ وہ تو انہیں فون کال بھی نہیں کر سکتا تھا جبکہ اس کا دل چاہتا تھا کہ جو پر خلوص سارشتہ طلحہ اور راشد کے مابین ہے۔ ویسا ہی رشتہ وہ ان کے ساتھ قائم کر سکتا۔ اس کی بڑھتی ہوئی عمر کے تقاضے اس کے ابو کے لیے فقط وقت کا ضیاع تھے۔

انہیں نچانے کیوں انداز ہی نہیں ہو رہا تھا کہ سوڈے کی بوتل کو لبالب بھر دینے سے اس کے پھٹنے کے امکانات سو فیصد بڑھ جاتے ہیں اور وہ بوتل کو نہ صرف بھر چکے تھے بلکہ اس پر کارک لگانے کی کوشش کر رہے تھے۔

”میرے گھر چلتے ہیں۔ بہت مزا آئے گا۔“ راشد نے طلحہ کو پیش کش کی تھی جسے اس نے فوراً قبول کر لیا تھا۔ جبکہ اسے انہوں نے رسماً ”بھی اپنے ساتھ آنے کے لیے نہیں کہا تھا۔ وہ تینوں کتابیں سمیٹ رہے تھے۔ موسم اچانک ہی خوشگوار ہو گیا تھا۔

گہرے سیاہ بادلوں نے پہلے زمیں کے حصے میں آنے والی سنہری روشنی کو نگلا تھا۔ پھر باقی ماندہ زرد رنگ کو بھی نگل لیا تھا اور ہر طرف سرمئی سے رنگ پھیل گئے تھے۔

بادل سورج بادشاہ کو شکست دینے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اپنی اس کامیابی پر شاید ان کی اپنی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ تب ہی رم۔ بزم سی شروع ہو گئی۔ ہلکی بوند باندی ہونے سے ہوا میں بھی تازگی آگئی تھی۔ اکیڈمی میں موجود لڑکوں کی اکثریت پڑھنے کے بجائے میون سون کی پہلی بارش سے لطف اندوز ہونا چاہ رہی تھی۔ سوئیوٹر نے سب ہی کلاسز کو چھٹی دے دی تھی۔ وہ کون سا لڑکیاں تھیں جو بیٹھ کر انتظار کرتیں کہ کوئی لینے آئے گا تو ہی گھر جا سکیں گی دیکھتے دیکھتے سب لڑکے باہر نکل گئے تھے۔

”آئی سے کہوں گا۔ پکوڑے بنا کر کھلائیں۔ چائے بھی پیوں گا اور ہاں وہ پچھلی دفعہ کس چیز کا طلوہ کھلایا تھا تم نے۔“ طلحہ نے راشد سے فرمائش کرنے کے ساتھ ساتھ پوچھا تھا۔ وہ چٹورا بھی بہت تھا اور راشد کی امی سے کافی بے تکلف بھی تھا۔

”لو کی کا طلوہ تھا وہ۔“ راشد نے اپنی سائیکل کا لاڈلہ کھولتے ہوئے اسے بتایا تھا طلحہ نے بھی گردن ہلانے کی تھی۔ اسے یاد آگیا تھا کہ وہ کس چیز کا طلوہ تھا۔

ان دونوں کے ساتھ وہ بھی اپنی سائیکل کی سر پر بیگ رکھتا حسرت سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ اسے ان دونوں کے مابین یہ بے تکلفی بہت بھالی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی معیت میں کتنا مزا کرنے والے تھے سوچ کر ہی اس کے دل میں خواہش انگڑائی لے رہی تھی۔ اس نے ایسی بے تکلف دوستی کا مزا بھی نہیں چکھا تھا۔ لیکن وہ چکھنا چاہتا تھا، مگر کیسے؟ اب وہ تینوں اپنی سائیکلوں پر سوار ہو رہے تھے۔ چند لمحوں بعد وہ اپنی اپنی سمتوں میں روانہ ہو جاتے۔ اس کے ذہن میں یکدم ہی ایک خیال آیا تھا۔

”میں بھی اگر ان دونوں کے ساتھ چلا جاؤں تو کسی کو پتا نہیں چلے گا۔ ابھی تو چھٹی میں دو گھنٹے بڑے ہیں۔ میں وقت پر گھر پہنچ جاؤں گا۔ اگر ابو کو پتا چل بھی گیا کہ آج جلدی چھٹی ہو گئی تھی تو میں کہہ دوں گا کہ میں اکیڈمی میں بیٹھ کر پڑھتا رہا تھا۔ ہاں۔ ایسا ہو سکتا ہے۔ بہت مزا آئے گا۔“

اس نے سوچا تھا، نجانے کیسے سوچا تھا ایسا بہانہ پہلے کبھی نہیں بنایا تھا وہ۔ جھوٹ پونے کے لیے بہت درکار تھی جو اس کے پاس نہیں تھی۔ لیکن یہ کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو وہ کسی دکان سے خرید لاتا۔ اسے اپنے اندر یہ ”چیز“ اپنے آپ پیدا کرنی تھی۔ وہ خود کو آنا چاہتا تھا۔

”میں۔ میں بھی چلوں۔ تمہارے ساتھ؟“ اس نے سوچنے میں زیادہ وقت لگایا تھا، مگر کہنے میں ایک لمحہ بھی نہیں۔

”تم۔ ہمارے ساتھ۔ میرا مطلب ہے راشد کے گھر؟“ طلحہ کے لہجے اور راشد کی آنکھوں میں بے یقینی تھی۔

”تم چلو گے میرے گھر؟“ راشد نے بھی بے یقینی سے اس کی جانب دیکھا۔ اس نے جھپٹتے ہوئے انہایت میں سر ہلا دیا تھا۔

”ہاں ضرور چلو۔ بہت مزا آئے گا۔ میں تمہیں کمپیوٹر دکھاؤں گا۔ میری خالہ نے نیویارک سے بھیجا ہے۔“

راشد اسے پر جوش لہجے میں بتا رہا تھا۔ وہ تینوں اپنی اپنی سائیکل پر سوار ہو گئے تھے۔ وہ شام اس کی زندگی کی بہترین شام تھی۔ اپنے دوستوں کے ساتھ اس کی زندگی کے ایک نئے رخ سے متعارف ہونے کی کوشش کی تھی۔ اس کے لیے اطمینان بخش بات یہ تھی کہ اس کے ابو اس کی اس سرگرمی سے قطعاً بے خبر رہے تھے۔ یہ شام اسے طلحہ اور راشد کے مزید قریب لے آئی تھی۔

”تم اپنے بارے میں کبھی کچھ نہیں بتاتے۔“ وہ تینوں کی بات پر ہنس رہے تھے، جب طلحہ نے اچانک کہا۔

”کیا بتاؤں؟ تم پہلے ہی میرے بارے میں کافی کچھ جان چکے ہو۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا تھا۔ دل ہی دل میں اسے طلحہ کا یہ شکوہ بہت اپنا نیت بھرا لگا تھا۔

”جی نہیں۔ کچھ نہیں جانتے ہم۔ سچ تو یہ ہے کہ تم اپنے بارے میں کبھی کوئی بات کرتے ہی نہیں ہو۔“ طلحہ نے اس کی تردید کی تھی۔ اب کی بار وہ کچھ حیران ہوا۔ اپنی دانست میں وہ انہیں کافی کچھ بتا چکا تھا۔ اتنی باتیں تو اس نے آج تک کسی سے بھی نہ کی تھیں جتنی وہ ان دونوں سے کرتا تھا۔

راشد نے سر ہلا کر کہا تھا۔ اکیڈمی میں تھیوری نیکل کورس ختم ہو چکا تھا اور پریکٹیکل کی پریکٹس شروع ہو چکی تھی، جس کی وجہ سے انہیں باتیں کرنے کے لیے زائد وقت مل جاتا تھا۔

”پھر بھی۔ کچھ نہ کچھ تو ہو گا۔“ طلحہ بضد تھا۔

”کیا بتاؤں؟“ اس کے لہجے میں شرمندگی تھی۔

”میں ایک عام سالز کا ہوں۔ ابو کے بارے میں تم لوگوں کو پتا ہی ہے۔ امی ہاؤس وانف ہیں۔ ایک بہن ہے۔ چھوٹی ہے مجھ سے۔ تم لوگوں کی طرح میری کوئی خاص ہابی نہیں ہے۔ میرے ابو کو فلمیں دیکھنا پسند نہیں ہے۔ ہمارے گھر ڈش اینڈینا اور ویڈیوز

وغیرہ نہیں ہے۔ کمپیوٹر بھی نہیں ہے۔ اور۔ اور۔ ہاں میری سب سے بڑی خواہش ہے کہ میں کنگ ایڈورڈ سے ایم بی بی ایس کروں اور میں بڑا ہو کر کارڈیا لوجسٹ بننا چاہتا ہوں۔ اور۔“

وہ اپنے بارے میں چیدہ چیدہ باتیں دوبارہ سے بتا کر اب پر سوچ انداز میں ان کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اس کے پاس مزید کچھ نہیں تھا بتانے کے لیے۔

”کتنا میسنا ہے یہ۔“ طلحہ نے راشد کی جانب دیکھ کر کہا تھا، ساتھ ہی اس کی پشت پر دھپ رسید کی۔

”ہمارے ساتھ چلا کیوں۔ ہاں۔“ راشد بھی سر ہلا رہا تھا۔

”پتا نہیں تم لوگ کیا جانا چاہتے ہو۔“ وہ بے بسی سے مسکرایا۔ اپنی نا سمجھی و نادانی پہ شرمندگی بھی ہو رہی تھی۔

”بس۔ یہ ساری باتیں تو ہمیں پہلے سے پتا ہیں۔ یہ سیکرٹس تو نہیں ہیں گھنے۔“ طلحہ کہنے کے ساتھ آنکھیں بھی گھما رہا تھا۔

”تو پھر کیا سیکرٹس؟“ وہ اب واقعی حیران تھا۔

”اوئے اسٹوپیڈ۔ اس کا مطلب ہے لڑکوں کی باتیں۔ کوئی لڑکی تو ہوگی تمہاری لائف میں۔ کوئی تو پسند ہوگی تمہیں یا تم کسی کو پسند ہو گے۔ کوئی کزن۔ ہسائی یا کلاس فیلو۔ یہاں اکیڈمی میں بھی کتنی ہی لڑکیاں آتی جاتی ہیں۔ کبھی تو کوئی اچھی لگی ہوگی نا۔“

راشد کا انداز بھی طلحہ جیسا ہی تھا۔ وہ جھینپ سا گیا۔ راشد اور طلحہ کبھی کبھار اپنی کزنز کا حوالہ دیتے تھے۔ لیکن اس نے کبھی ایسی باتوں میں دلچسپی نہیں لی تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ اسے ایسی باتیں سمجھ میں ہی نہیں آتی تھیں۔ ایسی باتیں سننے کے بعد اسے مزید وضاحت کی ضرورت پڑتی تھی۔

”میری زندگی میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ ابھی ہم اتنے بڑے نہیں ہوئے کہ ایسی باتیں کریں۔“

وہ جھینپ ہوئی، ہنسی کے ساتھ بولا تھا۔ طلحہ اور راشد ڈش کچر سے متعارف ہونے کی وجہ سے اس



معاملے میں کسی قدر ہٹ دھرم ہو چکے تھے۔  
”تمہارا مطلب ہے ایسی باتوں کے لیے ہمارا بڑا ہونا ضروری ہے۔ جب ہمارے بچے ہمارے جتنے ہو جائیں تب ہم ایسی باتیں کریں گے۔ ہے نا۔ بہت عقل مند ہو تم۔ آفٹر آل پوزیشن ہولڈر ہو۔ اپنی سمجھ کے مطابق بات کرو گے۔ اسٹوڈنٹ۔ اٹھارہ سال کا ہو چکا ہوں میں۔ اور یہ۔ یہ راشد ایک مہینہ ہی چھوٹا ہے مجھ سے۔“

طلحہ کا انداز استہزائیہ تھا۔ اسے نہ چاہتے ہوئے بھی ہنسی آگئی۔  
”اگرچہ یہ بات ہمیشہ میرے لیے شرمندگی کا باعث بنی رہی ہے۔ مگر ہے نا۔ یہ عمر عیار مجھ سے ایک ماہ بڑا ہے۔“

راشد نے بے ڈھنگے پن سے طلحہ کی تائید کی تھی۔ ان کا انداز اتنا مزاحیہ تھا کہ وہ ہنستا ہی چلا گیا اور بات آئی گئی ہو گئی، لیکن اس کے دوستوں کے ہاتھ ہنسنے کا ایک منفرد ٹاپک لگا تھا۔ وہ اکثر اسے چڑانے لگے۔  
”تم اپنے لیے کوئی گرل فرینڈ ڈھونڈو ورنہ مجبوراً“  
مجھے اپنی ایک آدھ گرل فرینڈ تھیں دینی پڑے گی۔“  
راشد اس کو کہتا تھا۔

اگرچہ تینوں ہی ”گرل فرینڈ“ کے اصل مفہوم سے آشنا تھے۔ لیکن اس کے لیے تو یہ لفظ ہی بے حد انوکھا اور نیا تھا اس لیے وہ جھل سا ہو جاتا۔

”ہاں بھی پڑھا کو کوئی گرل فرینڈ ملی یا نہیں؟“  
طلحہ بھی اکثر سوال کرتا۔ وہ چپ چاپ خجالت بھرے انداز میں ہنستا رہتا۔ اسے ان کی باتیں اچھی لگتی تھیں۔ اس کے لیے یہ سب سنجیدہ موضوعات نہیں تھے بلکہ دوستوں کے بے تکلفی کے مظاہرے تھے۔ پریکٹیکل کے بعد اکیڈمی میں ٹیوشن کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ طلحہ اور راشد بھی بے شک پوزیشن ہولڈر نہیں تھے، لیکن امتحانات ان کے لیے بھی اہم تھے سو باتیں کرنے کے مواقع کم ہو گئے اگرچہ ختم نہیں ہوئے تھے۔

”یہ صبا نورین کون ہے؟“ اس نے طلحہ سے

پوچھا تھا۔

”تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“ طلحہ کی ذہنیت دل بدلتی ہو رہی تھی۔ وہ فوراً ہی ذہنی انداز اختیار کر لیتا تھا۔

”عاطف صاحب آج بہت تعریف کر رہے تھے کہہ رہے تھے لڑکیوں کے سیکشن میں صبا نورین ٹاپ پر جاری ہے۔ اس نے سیریز ٹیسٹ میں کیمسٹری کے سبجیکٹ میں مجھ سے تین مارکس زیادہ لیے ہیں، جبکہ بائیو اور فزکس میں میرے مارکس زیادہ ہیں اور انگلش میں ہم برابر ہیں۔“

اس نے کیمسٹری کے آخری ملنے والے ٹیسٹ کی جوابی کاپی کو دوبارہ سے صفحہ با صفحہ دیکھنا شروع کیا تھا اور ساتھ ہی طلحہ کو وضاحت دی تھی۔ نمبریکل کی ایک غلطی نے اسے ٹیسٹ میں تین مارکس کم دلوائے تھے۔ اسے فی الحال اپنے ابو کے خوف سے زیادہ کوئی چیز یاد نہیں تھی، جبکہ طلحہ کو شرارت کا موقع مل گیا تھا۔  
”تم پڑھا کو لوگ بھی بس ایویں ہی ہوتے ہو۔ اب لڑکی بھی کون سی پسند آئی جو منہ متھے لگنے کے قابل بھی نہیں ہے۔ سانولی اور موٹی۔ جسے مسکراتا بھی نہیں آتا۔ اونسس۔“ طلحہ بظاہر اسے چڑا رہا تھا۔ بڑھتی عمر کے ساتھ اس کی گفتگو زیادہ ہی بے لگام ہوتی جا رہی تھی۔

”مجھے وہ لڑکی پسند نہیں آئی۔ میں نے اسے کبھی دیکھا بھی نہیں۔ میں نے اس کا نام بھی آج پہلی بار سنا ہے۔ مجھے کیا پتا وہ سانولی ہے یا موٹی۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ کیمسٹری میں مجھے بیٹ کر رہی ہے۔ میرے ابو کو باقی تینوں سبجیکٹس نظر نہیں آئیں گے۔ صرف کیمسٹری کا رزلٹ نظر آئے گا اور صبا نورین کا نام نظر آئے گا۔“ وہ اکتا کر بولا تھا۔ اکیڈمی میں لڑکے لڑکیوں کی کلاسز الگ الگ ہوتی تھیں، لیکن حوصلہ افزائی کے لیے رزلٹس ایک نوٹس بورڈ پر ڈسپلے کیے جاتے تھے۔

”تمہارے ابو کو یہ نام بعد میں نظر آئے گا۔ پہلے تمہاری نظر اس نام پر اٹے گی۔ سچ بتاؤ، کہیں تم

نے جان بوجھ کر تو کیمسٹری میں کم مارکس نہیں لیے؟“  
طلحہ کی ٹرین ایک ہی اسٹیشن پر رک سی گئی تھی۔

”میرا دماغ ابھی اتنا ناکارہ نہیں ہوا۔“ اس نے غلط ہو جانے والے نمبریکل کو دوبارہ چیک کرتے ہوئے کہا تھا۔ دو جگہ والیوم کا یونٹ نہ لکھنے پر سر نے اس کے تین مارکس کاٹ لیے تھے۔ اسے اس چیز کے لیے سر سے بھی شکایت تھی کہ یونٹ نہ لکھنے پر ایک نمبر کٹنا چاہیے تھا۔

”ہو جائے گا۔ ہو جائے گا۔ دماغ کو ناکارہ ہوتے کون سی دیر لگتی ہے۔“

طلحہ نے پھر کہا تو وہ اکتا کر اس کے پاس سے اٹھ گیا تھا۔ دوستی اپنی جگہ تھی، لیکن بڑھائی اس کی ترجیحات میں سرفہرست تھی، جسے وہ کبھی نظر انداز نہیں ہونے دیتا تھا۔ لیکن اس کے دوست زندگی کی غیر ضروری دلچسپیوں میں گمن رہنے لگے تھے۔ اس کی ان دونوں کے ساتھ بے تکلفی بڑھی تھی تو وہیں ان دونوں کی کچھ عادات سے اسے چڑ بھی ہونے لگی تھی۔ خصوصاً ”طلحہ سے اسے زیادہ شکایات تھیں۔“

طلحہ کافی منہ پھٹ تھا اور بڑھائی کے لیے اتنا سنجیدہ نہیں تھا جتنا کہ شروع میں نظر آتا تھا۔ اونچے قد کاٹھ اور ٹیکھے نین نقش والا طلحہ کا بلاشبہ خوش شکل لڑکوں میں شمار تھا، لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ اپنی اس خوبی کے زعم میں کچھ زیادہ ہی جتلا رہنے لگا تھا۔ بچلے درجے کے فیشن اور شو بزمیگنہ پڑھ پڑھ کر وہ خود کو کسی فلمی ہیرو سے کم نہیں سمجھتا تھا۔ اس کی گفتگو بھی فلمی جو کس اور فلمی گوسپ کے گرد گھومتی تھی، تب ہی اس کے منہ سے ایک لڑکی کا نام سن کر اور اس کے متعلق استفسار سن کر وہ بلاوجہ اسے اس لڑکی کا نام لے کر چیخنے لگا تھا۔

فرسٹ ایئر کا رزلٹ آنے والا تھا۔ اسی لیے اکیڈمی کے ٹیچرز اکثر اپنے بہترین اسٹوڈنٹس کا ذکر لیکچر یا پریکٹیکل کے دوران کرتے تو صبا نورین کا نام بھی بکثرت سننے کو ملتا۔ جب بھی یہ نام سنائی دیتا طلحہ خوا خواہ اور ذہنیت سے اسے جتنے لگتا، کہنی مار کر متوجہ کرنے

کی کوشش کرتا یا آنکھیں جھما جھما کر مسکراتا شروع کر دیتا۔ وہ ان کی ایسی حرکات کو نظر انداز کرتا، مگر کبھی کبھی اسے ہنسی بھی آجاتی جس سے انہیں مزید شرم لیتی۔

یہ سلسلہ شاید اسی طرح چلتا رہتا، مگر فرسٹ ایئر کے رزلٹ نے یکدم ہر چیز پر بڑا سا قفل اسٹاپ لگا دیا تھا۔

”مجھے تم سے یہی امید تھی۔“ ابو نے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے کہا تھا۔ وہ کبھی اسے دیکھتے تھے اور کبھی ہاتھ میں پکڑی مارکس شیٹ دیکھنے لگتے تھے۔ ان کے سامنے میز پر اس لڑکی کی مارکس شیٹ پڑی تھی، جس نے بورڈ میں فرسٹ پوزیشن حاصل کی تھی، جبکہ وہ اس بار تیسری پوزیشن حاصل کر پاتا تھا۔ اس کے ابو ان لوگوں میں سے تھے جن کے لیے تیسرا درجہ آخری ہوتا ہے۔ اس کے اوپر نیچے درمیان میں کچھ نہیں ہوتا۔ اس لیے اس کی تیسری پوزیشن ان کے لیے کوئی کارنامہ نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح اس پر برس رہے تھے اور یہ سلسلہ تب سے جاری تھا جب سے رزلٹ باقاعدہ اناؤنس کیا گیا تھا۔ آج وہ نجانے کس طرح فرسٹ اور سیکنڈ آنے والی لڑکیوں کی مارکس شیٹ نکلا لائے تھے اور اب ایک بار پھر اس پر برس رہے تھے۔  
”تم نے ثابت کر دیا ہے کہ تم لاٹوں کے بھوت ہو۔ تم سے نرمی برتنے کا مطلب ہے۔ غلطی۔ صرف غلطی۔“

انہوں نے اس کی مارکس شیٹ اس کے پاؤں میں پھینک دی تھی۔ وہ پہلے ہی سر جھکائے کھڑا تھا۔ مارکس شیٹ قدموں میں گرتے ہی اس نے گردن مزید جھکا لی تھی۔ مارکس شیٹ پر لکھا اس کا اپنا نام اسے ذرا سادھند لایا ہوا لگ رہا تھا۔ حالانکہ اس کی آنکھوں میں نمی نہیں تھی۔ ابھی تک ابو نے اسے ایک بھی پھپر رسید نہیں کیا تھا۔ وہ شاید آج صرف لفظوں کی مار سے اسے گھائل کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

”میری محنت کا یہ صلہ دیا ہے تم نے مجھے۔ لوگوں کو باتیں بنانے کا اچھا موقع مل گیا۔ تم اپنی نہ سہی



برقرار تھا۔ اس کے اندر کھلبلی سی جگمگاتی تھی۔  
 ”ابو فرسٹ پوزیشن لینے پر بھی خوش نہیں تھے  
 ابو تھرو پوزیشن لینے پر بھی ناراض ہیں۔ جب میں ابو  
 کو خوش کر ہی نہیں سکتا تو کس لیے۔ کیوں؟“  
 اس کے ابو کو اس سے ”صلہ“ چاہیے تھا اور وہ  
 ”گلہ“ کر رہا تھا۔

\*\*\*

”ارے لڑکے کیا ہر وقت فارغ بیٹھے رہتے  
 ہو۔ یہاں آؤ۔“ میں گھر کے دروازے کے باہر بیٹھا  
 خشک نڈمنڈ بکھرے میلے میلے سہ رنگی پتوں کو دیکھ رہا  
 تھا جو میرے سامنے ہی درخت سے علیحدہ ہوئے تھے۔  
 ان میں اور مجھ میں بہت مماثلت تھی اور فرق صرف  
 ایک تھا۔ وہ باؤں کے نیچے کھلے جاتے تھے تو چڑھ کر  
 شور مچاتے تھے، اپنے ہونے کا احساس دلاتے تھے جبکہ  
 میں نے یہ کام چھوڑ دیا تھا۔ گرینی۔ مسٹر ایرک اور  
 کوہو۔ میں سب سے لا تعلق اور لا پرواہ ہو چکا تھا۔  
 میں نے سب کو ان کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔  
 ”ارے لڑکے! میں تم سے مخاطب ہوں۔“

لکڑی کے جنگلے کے اس پار سے پھر کوئی پکار رہا تھا۔  
 میں نے کھڑے ہو کر دیکھا۔ وہ مسٹر ایرس تھے۔ میرا  
 ان سے تعارف تھا۔ کبھی ملاقات ہوئی تھی، گو ہونے  
 مجھے ایک بار ان کے بارے میں بتاتے ہوئے محتاط  
 رہنے کی ہدایت کی تھی کہ وہ کافی بد مزاج شخص ہیں۔ وہ  
 ہمارے ساتھ والے گھر میں رہتے تھے، میں نے انہیں  
 کئی بار آتے جاتے اپنے گھر کے لان میں خود سے باتیں  
 کرتے دیکھا تھا۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ وہ کچھ بد مزاج  
 اور غصیلے قسم کے انسان ہیں۔ وہ اپنے گھر میں اپنی  
 ہاؤس کی پرانی زور سے چلاتے تھے کہ ان کی آوازیں  
 ہمارے گھر کے لان تک آتی تھیں۔

”میں ڈی ونچی کا آرٹ پس نہیں ہوں۔ اتنے  
 غور سے مت دیکھو مجھے۔ میں اس بات کا برا ماننا  
 ہوں۔“

ان کی آواز میں اور ان کے انداز میں مزاح کی

میری عزت کا خیال کر۔ لیکن نہیں۔ تم ایسا کیوں  
 کرو گے۔ تمہیں تو موقع چاہیے باپ کو ذلیل کرنے  
 اور کروانے کا۔ سب لوگ کہتے تھے کہ اسے کسی  
 بڑے کالج میں داخل کرواؤ، میں نے کہا نہیں۔ بڑے  
 کالج میں ایڈمیشن کا مطلب ہے الٹی سیدھی  
 سرگرمیوں میں وقت ضائع کرنا۔ پچھتیں طرح کی  
 سوسائٹیاں بنی ہوتی ہیں ایسے کالج میں۔ بچوں کو گھر  
 گھار کر اس میں شامل کر لیتے ہیں۔ پھر ان کا وقت  
 ضائع کرتے ہیں، لیکن مجھے یہ نہیں پتا تھا کہ میرا بیٹا کسی  
 سوسائٹی کا حصہ بنے بغیر بھی یہ کام اچھے طریقے سے  
 کر سکتا ہے۔ میں ذرا مصروف کیا ہوا تھا، میں برزے  
 نکالنے کا موقع مل گیا۔ ”ان کا لہجہ سرد تھا، مگر الفاظ  
 شعلوں کی طرح گرم تھے۔ اسے اپنے ماتھے پر پسینے کی  
 نمی محسوس ہونے لگی تھی۔“

”جانتے ہونا اس سال سے انٹری ٹیسٹ ہو گا۔  
 پورا پنجاب بیٹھے گا اس ٹیسٹ میں۔ ایک ایک نمبر  
 کے لیے سخت مقابلہ ہو گا اور ڈس کو الیفائی ہونے کا  
 مطلب ہے میڈیکل کی فیلڈ میں نو انٹری۔ سن رہے  
 ہو میری بات۔ ایک ایک نمبر کا مقابلہ ہے۔ ایک بات  
 غور سے سن لو۔ میں دوبارہ نہیں دہراؤں گا۔ اگر تم  
 میرٹ لسٹ پر نہ آسکے تو میں بخشوں گا نہیں تمہیں۔  
 اپنے ہاتھوں سے گولی مار دوں گا۔“

اس کے ابو بھول گئے تھے کہ بخشے کا اختیار صرف  
 اوپر والے کے ہاتھ میں ہے۔ وہ اپنا غصہ اپنے بیٹے پر  
 اتار رہے تھے، جبکہ بیٹا ان کی باتوں پر پہلی بار اتنا غمگین  
 نہیں ہوا تھا۔ اس کے لیے اس کے ابو کی باتیں جو ہر  
 کے پانی کی طرح تھیں۔ سڑی ہوئی اور بدبودار جو اسے  
 سرد اور ذہنی تعفن کے علاوہ کچھ نہیں دیتی تھی۔ اس  
 نے فرسٹ آنے والی لڑکی سے آٹھ نمبر کم لیے تھے وہ  
 پر امید تھا۔ فرسٹ پوزیشن حاصل کر لینا بہت بڑا  
 معرکہ سر کرنے کے برابر نہیں تھا۔ وہ میٹرک میں یہ  
 کام کر چکا تھا، مگر تب بھی ابو نے اسے گلے لگا کر مبارک  
 باد نہیں دی تھی۔ وہ تب بھی اس سے اتنا ہی دور تھے  
 جتنا کہ اب۔ ان کا اور اس کا درمیانی فاصلہ آج بھی

جھلک تھی نہ بے تکلفی کا کوئی عنصر۔ وہ سنجیدہ اور کسی  
 قدر کرخت دکھائی دیتے تھے۔ میں نے چاہتے ہوئے بھی  
 کسی معمول کی طرح سیڑھیاں اتر کر جنگلے تک اور پھر  
 دروازہ کھول کر ان کے ساتھ چلنے لگا۔  
 ”میرے گھر آؤ۔ کچھ بات کرنی ہے۔“ وہ ساٹھ  
 کے بیٹے میں لگتے تھے۔ ان کی چال میں چستی تھی اور  
 ان کے ہاتھ میں لاپٹھی بھی نہیں تھی، لیکن ان کی  
 پشت تھوڑی خمیدہ تھی۔

”ہم یہاں ہی کھڑے ہو کر بات کر لیتے ہیں۔“  
 جب وہ اپنے گھر کے اندر قدم رکھنے لگے تو میں نے کہا  
 تھا۔ وہ میری جانب مڑے۔ ان کی آنکھوں میں  
 ناپسندیدگی تھی۔  
 ”مرد راستے میں کھڑے ہو کر باتیں کرتے ہوئے  
 اچھے نہیں لگتے۔ بالخصوص دوپڑھے لکھے، سمجھ دار  
 اور وجہ مرد۔“

انہوں نے بنا مسکرائے کہا تھا۔ میں بھی نہیں  
 مسکرایا تھا۔ ہم دونوں میں سے کسی ایک کی حس مزاح  
 یقیناً ناکارہ اور قابل مرمت تھی۔ میں ان کے پیچھے  
 ان کے گھر میں داخل ہو گیا۔  
 ان کا گھر کشادہ اور صاف ستھرا تھا۔ ہلکی سی حدت  
 کے ساتھ فضا میں میٹھی سی خوشبو بھی محسوس ہوتی  
 تھی۔ مجھے سب کچھ بہت بھلا سا محسوس ہوا۔ تمام تر  
 حسات کو جیسے سکون ملا ہو۔ میں نے چند بے آواز لمبی  
 سانسیں بھریں۔

”آپ تنہا رہتے ہیں؟“ وہاں کوئی آہٹ سنائی دی  
 تھی نہ آواز، سو میں نے پہلا سوال یہی کیا تھا۔ وہ ہال  
 سے ہو کر اوپر کی جانب جانے والی سیڑھیوں کی طرف  
 بڑھ رہے تھے۔ میں بھی ان کے پیچھے تھا۔

”میں گناہ گار ہوں نہ فرشتہ۔ میں کیوں رہوں  
 تنہا۔“ وہ مجھے جتا رہے تھے۔ مجھے ان کے اس جملے کے  
 ابہام نے الجھا دیا۔

”میں معافی چاہتا ہوں، لیکن مجھے کوئی نظر نہیں آیا  
 تھا۔ اس لیے میں نے پوچھ لیا۔“ میں نے وضاحت  
 کی۔ سیڑھیاں ختم ہو چکی تھیں۔ اب ہم کوریڈور سے

گزر رہے تھے۔ دیوار پر جابجا چھوٹے بڑے فریم  
 آویزاں تھے۔ ہر چیز میں بہت سلیقہ اور قرینہ نظر آ رہا  
 تھا۔ میں نے دل ہی دل میں مسٹر ایرسن کی نفاست و  
 خوش ذوقی کو سراہا۔  
 ”کون نظر نہیں آیا تمہیں۔ کسے دیکھنا چاہ رہے  
 ہو تم۔ میرے ساتھ کوئی نہیں رہتا۔ اکیلا ہوں  
 میں۔“

انہوں نے ڈیٹ کر کہا۔ میں نے چونک کر ان کی  
 جانب دیکھا۔ لیکن چونکہ میری جانب ان کی پشت  
 تھی، سو میں ان کا چہرہ نہیں دیکھ پایا تھا۔ وہ ایک دروازہ  
 کھول کر اندر داخل ہو گئے۔  
 ”آپ نے خود ہی تو کہا تھا کہ آپ اکیلے نہیں  
 رہتے۔ آپ گناہ گار ہیں نہ فرشتہ۔“

میں نے انہیں یاد دلایا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میرے  
 سامنے مسٹر ایرسن نہیں، بلکہ گرینڈ پا کھڑے ہوں۔  
 میں ان کے ہمراہ جس کمرے میں داخل ہوا تھا وہ  
 دراصل ایک بڑی سی لائبریری تھی۔ چاروں دیواروں  
 کے ساتھ چھت تک کتابیں ہی کتابیں تھیں۔ ایک  
 جانب آرام کر سکتی تھی، جبکہ دوسری جانب اسٹڈی ٹیبل  
 تھی۔ جس پر ایک کتاب اونڈ می بڑی تھی۔ ایک الگ  
 کارنر میں رائٹنگ ٹیبل بھی نظر آرہی تھی۔

”میں اکیلا رہتا ہوں، مگر تنہا نہیں ہوں۔ دونوں  
 باتوں میں فرق ہے اور میرے پاس نہ تو اتنا دل ہے نہ  
 وقت کہ میں اس فرق کو تم جیسے احق کو سمجھا سکوں۔“  
 ان کی آواز میں غصہ نہیں جھلکتا تھا، لیکن الفاظ وہ  
 غصیلے ہی استعمال کرتے تھے۔

”یہ میری دنیا ہے۔ اسے صاف کرنے کے کتنے  
 پیسے لوگے؟“ انہوں نے میرے تاثرات کی پروا کیے بنا  
 پوچھا تھا۔

”نی دنیا کو گندا کرنے کے کتنے پیسے خرچ کیے تھے  
 آپ نے؟“ میں ان کی پہلی بات پر غصہ میں تھا۔ اس  
 لیے میں نے ان ہی کے انداز میں پوچھا تھا۔ انہوں نے  
 مرکز لغور میرا چہرہ دیکھا، پھر دوسری جانب مڑے۔

”تمہارا مطلب ہے کہ جتنے پیسے اس کو گندا کرنے







”میرا سامان اب کیوں پیک کر دیا جا رہا تھا۔“  
دروازے کے باہر بیڑھیاں اترتے ہوئے میں نے سوچا تھا۔

”یہ دونوں عورتیں کب تک مجھے پنگ پانگ سمجھتی رہیں گی۔“

بیڑھیوں کے بعد اب سرخ روش شروع ہو گئی تھی۔ مسٹر ایمرسن کے سامنے بھی کچھ بجھا بچھا سا تھا۔ اپنا سب کام پنپا کر۔ جب میں ان کے سامنے بیٹھا تو زیادہ دیر تک اس کا بلا تے سوال کو ان سے پوچھنے سے روک نہیں پایا تھا۔

”کیا بد قسمتی کا کوئی تریاق نہیں ہوتا؟“ میرے لمبے سے رنجیدگی سے چاہتے ہوئے بھی ٹپک رہی تھی۔

”سنا ہے وہم کی بیماری لاعلاج ہوتی ہے۔ اور میری معلومات کے مطابق لاعلاج بیماریوں کے لیے کوئی تریاق نہیں ہوا کرتا۔“

وہ اپنے مخصوص چہرے سے انداز میں کہہ رہے تھے۔ ان سے گفتگو کرتے ہوئے ہمیشہ یہ احساس حاوی رہتا تھا کہ شاید وہ آپ کی باتوں کو ناپسند کر رہے ہیں۔ لیکن مجھے اتنے دنوں میں ان کے ساتھ رہتے ہوئے یہ اندازا ہو گیا تھا کہ ان کے چہرے کا یہ تاثر مستقل تھا اور تجربات زندگی کی دین تھا۔

”آپ بد قسمتی کو وہم کہہ رہے ہیں؟“ میں نے پوچھا تھا۔

”نہیں۔ وہم کو بد قسمتی کہہ رہا ہوں۔“ یہ بھی ایک مخصوص طنز یہ جملہ تھا مجھے باور کروانے کے لیے کہ جب بات واضح ہے تو بلا وجہ سوال کی کیا ضرورت تھی۔

”تم جانتے ہو تمہارا مسئلہ کیا ہے؟“ وہ میری جانب متوجہ تھے۔ وہ ایک گھنٹہ جو وہ میری خدمات کے معاوضے کے طور پر مجھے دیتے تھے۔ اس میں وہ کسی استاد کی طرح مکمل نیک نیتی سے مجھے برواشت کرتے تھے۔

”قدرت نے تمہیں چھوٹی عمر اور بڑا دماغ دے دیا ہے۔ تم قدرت کی اس مہربانی پر شکر گزار ہونے کے

درمیان ایک بات مشترک تھی، وہ انسانوں سے اکتائے ہوئے تھے اور میں انسانوں کا ستیا ہوا تھا۔ ہم دونوں بہت اچھے دوست بن چکے تھے۔ میں ان کی لائبریری کا کیرٹیکر بن گیا تھا۔ ان کی لائبریری میں کیمیا اور نادر کتابوں کا ذخیرہ تھا۔ ابتدا میں مجھے کتابیں پڑھنے کا اتنا جنون نہیں تھا، لیکن میرے پڑھنے کی رفتار اتنی تیز تھی اور مسٹر ایمرسن نے ابتدا میں مجھے چند کتابیں پڑھنے کو دی تھیں۔ جو انہیں میں نے بہت جلد پڑھ کر واپس کر دیں جس سے وہ بہت خوش اور حیران ہوئے۔ پہلی بار انہوں نے مجھے ازراہ مروت اپنی کتابیں دی تھیں، پھر وہ مطالعہ کو میرا جنون سمجھ کر خوشی خوشی یہ کام کرنے لگے اور میں نے بھی پہلی بار کتابیں صرف ان کا دل جیتنے کو پڑھنا شروع کی تھیں، لیکن مجھے بھی دھیرے دھیرے اس کام میں مزا آنے لگا۔

کوہو کا بلا وجہ ویلا ضرورت سوال اسی لیے مجھے بد مزہ کر گیا تھا۔

”کوئی کام ہے۔ مجھ سے؟“ میں نے بنا ان کی جانب دیکھے سوال کیا تھا۔ وہ چپ رہیں جیسے کچھ سوچ رہی ہوں۔ میں نے اپنا جیکٹ پہنا اور اس کے کالرز کو کانوں تک پھیلا کر باہر نکلے لگا۔

”تم جہاں بھی جا رہے ہو۔ وہاں سے جلدی واپس آ جانا۔ تمہارا سامان پیک کرنا ہے۔“

وہ سابقہ انداز میں بولیں، جبکہ میں نا صرف حیران ہوا بلکہ عجب شش و پنج میں گھر گیا۔ کوہو کا شروع سے ہی یہی انداز تھا۔ وہ مجھ سے اپنی مرضی سے مخاطب ہوتی تھیں اور مرضی کی ہی بات کرتی تھیں۔

پہلے میرا دل چاہا کہ ان سے پوچھوں کہ اب مجھے کہاں بھیجا جا رہا ہے، لیکن جان بوجھ کر انہیں چڑانے کے لیے میں نے یہ ارادہ ترک کر دیا۔

”اوکے۔ میں اپنی پوری کوشش کروں گا۔“ ان کے سامنے سے تو میں سپاٹ چہرہ لیے ہٹ گیا تھا۔ لیکن دروازے سے باہر قدم رکھتے ہی جیسے میرا دل بے چین ہوا تھا۔

بجائے اسی سے انتقام لینے پر تل گئے ہو۔ اتنا مت خرچ کرو اس دماغ کو۔ آئندہ بہت مرحلے آنے ہیں اس کام کے لیے۔“

ایک بار پھر وہی مخصوص ناگوار انداز، ناصحانہ الفاظ۔ مجھے بھی ہمیشہ کی طرح غصہ آیا۔

”آپ خود بھی بوڑھے ہو چکے ہیں اور آپ کا دماغ بھی۔ آپ کی ساری جنریشن کا یہی مسئلہ ہے کہ جو چیز آپ لوگوں نے اپنی ذات پر نہیں برتی ہوتی آپ اسے ”وہم“ قرار دے دیتے ہیں، لیکن مسٹر ایمرسن لازمی نہیں کہ جو چیز آپ نے زندگی میں کبھی تجربہ نہ کی ہو وہ صرف وہم ہی ہو۔ ہم زندگی کو جس رنگ کے شیشوں کی عینک لگا کر دیکھتے ہیں زندگی اسی رنگ کی نظر آتی ہے، لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں ہوتا کہ باقی رنگ ہیں ہی نہیں یا پھر ہمارا وہم ہیں۔ آپ کسی پیدائشی اندھے شخص سے پوچھیں کہ تاریک رات کے اس پار کیا ہوتا ہے تو وہ یہی جواب دے گا کہ مزید تاریک رات۔ اسے بھی آپ اس کا وہم قرار دیں گے؟“

میں نے ان سے سوال کیا تھا۔ میرا انداز جارحانہ ہو گیا تھا۔ ان کی عینک ان کی نوکیلی ناک کے آخری سرے پر تھی اور وہ مکمل طور پر اخبار میں منہمک نظر آنے کی اداکاری کر رہے تھے۔

”اندھا نہیں جانتا کہ رات کے بعد دن بھی ہوتا ہے، کیونکہ اس نے کبھی دن دیکھا نہیں ہوتا۔ اس لیے ہم اسے ”وہم“ نہیں کہہ سکتے۔ وہ بد قسمت ہوتا ہے مسٹر ایمرسن۔ بد قسمت۔“

میں نے آخری لفظ پر اپنی ساری قوت لگادی تھی۔ انہوں نے گردن ہلائی۔

”تم تو بہت ذہین ہو گئے ہو۔“ وہ بظاہر مجھے سراہ رہے تھے۔ ”چلو مان لیتا ہوں کہ اندھا شخص بد قسمت ہوتا ہے۔ لیکن کیا تم اندھے ہو؟“ یہ ان کا پہلا سوال تھا۔ انہوں نے آنکھوں سے عینک اتاری تھی۔

”تم کسی اور معذوری کا شکار ہو۔ گوگلے ہو یا ہرے۔ لوٹے، لنگڑے یا کسی دائمی مرض کا شکار ہو۔“

عینک کے شیشوں پہ ان کا عکس دھندلا ہونے لگا تھا۔

”قدرت نے تمہیں مکمل تندرست اور ایک جائز بندھن کے نتیجے کے طور پر دنیا میں بھیجا ہے۔ کسی بھی انسان کی خوش قسمتی کی اس سے بڑی دلیل کوئی نہیں ہو سکتی کہ قدرت اس کی اتنی معاونت کرے۔ یہ ذرا میری عینک صاف کرو۔“

بات کرتے کرتے انہوں نے اپنی عینک مجھے تمھارے دی تھی۔ میں اپنے روبرو اسے صاف کرنے لگا۔ ”اس لیے خود کو بد قسمت کہہ کہہ کر قدرت کو زیر کرنے کا خیال دل سے نکال دو۔ تم یہ کام نہیں کر سکتے۔“

ان کا انداز قطعی تھا اور میرا موقع بھی سو میں نے پر عزم ہو کر ان کی عینک ان کی جانب بڑھائی اور چوکس ہو کر میدان میں آیا۔

”میرا ایسا کوئی ارادہ بھی نہیں ہے۔ میں نے وہ کام کرنا ہی ترک کر دیے ہیں جو میں نہیں کر سکتا یا اچھے طریقے سے نہیں کر سکتا، لیکن جو کام میں اچھے طریقے سے کر سکتا ہوں۔ وہ تو میں ضرور کروں گا۔“

”اچھا۔ میں بھی تو سنوں کہ تم کون سا کام اچھے طریقے سے کر سکتے ہو۔“

انہوں نے ٹانگ پر ٹانگ اور ناک پر عینک رکھ لی۔ ہاتھ میں جو کتاب تھی۔ وہ بھی کرسی کی انتہی پر اوندھی رکھ دی۔

”بحث۔ کم از کم یہ میں کر سکتا ہوں مسٹر ایمرسن۔“

”تمہارے پاس بمشکل تیس منٹ باقی ہیں۔ کام کی بات کرنی ہے تو کرو ورنہ جاؤ یہاں سے۔“

انہوں نے دوبارہ کتاب کی پشت پر ہاتھ رکھا۔ یہ ان کا نفسیاتی حربہ تھا۔

”کیا واقعی ”بد قسمتی“ صرف ہمارا وہم ہوتی ہے۔“ میں نے پوچھا تھا۔ انہوں نے زچ ہو کر گہری سانس بھری۔

”میرا موقف تو کم از کم یہی ہے کہ ”بد قسمتی“



تو یہ اچھی تقدیر ہے اور جب آپ اپنی تقدیر پر قانع نہ ہوں اور دبدو مخالفت پر اتر آئیں تو یہ بری تقدیر بن جاتی ہے۔

قدرت کے ساتھ مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ مقابلہ اپنے برابر والوں سے ہوتا ہے۔ قدرت پر راضی ہوا جاتا ہے۔ اس کی لکھی تقدیر پر قانع ہوا جاتا ہے۔ یہ بات تم جتنی جلد سمجھ لو اتنا اچھا ہے۔ میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ قدرت آپ کو مکمل پیدا کرے اور ایک ایسے بندھن کے نتیجے میں پیدا کرے جو جائز ہو تو یہی اس کی آپ پر سب سے بڑی مہربانی ہے۔ اس مہربانی پر شکر ادا کرنا سیکھو۔ قانع ہونا سیکھو تقدیر کو اوڑھنی بچھو نہیں اسے پشت پر نہیں بہاؤ کی طرح سینے پر رکھو تقدیر کو ”زیر“ نہیں ”زیر“ کرنا سیکھو۔

ان کا انداز ہمیشہ کی طرح مدلل اور مفصل تھا۔ مجھے بہت کچھ سیکھنے کو ملا تھا لیکن ان کے کہنے کے مطابق تقدیر کو زیر کیسے کرنا تھا یہ میں نہیں جانتا تھا۔

”میں جانتا ہوں کہ تم اپنے حالات سے مطمئن نہیں ہو۔ تمہاری زندگی میں کچھ مشکلات ہیں لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ تم اس وہم کا شکار ہو جاؤ کہ تم بد قسمت ہو۔ یہ تو ایسا ہی ہے کہ اپنی ناکامی پر اپنے ہاتھوں سے ماتھے پر ”بد قسمتی“ کا ٹیک لگا لو اور اس کے بعد خود کو کوٹنے لگے بجائے قسمت کو تقدیر کو کوستے رہو۔ اس سے تم کامیاب نہیں ہو جاؤ گے۔ کامیابی کے پیچھے صبر آزما محنت درکار ہوتی ہے۔ تم کامیاب عظیم لوگوں کی زندگیوں کا مطالعہ کر کے دیکھو۔ ہر شخص مشکلات سے دوچار رہا بعد از ازا رہا۔ جیسے کرانسٹ سے لے کر نیوٹن آئن اسٹائن تک ہر شخص کی زندگی میں مشکلات تھیں لیکن آج کی دنیا ان کا نام کامیاب انسانوں کے طور پر لیتی ہے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو۔ تم اچھے لڑکے ہو۔ تم میں بہت صلاحیتیں ہیں۔ میں نے تمہیں آزمایا ہے۔ تمہاری انگلیوں میں لفظوں کے خزانے دفن ہیں۔ تم ابھی اس سے بے خبر ہو۔ وقت آنے پر اس خزانے کو دل کھول کر استعمال کرنا۔ تم خود کو بد قسمت کہنا چھوڑ

صرف وہم ہوتی ہے تم خود سوچو قدرت ایک دنیا بناتی ہے، اسے محبت سے تخلیق کرتی ہے، اسے نعمتوں سے برکتوں سے مالا مال کرتی ہے۔ اپنی مخلوق کے لیے ہر آسانی عطا کرتی ہے۔ اس کا مطمح نظر کبھی یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنی مخلوق کو پریشان کرے یا اسے دکھ دے یا اس کی بے چینی کا باعث بنے۔ یہ کام حضرت انسان خود کرتا ہے۔ اس دنیا میں جتنی کشش ہے، جتنی بے سکونی ہے وہ ہماری یعنی انسان کی پیدا کردہ ہے۔ بد قسمتی بھی اسی بے سکونی کا نام ہے۔ وہ لمحہ بھر کے لیے رکے پھر بولے۔

”قدرت نے اسے تخلیق نہیں کیا۔ اس نے تقدیر لکھی ہے۔ چلو تم اسے قسمت کہہ لو۔ ایک بات ذہن نشین کر لو۔ قدرت آپ کی ”تقدیر“ کو آپ کی آسانی کے لیے لکھتی ہے۔ یہ پاؤں کی بیڑی ہے نہ ہتھکڑی نہ زنجیر یہ وہی ہے جو آپ ہیں یعنی آپ کو دنیا میں بھیجنے سے پہلے قدرت جس حفاظتی پرت سے آپ کو ملفوف کر دیتی ہے اسے ”تقدیر“ کہتے ہیں۔ قدرت آپ کو جس ”تقدیر“ کا تحفہ دیتی ہے۔ یقین کرو وہی ”مناسب ترین“ ہوتی ہے۔ ایک عمدہ مونوں لباس کی طرح۔ آپ کسی اور کے لباس میں اتنی آسانی سے نہیں سما سکتے جتنا کہ خود اپنے لباس میں۔ اس لیے اسے قدرت کا دان سمجھو۔ عطا مہربانی۔ یہ بندش نہیں ہے کہ اس کا توڑ ڈھونڈا جائے۔ یہ بیماری نہیں ہے کہ اس کا تریاق مانگا جائے۔ فرض کرو قدرت انسان کو اپنے ہاتھوں سے تقدیر لکھنے کا موقع دے دیتی تو کیا ہوتا۔ دنیا کا اس سے برا حال ہو جاتا جواب ہے۔ انسان تو آزادانہ طور پر اپنی خوراک کے بارے میں یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ وہ ہر کو کیا کھا رہا ہے تو شام کو کیا کھائے گا۔ کل کیا کھائے گا۔ کل کے بعد کیا کھائے گا۔ یہ قدرت کا کام ہے میرے بچے۔ اسے کرنے دو۔“

وہ ایک بار پھر رکے اور چند گہری سانس بھریں۔ ”میں یہ مانتا ہوں کہ تقدیر کے دو پہلو ہیں۔ اچھی تقدیر جب آپ اپنی تقدیر پر ہنسی خوشی قانع ہو جائیں

”آپ قرآن پڑھنا چاہتے ہیں؟“ نور محمد نے دوسرا سوال کیا تھا۔

”وہ تو پڑھ چکا ہوں میں۔“ احمد اب اپنے ہاتھوں کی جان دیکھنے لگا تھا۔ نور محمد نے نا سمجھی کے عالم میں اس کا چہرہ دیکھا۔

”نماز آپ کو آتی ہے قرآن آپ پڑھ چکے ہیں۔ تو پھر مجھ سے کیا سیکھنا چاہتے ہیں آپ؟“ وہ تذبذب میں گھر کر پوچھ رہا تھا۔ اسے متے حل کرنے نہیں آتے تھے۔

”کیا دین میں نماز قرآن کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے؟“ احمد نے سر اٹھائے بنا پوچھا تھا۔ نور محمد اس کے سوال پر ششدر رہ گیا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

”مجھے شرط صرف یہی ہے کہ شارٹ کٹ مت تلاش کرو۔ محنت کرو اور تقدیر پہ قانع ہونا سیکھ لو۔“

انہوں نے گہری دیکھی اور کتاب دوبارہ اٹھالی۔ ایک گھنٹہ پورا ہونے میں ایک منٹ ہی باقی تھا۔

”مزید کچھ پوچھنا ہے تمہیں؟“ یہ انہوں نے منہ سے نہیں کہا تھا لیکن ان کا انداز میری سمجھ میں آ رہا تھا۔

”تقدیر پہ قانع ہونے کا کوئی تریاق ہے؟“ میں نے ان کے چہرے کی طرف دیکھا وہ گہری کی طرف دیکھ رہے تھے۔

”ہاں۔ سو نمونہ کیا کرو۔“ انہوں نے کہا اور کتابوں میں گم ہو گئے۔ ایک گھنٹہ ختم ہو گیا تھا۔

\*\*\*


”آپ دین سکھاؤں گے نا مجھے؟“

احمد معروف کے کعبے میں آس ہی نہیں کرب بھی تھا۔ وہ بہت دھیمی آواز میں ہر لفظ پر زور دے کے بول رہا تھا۔ نور محمد کو اس پر غصہ نہیں آیا۔ احمد معروف پر غصے کا اثر ہوتا بھی نہیں تھا۔ نور محمد کو اس پر ترس آیا۔ وہ کیسا اونچا لباسا شخص تھا دیکھنے میں تو اتنا بھی تھا مگر تاجانے کس کس کا ستایا ہوا تھا کہ جب اپنے مخصوص لمبے میں نیلی آنکھوں کو جھکا کر التجائیہ انداز میں بات کرتا تو منہ سے لفظ جلتی موم جی کے موم کی طرح پکھل پکھل کر نچے گرتے۔ ان لفظوں کو ہاتھ لگاتے بھی نور محمد کو ڈر لگتا تھا کیونکہ موم گرم بھی ہوتا ہے لیکن پھر نور محمد کو ترس آنے لگا کیونکہ موم ٹھنڈا بھی ہو جاتا ہے۔

”آپ نماز سیکھنا چاہتے ہیں؟“ موم ہی ٹھنڈا نہیں ہوتا انسان کا مزاج بھی ٹھنڈا ہو جایا کرتا ہے۔ نور محمد کے لمبے میں نرم سی ٹھنڈک اتری تھی۔ خدا ترسی مزاج کو نرم کر رہی دیا کرتی ہے۔

”میں کوئی بچہ تو نہیں ہوں۔ نماز آتی ہے مجھے۔“ احمد معروف نے ذرا سا مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ اس کی مسکراہٹ میں بھی ہچکچاہٹ پنہاں تھی۔

**خواتین ڈائجسٹ**  
کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول



**دیکھ کر رزق محبت**

قیمت - 300 روپے

صائمہ لکھنوی

منسلک کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار، کراچی۔ فون نمبر: 32735021



## کنیز نور علی



”پھپھو! یہ دیکھیں فاطمہ کے لیے شرٹس لائی ہوں۔ اس کا طرز ڈسے ہے کل اور کوئی ڈھنگ کا ڈریس نہیں تھا۔ مجھے بہت فکر تھی۔ لیکن یہ دیکھیں ائی نے لے کر دی ہیں۔“

عریشہ خوشی خوشی شاپنگ بیگز سے کپڑے نکال نکال کر ساس کو دکھا رہی تھی۔

”اچھے ہیں نا۔“

”اچھے ہیں۔ بہت اچھے ہیں۔“ ان کا لہجہ ساٹھا تھا۔ ناگواری کے تاثرات کو چھپاتا ہوا۔ لیکن خوشی کا اظہار بھی مفقود تھا۔ عریشہ سمجھ تو گئی تھی۔ لیکن فی الوقت شاپنگ کی خوشی میں اس طرف توجہ نہیں دینا چاہتی تھی۔

”یہ بدر کے شوز بھی ہیں۔ سیل لگی ہوئی تھی۔ کافی مناسب قیمت پر مل گئیں سب چیزیں۔“

اس نے ایک مشہور برانڈڈ شاپ کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔

”اب جلدی سے کھانا بنا لو۔ بچے آنے والے ہوں گے اسکول سے۔“ پھپھو کو شاپنگ کی تفصیلات سے زیادہ بچوں کے آنے میں دلچسپی تھی لیکن عریشہ کچھ اور سوچے بیٹھی تھی۔

”سالن بنا ہوا ہے پھپھو! شام کو احسن کے لیے کچھ بنالوں گی۔“ قدرے بے فکری سے اب وہ چیزیں سمیٹ رہی تھی۔

”بچوں کے لیے کچھ تازہ مزے دار سی چیز بنالوان کی پسند کی۔ خوش ہو جائیں گے۔ کل کا سالن اور روٹی بڑے تو کھالیں لیکن بچوں کے لیے تو سزا ہی ہے۔“

عریشہ پچھلے کچھ سالوں سے الگ رہ کر آزادی کی عادی ہو گئی تھی۔ اب ساس ایک بار پھر اس کے پاس رہنے کے لیے آگئی تھیں۔ ان کی یہ روک ٹوک نصیحت اور مشورے اسے کسی وقت بے حد کھٹکتے تھے۔ اور کسی موقع پر ان کی کوئی ہدایت بے حد کام آتی تھی۔ ایسے موقع پر اسے بے حد خوشی بھی ہوتی تھی۔ ساس بسو کی اگر کسی بات پر نہیں بنتی تھی تو ایسے بھی بہت سارے معاملات تھے جن میں دونوں کا اتفاق ہو جاتا تھا۔ وہ ایک دوسرے کی بات سنا بھی کرتی تھیں اور وقت آنے پر ایک دوسرے کو سمجھا بھی لیا کرتی تھیں۔ بدگمانی، غلط فہمی اور منافقت سے آپس کے رشتے کو تلخ نہیں بناتی تھیں۔ بلکہ ابھی ہوئی گرہ کو تھوڑی محنت کر کے سلجھاتی تھیں۔ اس لیے دل میں ایک دوسرے کے لیے محبت قائم تھی۔

عریشہ کی ساس شادی بیگم پچھلے چند سال سے بڑے بیٹے کے پاس کراچی میں مقیم تھیں۔ اب کچھ عرصے پہلے وہ اپنی فیملی کے ساتھ یورپ شفٹ کر گئے تو وہ اپنے چھوٹے بیٹے کے پاس واپس لاہور چلی آئیں۔ وہی اپنا گھر وہی معمولات تھے۔ بچے اب بڑے ہو چکے تھے۔ اسکول جاتے تھے۔

شادی بیگم کی لاڈلی بھتیجی اور پیاری بسو کے ساتھ خوب بنتی تھی۔ جہاں وہ اس کے اخلاق، مروت اور سکھراپے پر خوش تھیں۔ وہیں انہیں عریشہ کے کچھ کاموں پر اعتراض اور تشویش بھی ہوتی تھی۔ انہیں آئے ہوئے چار ماہ ہو رہے تھے اس دوران انہوں نے محسوس کیا کہ عریشہ بے شک سکھ رہے گھر کے کاموں

میں طاق بھی ہے، لیکن بعض جگہوں پر وہ بے جا فضول خرچی کر کے اپنے لیے خود ہی تنگی کا سالن پیدا کر لیتی تھی۔ قریب ہی مہکے تھے۔ ہر دوسرے دن وہاں کے چکر اور پھر وہاں سے شاپنگ کے لیے نکل جاتا۔ اگر اپنے پیسے برباد نہیں کرتی تھی تو ماں کے لیے سے خرچ کر کے سالن اٹھائے گھر چلی آتی تھی۔ آج بھی بچوں کے اسکول جانے کے بعد گھر کے کچھ کام پٹنا کر بیٹھی تھی۔ وہاں سے اپنی امی کے ساتھ مارکیٹ اور اب گھر واپس بچوں کی شاپنگ کے ساتھ آئی تھی۔ شاید بیگم کو اس بات پر سخت اعتراض تھا۔ وہ ان عورتوں میں سے نہ تھیں۔ جو اس بات پر خوش رہتی ہیں کہ بسو میکے سے لالا کر گھر بھرتی رہے اور ان کے بیٹوں کی کمائی میں سے خرچ نہ ہو۔ انہوں نے بہت محنت سے اپنے بچوں کو پالا تھا۔ اپنی اولاد کے لیے ایسی آسائشوں کے حق میں نہ تھیں جو بعد میں آلام کا باعث بنیں۔

سوا ب جب عریشہ آچکی تھی تو انہوں نے بھی اسے سمجھانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

عریشہ شاپنگ بیگز کمرے میں رکھنے جا چکی تھی۔ واپس آکر وہ ابھی بیٹھی ہی تھی کہ انہوں نے کہہ دیا۔

”وہ کباب رکھے ہوئے ہیں بچوں کے لیے برگر بنادو۔ کچھ اور مایونیز وغیرہ ڈال کے۔ خوش ہو جائیں گے۔“

”ہائے پھپھو! دو چیزیں بنیں گی۔ اس طرح تو بجٹ آؤٹ ہو جائے گا۔ کباب تو مہمانوں کے لیے بنا کر رکھے ہیں۔“

”کچھ نہیں ہوتا۔ برکت کی دعا کیا کرو۔ اچھا بھلا تو ہو رہا ہے گزارہ۔ سلیقے سے چلو گی تو کچھ آؤٹ نہیں ہو گا۔“

”کہاں پھپھو! ابھی یہ شاپنگ امی نے کروادی ہے۔ میں نے تو شکر کیا۔ بے فکری ہو گئی ورنہ سب کچھ خود لیٹا پڑتا تو مینے کے آخر میں بہت مشکل ہو جاتی ہے۔ بجٹ دیکھ کر چلنا پڑتا ہے۔“

پھپھو کو یہ بات ناگوار گزری تھی۔



”اتنا کم تو نہیں کماتا میرا بٹاکہ تمہیں یوں ماں سے لے کر گزارہ کرنا پڑے۔ میں جب سے آئی ہوں تمہیں سمجھائے جا رہی ہوں کہ سلیقے سے سمجھ داری سے خرچ کرو۔ لیکن کچھ فائدہ نہیں کہنے کا۔“ انہوں نے ناراضی سے کہا۔

”آپ منگائی تو دیکھیں پھپھو! میں نے کون سی فضول خرچی کر دی ہے۔ جو آپ خفا ہو رہی ہیں۔ یہ سب آج امی نے لے کر دیا ہے۔ میں نے خود نہیں لیا میں سچ کہہ رہی ہوں۔“ عریشہ نے ان کی غلط فہمی کو ختم کرنے کی کوشش کی تھی۔ ابھی تک اس کی ”امی



نے لے کر دیا ہے۔" کی تکرار جارہی تھی۔ پھپھو کے سمجھانے کو وہ غلط رنگ دے رہی تھی۔  
 "کیوں لیا ہے ماں سے؟ کوئی خاص وجہ ہے اس کی؟ کوئی عید سالگرہ خوشی کا موقع۔ کس وجہ سے ماں نے یہ تحائف دیے ہیں؟" ان کے الفاظ سخت لیکن لہجہ کافی نرم تھا۔  
 "میری امی مجھے ویسے نہیں دے سکتیں کیا پھپھو! اس میں حساب کتاب کیسا؟" عریشہ صدمے میں بولی تھی کہ پھپھو نے کس قدر عجیب بات کی ہے۔ ماں سے لینے پر اعتراض کیوں بھلا!

"عریشہ! میں اگر تمہیں ایک بات سمجھاؤں۔ کوئی نصیحت کروں تو اسے غلط مت سمجھنا بیٹا! میری کوئی بیٹی نہیں ہے اور سوؤں کو بیٹی ہی سمجھا ہے میں نے۔ پھر تم تو میرے بھائی کی اولاد ہو۔" ان کا لہجہ نرم سے نرم تر ہوتا جا رہا تھا۔ عریشہ کو ایک دم فکر لاحق ہوئی تھی کہ آخر بات کیا ہے۔ عجیب قسم کے اعتراض اور عجیب تر بات۔  
 "کیا بات ہے پھپھو! مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہے کیا۔ بتائیں پلیز۔" وہ فکر مندی سے بولی تھی۔  
 "اپنے شوہر کی کمائی سے گھر چلاؤ بیٹا! اللہ اسی میں برکت دے گا۔ ماں کے گھر پر تمہارا لاکھ حق سہی۔ لیکن یوں روز روز ماں سے لینا بھائیوں کے دل میں تمہارے لیے نفرت کا بیج بو دے گا۔ اور ان ہی باتوں کی وجہ سے ماں کے بعد لڑکی کو میکے میں خوش دلی سے بلانے والا کوئی نہیں ہوتا۔"

"یہ کیا بات ہوئی پھپھو!" اس نے قدرے نا سمجھی سے انہیں دیکھا تھا، جیسے بات اس کی سمجھ سے قدرے باہر تھی لیکن پھپھو کی بات ابھی جاری تھی۔  
 "جو ماں میں ہر وقت بیانی ہوئی بیٹیوں کے لیے مال اور چیزیں اکٹھی کرنے میں لگی رہتی ہیں ان کے دل بہوؤں کے لیے تنگ ہو جاتے ہیں۔ پھر ایک دوسرے کے لیے دل میں جگہ نہیں رہتی۔ ایسی ماں اچھی نانیاں تو بن جاتی ہیں لیکن دایاں بہت ظالم اور کٹھور ہوئی ہیں یہ۔ بچوں میں بھی فرق رکھتی ہیں۔ پہلے بیٹی

کے لیے۔ بعد میں نواسے نواسیوں کے لیے ہی فکر مند رہتی ہیں۔ کیا فائدہ ایسی فکر کا جو دل میں نفرت پیدا کر دے۔ اگر وہ دونوں طرف محبت بانٹیں تو آئندہ بھی ان کی اولادیں خوش و مطمئن تو رہیں ناں۔ یہی اصل بات ہے۔ تم لو اپنی ماں سے۔ فرمائش بھی کرو گھر۔ عید بقر عید پہ اپنی اور بچوں کی سالگرہ پر جیسے ہر گھر کی روایت ہے ویسے۔ لیکن ہر وقت کے اس لین دین سے بچو۔ دوسروں کے حقوق مار کر اپنا گھر مت بھرو۔ بہتر یہی ہے دوسروں کے حق انہیں لینے دو۔ تم اپنے حصہ پر قانع رہو۔

میرے بیٹے کی کمائی پر گزارا کرو۔ جتنا رزق تمہارے نصیب میں ہے وہ تمہارے گھر تک پہنچ کر رہے گا لیکن اگر یوں زور زبردستی سے ماں کے گھر سے پیسہ لاکر اپنے گھر کی غریبی ختم کرنے کا جتن کرو گی تو یہ اور بڑھے گی کیونکہ یہ غریبی نہیں تمہارے دل کی حرص ہے۔ جو ختم نہیں ہوتی۔"

وہ اپنی بات پوری کرنے کے بعد اسے غور سے دیکھ رہی تھیں۔ عریشہ بے حد گم صم ہو گئی تھی۔  
 "پھپھو! اس حوالے سے تو میں نے کبھی نہیں سوچا۔ میرا تو خیال تھا امی کے گھر پر میرا حق ہے۔" پہلے نہیں سوچا تو اب سوچو بیٹا۔ مانتی ہوں تمہارا حق ہے لیکن صرف تمہارا حق نہیں ہے۔ اور بھی حق دار ہیں۔ انہیں ان کا حق لینے دو۔ بیٹیوں کے حوالے سے ماں بہت جذباتی ہوتی ہیں۔ بہوؤں کی حق تلفی کرنے میں عار محسوس نہیں کرتیں۔ لیکن اگر بیٹیاں تم جیسی سمجھ دار ہوں تو ماؤں کو ان غلطیوں سے بچالیں گی۔ مجھے یقین ہے تم میری بات پر غور کرو گی۔ میں اب وضو کر لوں۔ تم روٹیاں بنالو۔ بچے بس پیچھے والے ہوں گے۔"

وہ اٹھ کر وضو کرنے چل دی تھیں اور عریشہ کے اندر سوچ کا ایک درواہا ہوا تھا۔

☆

طبل فلور ایڈر ڈبل طاقت





سائنس و صحت

## صحت کی حکمت

”آپ ہر بار یہی کہتی ہیں۔“ وہ کچھ مانے کو تیار نہیں تھا۔ آریا پار کا ارادہ کیے بیٹھا تھا۔  
”نہیں بیٹی۔“ وہ لہجے میں مزید شدت سمو کر گویا ہوئی۔ ”ہر بار کیوں؟ کتنی امپورٹنٹ ہے آپ کے لیے پڑھائی، لفٹھ اسٹینڈر کا ایگزام۔ اس کے رزلٹ پر آگے آپ کو۔“  
”مام!“ اس نے بات کاٹ دی۔ ”ایگزام تو امپورٹنٹ ہی ہوتا ہے مگر یہ چھٹیاں ہیں اور سب گھر جا کر انجوائے کر رہے ہیں۔“  
”گھر میں کیا انجوائے منٹ۔ میں اپنے آفس میں بڑی ہوتی ہوں۔ آپ کے بابا ویسے بھی کسی سٹیشن ٹور پر ہوں گے۔ بچھوٹے بہن بھائیوں کے ساتھ آپ کیا کرو گے۔ وہ تو بہت ہی چھوٹے ہیں نا۔“ اس کی ساری سلجھے لہجے کی گفتگو درحقیقت یکوا اس تھی۔ وہ خود بھی سمجھ رہی تھی اور سامنے بچے کو بھی اس ”یکوا اس“ سے کوئی سروکار نہیں۔  
”ہاں تو میں ان ہی کے ساتھ کھیلوں گا نا۔“ اس نے اپنے دل کی بات کہی۔  
”نہیں گود میں اٹھاؤں گا، گھوڑا بنوں گا، دونوں کو باریاں دوں گا اور ہم کھلونوں سے کھیلیں گے نا۔“  
”ارے۔ ارے۔ ایسے تو وہ گر جائیں گے۔ چوٹ لگے گی تو رونہ پڑیں گے۔“ اس نے چہرے پر

مکمل ناول





مصنوعی ہر اس پیدا کیا۔  
 "میں گرنے بھی نہیں دوں گا اور چوٹ تو کبھی بھی  
 نہیں لگے گی اور رو میں گے تو چپ کرواؤں گا۔ میں بڑا  
 بھائی جان ہوں ماما۔"  
 "وہ تو آپ ہوئی۔" اس نے آگے بڑھ کر اس کے  
 بال سنوارے۔  
 "میں تو دراصل یہ چاہ رہی تھی کہ آپ اسکول  
 گروپ کے ساتھ میر کو جاتے یہی تو انجوائے کرنے  
 کے دن ہیں۔"  
 "مجھے بس گھر آنا ہے اور صرف گھر کے اندر رہنا  
 ہے۔ کہیں بھی نہیں جانا۔ یہاں تک کہ میں لچیا ڈنر  
 کے لیے بھی باہر نہیں جانا چاہتا۔ ایوری تھنگ ایٹ  
 ہوم۔" وہ قطعیت سے کہہ رہا تھا اور اسے اس لہجے کی  
 پہچان تھی۔  
 "آپ بس مجھے گاڑی بھیج دیں۔ ورنہ میں اسد  
 کے ساتھ آجاؤں گا۔"  
 "اوہ۔ نہیں۔" وہ گہرائی۔ "کیلے مت نکلنا میں  
 بھیج دوں گی۔" اس نے ہارے لہجے میں کہا تھا۔  
 وہ اس کے لہجے کا ضدی پن، قطعیت دیکھ آئی  
 تھی۔ وہ اسے خواہ مخواہ کی باتوں سے بہلا رہی تھی جبکہ  
 بخوبی جانتی تھی۔ اتنے دن کی چھٹیوں میں وہ اکیلا ہاسٹل  
 میں کیا کرے گا۔ وہ ہاسٹل یا پردھائی سے بھاگنے والا بچہ  
 نہیں تھا۔ بہت کلیئر تھا اپنی پردھائی کے حوالے سے۔  
 اس نے کبھی ضد نہیں کی کہ اسے ہاسٹل میں رہ کر  
 نہیں پڑھنا۔ خاندان کے کئی بچے پڑھتے تھے اور  
 جہاں اس کی مام کی پوسٹنگ تھی وہاں اچھا اسکول نہیں  
 تھا۔ اس اوسکے۔ بٹ وہ چھٹیوں میں ادھر ادھر کیوں  
 گھومتا ہے۔ اسے گھر میں رہنا ہے پہلے جب بہت  
 چھوٹا تھا تب سب سمجھ جاتا تھا، لیکن اب وہ بڑا ہو رہا تھا  
 وہ سوال و جواب کر کے لاجواب کرنے میں ماہر ہو گیا  
 تھا۔  
 کم از کم اس کو تو ایسا ہی لگتا۔ وہ اس سے محبت کرتی  
 تھی، مگر اس کے ساتھ بیٹھ کر وقت گزارنا بہت مشکل

لگتا۔ بچوں کے لایعنی سوالوں کے جواب تحمل اور  
 کاملیت کے ہمراہ دینا اور بچوں کو سنا دینے ہی صبر آزما  
 کام ہے۔ دل گروے اور طرف کا اور پھر اگر بچہ ذہین ہو  
 اس کے سوالوں اور حیرتوں اور اعتراضات کا جواب تو  
 وہ گوگل سرچنگ کے ذریعے بھی نہ دے پاتی۔  
 اب بھی دانتوں تلے ہونٹ دبائے اسے دیکھ رہی  
 تھی جو لاؤنچ کے بیچ بیچ کھڑا سوال تھا حیران تھا  
 بے یقین تھا اور سب سے بڑھ کر وہی تھا۔  
 "آپ نے میرے بغیر شہیر کا برتھ ڈے سیلبریٹ  
 کر لیا۔"  
 "کوئی خاص سیلبریشن نہیں۔ بس آپ کے بابا  
 اچانک کیک۔"  
 "دس ازناٹ اچانک کیک ماما۔" وہ چلایا تھا۔  
 "اچانک ایسے نہیں ہوتا۔" وہ رو دینے کو تھا۔ ماما  
 اسے دیکھ کر کہہ گئیں۔  
 وہ چار فٹ قد کا بچہ تھا۔ بڑے نیکر اور ریڈ شرٹ  
 میں ملبوس، مگر چہرے پر غم صدیوں کو بھگتائے بابے  
 جیسا تھا اسے صدمے نے شل کر دیا تھا۔ وہ جواب  
 چاہتا تھا یہ جانتے ہوئے بھی کہ ماں اسے مطمئن نہ  
 کر سکے گی۔  
 "بیٹا! آپ کی پردھائی۔"  
 "کیا پردھائی! آپ مجھے انفارم کر دیتیں میں آجاتا۔  
 میری میم مجھے فوراً چھٹی دیتیں کہ میں ان کا فیورٹ  
 اسٹوڈنٹ ہوں میں نے کبھی چھٹی نہیں کی سب کام  
 وقت پر کرتا ہوں۔ وہ مجھے اپری شٹ کرتی ہیں۔ میں  
 ان سے ایک بار کہہ دیتا وہ مجھے خود بھیج دیتیں اور آپ  
 کہتی ہیں کہ۔"  
 وہ چپ کر گیا۔ مثالیں کم نہیں ہوئی تھیں وہ یک  
 دم نڈھال ہو گیا تھا۔  
 ماما کو بھی چپ لگ گئی تھی۔ وہ اپنے بارے میں  
 ایک لفظ غلط نہ کہہ رہا تھا۔ یہ خوبیاں اور عادتیں تو اس  
 کی جینز کا حصہ تھیں۔  
 "اس سے پہلے۔" اسے کچھ اور یاد آیا۔ "پچھو

کے بیٹے احسن بھائی کی شادی کا میں انتظار کرتا رہا کہ ہم  
 سب اکٹھے ہوں گے سب فیملی کزنز۔ آپ سے بھی  
 پوچھتا رہا ڈیڈ سے بھی۔ آپ دونوں نے کہا۔ ابھی  
 طے نہیں ہوا۔ کچھ دن باقی ہیں، کبھی یہ بولا کبھی وہ بولا  
 اور میں نے گھر فون کیا تو پتا لگا۔ آپ سب لوگ شادی  
 میں گئے ہیں۔ مجھے بتایا تک نہیں۔" اس کی آواز پھٹنے  
 لگی تھی۔  
 "بیٹا! شادی تو سچ یکدم ہوئی۔ احسن کی ہونے والی  
 سز کے دادا جی بیمار تھے تو انہوں نے زور دیا تو بس جیسے  
 منٹوں میں۔ فیصلہ ہو گیا۔"  
 "تو مجھے کیوں نہیں بلوایا؟" اس کا ریکارڈ وہیں اڑکا  
 ہوا تھا۔  
 "بیٹا! شادی تھی۔ سب ہڑونگ میں ہوا۔ آپ کا نہ  
 ہونا اتنا۔"  
 "لیکن برتھ ڈے میری بغیر کیسے کر لی گئی اب آپ  
 کہہ دیں کہ اس میں بھی میرا کیا کام شادیوں میں بچوں  
 کا کیا کام؟"  
 "ہاں نا۔" ماما تائیدا "سرہلانے لگی۔ تشفی کا نیا  
 جملہ مگر۔  
 "شادی تو بڑوں کا یونٹ ہے۔ بچے تو۔"  
 "کیوں؟" اس نے لڑا کوں اور جاہلوں کی طرح ہاتھ  
 نہجایا۔ "میں نے تو آج تک، کوئی ویڈنگ کارڈ نہیں  
 دیکھا جس پر لکھا ہونے کے ناٹ الاؤڈ۔ وہ اردو میں لکھتے  
 ہیں بمعہ اہل و عیال۔ شادی کلب پارٹی نہیں ہوتی  
 کہ اونٹی مسٹر اینڈ مسز جاتے ہوں۔" وہ اسے ہر بار  
 لاجواب کر دیتا تھا۔ پتا نہیں کیوں وہ ہر بار حیران ہوتی  
 تھی۔  
 "اچھا ابھی آرہی ہیں نا آپ کے تایا کے گھر  
 شادیال۔ تو اس میں تو آپ ہوں گے ہی پیریز کے بعد  
 اپریل میں رکھی جائیں گی، سدرہ کا برتھ ڈے بھی  
 نزدیک ہے۔"  
 "آپ اس میں بھی کوئی بہانہ کریں گی کہ نئی کلاسز  
 شروع ہیں شادی میں کیا رکھا ہے۔"

"میں ایسا نہیں کروں گی زین۔" وہ چاہنے کے  
 باوجود اسے ڈانٹ نہیں پاتی تھی نہ اونچا بول پاتی۔ وہ  
 جتنا بھی بھڑکتا۔ وہ اتنی دھیمی ہوتی جاتی۔ اس کا کیا  
 قصور تھا۔ سارے سارے قصور خود اس کے ہی نکلتے تھے۔  
 سارے جرم، ساری دفعات، سارے خسارے۔ اس  
 کے تھے۔ ان کے تھے ان دونوں کے۔  
 "اور کبھی آپ نے میرا برتھ ڈے تو ایسے  
 سیلبریٹ نہیں کیا فیملی اوکھڑن کہہ دیتی ہیں، کبھی  
 میرے دوستوں کو نہیں بلاتیں بس کیک کاٹ دیتی ہیں  
 گفتش دے دیتی ہیں آپ!"  
 "اچھا! اس بار آپ کی برتھ ڈے بھی ایسے ہی  
 کریں گے۔"  
 "آپ جھوٹ بولتی ہیں۔ اور سوری۔ آپ غلط  
 وعدہ کرتی ہیں یا بھول جاتی ہیں یا کبھی بڑی ہو جاتی  
 ہیں۔" اسے ماں کے رتبے کا احساس تھا اس نے کسی  
 کے ٹوکے بغیر کبھی خود سے کر لی تھی۔  
 "شادی میرے بغیر ہو سکتی ہے بچوں کا کیا کام؟  
 شہیر، سدرہ، مونا، علی، خدیجہ، یعنی پارو۔ کوئی نہیں گیا  
 ہو گا نا؟" اس نے اپنے ہم عمر کزنز کا نام لینا شروع  
 کر دیا۔ "حسن اور شامین بھی۔"  
 "اور برتھ ڈے بھی میرے بغیر۔" وہ صوفے پر  
 اسی کے برابر گر سا گیا۔  
 "میں اتفاق سے البم نہ دیکھ لیتا نیٹ پر پوری ویڈیو  
 تھی۔ مجھے تو پتا بھی نہ لگتا آپ پھر جھوٹ بول۔  
 بتائیں ہی نہ بلکہ۔" وہ رونے لگا۔  
 "آپ لوگ مجھے اپنے ساتھ رہنے ہی نہیں  
 دیتے۔" وہ ہتھیلی سے آنسو گرنے لگا۔  
 ماما کا دل موم ہو گیا۔ قطرہ قطرہ۔ اس نے آگے  
 ہو کر اسے بانہوں میں بھر لیا۔ اپنے ہونٹ اس کے  
 بالوں سے جوڑ دیے۔ وہ بالوں سے اٹھتی میک کو اندر  
 روح تک کھینچ رہی تھی، سکون مل رہا تھا مگر وقتی۔  
 جو بے سکونی دل میں تھی۔ زندگی میں تھی اس کا کیا  
 علاج۔



اور ادھر سر میں پھلی پکڑنے کا بھی بولا۔ سب تیاری کر کے رہنی ہے بابا! دونوں کے پاس اپنی اپنی ذمہ داریوں کے حوالے سے اطلاعات تھیں۔

”آل بابا میرے کو بھی بولا۔ اپنے بیٹے کو بھی ساتھ لے لوں۔ زیادہ لوگ ہوں گے تو زین بابا کو اچھا لگے گا۔“ ڈرائیور نے ذرا آخر سے کہا۔

”ہمارا صاحب ہے ہی بہت اچھا اور میڈم صاحب بھی ابھی اندر۔“ خیرن تفصیل سے بتانے لگی۔

”آو بابا آؤ۔ اللہ سائیں کا خاص لوگ ہوتا ہے ایسا ورنہ ایسا لے پالک بچے کو کون پیار کرتا ہے۔“ ملی نے انگلی آسمان کی طرف اٹھا کر کہا۔ وہ آنکھیں بند کر کے جھوم رہا تھا۔

خیرن اور ڈرائیور نے تائیداً ”زور و شور سے سر ہلائے تھے۔“

\*\*\*

محبت خواب کی صورت۔

نگاہوں میں بسی رہتی ہے کسی مہتاب کی صورت

محبت آگ کی صورت

بچے سینوں میں جلتی ہے تو دل بے دار ہوتے ہیں

محبت کی۔

اس نے اس بار چھٹیاں خوب انجوائے کی تھیں۔ بہت خوش کن وقت گزارا، مگر واپس تو آتا ہی تھا مگر واپس آتے ہوئے وہ خوش نہیں تھا۔ دوبارہ کب چلائے گا سام اور ڈیٹس اور گھر لان اور سارا شہر۔

حالانکہ اس کی بہت ساری خواہشات پوری نہیں ہوئی تھیں۔ پھپھو اور تایا کے گھر مگر نرم خوام نے سختی سے ڈانٹ دیا تھا۔ اسے رویوں کی سمجھ بہت پہلے سے آنے لگی تھی، مگر رویوں کی وجوہات۔؟ وہ کھوج نہ لگاتا۔ اسے لگتا ہے اگور کیا جاتا ہے۔ علیحدہ رکھا جاتا ہے یا پوشیدہ رکھا جاتا ہے، مگر کیوں؟

اس کا سارا سامان چوکیدار اندر لے جا چکا تھا۔ وہ مین گیٹ سے اندرونی عمارت کو جاتی سیاہ سڑک پر بہت تھکے قدموں چل رہا تھا۔ سر پر کیپ تھی ہاتھ میں

بھرائی کرنے کے خیال سے اگلے کئی دن نام اس کے ساتھ گزارے۔ وہ اسے لے کر پارک گئی۔ تینوں بچوں کے ساتھ بیٹھ کر کارٹونز فلم دیکھیں ایک جانب زین کو بٹھایا۔ ایک طرف سدرہ۔ گود میں شہسوہ اسے شاپنگ کروائی یہاں تک کہ اس کے لیے اپنے ہاتھوں سے کچھ کھانے بھی بنائے۔

چپس کھچپ اور سینڈویچز۔ بالوں کو بہت اوپر سمیٹے اپرن لگا کر آستین موڑے وہ ایک ماڈرن شیف لگ رہی تھی۔

”تو ناظرین آج کے پروگرام میں ڈی او صاحبہ ہماری مہمان ہیں اور ہمیں بتائیں گی کہ اپنے بچوں کے لیے کھانا کیسے بناتے ہیں۔“ زین نے بیلن کو ایزاے مانگ اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔

”محبت سے۔“ مانگ اس کے سامنے آیا تو اس دو حرفوں میں بات سمیٹ دی۔

”نہیں ہمارے ناظرین اجزاء کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں کہ آپ نے کیا کیا استعمال کیا۔ کتنی مقدار میں۔“

”بہت سی محبت۔ ڈھیر سا پیار۔ کس حسب ضرورت۔“

وہ بھی شرارت اور مزے کے موڈ میں تھی۔ اس نے اپنی پگن ہیلز زکو باہر نکال دیا تھا وہ خود بچوں کے لیے کچھ بنائے گی۔ حالانکہ اسے کچھ بھی خاص بنانا نہیں آتا تھا پگن اس کی فیلڈ ہی نہ تھا۔ شادی سے پہلے بڑھائی کے چکر۔ بعد میں ایک ملازمہ سرکاری مل گئی۔ ایک سر تاج صاحب نے رکھ دی، لیکن ابھی وہ کچھ نہ کچھ تو بناتی تھی۔

کام والی خیرن اس فرصت سے لطف اٹھانے کے لیے لان میں نکل آئی۔ وہ مالی سے اندر کا حال بیان کر رہی تھی۔ ڈرائیور بھی نزدیک سرک آیا۔

”صاحب تو کل آئے گا۔“ وہ بولا تھا۔ ”کرکٹ کا سب سامان ومان تیار رکھو۔ زین بابا کے ساتھ میچ ہوگا

ہمارا اپنا بچہ۔ مجھے لگتا ہے ہم انصاف نہیں کر پائیں گے۔“

”کیوں نہیں کر پائیں گے۔“ وہ تڑپ کر بولی۔

دونوں قریب ہی بیڈ پر سو رہے تھے پانچ سالہ زین اور دو ماہ کا سبٹین۔ ”لوگوں کے درجن درجن بچے ہوتے ہیں... سنے بچے ہوتے رہتے ہیں تو پرانوں کو نکالتے جاتے ہیں۔“ اس نے اپنے تئیں اسے لا جواب کر دیا تھا۔

”نہیں نکالتے۔ کبھی نہیں نکالتے مگر وہ ان کے اپنے بچے ہوتے ہیں۔ یوں یہ بھی میرا اپنا بچہ ہے۔ میرا خون۔ میرا دل۔ میری۔“ بچہ تو سو رہا تھا اس نے اپنے دونوں ہاتھ سینے سے لگا کر یوں جھپٹے جیسے ان میں بچہ ہو، سینے سے لگا ہو۔

”بہر حال میں فیصلہ کر چکا ہوں۔ اور۔ اور باقی سب بھی یہی مناسب خیال کرتے ہیں۔“

”بابی سب کون؟“ وہ بری طرح جو گئی۔

”بابی سب آئی، بابا اور بھائی، بہن۔“ وہ نظریں چرا کر

گیند تھی جسے تولتے ہوئے وہ آکے بڑھ رہا تھا اس کے پیچھے اس کا بیٹ زین پر رگڑ کھاتا گھسٹ رہا تھا۔ گیند ہاتھ سے لڑھکی روڑے اتری لان میں دوڑی۔ کھلے سے ٹکرائی اچھلی اور پھر گھومتی گھومتی کتنی ہی دور چلی گئی۔

وہ رک گیا اور گیند کی بے بسی کو دیکھنے لگا جو ساکت ہونے سے پہلے کتنی دیر تک لرزتی رہی تھی۔ اسے لگا وہ بھی گیند ہے مگر بس اس کی سوچ اتنی ہی تھی۔ وہ گیند لینے آگے بڑھ گیا۔ نیل بج رہی تھی۔ اسے اب اندر جانا تھا۔

مگر نو عمر زین میں آنے والا ایک جملہ کہ ”وہ گیند جیسا ہے“ واقعی حقیقت تھا۔ وہ واقعی گیند تھا۔

لڑھکتا۔ ٹھوکر کھاتا اور آج سے نہیں ہمیشہ سے۔ جب پانچ سال کا تھا تب سے۔

\*\*\*

”میں منافقت میں نہیں جی سکتا۔ بس تم اسے واپس کر دو۔“

”یہ بے جان مانگی ہوئی کیتلی نہیں ہے جو ضرورت پوری ہو گئی تو واپس لوٹا دیں۔ یہ جان دار انسان ہے بچہ ہے اور وہ بچہ جس نے ہماری زندگی میں اس وقت رنگ بھرے جب ہم جیتے جاگتے انسان تھے مگر کفن پوش دکھائی دیتے تھے۔“

”ہاں تو میں نے کب انکار کیا بدل میں سب کچھ تو دیا محبت، توجہ، خوراک، سرد و گرم سے بچا کر رکھا، لیکن! تم سمجھ نہیں رہی ہو۔ اب نہ تو ہمیں اس کی ضرورت ہے اور نہ ہی اسے ہماری۔“

”نہ کیسی بات ہے۔ وہ فقط پانچ برس کا بچہ ہے اسے کیسے ضرورت نہیں ہے۔ وہ تو کور کی ٹوٹی دبا کر پانی تک نہیں نکال سکتا اور آپ کہتے ہیں۔“ وہ تڑپ اٹھی۔

”میرا یہ مطلب نہیں ہے۔“ وہ جھنجھلایا۔ کیسے سمجھائے اس عورت کو۔

”نہیں یہ کہہ رہا ہوں کہ اب ہماری اپنی اولاد ہے۔“

خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے پیش کردہ

کے لیے مختص

کے لیے مختص

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

فون نمبر: 32735021

37، اردو بازار، کراچی



بولا تھا۔ ”اور دوسرے اصل بات یہ ہے کہ اب وہ پہلے جیسی مجبوری بھی نہیں ہے۔ نہ ہمیں اور نہ انہیں۔“

”کیا مطلب؟“ وہ تاسمجھی سے شوہر کی صورت دیکھنے لگی۔

”مطلب یہ کہ وہ وقت گزر گیا۔ بھول بھال گئی دنیا کہ یہ بچہ پہلے کی بات اور تھی مگر اب تو وہ ویل اسٹبلشمنٹ ہے۔ ایک عہدے پر۔ رتبہ ہے۔ بات میں وزن ہے۔ اب وہ اسے ساتھ رکھ سکتے ہیں۔“ وہ جملوں سے زیادہ آنکھوں سے سمجھا رہا تھا۔

”لیکن کیا ان کی اس نئی زندگی میں اس کی جگہ ہوگی؟ کوئی نہیں جانتا کہ۔“ وہ اٹک گئی۔

”سب سیٹ ہو جاتا ہے۔ جگہ خود بخود بن جاتی ہے۔ میں بہر حال فیصلہ کر چکا ہوں۔ نا انصافی میرے اپنے بچے کے ساتھ ہوگی یہ ڈر نہیں ہے مگر میں اس سے محبت نہیں کر سکوں گا اب۔ تم سمجھ کیوں نہیں رہی ہو۔“

وہ اب پینتر ابدل کر دواؤ کھیل رہا تھا۔ وہ سوچ میں ڈوبی تھی۔

\*\*\*

کالج میں گزارے جانے والے پانچ گھنٹے ذہنی اور جسمانی اعتبار سے پر مشقت تھے اور پھر اگر بڑھنے والی شجرۃ الدرد ہو تو۔ جو کبھی سیر پڑمس نہیں کرتی تھی۔ فارغ وقت میں بھی دوستوں کے جھنڈ میں بیٹھنے کے بجائے وہ لائبریری چلی جاتی۔ کتابیں پڑھتی اخبار کی ورق گردانی کرتی، کینٹین جانے کا شوق بھی نہیں تھا اور پاکٹ منی اس کی اجازت بھی نہیں دیتی تھی۔ وہ اخبار کا پورا صفحہ چرے کے آگے پھیلا لیتی اور بند ہونوں کے ساتھ بے آواز گھر سے لائے پرائے کے لئے اتارتی رہتی۔

لائبریرین نے اس بات کو دیکھ لیا تھا۔ مگر وہ نظر انداز

کر دیتی تھیں۔ وہ سینکڑا ایر میں تھی اور ان پونے دو سالوں میں سب سے زیادہ کتابیں جاری کروانے کا اعزاز اسی کو حاصل تھا۔ اس کے ظاہری حلیے سے اس کی کلاس کا پتا چلتا تھا۔ ایک سفید پوش گھرانے کی سادہ سی لڑکی، سستا سا بیگ، ڈھیلا ڈھالا یونیفارم، لمبی چوٹی، ساوگی سے بنا مانگ نکالے گندھی ہوئی۔ وہ چوٹی آگے ڈال لیتی اور پڑھنے کی محویت کے دوران چند لٹوں سے کھیلتی رہتی۔

سارے اخبارات چاٹ جاتی۔ اتنی قابل اور علم دوست لڑکی کے لیے لائبریرین کے دل میں خود بخود گنجائش پیدا ہو گئی تھی۔

اور بے پناہ ذہنی مشقت کے بعد وہ جسمانی مشقت بھی جھیلتی تھی۔ اور شاید بخوشی بھی۔ یا شاید اب عادی ہو گئی تھی۔ کالج گھر سے کافی دور تھا اور اسے دو بسیں کرنا پڑتی تھیں مگر وہ صبح میں جلدی کے باعث دو بسیں کر لیتی مگر واپسی پر ایک ہی بس لیتی۔ محسنہ اسے پورا کرایہ بھی دیتی تھیں اور جیب خرچ کے نام پر بھی کچھ نوٹ تھما دیتیں۔ مگر شجرۃ کو وہ پیسے بچانے ہوتے تھے۔ اور اسی لیے وہ پراٹھا کھاتی اور پیدل چلتی۔ اور مینے کے آخر میں کوئی کتاب خریدتی۔ نوٹس لیتی اور اپنی پڑھائی کے دیگر اخراجات نکالتی۔ وہ جانتی تھی محسنہ اسے اتنی ہی رقم دے سکتی ہیں۔ جس میں کوئی خارج از امکان نہیں تھی اور بدھونی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

\*\*\*

کلاس میں شجرۃ کی واہ واہ تھی۔ ٹیچر اس کے رزلٹ سے بہت خوش تھیں۔ شجرۃ کی لکھائی موتیوں جیسی تھی اور اغلاط سے پاک پھر اس قابل تھا کہ اسے اخبار میں چھپوا دیا جاتا۔ ”تمہارے پیرٹس بہت خوش ہوئے ہوں گے ناں شجرۃ۔“ ٹیچر کے جانے کے بعد کچھ لڑکیاں تو جملے منہ

پنائی کلاس روم سے بھاگیں۔ مگر ایک ڈھیر سا اس کے سر پر بھی اکٹھا ہو گیا تھا۔ سب اس کا پیپر دیکھنے کی کوشش میں ڈیسک پر گھیرا بنا کر جھکی ہوئی تھیں۔

”پیرٹس نہیں۔“ ایک لڑکی نے ٹوکا۔ ”صرف در۔“ میں صبح کہہ رہی ہوں ناں شجرۃ۔ تمہارے فادر؟ وہ قصداً ”کی کہ شجرۃ خود ہی درست جواب دے دے۔“

”ہاں!“ اس نے واضح صاف لہجہ میں اثبات میں سر ہلایا۔

”وہ فوت ہو چکے ہیں۔ جب میں چھ برس کی تھی۔“

”اوہ! کورس میں تاسف کا اظہار سب کی طرف سے تھا۔“

”تو پھر تم کیا اکیلی رہتی ہو۔ یعنی۔ میرا مطلب ہے کہ۔“

”میں۔ ہم اپنے ماموں کے ساتھ رہتے ہیں۔ میرے دو ماموں ہیں۔“ اس کے انداز میں غلٹ تھی۔ اسے لائبریری جانا تھا، صرف ان پیپرز کی وجہ سے یہاں رکنا پڑا تھا۔ اس کی غلٹ چند کونا گوار گزری۔ منہ بر مارنے کے سے انداز میں پیپر اس کے سامنے بچے گئے۔ اس نے قطعاً ”برانہ مانا۔ بیگ کندھے پر رکھے کھڑی ہو گئی۔

اس کی جانب سے متوقع ری ایکشن نہ دیکھ کر پیپر پٹختے والی لڑکیوں کو اور زیادہ برا لگا۔ جیسے وہ انہیں اہمیت دے ہی نہ رہی ہو۔

”ویسے کلاس میں تو تم خاموش رہتی ہو۔ میرے خیال میں کوچنگ وغیرہ بھی نہیں لیتی ہو۔ نوٹس کی بہت تعریف کر رہی تھیں۔ کیوں؟ کیا اپنے ماموں سے سناؤ؟ ہو؟ یا کسی سے خریدتی ہو ویسے تم خریدنے والی لگتی تو نہیں ہو۔“ کہنے والی نے اسے سر سے پیر تک دیکھا اور پھر تائید اپنی ہم نوا دوستوں کو بھی۔

”صحیح کہہ رہی ہو، میں واقعی نوٹس خریدنے والی نہیں ہوں۔ اور میرے ماموں بڑے ماموں کی ورکشاپ ہے جہاں اسپتیر پارٹس کا کام ہوتا ہے اور چھوٹے ماموں میٹرک فیل ہیں۔ میں یہ نوٹس لائبریری

میں جا کر بناتی ہوں۔ ٹیچر کے لیکچر نوٹ کر لیے جاتے ہیں۔ کلاس میں دماغ حاضر رکھا ہوا اور چھوٹے سے چھوٹے ٹاپک کے لیے بھی کم از کم چار کتابوں سے ریفرنس لے لیا جائے تو تم سب اس سے بھی اچھے نوٹس بنا کر واہ واہ سمیٹ سکتی ہو۔“

اس نے بہت دھیمے لہجے میں نسخہ کیسیا بیان کیا۔ وہ آگے بڑھ رہی تھی۔ ڈھیر خود بخود چھٹ رہا تھا۔ اسے راستہ دینے کے لیے ”میں وہیں جا رہی ہوں“ چاہو تو آپ سب بھی آسکتی ہو۔“

اس نے آخری جملہ کسی قدر تیزی سے کہا تھا اور اس سے بڑھ کر تیزی دکھاتے ہوئے وہ کلاس روم سے نکل گئی۔

\*\*\*

ہر تعریف و تنقید سے پرے شجرۃ الدرد بہت خاموش کیفیت کے زیر اثر اخبار چرے کے آگے پھیلائے بیٹھی تھی اس کے رول کیے پرائے میں بھنڈی کی بھرت تھی۔ مگر نہ تو اخبار پڑھا جا رہا تھا اور نہ ہی شدید بھوک کے باوجود وہ کھانے سے لطف اٹھا رہی تھی۔ بس نوالے حلق سے اتر رہے تھے۔ وہ سطر سطر پڑھ رہی تھی مگر غائب دماغی سی تھی۔ اس کا سارا دھیان کلاس فیلو کی گفتگو میں اٹکا تھا۔

”تمہارے پیرٹس بہت خوش ہوتے ہوں گے“ والا قیافہ اس کے لیے ایک تکلیف تھا۔ ارمان تھا جو حسرت میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اور جیسے اب وہ اس حسرت کو بھی فراموش کر چکی تھی۔ اس کے ابو اس وقت اسے چھوڑ کر چلے گئے تھے جب بچوں کے تالیاں پیٹنے اور بننے رونے ہی کو سراہا جاسکتا ہے۔ یعنی وہ چھٹے برس میں تھی جب وہ فوت ہو گئے۔ پڑھائی لکھائی کے حوالے سے سراہے جانے کا دور شروع ہونے سے پہلے ہی۔ یقیناً ”اگر وہ آج ہوتے تو ان سے زیادہ سراہنے والا اس پوری دنیا میں کوئی اور نہ ہوتا۔ مگر وہ نہیں تھے۔ امی تھیں۔ اور دیگر بہت سے لوگ بھی تھے۔ مگر ان سب کو شجرۃ کی کامیابیوں سے کوئی سروکار



نہیں تھا۔ یہ نہیں تھا کہ وہ اس سے جلتے تھے۔ یا کسی بھی قسم کا عناد و بغض تھا۔ دراصل محسنہ اور دیگر اہل خانہ اور اک رکھتے ہی نہ تھے کہ شجرۂ کتبی قابل ہے۔ کتبی محنتی ہے اور کتبی کامیابیاں سیمتی ہے۔ محسنہ یہ ضرور چاہتی تھیں کہ وہ بڑھے لکھے اور ضرور ہی کچھ بن جائے اس کے اسکول کی اہمیت اتنی تھی کہ وہ اس کا یونیفارم دھو دیتی تھیں اور اس بات کا دھیان رکھ لیتیں کہ کوئی نہ کوئی سوکھا سالن آلو کی بھجیا یا کبھی کبھار اندازاً مینج سویرے موجود ہو جسے وہ اس کے بچ کے پرانے میں رول کر سکیں۔ اس کی کتابوں کے ڈیجر کو سنبھال کر رکھتی تھیں اور ایک ورق بھی ضائع نہ جانے دیتیں۔ یہاں تک کہ گولہ بٹا کر پھٹنے کاغذ کو بھی ہاتھوں سے پرے کر کے سیدھا کر لیتیں اور اسے دکھا کر قطعاً بے کار کی تسلی کے بعد ضائع کرتیں۔

گھر کا ماحول قطعاً علمی نہیں تھا۔

بڑے ماموں نے بڑے بیٹے کو اپنے ساتھ ورک شاپ لے جانا شروع کر دیا اور لڑکیاں بھی ماؤں کے ساتھ ہاتھ بٹاتے بٹاتے گھر میں رہ گئیں اور پھر بہت کم عمری ہی میں اپنے گھروں کی ہو گئیں۔ ایسے لاپرواہانہ ماحول میں شجرۂ الدر کی ذہانت و محنت خدا داد تھی۔ اور شوقِ مرحوم والد کی جانب سے لبو میں گردش کرتا تھا۔ وہ اسکول پہنچتے اور محسنہ فقط اتنا لکھتا رہتا جانتی تھیں کہ گزارہ ہو جاتا۔ کما کے لانے کے لیے شوہر تھے گھر کیسے چلانا ہے۔ اس کی گائیڈ لائن بھی دے دیتے۔ اور محسنہ ان عورتوں میں سے تھیں جو بنا روکد کے شوہر کے بتائے راستے پر چلتی ہیں کہ وہ بالکل درست کہتے ہیں۔ اور ماسٹر عبدالرحیم تو پھر سچے شانداز انسان تھے۔

زندگی نے مہلت نہ دی۔ ابھی تو صرف پوری ب اور آدمی ب کا فرق بتایا تھا۔ اردو اور انگلش میں نام لکھنا سکھایا تھا۔ اس کے ساتھ لک لک کر پانچ تک

کے پہاڑے یاد کیے تھے۔ دو ایک دو۔ دو دوئی چار۔ دو دائیں دس۔ کہ زندگی کی بس ہو گئی۔

شہر کے دوسرے کونے کے کرائے کے گھر میں عدت گزارنی بھی بہت مشکل تھی۔ وہ تھوڑا بہت سالن سمیٹ کر ہمراہ لے گئی بھائیوں کے گھر لوٹ آئیں۔ بھائیوں نے کوئی دعا انہیں کیا تھا سر پر ہاتھ بھی نہ رکھا۔ بنا کچھ کئے نئے سالن کو سونڈ کی میں چڑھاتے رہے۔ بھابیوں کو اندازہ تو ہو چکا تھا کہ یہ زندگی بھری ذمہ داری سر پر بڑی ہے مگر وہ بھی ماں بیٹی کو خود سے لگائے ہچکیاں بھر بھر کے روتی تھیں۔

جوان نند۔ کم سن بچی۔

یہ محسنہ کے ابا کا بھی گھر تھا۔ اور وہ اس میں برابر کی جھے دار تھیں۔ مگر شادی کے بعد اب یہ بھابیوں کا گھر تھا۔ اور محسنہ احسان مند تھیں۔ انہیں مرحوم ابا اہل کا کمرہ دے دیا گیا۔ ایک الماری۔ پٹنگ۔ چار کرسیاں۔ میز چٹائی۔ برتن محسنہ نے خود ہی لاکر بلاورچی خانے میں رکھ دیے۔

بھابی نے پرانا کور پیچینک کر محسنہ کا نیا کور اسٹینڈ میں رکھا تو محسنہ نے کروشہ کا نیا کور پوش بھی نکال کر اوپر ڈال دیا۔

عدت میں چار ماہ تک گھر سے نہ نکلنے کا حکم ہے مگر گھر کے اندر کو نالینے کی اجازت کوئی نہیں دیتا۔ چار دن تک بھابیوں، بھینچوں نے کھانا پانی رکھا اور پانچویں دن محسنہ خود ہی صبح سویرے اٹھ کر آٹا چھانٹنے لگیں۔ سب کو ناشتہ دیتے دیتے سوئی دس سے اوپر چلی گئی۔ بڑی بھابی نوکری ہاتھ میں لے کر سبزی لینے جا رہی تھیں۔

”آج کیا پکائیں محسنہ۔ یہ بھی روز کی مصیبت ہے۔ اب تم ہی بتاؤ۔“

”مٹر آلو بنالیتے ہیں ساتھ ٹماڑی چٹنی۔ محسنہ نے بھی کام میں جتے جتے ہوئے جواب دیا۔ جیسے یہ روز ہی

کا معمول ہو۔ ”تین دن سے گھوم پھر کے گوشت یا چاول ہی بن رہے ہیں۔“ ساتھ وجہ بھی بیان کر دی۔ ”ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔“ چھوٹی بھانج نے تائید کی۔

اور یوں زندگی ایک نئے ٹریک پر یوں چڑھی اور بھاگنے لگی جیسے صدیوں سے بس یو ٹی ہو مارا۔ اور ہوتا رہے گا۔

ایک بے حد نارمل زندگی۔ صبح اور شام کی ایک دوسرے کو پچھاڑنے کی کوشش۔

گھر کا ماحول خوشگوار ہی رہا۔ بیوہ مند مالی لحاظ سے بوجھ نہیں بنی تھی۔ اسے میاں کی پنشن مل جاتی تھی۔ جو بہت قلیل رقم تھی مگر ان ماں بیٹی کے لیے کافی تھی۔ نوے کی دہائی کا آغاز تھا۔

سادگی کا زمانہ تھا۔ اور بیج کلر کے 101 صابن سے مائیں کپڑے بھی دھو لیتیں اور بعد میں بچوں کے سر بھی۔ منہ دھونے کا الگ صابن۔ اماں اپنے ہاتھ پر صابن رگڑتیں اور ایک ہاتھ سے چار بچوں کے منہ نبھا دیتیں۔

لباس ضرورت کی طرح استعمال ہوتا تاکہ نمائش کے لیے۔

خوراک کے نام پر بھی سادگی۔ کبھی کبھار ناشتے کی حلوہ پوری۔ بچے روٹیاں اور پاپڑ کھاتے۔ امیوں کا پتا نہیں۔ غریبوں کے گھر میں پھل خیرک ہی کی طرح آتا تھا۔ اور تقسیم ہو جاتا۔

محسنہ کے لیے یہ سب کچھ معمول کا حصہ تھا۔ وہ اسی گھر سے آٹھ سال پہلے رخصت ہوئی تھیں۔ سو آسانی سے ایڈجسٹ ہو گئیں۔ مگر شجرۂ الدر؟ وہ اپنے ابو کی اکلوتی لاڈلو تھی۔

ابو اسے بات بے بات سیرا جتے تھے۔ وہ محسنہ سے زیادہ عبدالرحیم کے قریب تھی۔ ابو بوائز اسکول ٹیچر تھے مگر وہ اسے ساتھ لے کر جاتے۔ وہ چاک اور ڈسٹر پکڑے کمرہ کمرہ گھومتی۔ ابو حساب کے فارمولوں سے پورا تختہ سیاہ بھر دیتے۔ وہ اپنے قدر برابر کا کونہ سفید

کرتی رہتی۔ منہ سر سب سفید۔ تھوڑا چاک کھا بھی جاتی پھر۔

محسنہ سے ڈانٹ کھاتی کبھی مار بھی۔ مگر عبدالرحیم کچھ نہ کہتے۔ اکلوتی بیٹی جی جان سے پیاری تھی۔

وہ کسی بھی جماعت میں بیٹھ جاتی تھی۔ سب سے اگلے ڈیسک پر۔ بہت ضد کر کے مانیٹر اور پرفیکٹ دونوں کے بیچ بھی سینے پر اکٹھے لگا لیتی۔

اور اب یہاں ماموں کے گھر آنے کے بعد کسی کو دھیان ہی نہ رہا کہ اسے اسکول بھی جانا ہے۔ محسنہ عدت سے انھیں تو ایک دن اسے گھر کے نزدیکی اسکول میں داخل کروا آئیں۔ اسے اسکول پسند نہیں آیا۔ یہاں اسے سب سے آخری ڈیسک دیا گیا۔ یہ پرائیویٹ اسکول تھا۔ ایک کثیر المنزلہ عمارت۔ اسے گراؤنڈ اور پھول پودے درکار تھے اور بڑا درخت وہاں ابو کے گورنمنٹ اسکول کا گراؤنڈ بہت بڑا تھا۔ وہ بھاگ بھاگ کر تھک جاتی تھی اور ابو نے ایک

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

سلسلہ حیات الحکما



انجمن خواتین

قیمت - 300 روپے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

فون نمبر 32735021 37، اردو بازار، کراچی



درخت پر جھولا بھی ڈلوایا تھا۔ اسے نئے اسکول میں ہوا کا فائدہ اٹھانے لگا اور اندھیرا محسوس ہوتا۔ اسکول جانے کے نام پر رونا محسنہ کے لیے حیران کن تھا۔ اسے تو اسکول بہت پسند تھا۔

”مجھے ابو والا اسکول پسند ہے امی! ہم یہاں کیوں آگئے ہیں۔ اپنے گھر واپس چلتے ہیں پھر تو میرا وہ اسکول نزدیک ہو گا دو گلیاں آگے بس۔“ اس نے محسنہ کی سخت باز پرس پر دل کی بات کہی۔

”تمہیں سمجھا چکی ہوں شجرہ! وہ گھر ہمارا نہیں تھا۔ اور اسکول بھی نہیں۔“

”وہ میرے ابو کا اسکول تھا امی۔“ وہ یوں چلائی جیسے کسی نے دل نوج لیا ہو محسنہ چلانے پر بھڑکی تھیں خود کو برداشت کا درس دیا۔

”اور اباب نہیں ہیں بیٹا!“

”تو ابو کہاں گئے آپ انہیں بلا لیں میرے بہت مسئلے ہو گئے ہیں امی۔ مجھے بہت سارا کام سمجھنا ہے۔ انگلش کا اور میتھ کا بھی۔ اردو کا میں نے کر لیا۔“

”وہ واپس نہیں آسکتے۔“ تم بھی نہیں ہو شجرہ۔“

محسنہ دانت بچھنچ کر چلائیں۔ ”یہ ہمارا گھر ہے اور یہی تمہارا اسکول۔ اگر ایسے ہی تنگ کرتی رہیں تو اس اسکول سے بھی چھٹی ہو جائے گی۔ ٹیچر نام کٹ دیں گی پھر تم رہنا گھر کے اندر۔ گندی بچی بن کر رہاں۔“ محسنہ نے تیر نشانے پر لگایا۔ اور وہ ڈر بھی گئی۔

”ٹھیک ہے میں جاؤں گی لیکن میں مانیٹر نہیں ہوں اور آگے بھی نہیں بیٹھتی ہوں۔“

”تم اچھی لائق بچی ہو اور فرسٹ آؤگی۔ تو ٹیچر خود ہی مانیٹر بنادیں گی تمہارے ابو بھی یہی چاہتے تھے تاکہ تم بہت سارے ہو۔“

اور شجرہ کو ایک بار پھر بات سمجھ میں آگئی۔ اسے پڑھنا ہو گا۔

لیکن یہاں پھر ایک مسئلہ ہو گیا۔ اب ابو تو نہیں تھے۔ وہ اپنا کلاس ورک ماموں کے سامنے رکھ دیتی جو تین چار بار پکارنے پر سرسری نگاہ اس پر آگے بڑھائی کاپیوں پر ڈال کر گال سہلا دیتے۔ اس کے لب کھلنے

سے پہلے ہی کہنے لگتے۔

”ہاں ہاں۔ بہت اچھا ہے۔ شاباش۔ تم تو بڑی قابل ہو۔“ وہ پھر کسی سے محو گفتگو ہو جائے جبکہ شجرہ کو پوری تسلی کروانی تھی۔ نقطے لائن رنگ ہر شے ایکسپلین کرنی تھی۔ اور غلطیاں نکلوانی تھیں اور صحیح کروانی تھی جیسے جیسے کہ ابو کرتے تھے۔ لیکن یہ ان کا مزاج نہیں تھا۔ وہ بچی سمجھ کر بچکار دیتے سہلا دیتے مگر پھر آواز لگانے لگے۔

”مازیہ! اگر وہ کھو۔۔۔ بن کیا کہتی ہے۔ محسنہ اسے لے جاؤ۔ جاؤ بیٹا امی سے پوچھ لو یا بھائی سے سمجھ لو۔“

کبھی مامیاں پکارتیں۔ شجرہ! اوھر آ جاؤ ماموں تمہکے ہوئے آئے ہیں سپانی تو پینے دو۔ تم کیا بستہ لے کر پہنچ جاتی ہو۔“

وہ انہیں بتانہ پاتی کہ اسے امی سے نہیں پڑھنا اور نہ ہی اپنی تعریف و توصیف کسی اور کو بتانی ہے اسے بس ماموں ہی کو بتانی ہے جیسے ابو کو بتاتی تھی۔ اور پھر ابو جیسے اسے لے کر گھنٹوں بیٹھ جاتے تھے مگر یہاں ماموں۔ اور ماموں کو اس سے کوئی عناد یا چیز نہیں تھی وہ اس ٹائپ کے تھے ہی نہیں۔ مشینی انسان۔ اپنی نفسیاتی و جذباتی مجبوریوں کی بنا پر وہ بڑھائی پر توجہ نہ دے پاتی جس کے باعث کلاس میں بھی کوئی خاص مقام حاصل نہ کیا پاتی کہ سراہی جاتی۔ الٹا وہ خراب کارکردگی دکھا رہی تھی۔

محسنہ نے سب کچھ سوچ رکھا تھا مگر وہ فیل ہو گی۔ کبھی نہیں۔

”تم پڑھنے پر توجہ نہیں دیتیں شجرہ۔“ محسنہ کو صدمہ ہوا تھا۔ ”کیا اپنے ابو کو یہ رزلٹ دکھاتیں۔“

”ابو نہیں ہیں امی!“ اس نے ٹھنڈے لہجے میں قصہ ہی ختم کر دیا۔ محسنہ دنگ رہ گئیں۔ بہت دیر تک کچھ نہ بول سکیں۔

”لیکن بہت سے لوگ ہیں جو یہ جانتے ہیں تم ماسٹر عبد الرحیم کی بیٹی ہو اور ماسٹر عبد الرحیم کی بیٹی کا ایسا رزلٹ؟ لوگ کیا کہیں گے۔“ محسنہ کو جملوں کی مار مارنا نہیں آتی تھی، مگر شجرہ الدرد کو بہت زور سے لگی۔ وہ

جب تک انہی پوری آنکھیں کھول کر ماں کا چہرہ دیکھنے لگی۔ محسنہ اپنی بات کہہ کر اٹھ کر جانے لگی تھیں۔ ان کا چہرہ اداس تھا پر ملاں۔ وہ شجرہ کو حسب ضرورت توجہ و محبت نہیں دے پا رہی تھیں۔ انہیں اس کی کمی کا ادراک ہی نہیں تھا۔

شجرہ نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے مگر پھر بھیچ لے پھر دوبارہ نہ تو کبھی محسنہ بولیں نہ شجرہ۔ جو چند الفاظ محسنہ نے کہہ دیے اس نے گھر سے باندھ لیے۔

”میں ٹیوشن لگوا دیتی ہوں شجرہ۔ تم اتنا مسئلہ کیوں بنا رہی ہو۔ کلاس میں جو مس بتا میں اسے غور سے سنو اور گھر آ کر یاد کرو۔ اپنا کام پورا رکھو۔ تھوڑی توجہ تھوڑی محنت بس ہر ایک کے آگے کاپی کیوں رکھ دیتی ہو۔“

اس کے یہ کہنے پر کہ اسے کچھ یاد نہیں ہوتا۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ محسنہ نے حل بتایا تھا۔ شجرہ نے سوچا یعنی ذرا سا غور توجہ اور ہر شے کو یاد کر لیتا۔ یہ تو اتنا مشکل کام نہیں۔

”پھر تم نے بھی تو اپنے ابا کی طرح ٹیچر بننا ہے نا۔“ محسنہ نے گرم لہجے پر چوٹ لگائی۔

”ہاں۔ وہ تو مجھے بننا ہے۔“ اس کے ارادے واضح تھے۔

”تو بس جو کرنا ہے تمہیں خود ہی کرنا ہو گا۔“ محسنہ اٹھ گئیں۔ انہیں لیجن میں بہت کام تھے۔ روایتی متوسط گھرانے کی طرح یہاں کام کے پیچھے لڑائی نہیں تھی۔ محسنہ قطعاً ”بھابیہوں کی چاکری“ نہیں کرتی تھیں، مگر اتنے بھرے پڑے گھر میں وہ ایک کام بھی اپنے ذمے لیتیں تو گھنٹوں گزر جاتے۔ مل جل کر ہی کام ہوتے تھے۔ بڑی بھابیہ کپڑے دھوئیں تو چھوٹی جھاڑو پوچھا کرتیں۔ محسنہ کچن دیکھ لیتیں۔ کبھی ترتیب بدل جاتی، مگر فارغ بیٹھنے کی گنجائش قطعاً نہیں تھی۔

شام کے وقت مدرسے سے واپسی کے بعد ماموں چچا کی کپڑوں کو دری ڈال کر بٹھا دیتیں کہ ہوم ورک کر لیں۔ وہ سب بیٹھ جاتے، مگر پھر پنسل ریزر پر

جھگڑتے۔ چھینا چھینی میں وقت گزرتا۔ اس شور ہنگامے میں شجرہ کے لیے ایک لفظ پڑھنا بھی عذاب ہو جاتا۔ وہ خاموشی سے بیگ لے کر پچھلی سیڑھیوں میں آ بیٹھتی۔ محسنہ کا بتایا نسخہ کیما اب ہر مسئلے کا حل تھا۔ وہ ہر شے کو یاد کرتی حلق خشک ہو جاتا، مگر روتے لگاتی رہتی اور پھر کبھی اسکول سے شکایت نہ آتی پھر کبھی وہ فیل نہ ہوتی پھر کبھی اس نے اپنی کاپی کسی کے آگے نہ رکھی نہ کچھ پوچھنے کے لیے نہ بتانے کے لیے نہ ہی دکھانے کے لیے جبکہ اب اس کی کاپیاں اشارز سے رپورٹ کارڈ Good سے بھری ہوئی تھیں۔

اس کی زندگی کا مقصد کورس کی کتابوں کو رٹنا تھا۔ گھول کر پینا تھا۔

وہ ہائیسٹ نمبر لے کر گھر پہنچتی تھی، مگر اب نہ تو چہرہ خوشی سے تھمتا تھا نہ کچھ بتانے کے جوش سے لب کھپاتے تھے نہ دکھانے کے شوق میں وہ بھاگی پھرتی تھی۔ محسنہ نے کبھی پوچھا ہی نہیں کہ وہ خوراتوں کو جاگ جاگ کر یاد کرتی ہے اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے جبکہ وہ صبح غیر ارادی طور پر محسنہ کو مصلے پر بیٹھ دیکھ کر کہہ چکی تھی۔

”امی! دعا کریں۔ میرا ٹیسٹ اچھا ہو جائے۔“ محسنہ نے جواب نہ دیا۔ دعا کے بعد کمرے میں پھونک ماری تو وہ خود بخود پھونک کے دائرے میں شامل ہو گئی۔ وہ ناشتے میں گرم چائے کے بڑے بڑے گھونٹ لیتے ہوئے بھی کتاب پر ہی نظر دوڑا رہی تھی، مگر گھر لوٹنے پر محسنہ نے ایک بار بھی نہ پوچھا کہ ٹیسٹ کیسا ہوا وہ منتظر ہی رہی۔

سب گھر والے یہ ضرور جانتے تھے کہ شجرہ پڑھا کو ہے ایک پڑھنے لکھنے والی سپر ہیرو۔ مگر کتنی قابل کتنی ذہین ہے اس کی گہرائی میں کوئی نہیں اترا ہاں وہ سختی ہے جنون کی حد تک اور کبھی ناکام نہیں ہوتی مہینے میں ایک آدھ بار ماموں اس کی مثال دیتے کہ عقل سیکھو شجرہ سے۔ کتنی قابل ہے۔

لیکن اس کی قابلیت کسی درجے کی ہے نہ کبھی کسی نے جانا اور نہ سراہا۔



لیکن پھر ایک روز اور ایک دفعہ۔

\*\*\*

چھوٹے ماموں ساری زندگی ڈیلی ورجز پر کام کرتے رہے، ملی ملی نہ ملی۔ اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے وہ ایسی امید و بیم والی زندگی پسند نہیں کرتے تھے۔ نوکری ہو تو سرکاری۔ کم کام۔ جیسے مرے تنخواہ ملے گی پھر آخر میں ایک ڈھیری نوٹ اور پنشن الگ۔ دو ادارہ بھی ملتا ہے۔ پہلے شنزاد کو سرکاری اسکول میں داخل کروایا گیا۔ پھر جب ارادہ کر لیا کہ اسے فوج میں بھیجیں گے تو اپنے حساب سے ایک اچھے ریسٹ اسٹوٹ اسکول میں داخل کروا دیا۔ وہ اچھا تو پتا نہیں لگتا تھا۔ مزگا البتہ خوب تھا۔ شروع کے سال تو وہ پاس ہوتا رہا، مگر اب کچھ سالوں سے رزلٹ خراب سے خراب تر ہوتا چلا گیا، یہاں تک کہ وہ فیل ہو کر اس کلاس میں اٹک گیا یہ سب کے لیے شرمندگی آمیز صدمہ تھا جبکہ ماموں کے لیے معاشی دھچکا۔ یعنی کہ یونی فالتو میں اسی پچھلی کلاس میں سال گزارا جائے گا۔ وہی کتابیں، کاپیاں اور فیس ہاں۔

وہ دندنا تے ہوئے اسکول پہنچے اور بدبواتے ہوئے گھر لوٹے۔ پرائیویٹ اسکول کی پرنسپل کو انگلش بولنی آتی تھی، ساڑھے سہنٹیس منٹ کی گفتگو میں اس نے انگلش بول بول ماموں کا دل غل کر دیا۔ ماموں ایک جملہ تک نہ سمجھے، مگر یہ ضرور جان لیا ڈلت کسی بھی زبان میں کی جائے۔ حرف بہ حرف پتا لگتی ہے۔ اتنا تالاق بیٹا۔ سمجھ میں نہ آیا کس منہ سے پرنسپل سے درخواست کریں کہ اسے پروموٹ کر دیں وہ سر دھڑکی بازی لگا دیں گے اسے لائق بنانے کے لیے۔ ”شجرہ۔۔۔ شجرہ بات کرے گی پرنسپل سے اتنی موٹی موٹی کتابیں تو پڑھتی ہے انگلش کی۔“ شجرہ نے حیرت سے سنا اور کوئی بھی تسلی دینے بنا، یقین دلائے بغیر ماموں کے ساتھ نکلی۔

اس نے پرنسپل کا حرف حرف سمجھا کہ وہ اس سے اردو ہی میں بات کر رہی تھیں اور جس کالب لبالب یہ

تھا کہ شنزاد ریاض انتہا درجے کا نکملا پرواز کا ہے۔ اسے ایک کلاس آگے بڑھانے کی نہیں سمجھتے تھے جانے کی ضرورت ہے۔ ماموں کے چہرے کا رنگ بدلتا جاتا تھا۔ شجرہ کو وعدہ کرنا پڑا۔ وہ چونکہ بقول پرنسپل خود اتنی پڑھی لکھی مسجیدہ قابل لڑکی دکھائی دیتی ہے تو اسے ہی اپنے بھائی کو بڑھانا ہو گا۔

ماموں خوش ہو گئے اور شنزاد بھی۔ نئی کتابیں خریدی گئیں اور شنزاد دوستوں کے سامنے ہٹی سے نکلا گیا۔ کام ہو گیا تھا۔ سب نے مانا شجرہ بہت عقل مند ہے۔ کیسے پرنسپل کو قائل کر لیا بھی وہاں۔

مگر ارے۔۔۔

اگلا دن حیران کن تھا۔ شجرہ ماموں یا شنزاد کی طرح جان چھڑا کر وقتی وعدہ نہیں کر کے آئی تھی۔ اس نے جو کیا وہ کسی کے سامن و گمان میں بھی نہیں تھا۔ وہ فرسٹ ایر میں تھی اور شنزاد سکس کلاس میں۔ قدمیں دونوں برابر لگتے تھے تقریباً۔

اس نے شام کو ہاتھ میں موٹا ڈنڈا پکڑا اسے پاس بٹھالیا اور پھر اللہ دے اور بندہ لے ڈنڈا ڈنڈا کر کے کان مروڑ کر بالوں کے گچھے ہاتھوں میں پکڑ پکڑ کے آخر میں ڈنڈے سے مار مار کے اسے پڑھانا شروع کر دیا۔

”ارے کیا جان لیتی ہے لڑکے کی!“ چھوٹی مامی کا دل بند ہونے لگا۔

”خبردار مامی! آپ کا کیا خیال ہے میں وقتی فائدہ حاصل کرنے کے لیے جھوٹا وعدہ کر کے آئی ہوں۔ پہلے سمسٹر میں اچھے نمبر نہ لایا تو دوبارہ بھیج دیں گے چھٹی کلاس میں۔ اسے انسان کا بچہ بننا ہی ہو گا۔“ جملے کے انت میں کتاب اس کے سر پر برسا دی جو گنگ سن رہا تھا۔

”ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ تیرے لاڈلیا رہی نے یہ دن دکھایا ہے۔“ ماموں نے مامی کو جھاڑ دیا۔ ”جیسے دل چاہے پڑھانا پس اسے پاس ہونا ہے فوج میں بھیجوں گا اگر کو تو چہرے کا ٹیلٹ بنوا کر لا دوں؟“

ہاں۔ سب کے کھلے منہ پر ہاتھ ٹک گئے۔ اور چار ماہ بعد شنزاد کلاس میں پانچویں نمبر پر آیا تھا۔ ابھی یہ حیرت آمیز خوشی ہی کم نہ ہوئی تھی کہ محلے کے معجز بڑھے لکھے بندے عبدالغفور صاحب نے ماموں کو روک کر شجرہ کی تعریف میں زین آسمان کے قلابے ملانے شروع کر دیے۔ ان کی دونوں بیٹیاں ٹانھتھ کلاس میں اچھے نمبر لاتی تھیں اور وہ شجرہ سے بہت پڑھتی تھیں۔

”مگر آپ کو برا نہ لگے تو میں بیٹے کو بھی آٹھویں جماعت کے حساب کے لیے بھیج دوں۔ بیٹیاں بہت تعریف کر رہی تھیں بچی کی۔ پڑھائی کے معاملے میں بہت سنجیدہ ہے۔ شنزاد کو بھی اسی نے چلایا ہے ویسے تو شجرہ سے سیکھا حساب یہیں اسے کروائی رہی ہیں مگر وہ ان کے ہاتھ آتا نہیں ہے۔ میرے پاس وقت نہیں ہوتا تو۔“

دونوں ماموں ایک خوش گوار حیرت میں گھر گئے۔ شجرہ قابل تو تھی مگر اتنی۔

”میرے پاس ٹائم نہیں ہوتا ماموں!“ شجرہ نے جواب دیا تھا۔

”ہائیں۔!“ وہ حیران رہ گئے۔

”اور دوسرے جب انعام ارم کو پڑھایا۔ تب میں فارغ تھی وہ چھت سے کود کر آجاتی تھیں۔ اب میری اپنی پڑھائی۔“

”بیٹا! وہ تو تمہاری بہت تعریفیں کر رہے تھے انکار کرتے شرم آئے گی۔ ایک ہی تو لڑکا ہے وہ۔“

”بہر حال اگر وہ اتنا ہی زور دے رہے ہیں تو میں فیس لوں گی۔“

اس بار کا ”کیا؟“ کورس میں تھا سب حق دق رہ گئے تھے کوئی عزت افزائی کی قیمت لیتا ہے۔

”میرا وقت بہت قیمتی ہے۔ پڑھانے کی کیا قیمت لوں گی وقت کی تو لے لوں۔ کام آئے گی۔“

اور خود میں گنگ شجرہ نے شام کے ایک گھنٹے کے لیے ایک کلاس تیار کر لی۔ اسے آگے کالج میں داخلہ لینا تھا۔ اسے بہت آگے جانا تھا۔ کامیاب ہونا تھا ابو کی

طرح ٹیچر بننا تھا۔

اسے اپنے لیے خود راہیں چننا تھیں۔ فیصلے کرنے تھے۔

محسنہ اس سے گھر کا کوئی کام نہ لیتیں۔ وہ دو بجے تک کالج سے آکر گھنٹے ڈیڑھ گھنٹہ آرام کرتی۔ پھر ٹیوشن والے بچے اور پھر گھر کے اپنے بچے جو ماؤں کی کڑی نگرانی میں بیٹھتے تھے سب کو پورے دھیان سے پڑھاتی۔ اس سے بڑے تو بڑھے لکھے بغیر ہی زندگی کی ریس میں شامل ہو چکے تھے، مگر بعد والے اس کے پیچھے چلنا چاہ رہے تھے۔ نئی راہ۔

اب اکثر معاملات میں اس سے رائے لے لی جاتی یا اگر اس نے کچھ کہہ دیا ہے تو۔ لیکن وہ اب ایک خاموش خود میں گنگ لڑکی تھی۔ اپنے کام سے کام رکھنے والی۔ رات گئے تک پڑھنے لکھنے والی۔ جس کے اندر کوئی جھانکتا نہیں تھا یا اس نے کھڑکی ہی بند کر دی تھی۔

\*\*\*

وہ پوری کوشش کر رہی تھی کہ سر کے لیکچر پر دھیان لگائے، مگر ناکام ہو رہی تھی۔ چہرے سے لگتا تھا ”موڈ آف ہے۔“ مایوس ہے چمن اور دل گرفتہ وہ سر کو دیکھنے کے بجائے اپنے گرد بیٹھے دوسرے اسٹوڈنٹ کو دیکھ رہی تھی۔ خاص طور پر ان کو جن کے پاس بے حد ضخیم ڈکٹنری موجود تھی۔

سر آج کا کیا لیکچر دے رہے تھے کچھ پتا نہیں تھا، مگر سر نے پرسوں کیا لیکچر دیا وہ اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ یاد آ رہا تھا اور نئے طریقے سے غم و غصہ میں مبتلا کر رہا تھا۔

”انگلش لینگویج سیکھنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آپ کو ایک سرٹیفکیٹ دے دیا جائے اور آپ منہ بگاڑ کر سواری ٹھینک پوٹاؤ آریو۔“ آئی ایم فائن ٹھینک یو جیسے چند لفظ اور جملے بولنا سکھ لیں۔

”میں یہاں آپ کو انگلش بولنا سکھاؤں گا درست گرامر کے ساتھ اور یہ بھی کہ آپ جواب کو مادری



زبان میں تیار کر کے پھر انگلش میں ترجمہ کر کے نہ بولیں بلکہ وہ آپ کی سوچ کے اندر بھی انگلش ہی میں تیار ہو اور اس برق رفتاری کے لیے ضروری ہے۔ ذخیرہ الفاظ اور متبادل الفاظ سے گہری واقفیت اور اس کا بہترین ذریعہ ہے ڈکشنری کا مطالعہ۔

پھر مسلسل بولتے جا رہے تھے۔ ”سو آپ میں سے کتنے اسٹوڈنٹ ڈکشنری رکھتے ہیں؟“ ”اوہ می کلاس۔“ کے ہاتھ اٹھے۔ ”کتنے ہیں جو ساتھ رکھتے ہیں؟“ ”دو اسٹوڈنٹ کے ہاتھ اٹھے۔ ایک کے پاس ڈائجسٹ سائز کی کتاب تھی اور شجرہ کے پاس اتنی چھوٹی ڈکشنری تھی کہ ہپ پاٹ میں آرام سے آجائے۔

”گٹے لیکن میں جس ڈکشنری کا نام لے رہا ہوں وہ یہ ہے۔“ ”سرنے روٹرم پر بڑی اپنی ڈکشنری اٹھا کر دکھائی۔ یہ تارن کی کسی کتاب کی طرح بے حد موٹی اور وزنی کتاب تھی۔

”جو دو بک آپ نے دکھائی ہیں۔“ ”انہوں نے شجرہ اور دوسرے اسٹوڈنٹ کو دکھا۔ ”یہ چھوٹی کلاسوں میں تو کام آسکتی تھیں مگر اب جب آپ سیریسلی اور پروفیشنلی انگلش کو اپنانے کا ارادہ رکھتے ہیں تو پھر یہی والی۔ یا اس جیسی کی ضرورت ہے۔“ ”انہوں نے اپنی بک پر ہاتھ بجا یا۔ سرنے اپنی بک اسٹوڈنٹ کی جانب بڑھا دیں۔ شجرہ بھی بہت جوش سے دیکھنے لگی۔

سب اور انا پلٹ رہے تھے مگر جب شجرہ کی باری آئی تو اس نے بہت تیزی اور جوش سے قیمت ڈھونڈی تھی اور۔۔۔ جیسے تڑپ کر رہ گئی اتنے زیادہ پیسے اس نے تین ہند سول والی قیمت کو بے یقینی سے دیکھا۔ محسنہ اسے مخصوص رقم پتی تھیں اب جبکہ اس کی اپنی پڑھائی بہت زیادہ وقت مانگتی تھی اس نے صرف تین بچے ٹیوشن کے رکھ چھوڑے تھے اور اس فیس میں کچھ پیسے وہ محسنہ سے لے کر اس بے حد مہنگے انسٹیٹیوٹ کی فیس ادا کر رہی تھی اور اس پر اتنی مہنگی کتاب افسوس محسنہ سے کچھ کمنا فضول تھا۔ پنشن کی محدود رقم بنا کسی کے کہ سنے گھر میں خرچ ہو جاتی۔ محسنہ نے کچھ

کیٹیاں ڈال رکھی تھیں۔ آخر کو انہیں کل کو شجرہ کا بیان تھا۔ اپنی شادی کا ڈھائی تولے کا سیٹ بھی سنبھال رکھا تھا اور وہ کتابوں کے لیے اتنی پاگل ہو رہی تھی کہ اگر ممکن ہو تا تو ایک انگوٹھی یا بندہ ہی دے کر کتابیں لے آتی۔

مگر چونکہ یہ ہوا نہیں تھا اور ہونا ممکن بھی نہیں تھا سو اس وقت وہ ساری دنیا سے اور خود سے بھی خفا ہو کر بیٹھی تھی۔

کچھ اسٹوڈنٹ نے اپنی کتابیں دکھادی تھیں سب کو دو ایک روز میں لانے والے تھے اور وہ۔۔۔ ”شجرہ! آپ کچھ نہیں بولیں۔“

اپنے نام کی پکار پر وہ چونک کر کھڑی ہوئی۔ سراسر سے پوچھ رہے تھے۔

”سوری سو۔۔۔ میں بکس نہیں خرید سکتی۔ یہ بہت مہنگی ہیں۔ میری پچھنگ پاور سے باہر۔“ اس کی آواز واضح اور دو ٹوک تھی۔ بے جھجک۔

سر سمیت سب یک دم اسے دیکھنے لگے۔ ”اوہ آئی سی۔“ ”سرنے چشمہ ہاتھ میں پکڑ لیا اور اسے بغور دیکھنے لگے اس نے پلکیں نہ جھپکیں۔ ”ایو سی کاشا تب تک چہرے پر نہ تھا۔ سر کو یہ اعتماد اور سچائی بھائی تھی۔ وہ چند پل خاموش رہ کر دل سے مسکرائے۔

”آپ کو ضرورت محسوس ہو تو آپ کلاس میں کسی سے بھی پلپ لے سکتی ہیں۔ اے کم آن کلاس! شجرہ کو آپ سب کتابیں پڑھنے کے لیے دیں گے؟“ ”نہیں سارا آف کورس سو۔!“ سب یک آواز بولے۔

”اور میں تو ہوں ہی۔“ ”سرنے چشمہ دوبارہ ناک پر ٹھرایا۔ اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ”تھینک یو سر!“ وہ خود اعتمادی سے بیٹھ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆  
”اے ہیلو۔ ہیلو۔ شجرہ الٹ شجرہ الٹ۔“

بچے سے بڑے والی پکار میں اس کے نام کو درست تلفظ سے لے کر کوشش نمایاں تھی۔

وہ چونک کر مڑی اور سینے پر ہاتھ پٹیت کر اسے بغور دیکھا۔ وہ سنان الیاس تھا۔ کلاس فیلو۔ ”شجرہ۔۔۔“ ”شجرہ! شجرت، تل، در۔“ اس نے اپنا نام توڑ کر سر سر سے اس طرح بتایا کہ دوبارہ زیر زیر کی غلطی نہ ہو۔

”اوہاں۔۔۔ سوری تمہارا نام خاصا مشکل ہے۔“ وہ ہال کر آیا تھا سو سانس بحال کر رہا تھا وہ کچھ نہ بولی۔

”تم میری بکس لے سکتی ہو۔ یہ ڈکشنری اور یہ گرامر بک یہ اس کانوائزیشن ہے۔“ اس نے دونوں ہاتھ آگے کر دیے تھے مگر شجرہ کی آنکھوں میں حیرت آ رہی اور پھر سوال۔

”تم ہی کیوں بھی۔ سرنے اکیلے تم ہی کو تو نہیں کہہ کوئی بھی دے دے اور وہ بھی جب مجھے ضرورت ہوگی۔“

”ہاں سرنے ہی کہا ہے مگر جب تین دن پہلے میں یہ بک خرید رہا تھا۔ تب تم بھی دکان میں آئی تھیں۔ تب گرامر بک کی ایک ہی کاپی تھی۔ اس سے پہلے کہ دکاندار تمہیں دے دیتا میں نے تیزی سے پیسے پکڑا کر لے لیے۔ مجھے بس شرمندگی سی ہو رہی تھی اس لیے۔“

”تمہاری شرمندگی فضول ہے۔ میں صرف یہ معلوم کرنے گئی تھی کہ کتنا کنسیشن مل سکتا ہے مگر اس نے اب تک کتابیں پکڑی نہیں تھیں۔“ ”تم جو بھی کرنے گئی تھیں مگر۔ تم انہیں رکھ لو۔ مجھے ابھی وقت ضرورت نہیں ہے۔“

”کیوں تمہیں کچھ نہیں پڑھنا۔“ اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ”پھر خریدی کیوں تھیں؟“

”پڑھنے ہی کے لیے لی تھیں مگر آج کل میں کچھ پڑھ رہا ہوں۔ یونہی الماری میں پڑی رہیں گی۔ تم دیکھ لو اتنی سویر میں سچ کہہ رہا ہوں۔ شجرہ لہس۔۔۔“

وہ اس کے نام پر پھر اٹک گیا تھا جو نظروں کو ایکسرے کی طرح جیسے اندر کا سارا بھید جان لیتا جاتی تھی۔ ”شجرہ الٹ۔!“ اس نے ٹھنڈا سانس لے کر

دوبارہ نام کا صحیح تلفظ سر سر کر دہرایا۔ ساتھ ہی ہاتھ آگے بڑھا دیا کہ کتابیں دے دے۔

سنان کے چہرے پر طمانیت و مسرت پھیل گئی۔ ”کل سنڈے سے ٹیوژڈے کو واپس لاؤں گی۔“ وہ ورق پھر پھرانے لگی تھی۔

”نہیں، فیکسٹ ویک تک رکھ لو۔ کوئی ایڈو نہیں۔“ وہ ہلکا پھلکا لگ رہا تھا۔ شجرہ کو اسی لینگوئج کلاس میں دیکھا تھا۔ صرف نام سے واقف تھا اور یہ کہ اس کا تمام ہوم ورک کمپلیٹ ہوتا ہے۔ سر کا دیا جانے والا تمام کام وہ جیسے گھول کر لی کے آتی تھی۔ ویسے خاموش، خود میں مگن قطعاً ”نوٹس میں نہ آنے والی لڑکی تھی کہ کلاس میں ایک سے ایک طرح دار لڑکیاں موجود تھیں جو خود کو اجاگر کرنے کے فن سے بخوبی واقف تھیں۔ ایسے میں شجرہ اپنے کالج یونی فارم ہی میں ہوتی تھی۔ سیاہ بڑے منہ والے جاگرنس۔ صبح گھر سے نکلتے وقت جو چوٹی گوندھتی وہ تین بجے تک اجڑا بچڑ جاتی۔ اس کے چہرے پر تکان ثبت ہوتی۔ عام سی شکل و صورت تھی نمکین سی رنگت چمک دار شفاف بے داغ جلد کی وجہ سے گندمی لگتی تھی۔ البتہ آنکھیں بہت خوب صورت تھیں کالی سیاہ گہری ان میں اداسی بھی تھی سنجیدگی اور ذہانت بھی جو دیکھنے والوں کو متوجہ کرتی تھی لیکن اس کی بے نیازی کسی کو قریب نہیں ہونے دیتی تھی۔

چھٹی سوا ایک بجے ہوتی تھی۔ وہ اس کے بعد کا تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ کالج ہی میں گزار دیتی کہ گھر جا کر دوبارہ آنا فزیکلی تو مشکل تھا ہی مگر فائنل ناممکن۔ وہ سارا دن خوار ہوتی پانچ ساڑھے پانچ بجے گھر پہنچ پاتی۔

ایسی تڑھال، حساب کتاب میں ابھی لڑکی کسی کی نگاہ میں نہیں تھی کوئی اسے نہیں جانتا تھا مگر آج چند جملوں نے ساری حقیقت آشکار کر دی تھی۔

”دس دن تک کے لیے رکھ لوں؟“ شجرہ کے چہرے پر پہلی بار اچھٹا پھیل گیا۔

”ہاں۔ رکھ لو۔“ وہ بے پروائی سے اپنا بیگ کر پر



سیٹ کر رہا تھا۔  
”تو تم کیا کرو گے۔ اتنے دن تک۔ کیا پڑھو گے؟“  
”میرے پاس دو تین ڈکٹریز اور بھی ہیں ضرورت  
ہوئی تو مانگ لوں گا ویسے بھی میں نے کمائائیں آج کل  
کچھ اور پڑھ رہا ہوں۔“

”کچھ اور۔ کچھ اور کیا پڑھ رہے ہو؟“ وہ حیران  
ہوئی، ایسا کیا کہ اتنی اہم بکس کو سرسری لے رہا ہے۔  
”میں تو خیر کچھ نہ کچھ پڑھتا ہی رہتا ہوں۔“ وہ  
دونوں ہاتھوں سے بغلوں کے پاس بیک کے فیتے سیٹ  
کر رہا تھا۔ ”لیکن آج کل“ نسخہ ہائے وفا“ پڑھ رہا  
ہوں۔ بعض جگہ مشکل لگتا ہے اور بعض جگہ اتنا  
خوب صورت کہ پڑھ پڑھ کے دل نہیں بھرتا۔ کبھی  
پوری غزل پر اٹک جاتا ہوں کبھی مصرع پر اور کبھی  
صرف ایک لفظ پر بھی۔ تم نے تو۔“

”کیا پڑھ رہے ہو۔ نسخہ؟“ وہ چونکہ بولتے  
وقت بھی تصور کن کیفیت میں گھر گیا تھا اور لہجہ قدرتی  
تیز تھا، لہذا شجرہ کو اس کے تمام جملے سر سے گزرتے  
محسوس ہوئے۔

”نسخہ نسخہ وفا۔ تم کیا کوئی حکیم ہو۔  
حکمت وغیرہ کرتے ہو؟“

”واٹ! وہ بھونچکا رہ گیا۔ اڑی پر ہلتا لاروا  
اندانہ۔ وہ اچھلا تھا اور پھر جیسے ساکت ہو گیا تھا۔ جنبش  
سے بھی قاصر۔ اور وہ ابھی تک جواب کی منتظر تھی۔  
جینز کی پینٹ، جاگرز جیکٹ، بالوں کی تراش بہت  
جاذب نظر تھی اور وہ اچھا خاصا اول۔ ہوں۔ خاصا  
اسمارٹ تھا۔ ماموں جن حکیم صاحب سے دوا لایا  
کرتے تھے۔ وہ تو دبلے پتلے تنکے سے تھے ساری  
کنزرویوں کا علاج ان کے پاس تھا۔ بس اپنے جسم پر پاؤ  
بھر بولی بھی پیدا نہ کر سکے اور ان کے دونوں بیٹے بھی ان  
کی فوٹو کاپی تھے تو پھر کیا حکیم تھا اور اپنے پیٹے سے اتنا  
غلصہ کہ باقاعدہ کتب بینی کرنا ہے واٹ۔“

وہ حیران تھی اور وہ اسے ایسے دیکھ رہا تھا جیسے اس  
کے سر پر تو بوزاگ آیا ہو۔

\*\*\*

”میں نے تمہیں دس دن تک کے لیے دی تھی  
اور تم آج تیسرے دن ہی واپس لے آئیں۔“  
”حیرت سے کہا۔ پھر ہاتھ بڑھا کر کتابیں لے لیں۔  
”ہاں تم نے دس دن تک کے لیے دی تھیں۔“  
اینا بیک کرسی کی بیک سے لٹکاتی بیٹھ گئی وہ ابھی ابھی  
انسٹیٹیوٹ پہنچی تھی۔ سانسیں کسی قدر منتشر تھیں۔  
جھک کر جاگڑ کے لیس کو کسا۔

”مگر میں ایک الجھن میں گرفتار ہو گئی۔ واپس کے  
خیال میں چونکہ دن گننے تھے کہ تین ہو گئے اور سناٹ  
رہ گئے تو اتر تکا پیدا نہ ہو سکا۔ بے چینی سی تھی اور پھر  
سچ کہوں، لیتے وقت دل کے کس کو نے میں خیال تھا۔  
ساوی کی ساری فوٹو کاپی کروالوں، مگر وہ کام مشکل تو  
ہی مہنگا بھی لگا بس اس لیے۔“

”عجیب بات کرنی ہو تم۔ تم جب دل کرتا واپس  
کرتیں، میں نے تمہیں کہا تھا نا۔“ وہ عجیب سی منظر  
سن کر حیران تھا۔

”تمہیں کچھ نہیں کہہ رہی ہوں بے سکونی  
تھی۔ پھر میں نے اس دن کہا تھا نا کہ میں انور ڈکٹریز  
کر سکتی، مگر کچھ جوڑ توڑ کیا ہے، میں عام طور پر اپنی ای  
سے پیسے نہیں مانگتی مگر پھر سوچا، پوچھوں تو سہی۔ تو  
کننے لگیں، وہ کوشش کر کے عنقریب لے دیں گی۔  
بس اسی لیے۔“

”آئی سی۔“ وہ سمجھ گیا۔ ”ایسا کرو تم چندہ کرو۔  
تھوڑے بھائیوں سے مانگ لو۔ تھوڑے بھائیوں  
سے۔ بہنوں سے بھی اور ہاں ابو سے۔ میں تو جب  
بھی فنانشل کراؤنسر میں گھرتا ہوں، ڈوٹے کا کلسا  
کر سب کے آگے پہنچ جاتا ہوں اور کہتا ہوں۔ کیا  
زور زبردستی نہیں، حسب توفیق عنایت کی جائے  
میری شکل پر مت جائیں۔ میری اوقات مت  
دیکھیں۔ اپنی اوقات کے حساب سے دیں ضرورت  
دوسو کی ہوئی ہے پر جمع ہیشہ ڈبل ہو جاتے ہیں۔“

وہ بڑے مزے سے گھر کی بات بتا رہا تھا اور شجرہ کی  
آنکھیں پھیلی جا رہی تھیں۔ وہ اس کے سنائے سنائے  
پارٹ کو وڑیولائز کر کے دیکھ رہی تھی اور کرسی اٹھانے

کمل ہونے پر مسکرائی اور پھر بہت زور سے ہنس دی۔  
اس نے اس کی ہنسی پر اسے آنکھیں سیکڑ کر دیکھا۔  
”تم شاید مذاق سمجھ رہی ہو۔ لیکن کرو میں ایسے ہی  
کرنا ہوں۔“

”بلکہ۔“ وہ اس کی جانب رخ موڑ کر بیٹھ گیا۔ ”تم  
بھی ایسے ہی کرنا دونوں میں مالی بحران سے باہر آؤ گی۔“

اس نے چٹکی بجاتی۔  
شجرہ نے ہنسی روکی۔ آنکھ میں آیا پانی انگلیوں کی پور  
سے پونچھا۔ وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ متوقع نگاہوں سے  
کہ وہ ترکیب کو سراہے اور ہاں بھی بھرے۔

”میں ایسا نہیں کر سکتی۔ ہمارے گھر میں صرف  
جمعرات کو آنے والے فقیروں کو دو دو روپے دیے  
جاتے ہیں اور دوسرے میرے بھائی بھی نہیں ہیں اور  
نہ بہنیں۔ میں اپنی امی کے ساتھ ماموں کے گھر رہتی  
ہوں اور ان کے زیادہ تر بچے مجھ سے چھوٹے ہیں  
صرف ایک بڑیا لیتے ہیں چیز کھانے کے لیے۔ ابو  
میرے تب فوت ہو گئے تھے جب میں چھ برس کی  
تھی۔“

تھوڑی دیر پہلے کا ہنسا تاثرات سے بھرپور چہرہ  
اچانک سیاٹ ہو گیا۔ وہ اپنی بات کہہ کر جیسے اس کے  
وجود کو بھی نظر انداز کر گئی۔ پیچھے لٹکتا بیک آگے کیا۔  
نوٹ بکس اور قلم نکال کر بالکل سیدھا بیٹھ گئی۔ نگاہیں  
بلیک بورڈ پر تھیں۔ ایسے لگتا تھا جیسے اسے اسٹاپ کہہ  
دیا ہو۔

”آئی ایم سوری۔“ سنان کی آواز دھیمی تھی۔  
”مجھے نہیں معلوم تھا میرے فادر کی بھی ڈھنگ ہو چکی  
ہے۔ جب میں نانٹھ کلاس میں تھا، مگر میری ماشاء اللہ  
بڑی فیملی ہے امی ہیں اور بھائی۔“

”گڈ آفٹرنون سر۔“ ساری کلاس کی کورس میں  
آواز اور ہمزڈ بڑوہ دونوں بھی چونکے اور تیزی سے  
کھڑے ہو گئے سر آگئے تھے۔

\*\*\*

”اے ہیلو۔ شجرہ۔ تل در۔ ہیلو سنو شجرہ رکو۔“

وہ تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ موسم سرد اور اوپر  
سے بادل۔ اسے شام پانچ بجے ہی اندھیرے کا احساس  
ہو رہا تھا۔ گھر جانے تک تو گہری سیاہ رات بڑجانی تھی۔  
وہاں لینگوٹج کلاس میں پکارنا یا بات کرنا اور بات  
ہے لیکن ایسے سرراہ۔ اس کے چہرے پر سوال اور  
مانٹھے پر ناگواری کی لکیر ابھر چکی تھی۔

”میرے پاس تمہارے لیے ایک زبردست سلوشن  
ہے۔ آئی مین میرے پاس ایک آئیڈیا ہے۔ تم میرے  
ساتھ اولڈ بکس اسٹالز پر چلو۔“ لہجے میں ایکسٹنٹ  
انتہا کی تھی۔ غلت یقین اور خوشی بھی مگر شجرہ نے فقط  
”میرے ساتھ چلو“ کو سنا تھا۔ سناٹے لالچے سے ہی  
نہیں جیسے۔

اور سنان نے بھی ایک لمحے کے توقف کے بعد جیسے  
شجرہ کی سوچ بڑھ لی۔ وہ یک دم چپ ہوا تھا۔ ”میرا  
مطلب ہے تم سیکنڈ ہینڈ بکس خرید لو۔ آدھی قیمت  
پر۔ نئی نہیں خرید سکتی ہو تو۔ تمہیں خود خیال کیوں نہ  
آیا؟“

شجرہ بد مزہ ہوئی۔

”میں نے پتا کر لیا تھا، مگر سرسید اردو بازار سے  
صرف کورس سے ریلیٹڈ بکس ملتی ہیں اور۔“  
”ارے نہیں۔ برائی کتابوں والے فٹ ہاتھوں  
سے دنیا کی ہر کتاب ملتی ہے۔ ڈھونڈنے والی آنکھ اور  
ہاتھ چاہیں بس۔“

”کون سے فٹ ہاتھ؟ یہ کہاں ہیں؟“  
”شہر میں جگہ جگہ بکھرے ہوئے ہیں اور میں سب  
جانتا ہوں، میں تمہیں لا کر دے سکتا ہوں، بالکل سیمینہ  
بھی ملی تو تمہارا کام ہو جائے گا بلکہ بعض اوقات توفیق  
سے بڑھ کر اچھی ملتی ہیں۔ سر کی بتائی ہوئی سے بھی  
اچھی۔“

”تو یہ جگہ کہاں ہے۔ نزدیک ترین بتاؤ۔“ اسے  
دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی۔ ”میں زیادہ دور نہیں  
جاسکتی۔“

”اوکے تو پھر میرے ساتھ کریم آباد چلو۔ بارہ  
پندرہ ریڑھیاں تو ادھر بھی ہیں اور مجھے یقین ہے مزید



کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔" شجرہ نے چند بل سوچا پھر اثبات میں سر ہلایا تھا۔

\*\*\*

شجرہ کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اسے ڈکٹری کتابیں ٹولنے کے پندرہویں منٹ میں مل گئی اور لینگوٹج گائیڈ بک بون گھنٹے میں۔ اسے یہ بھی یاد آگیا کہ کوریس کی کتابوں میں ایک ریفرنس بک جو کہیں نہیں ملی تھی اس کے ہی جیسی ایک جگہ یہاں تھی۔ دن کے دو بجے کا وقت تھا اور دکانیں ابھی کھلی ہی تھیں۔ اس کے پیچھے بازار فیصل تھا اور عین سامنے مینا بازار۔

"حیرت ہے تم یہاں کبھی نہیں آئیں؟" سانج جے بے یقین تھا۔

"کیوں۔ تم اتنے حیران کیوں ہو رہے ہو۔ یہاں آنا کیوں ضروری تھا؟" وہ سوال پر حیران تھی۔

"یار! مجھے تو تم اس دنیا کی لڑکی لگتی نہیں لڑکیاں تو اتنی شارپ ہوتی ہیں۔ اندر بولی پارلرز ہیں لاتعداد۔ جنہیں عورتیں ہی چلاتی ہیں۔ مہندی، شادی، میک اپ فیشن کے تمام کام ہوتے ہیں بلکہ پورے پاکستان میں سب سے کڑی اینڈ مہندی کی ڈیزائننگ یہیں سے نکلتی ہے۔ پورے ملک میں سپلائی ہوتی ہے مینا بازار کی کون مہندی اور تم کہتی ہو کس۔"

"چھا! شجرہ کا چہرہ یک دم پرسکون ہو گیا۔ "تو یہ وہ مینا بازار ہے جہاں سارے کورسز بھی کرواتے جاتے ہیں۔" اسے یاد آگیا۔ "یوٹیشنز وغیرہ کسے؟"

"تم یہاں کبھی نہیں آئیں؟"

"نہیں کبھی نہیں۔" اس بار سانج جے بے یقین بولا۔

بس اسے دیکھ کر وہ گیا جو چند منٹ تک سامنے بنی طویل عمارت کے کونوں کھدروں کو کھوجنے کے بعد اب زمین پر بیٹھ کر نیچے بڑی کتابوں کے ڈھیر کو جانچ رہی تھی۔ وہ بھی بیٹھوں کے بل بیٹھ گیا۔

"مسنو سن! جب مردوں کا جانا ممنوع ہے تو تم کو کیسے اتنی معلومات ہیں تم نے کیسے دیکھا۔"

"ارے! وہ پہلے مسکرایا پھر زور سے ہنس دیا۔

"چار میری جنہیں ہیں، تین بھابھیاں اور ایک امی۔ بچپن میں امی کے ساتھ اندر تک چلا جاتا تھا۔

دس برس پہلے تک۔ اب بہنوں بھابھوں کے ساتھ آتا ہوں اور احقوں کی طرح ان کا انتظار کرتا ہوں۔

چار چار گھنٹے بعد برآمد ہوتی ہیں۔ مہندی سے لپی پٹی سرخ چہرے۔ اپنی طرف سے اچھی بن کر آتی ہیں۔

مجھے تو لگتا ہے پٹ کر آتی ہیں۔ سوچے منہ۔ ساری کمائی جھونک دیتی ہیں اپنے میاں کی اور وہ دیکھو اس لڑکی نے کتنی مہندی لگا رکھی ہے۔ میری نمبر دو والی

بھابھی کا بھی یہی حال ہوتا ہے۔"

شجرہ نے اس کے اشارے پر سامنے دیکھا۔ لڑکی نے شلوار اوپر تک چڑھا رکھی تھی۔ آدمی پینڈلی برہنہ تھی اور بیل بوٹوں سے چھپی ہوئی تھی۔ دونوں کلائیوں

کتنی تک مہندی سے بھری ہوئیں۔ دونوں بازو سر سے اوپر تک اٹھا رکھے تھے۔

"میں نے لگتا ہے یہ مدد کی طالب ہے کہ جیسے سیلاب آگیا ہو۔ پانچے کیلے نہ ہوں تو مقدور بھر چڑھالے اور ہاتھ ہوا میں اٹھا دیے۔ ہی ہی ہی۔" وہ ہنس پڑی۔ پھر

اس کے ہاتھوں میں کتابوں کا ڈھیر دیکھ کر بولی۔

"ارے ہاں۔ تم نے اتنی دیر میں کیا ڈھونڈا؟ میں تو کامیاب ہو گئی۔ تمہیں کیا ملا دکھاؤ۔" وہ اس کے کچھ

نزدیک سرک آئی تو اس نے ایک کے بعد ایک اپنی کتابیں اس کے آگے بڑھانی شروع کر دیں۔

شجرہ کے لیے کتابوں کے نام اجنبی تھے اور لکھنے والوں کے بھی۔

یہ بہت پرانی اور کافی حد تک بوسیدہ کتب تھیں مگر سانج جے بے یقین نظر آتا تھا۔

"کیا یہ سب تمہارے کورس کی کتابیں ہیں؟"

اچھے کا شکار تھی یہ سب شاعری تھی۔

"تم ان کتابوں کو لینے آتے ہو ادھر؟"

"صرف ادھر ہی کیوں؟ جہاں سے بھی ملنے کا مکان ہو سب سے پہلے پتہ لگتا ہے والا میں ہی ہوتا ہوں۔"

"مگر کیوں؟ کس لیے؟"

"کس لیے کا مطلب؟ اس لیے کہ مجھے شعرو شاعری سے عشق ہے، لفظوں کا کھیل مہسوت کر دیتا ہے مجھے۔ سحر زدہ، ششدر۔ سکون عطا کرتا ہے۔ کیا تم نے کبھی شاعری نہیں پڑھی۔"

"ہاں بس۔ یاد کی تھی۔ وہ جب کورس میں ہوتی تھی۔"

"شاعری یاد کرتے ہیں؟" وہ چلایا تھا جیسے۔

"تو کیا نہیں کرتے۔" وہ اس کے رد عمل پر حیران ہو گئی۔

"بالکل نہیں کرتے، یہ تو خود بخود دل و دماغ میں اتر جاتی ہے، کون پانچ شعر کے رٹے لگتا ہے؟"

"نیر شعروں کے رٹے تو میں نے کبھی نہیں لگائے۔" اس نے اپنی صفائی دینی شروع کی۔ "مگر میں

شاعری کے بارے میں بس اتنا جانتی ہوں کہ اچھی تشریح سے آپ فل مار کس لے سکتے ہیں۔"

اس نے صاف گوئی کی حد کر دی اور حقیقت پسندی کی انتہا۔ سانج کو لگا، کسی نے اس کے سر پر زور سے

ڈنڈا مار دیا ہو۔

"تمہارے نزدیک شاعری صرف تشریح کے لیے ہے، ایگزیم میں فل مار کس کے لیے؟ کبھی کوئی شعر دل میں نہیں کھاتا؟"

"نہیں۔" اس نے چند لمحے توقف کے بعد کہا۔

"غالب، جوش، میر تقی میر، درد، سودا، سناغ، ساحر اور اور۔" سانج نے رٹو طوطے کی طرح نام دہرانے

شروع کیے۔ ان میں سے کسی کے بارے میں کچھ نہیں سنا؟ کچھ نہیں جانتی ان کے بارے میں؟"

شجرہ نے چند لمحے رک کر تمام ناموں کو ذہن میں دہرایا۔

"نہیں۔ ان میں سے کچھ کو جانتی ہوں۔ ہماری اردو کی ٹیکسٹ بک میں ان کی پوٹری ہے۔ جیسے غالب، ہال، علامہ اقبال کو جانتی ہوں شاعر مشرق اور میر تقی

میر۔ اور میر انیس مرثیہ گوئی بھی پتا ہے، لیکن؟" وہ رک گئی۔

"میر جعفر اور میر صادق کے بارے میں بھی سنا

ہو گا۔ یہ کیسے شاعر تھے؟" سانج کے سر پر لگ چکی تھی۔

"میر جعفر۔ میر صادق۔" شجرہ نے ہونٹ دبائے، وہ آنکھیں سکیڑ کر سوچنے لگی تھی۔ یہ دونوں تو

وہ نہیں جو شیو سلطان کے غدار تھے؟ اس نے ثابت کر دیا تھا۔ اسے شاعری سے دلچسپی نہیں مگر اس کا علم

محدود یا چھوٹے دے کر حاصل کیا ہوا نہیں ہے۔

"یہ دونوں غداروں کے علاوہ شاعری بھی کرتے تھے؟" اس نے سانج سے پوچھا۔ اب اس سے بڑھ کر

کون درست معلومات دیتا۔

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ دونوں شاعر بھی تھے۔" سانج نے سوچا، خود کشی کا آسان فوری طریقہ کیا ہے۔

وہ روڈ پر جت لیٹ جائے؟

سامنے چھبے کے ننگے تاروں سے لپٹ جائے یا اونچے اوپر بیڈ برج سے کود کر جان دے دے؟

اس نے شجرہ کو دیکھا جو ہنوز جواب کی منتظر تھی۔

"اللہ! اسے خدا یاد آیا۔"

\*\*\*

شجرہ گھر میں داخل ہوئی تو بہت خوش تھی۔ مگر گھر میں کھستے ہی اس کی مسکان دم توڑ گئی۔ رونے کی آواز بلند تھی مگر ایک سناٹا سب پر طاری تھا۔ حیرت، خوف زدگی اور مختلف ادھام سے پہلے ہی۔ وہ آواز پہچانی اور فقط دو جملے سن کر جوہ بھی جان گئی۔ اس نے طویں

لباساں لیا۔

یہ ہما بھابھی کی آواز تھی۔ بڑے ماموں کی اکلوتی بڑی بہو جو اولاد سے محروم تھیں۔ گھر کی بڑی خواتین خاموش تھیں، کبھی کبھار کسلی کا بول بول دیتی تھیں۔

آفاق بھائی بھی ہاتھ میں براؤن لفافہ لیے بالکل ساکت بیٹھے تھے اور شجرہ نے ان سب کے چہرے اور پھر

لفافے کو دیکھ کر مضمون بھانپ لیا تھا۔

"میں کتنا خوش تھی اور ڈاکٹر کہتی ہے کہ کچھ بھی نہیں ہے۔ الزا ساؤنڈ میں کچھ نہیں ہے۔ مجھے اتنا غصہ آیا۔ میں نے کہا۔ تمہاری مشین خراب ہے اور



تم نکلی ڈاکٹر ہو۔ ہم دوسری ڈاکٹر کے پاس گئے۔ وہ ہچکچوں کے درمیان رو رہی تھیں۔ ”وہ بھی یہی سب بولی۔“

”بہت سارے ٹیسٹ بھی لکھ کر دے دیے ہیں۔“ اتفاق بھائی نے بھی جملہ جوڑا۔ بھابھی کے رونے میں شدت آگئی۔

”تو چلو اب وہ ٹیسٹ بھی کروالو ناں جو ڈاکٹر نے کہے ہیں۔ کوئی مسئلہ ہو گا تو علاج شروع کریں گے۔“ محسنہ نے کہا۔

”پہلے ٹیسٹ پھر علاج۔ اور وہ بھی کامیاب ہو گا کہ نہیں اور کب تک؟ مجھ سے ایک دن صبر نہیں ہوتا پھوپھو! اور اس بار آپ سب ہی نے کہا کہ کچھ ہے مجھے تو جیسے ڈاکٹر نے پہاڑ سے دھکا دے دیا۔“ ہمانے تڑپ کر جواب دیا تھا۔

”بس جب اللہ کا حکم ہو گا۔“ ماموسی دکھ بے چینی اتفاق کے چہرے پر بھی تھی اور لہجے سے بھی عیاں تھی۔ وہ لفافے کو تخت پر رکھتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ ایک نظر سب پر ڈالی اور باہر کو نکلے۔ چال سے بھی شکستگی اور تاسف نمایاں ہو رہا تھا۔

”ان کا ٹیسٹ بھی بولا ہے ڈاکٹر نے۔“ ہما بھابھی کا لہجہ دھیمہ ہو گیا۔ کچھ جھجکا ہوا ڈرا سا تینوں خواتین چونک گئیں۔ اور باہر نکلتے اتفاق بھائی بھی تیزی سے گھومے۔

”تو میں نے کب انکار کیا ہے۔ کروالوں گا۔ ٹیسٹ ہی تو ہے۔ پتا تو لگے کہ کیا وجہ ہے؟“ ہما بھابھی آنسو پونچھنے لگیں۔ لفافہ سنبھالنے لگیں۔ اسی میں ٹیسٹ لکھا ہوا تھا۔

محسنہ اور دونوں مامیاں از حد حیرانی سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں آدمیوں کے ٹیسٹ کب ہوتے ہیں۔ یہ ڈاکٹر بھی ناں۔

محسنہ ہما بھابھی کو پکار رہی تھیں۔ آنسو پونچھ رہی تھیں۔ شجرہ کے دل پر غبار سا چھانے لگا اس نے صبح نکلتے وقت محسنہ سے کہا تھا۔ وہ آج کتابیں ڈھونڈنے کے لیے کہیں جائے گی۔ دعا کریں کامیابی

ہو۔ وہ مولی مولی کتابیں اٹھا کر گھر لوٹی تھی۔ محسنہ نے اس کا چہرہ دیکھا جو کامیابی کو دکھا رہا تھا۔ لیکن۔

وہ اب تک اندر نہیں آئی تھیں کہ شجرہ کتابیں مل گئیں۔ پیسے کم تو نہیں پڑے یا بیچ گئے ہیں تو لوٹاؤ۔ اور آج تم کافی لیٹ آئی ہو۔ کہاں گئی تھیں کس کے ساتھ گئی تھیں؟“

سب اس پر اعتماد کرتے ہیں یہ خوشی کی بات تھی مگر اس کی فکر نہیں کرتے۔

اس نے کم عمری سے اپنے لیے فیصلے لینے شروع کر دیے تھے آٹھویں جماعت میں اس نے اسکول میں سائنس پوزیشن حاصل کی تھی۔ اس کا نام سائنس اسٹوڈنٹ کی فہرست میں سب سے اوپر تھا۔ اس نے گھر آکر محسنہ سے مدد مانگی کہ وہ سمجھ نہیں پا رہی کہ وہ سائنس لے یا آرٹس۔ اور محسنہ نے جواب دیا تھا۔

”بھئی۔ میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ جو تمہیں ٹھیک لگے۔ اب تم کو ہی معلوم ہو گا ناں کہ تم کیا پڑھ سکتی ہو کیا نہیں“ محسنہ اٹھ گئیں۔ گیند اس کے کورٹ میں۔

بہت بچپن ہی سے اسے جو چیزیں میں نہیں آتی تھیں۔ وہ ان کے پیچھے پڑ جاتی تھی۔ چیز سمجھ میں نہیں آتی مگر لے لگا لگا کر اسے اذیر ضرور ہو جاتی تھی۔ مضامین چننے کے اس مرحلے میں وہ سب تک گئی۔

اتفاق بھائی نے ڈرا دیا۔ سائنس بہت مشکل ہے سیدھا سیدھا آرٹس پڑھو۔ شازبہ، مازیہ نے بھی آرٹس کو آسان قرار دیا۔ ماموں کو دلچسپی نہیں تھی۔ بیوہ بہن کی بیٹی خود پڑھا کو تھی۔

”بیٹا! تم تو خود اپنی قابل ہو جو کرو گی ٹھیک ہی ہو گا۔ مجھ ان پڑھ کو کیا پتا۔“

شجرہ چپ کر گئی۔ وہ دونوں مضامین کے فائدے اور مستقبل کے راستے بتا تو رہی تھی ناں۔

شجرہ کتابیں جگہ پر رکھ رہی تھی۔ اس نے یونیفارم بدلا۔ ٹھنڈے پانی سے چہرے پر چھپا کے مارے۔ محسنہ کی اس کی جانب سے لاپرواہی اسے کھل رہی

تھی۔ وہ کب کہہ رہی تھی کہ وہ اسے گود میں بھر کے بیٹھ جائیں۔ وہ تو بس۔ پتا نہیں۔

\*\*\*

”نہیں تو کوئی زور زبردستی ہے۔“ وہ مصنوعی جھنجھلاہٹ سے کہہ رہی تھی۔ ”ضرورت ہی کیا ہے؟“

”ضرورت ہے جب ہی تو کہہ رہا ہوں۔“ وہ مصر تھا اور پریقین بھی۔ (وہ ہنسی روک رہی تھی۔ اچھی زبردستی ہے بھئی۔)

”نسم سے سنان۔! میں لے جاؤں گی پڑھ بھی لوں گی۔ تم کو تو یاد بھی کر کے آجاؤں گی۔ ایک سانس میں سناؤں گی اگر غلطی نکلے ناں۔ ایک ذرا سی بھی تو۔“ اس نے چنگی بنا کر دکھائی۔ ”تو جو چاہے سزا دے دینا مگر مجھے شعر سمجھ میں نہیں آتے۔“ اس کا لہجہ سچائی کا منظر تھا۔ ملتجی بھی۔ وہ ہر صورت اسے باز رکھنا چاہتی تھی۔

”تم کو ناں کورس کی ان بور کتابوں سے آگے بھی کچھ پڑھنا چاہیے۔“ وہ نئے برے سے نئے دلائل دینے لگا۔

”تو پڑھتی تو ہوں ناں۔ سارے اخبار ایک ایک لفظ۔ اس نے تیزی سے کہا۔

”وہ اخبار سنان نے بد مزہ ہو کر کھینچ کر کہا۔“ وہ بور روکھے سوکھے کالمز۔ وہ سیاست و معاشرت کے عرفان صدیقی کی باتیں حسن ثار کے زہر میں جھمے تیر اور گالیاں ہارون رشید پیش گوئیاں نذیر ناجی کی قلابازیاں ان کو تم پڑھنا کہتی ہو۔ مسرت جبین۔ ”وہ تیز لہجے میں شروع ہوا تھا۔ شجرہ نے فوراً ٹوکا۔

”اے مسرت جبین کو کچھ نہ کہنا۔ وہ تو اتنا شان دار لکھتی ہیں اور عطا الحق قاسمی اور عرفان صدیقی کی تو بات ہی۔“

”او میں نے کب کہا کہ وہ اچھا نہیں لکھتے مگر تم ان سب کے علاوہ کچھ اور پڑھتی کیوں نہیں۔“ وہ شاید

اپنے بال نوچنے والا تھا۔ شجرہ کو مسلسل ہی ہنسی آرہی تھی مگر بننے سے وہ شاید خفا ہو جاتا۔ اس لیے سنجیدگی سے قائل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اب ضبط نہ رہا۔ اور ہنسی کی گرفت ڈھیلی کر دی۔ قل قل قل۔

”یار! تم بڑھو تو جسٹ ریڈ اینڈ فیل۔“ وہ مسکور کیفیت میں گھر گیا۔ اس کے ہاتھ میں نسخہ ہائے وفا تھی۔ ”میں تمہیں پہلے کچھ آسان چیزیں سنانا ہوں۔“

سنان کے لیے ہر صفحہ اور ہر سطر خوب صورت اور سحر زدہ کر دینے والی تھی۔ مگر اس نے شجرہ کے لیے خدا وہ وقت نہ لائے۔

خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہوتو سکون کی نیند تجھے بھی حرام ہو جائے تیری مسرت پیہم تمام ہو جائے تیری حیات تجھے سچ جام ہو جائے غموں سے۔

”کیسا؟“ بہت خوب صورت لب و لہجے میں جذب کے ساتھ پڑھتا سنان کسی اور ہی جہاں سے بول رہا تھا۔ واپس لوٹا مگر جی بھر کے بد مزہ ہوا۔ دل ٹوٹ گیا۔

شجرہ نے اس کی اس کیفیت کو محسوس کیا تھا اور وہ حیران رہ گئی تھی۔ اسے اس طرح شعر پڑھتے اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔ اور ایسے میں اس کے لہجے کی خوب صورتی اور آواز کا اتار چڑھاؤ دل موہ لینے والا تھا۔ اسے اس کو سننا بہت اچھا لگا تھا۔ کانوں کو بھلا اور دل میں اترتا مگر اس کا سوال۔

”کیسا؟“

”بہت اچھا۔ سنان بہت اچھا۔ تم بہت اچھا پڑھتے ہو۔“ وہ سچ کہہ رہی تھی۔

”اے سنان نے سر پر ہاتھ مارا۔“ پڑھنے کو چھوڑو شعر کیسے ہیں؟“

”وہ شعر اچھے ہیں۔ شعر۔ اچھے۔ اچھے بہت اچھے۔“ وہ اس کمرائی میں گئی ہی کب تھی جہاں سے وہ ابھرا تھا۔ اسے تو شاید کنارہ بھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ اور یہ سنان نے بھانپ لیا۔



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شاندار پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ٹھیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریزیوم ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریٹخ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ پیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریٹخ
- ☆ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

**WWW.PAKSOCIETY.COM**

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

”او گاؤ۔ گڈ گاؤ۔!“ وہ سر پر پیر رکھ کے بھاگنے کو تھا۔  
”چھا اندر مت رکھو۔ مجھے دو۔ قسم سے میں بڑھنے کی کوشش کروں گی۔ نہیں میرا مطلب ہے مجھنے کی۔ نہ۔ میرا مطلب ہے۔“ سان کے چہرے کے تاثرات بگڑتے دیکھتے تو اپنے جیلے کی تصحیح کر دی۔  
”میرا مطلب ہے انجوائے کرنے کی۔“

\*\*\*

شجرہ نے گھر لوٹتے ہی ٹیوشن والے بچوں کو جلد از جلد نمٹانے کی کوشش کی۔ وہ ساتھ ساتھ بیٹھی اپنے ہوم ورک کے کچھ صفحات بھی کرتی جا رہی تھی۔ عام طور پر محسنہ اسے کام نہیں کہتی تھیں لیکن کھانے کے برتن اٹھانے جیسا کام بھی اسے آج ناگوار گزر رہا تھا۔ گھر میں کام کاج کے سلسلے میں کوئی لڑائی نہیں تھی۔ بڑے ماموں کی دو بیٹیوں کی جلد شادی کر دی گئی تھی۔ تیسری پڑھنے کی شائق رہی تھی۔ مگر وہ کندہ بن تھی۔ میٹرک میں ایک پیر رہ جانے کے بعد دل ہی چھوڑ بیٹھی۔ اس سمیت دیگر اہل خانہ سب شجرہ کی محنت، شاندار کامیابی کو جانتے تھے مانتے تھے اور جب جب راستے میں لوگ ماموں کو روک کر سفارش، گزارش کرتے کہ اگر شجرہ ان کے بچوں کو بھی ایک گھنٹہ دے دے تو ماموں کا سر فخر سے بلند ہو جاتا۔

شجرہ کو مار مار کر بڑھانے کے بعد سے تو وہ چھوٹی ماما کی پسندیدہ ترین ہو چکی تھی۔ شجرہ کے گھونٹے، پھنڈے کھا کر کسی کے پاس دادرسی کے لیے نہیں جلا یا کہ ہر در سے ٹھکرایا ہی جاتا۔ اب تو خیر اس نے سب سمجھو تاکر لیا تھا اور خود سے پڑھنے اور پوچھنے بیٹھ جاتا۔

سو اس وقت برتن دھونے کے نام پر آنے والی شمن چھوٹی ماما سے پوشیدہ نہ رہی۔ سب ہی جانتے تھے وہ رات گئے تک پڑھتی ہے۔ نسل نسل کر کبھی اونچی آواز، کبھی مدھم۔

”رہنے دو محسنہ! شجرہ سے نہ کو‘سارا دن کھتی ہے بے چاری۔ یہ نازیہ دھولے گی۔“

”تم۔“ وہ اپنی ہتھیلی میں مکار کر رہ گیا۔  
”نہ۔ نہیں۔ خفا مت ہو۔ اب ایسی بھی بات نہیں۔ شاعر کا انداز دعا گو ہے۔ وہ اپنے محبوب کو کسی بھی مصیبت یا مشکل میں گرفتار نہیں دیکھ سکتا اور۔ دراصل شاعر اپن شعر میں۔“  
”باس۔ بس۔ خدا کے لیے چپ کر جاؤ۔“ سان نے شجرہ پر کرنا تھا اور پھر نجائے ضبط کی کن کن راہوں سے گزر کر بولا تھا (چلایا تھا کہ۔ ارد گرد سے گزرتے کچھ اسٹوڈنٹ چونک کر متوجہ ہوئے تھے)  
سان نے سب کے چونکنے کو محسوس کر کے اپنے ہاتھ صلح جو انداز میں پھیلانے، وہ جیسے خود کو شانت رہنے کی تلقین کر رہا تھا۔ سانس لے رہا تھا۔ سانس چھوڑ رہا تھا۔  
مار دینے کے سو طریقے (یہ کتاب کہاں سے ملے گی؟) نہیں۔

مرجانے کے سو طریقے (اسے ڈھونڈنا ہو گا۔) بس۔ ”سوری۔ سوری سان۔“ سان کا چہرہ دلی جذبات کا ترجمان تھا۔ شجرہ نے فوراً کہا۔ ”ایسی بات بھی نہیں۔ مجھے ”مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ“ کا پتا ہے بلکہ وہ مجھے یاد بھی ہے۔ اور اسے میں سمجھ بھی سکتی ہوں۔“

وہ اپنی صفائی میں تیز تیز بول رہی تھی۔  
”یہ بھی تمہیں شاعری کے حوالے سے یاد نہیں ہوگی۔ نور جہاں کی وجہ سے۔ کہ انہوں نے اسے اتنی خوبی سے گایا ہے۔“ وہ دانت پیس کر اب کتاب کو بند کر رہا تھا۔ سیاہ جلد پر چاندی رنگ کے الفاظ۔  
شجرہ کو ایک بار پھر زور سے ہنسی آئی۔ اتنی خفگی؟  
”چھا نور جہاں نے اسے گایا ہے؟ مجھے نہیں پتا؟ میں نے تو۔“

”تو پھر تمہیں کیسے یاد ہو گئی؟“ وہ بیک بند کر رہا تھا۔  
زرا سار کا۔ شجرہ نے ہونٹ کا کوتا دانت میں دبایا۔

”سچ بتاؤں؟“  
”سچ ہی۔“ اس نے تادبا“ انگلی اٹھائی۔  
”وہ اردو کی ٹیکسٹ بک میں تھی ناں تو۔“



اور تازیہ نے قطعاً برا نہ مانا۔ تابع داری سے سر ملادیا۔

”مائی! چائے کا ایک کپ میرے لیے بھی۔“ شجرۃ نے بلا جھجک کہا اور اندر بڑھ گئی۔ مائی نے سر ملادیا تھا۔ کسی کے ماتھے پر شکن نہیں تھی۔

”دشہزاد! سوال یاد کیے بغیر مت سونا۔ میں سر پر پانی ڈال دوں گی۔“ اس نے اونچی آواز میں کہا تھا۔ شہزاد پھنس جانے پر نظریں چرانے لگا۔ کسی نے بھی نہیں کہا۔ ”اب رہنے دو، سو جانے دو۔“ اسے اب سوال یاد کرنا ہی تھا۔ سب کے کانوں میں پڑ گیا تھا ناں کہ شجرۃ نے سوال یاد کرنے کو دیا ہے۔

شجرۃ نے سب کاموں سے فارغ ہونے کے بعد بڑی تسلی سے نسخہ ہائے وفانکل لیا۔

وہ اپنی چارپائی پر تنکے کا سارا لیے نیم دراز تھی۔ ٹانگوں کی فینچی تھی اور گود میں کتاب دھری تھی۔ وہ ورق پلٹ رہی تھی۔

اشعار پڑھتی تھی۔ غزلیں اور نظمیں۔ کچھ لفظ سمجھ میں آتے تھے اور کچھ نہیں۔ انہیں وہ دوبارہ اور سہ بارہ پڑھتی۔ چارپانچ مرتبہ اسے اٹھ کر لغت سے معنی ڈھونڈنے پڑے۔ مگر اسے یہ کتاب پڑھنی تھی ہر صورت۔

شعروں سے ناواقفیت کے باوجود وہ کچھ چیزوں پر چونکی تھی۔ کچھ بحر س دل کو لگی تھیں کچھ پر ورق پلٹتا ہاتھ تھا تھا۔

بالیں یہ کہیں رات ڈھل رہی ہے  
یا شمع پگھل رہی ہے  
پہلو میں کوئی چیز چل رہی ہے  
تم ہو کہ میری جاں نکل رہی ہے

سننے کو بھیڑ ہے سر محشر لگی ہوئی  
تہمت تمہارے عشق کی ہم پر لگی ہوئی  
رندوں کے دم سے آتش سے بغیر بھی  
ہے میکدے میں آگ برابر لگی ہوئی

لاؤ تو قتل نامہ مرا میں بھی دیکھ لوں  
کس کس کی مر ہے سر محضر لگی ہوئی

وہ چونکہ کتاب میں موجود فیض کی یادداشتیں جیل کے ایام کچھ دوستوں کے خیال بھی ساتھ ساتھ پڑھ رہی تھی تو پہلی بار سب کچھ جان رہی تھی بعض چیزیں اسے اس تناظر میں بھی سمجھ میں آنے لگیں۔

اپنے انعام حسن کے بدلے  
ہم تمہی دامنوں سے کیا لینا  
آج فرقت زدوں پہ لطف کرو  
پھر کبھی صبر آزما لینا

ایک بار پوری کتاب ختم کر لینے پر اس نے پایا کہ اسے کتاب میں موجود شاعری سے زیادہ نثر نے متاثر کیا تھا۔ اس نے نثر کو دوبارہ پڑھنے کے لیے خود کو مجبور پایا تھا۔

رات کی آنکھ میں کاجل تھا اور دھیرے دھیرے پھیل رہا تھا۔ یہاں تک کہ ہر سو سپاہی کی چادر تن گئی۔

\*\*\*

”تم نے۔ اسے ایک رات میں پڑھ لیا؟“ وہ یہ جملہ جیج کر لینا چاہتا تھا۔ مگر صدقاتی حیرت نے گویا آواز کا گلا گھونٹنا شروع کر دیا تھا۔

”ہاں!“ وہ طمانیت سے چیونگم کار پر کھولتے ہوئے بولی۔ ”دو مرتبہ۔“

”تک۔ کیا؟“ اس کے حلق سے سیٹی سی آواز نکلی۔ ”دو مرتبہ؟“

شجرۃ نے منہ میں چیونگم رکھ لی تھی۔ سر زور زور سے ہلا کر اثبات کہا۔ پھر یکدم اسے سنان کے چہرے کے بے یقین شدید صدمے میں گہرے چٹخے چہرے کا دھیان آیا۔

”کیا اور زیادہ پڑھنی تھی؟“

”بے وقوف لڑکی!“ وہ مقدور بھر ضبط کے باوجود چلا آیا۔ ”فیض کے ایک مصرعے پر گیارہ راتوں تک غور کیا جاسکتا ہے کہ گہرائی سے ابھر نہیں پاتے گیارہ راتوں کے گیارہ سو معنی اور کیفیتیں۔ اور تم نے

ایک۔ رات میں۔ پورا آ آ دیوان پڑھ لیا۔“  
”وہ بھی دو مرتبہ“ اس کی خاموشی پر شجرۃ نے ٹکڑا لگایا۔ یاد دہانی۔

”ارے میرے اللہ!“ وہ سر ہاتھوں پر گرا کے بیٹھ گیا تھا۔

”تنی ڈھیر ساری چیزیں تو مجھے زبانی بھی یاد ہو گئیں۔“ وہ اب ذرا گہرائی۔ سناؤں؟“

”بھاڑ میں جاؤ۔ دو ادھر میری کتاب۔“ اس نے جھپٹا مارا۔

شجرۃ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر کلاس کی بیل ہو گئی۔ دونوں بھاگے۔ یہ پہلی بار ہوا تھا کہ شجرۃ کا دھیان کئی بار لیکچر سے بھٹکا اور نگاہیں نیچر سے ہٹ کر سنان الیاس پر گئیں جس کا قلم تیزی سے چل رہا تھا۔ مگر چہرے پر خفگی سی تھی۔ شجرۃ نے سوچا شاید اس نے کچھ غلط کہہ دیا ہو وہ سوری کر لے گی۔ مگر چٹخی میں موقع نہیں ملا۔ وہ کچھ لڑکوں کے ساتھ باہر نکل گیا تھا۔

انسٹیٹیوٹ سے پہلے اشاپ کی بس میں ڈنڈا پکڑ کر کھڑی وہ سنان ہی کو سوچ رہی تھی پھر اشاپ سے گھر تک تین راؤ اور نو گلیاں۔ آج ٹھوکروں پر چلتا ہمسفر پتھر کئی بار ادھر ادھر لڑھکا۔ وہ عجب غائب و باغی سی کیفیت میں تھی۔ رات بستر میں جانے تک۔

اور آج کی رات کی آنکھوں میں پچھلی رات سے بڑھ کر کاجل کی لکیریں تھیں جو پھیل کر ہر سو حاوی ہو رہی تھیں۔ سیاہی حد سے سوا۔ ہاتھ کو ہاتھ نہ سمجھائی دے۔ اوپر سے سردی۔ رات کی کپکپا رہی تھی۔ صبح کے سورج کو سوچ رہی تھی۔ وہ بھی بستر پر کوئیں بدل رہی تھی۔ پلکیں ایک دوسرے سے ہم آغوش تو ہوتی تھیں۔ مگر یہ وقتی قوت تھی کبھی جڑ میں کبھی ٹوٹیں۔ ایک دوسرے سے مدغم ہو کر سکون نہیں پاری تھیں۔ شجرۃ کو بھی صبح کے سورج کا بے چینی سے انتظار تھا۔

\*\*\*

شجرۃ نے سوچا وہ سنان سے سوری کہے گی۔ شاید وہ

ہرٹ ہوا تھا یا کچھ بھی۔ آج کالج آف تھا اور وہ گھر سے انسٹیٹیوٹ کی جانب آئی تھی۔ ایسا بہت کم ہوتا تھا کہ وہ سول ڈریس میں ہو۔ سبز رنگ کے کاٹن کے برنڈل سوٹ میں بالکل نئی نئی لگ رہی تھی۔ آج پل بھی سلیقے سے بنے ہوئے تھے جسے ہوئے۔ جب کالج سے آئی تھی تو وقت سے پہلے موجود ہوتی تھی۔ مگر آج ٹائم کا اندازہ نہ لگائی پھر بس بھی در سے ملی سو وہ حد سے زیادہ لیٹ ہو چکی تھی۔ ہانپتے بھاگتے اندر پہنچی تو کلاس خالی تھی۔ اس نے اچھے سے گرد و پیش کو دیکھا۔ سامنے سے ماسی آرہی تھی۔

”سر کے گھر میں کوئی ایمر جنسی ہو گئی ہے۔ بہت سوں کو تو فون کر دیا گیا تھا۔ تمہیں نہیں بتا لگا۔“

”اوہ۔“ وہ ہونٹ بھیج کر رہ گئی۔ اس کے گھر فون نہیں تھا۔ وہ باہر نکلی باقی پریڈز ہو رہے تھے۔ بیرونی ہال میں آکر وہ ٹھنک کر رہ گئی۔ ہال کی بیرونی دیوار شیشے کی تھی۔

اسے دور سے سنان الیاس آتا دکھائی دیا اس کے قدموں میں بہت تیزی تھی اسے بھی نہیں پتا تھا کہ کلاس آف ہے۔ دیوار کے دونوں جانب وہ دونوں تیزی سے بڑھے۔ کلاس ڈور اندر اور باہر کھلتا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے آن رکے۔ دونوں دروازے کو دھکیلنے لگے۔ شجرۃ نے اپنا ایک ہاتھ ہینڈل پر رکھا تھا۔ کہ کھولے تو وہی۔ دوسری جانب سنان کی بھی تھپی کو شش تھی۔ وہ ہینڈل پکڑ کر زور لگا رہا تھا۔ سنان نے سوچا اگر وہ ذرا سا ٹھیک دباؤ ڈال دے تو دروازہ جھٹکے سے کھل جائے گا۔ اس صورت میں شجرۃ بیٹھ کے بل بہت زور سے دھرا کرے گی۔

وہ یکدم پیچھے ہٹ گیا۔ جیت شجرۃ کی ہو گئی تھی۔ اس کا چہرہ روشن ہو گیا جگمگانے لگا۔ وہ جو مسکراتی بھی بہت کم تھی۔ پچھلے کچھ دن سے تھوڑا تھوڑا مسننے لگی تھی۔ مگر اب کی بار ہال کمرے کے سناٹے میں گونجنے والی اس کی ہنسی خود اس کے لیے حیرانی تھی۔ اسے پہلی بار پتا لگا۔ دل کھول کر مٹنے سے دل کتنا خوش ہوتا ہے اور پھپھڑے کتنے تازگی محسوس کرتے ہیں۔ کیسی



تازہ ہوا۔ تازگی اندر تک بھر جاتی ہے۔  
وہ اپنی کتابیں اور بیگ پیٹ سے لگائے ہتے ہوئے  
باہر نکلی تھی۔  
سنان ہنسا نہیں۔ وہ مسکراتے ہوئے اسے جیت کا  
جشن مناتے دیکھ رہا تھا۔  
اسے بھی پہلی بار ہٹا لگا۔ وہ ہتے ہوئے کتنی نئی نئی  
اور خوبصورت و دلچسپ لگتی تھی۔

\*\*\*

”سوری! میں نے شاید تمہیں ہرٹ کیا۔“ شجرہ  
نے کہا تھا۔

”نو۔ سوری شاید میں نے زبردستی تمہیں مائل  
کرنے کی کوشش کی۔ ہر شخص کی سوچ ہوتی ہے  
دلچسپی۔ جیسے دنیا میں ہر انسان شاعری نہیں کر سکتا۔  
ویسے ہی ہر کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ سوری تو مجھے کرنا  
چاہیے۔“ سنان بھی سوری ہی سوچ کر آیا تھا۔

”جیسے۔ سوری مت کہو۔ میں واقعی شاعری کو  
سمجھنا چاہوں گی۔“

”شاعری سمجھنے کی چیز نہیں ہے بے وقوف!“ وہ  
اس کی کم علمی پر اب خفا نہیں تھا۔

”لوگے میں جاننے کی کوشش کروں گی۔“

”شاعری کو شش کا نام ہی نہیں ہے۔ یہ تو ابہام  
ہے۔ کیفیت ہے۔ گمان اور پہچان ہے۔“

”پتا نہیں۔ مگر میری ایک عادت ہے سنان۔ اچھی  
یا بری۔ پتا نہیں۔ میں ہار نہیں مانتی۔ کسی چیز کے پیچھے  
پڑ جاؤں ناں تو بس۔ اب اتنی بھی کوڑھ مغز نہیں۔ میں  
واقعی تمہیں کر کے دکھاؤں گی۔“ اس نے اپنی فطری  
خوبی یا خامی بتائی اور ساتھ دعا بھی کر دیا۔

”لاؤ مجھے وہ کتاب دو۔“

”وہ تو میں گھر چھوڑ آیا۔“

”اوہ۔“

”ہاں۔ لیکن یہ وہ اپنے بیگ میں ہاتھ مارنے لگا۔  
ہاتھ باہر آیا تو وہ ”چاند مگر“ تھی۔ ”میں نے شاید پہلے  
تمہیں کچھ مشکل چیز دی تھی۔ آسان تو خیر یہ بھی نہیں

مگر یہ دل کو قریب سے چھونے والی شاعری ہے۔ بہت  
گہری بہت ساہو۔“ شجرہ نے جملے شاید سنے بھی  
نہیں۔ اس نے یونہی کتاب کھول لی۔

ہم دل کو لیے پردیس پھرے۔ اس جنس کے گاہک  
مل نہ سکے

اے بنجارو ہم لوگ چلے ہم کو تو خسارہ ہوتا ہے

ہم کسی در پہ ٹہرنے نہ کہیں دستک دی  
سینکڑوں دور تھے میری جان تیرے در سے پہلے

ہم کسی سمت بھی نکلے ہوں وہیں جا نکلیں  
ہم سے بھولی ہے وہ کوچہ جاننا کوئی

بھگی شاموں میں کھلے صحن میں تنہا تھا  
بے قرار نہ ہی دیکھا ہے خراباں کوئی

اور رات کے اس پہر وہ بیڑھیوں پر تنہا بیٹھی تھی۔  
چاند نگر کے اوراق پھر پھر اڑ رہے تھے۔ اسے شعر سمجھ

میں آتے نہ ہوں یاد ضرور ہو جاتے تھے گھنٹوں پر سر  
رکھ کے آنکھیں موندے وہ نیند سے بے حال ہو رہی

تھی۔ دروازے کو کھولنے کی تمکیش کا وہ منظر بار بار  
دھیان کے درتے پر دستک دیتا تھا۔

چہرے پر مسکان آتی پھر حیرت۔ پھر ہنسی۔ اس نے  
کبھی ایسے ٹھیل نہیں کھیلے تھے۔

رات بستر میں نیند اچھی نہیں آئی۔ مگر وہ ایک  
عجیب سا گند خواب بار بار دیکھتی تھی۔ وہ دونوں

اطراف کا زور۔ شرارت۔ کوشش۔ نتیجہ۔  
اس کی بے تحاشا ہنسی پر مقابل کی مسکراہٹ۔ وہ

جیسے اتنے بڑے دل کا تھا کہ اس کی جیت کو بھی متا رہا  
تھا۔

سب سے عجیب بات یہ تھی۔ خواب کی منظر نگاری  
میں وہ شیشے کی دیوار نہیں تھی۔

\*\*\*

اگلے روز شجرہ الدر چور نظروں سے سنان الیاس کو

دیکھتی رہی۔ وہ سر کے لپکچر کو شعوری کوشش سے سنتی  
تھی کہ دھیان پلٹ جاتا تھا۔

سر کی والدہ کل شدید بیمار تھیں۔ سر پریشانی میں  
گھرے تھے۔ وہ زیادہ دیر تک۔ لپکچر نہ دے پائے۔ کتاب

بند کر کے کرسی پر براجمان ہو گئے۔ وہ اسٹوڈنٹ سے  
ان کے فیوچر پلان کے بارے میں پوچھنے لگے۔ ہاتھ

سے اشارہ کرتے جاتے اور اپنی باری آنے پر سب  
اپنے دل کی کہتے۔ سر خاموش تھے۔ ہاں کسی سے کوئی

سوال کر لیتے۔

ایک سے ایک حیران کن جوابات۔ ہر شخص کے  
لیے پردھائی اس لیے اہم تھی کہ وہ اسے پروفیشن کے

طور پر آگے کام لاسکے۔ جتنی اچھی پردھائی اتنی اچھی  
کمانی کا فارمولا۔ ایک نے تو حد کر دی۔ انگلش

لینگویج میں اس کیے انٹرنشڈ ہے کہ شادی ہو کر  
امریکہ جانا ہے سوا ابتدائی تعلیم تو حاصل کر کے ہی

جائے۔

کلاس کبھی حیرت میں مبتلا ہوتی تھی۔ کبھی رشک  
میں اور حسد میں۔ ہنس بھی پڑتی تھی۔ سنان الیاس

کے جواب نے سب کو حیرت رشک و حسد میں مبتلا  
کر دیا۔

”سر! میرے لیے پردھائی ایک اچھے پروفیشن کو  
حاصل کرنے کی سیڑھی نہیں ہے۔ میرا ایک فیملی

بزنس ہے۔ جسے بھائی چلاتے ہیں اور مرحوم والد میرا  
شیئر رکھ گئے ہیں مگر میں کوئی بھی چیز اس لیے پردھتا

ہوں کہ مجھے پردھنا اچھا لگتا ہے۔ میرے نزدیک تعلیم  
خوب صورتی ہے۔ اسے اپنا کر آپ اپنے اندر جو دل

قریب خوبصورتی پیدا کر سکتے ہیں۔ وہ دنیا کی کسی بھی  
یونی پروڈکٹ سے حاصل نہیں ہو سکتی۔“

سر بے ساختہ کھڑے ہو گئے۔ وہ تالی بجا رہے تھے۔  
شجرہ سمیت سب کے سب گنگ ہو گئے جیسے۔

سنان کلاس میں کبھی بہت نہیں بولا تھا۔ مگر آج کے  
چند جملے اس کی پوری شخصیت اور سوچ کو عیاں کر

گئے۔

حیران بھی کیا اور کئی جیسے احتمالہ بات پر ہنسے بھی۔  
”سر! میں بی اے بی ایڈ کر کے اسکول ٹیچر بننا چاہتی

ہوں۔“

”ہائیں!“ ساری کلاس حیران ہو گئی۔ اپنی ذہانت  
پس محنت وہ کلاس کو دکھا چکی تھی۔ اس کے سارے

کام مکمل ہوتے تھے اور ایک بار کی سمجھائی بات اس  
نے کبھی دوبارہ نہ پوچھی تھی اور جواب اتنا ساہو اور دو

ٹوک۔ حیرت۔ ہنسی اور شرر سا ”اوہ۔“

”بس!“ سر نے پوچھا۔

”ییس سر۔ بس۔“ وہ بولی۔

”گریٹ۔“ سر نے سراہا۔ وہ کچھ کہنے والے تھے۔  
”سر! دراصل لیڈی ٹیچر ہونے کی صورت میں

ساتھ سال کی عمر تک مس پکارا جاتا ہے۔ ہمیں نہیں  
معلوم تھا آپ اتنی اتج کلنٹس ہیں۔“ یہ کسی کی شریر

جملہ بازی تھی۔

شجرہ نے مڑ کر کہنے والے کو دیکھا۔

”در اصل سر! میرے فادر۔ میرے مرحوم فادر  
اسکول ٹیچر تھے۔ میں بس ان جیسا بننا چاہتی ہوں۔ وہ

گورنمنٹ ٹیچر تھے۔ اور بہترین استاد تھے امپیشلی  
میتھ سر۔“

سر کے چہرے پر ستائش پھیل گئی۔ وہ بتانے لگے  
کہ استاد ہونا کتنی بڑی عنایت ہے۔ یہ پیغمبروں کا شعبہ

رہا ہے۔

شجرہ کے چہرے پر قفاخر آمیز مسکراہٹ بڑھتی چلی  
گئی۔ اسے لگ رہا تھا۔ سر اس کے فادر کی صفات بیان

کر رہے ہیں لیکن۔

”مجھے نہیں پتا تھا۔ تم اتنی بڑی کنویں کی مینڈک  
ہو۔ اور دور کی نگاہ اتنی کمزور ہے؟“ سنان نے چھوٹے



برا لگا۔ وہ اس کی توہین کر رہا تھا۔ اور اس کے خیال کی اور اس کے والد کی بھی۔ اس کی فطری درستی عود کر آئی۔

”سر کے آگے بڑی حسین جملے بازی کر کے آئے ہو۔ خود انٹر سے آگے بڑھ کر نہ دیے۔ ہاں یا پھر شاعری کو تعلیم کہتے ہوں گے۔ انٹر کا نام بھی خود ہی لے لیا ہے۔ ہمیں کیا پتا پاس ہوئے کہ فیل۔ باتوں کے بادشاہ ہو۔ جملوں کا خزانہ ہے۔ دونوں ہاتھوں سے صبح و شام لٹاتے ہو۔ دنیا دریا دلی کی تعریف نہ کرے تو کیا کرے۔“

وہ غصے سے سرخ ہو گئی تھی۔ ادھار رکھنے کی وہ فطرتاً قائل نہیں تھی۔ اسے لگا نشان نے اس کے لبا کی بے عزتی کی ہے۔ وہ اس کے اپنی ذات پر بہت سے احسان مانتی تھی۔ مگر ابو کے لیے۔ ہاں وہ تھی احسان فراموش۔

اس کے بھبھو کا چہرے اور سخت تلخ لہجے پر وہ برا نہیں مانتا۔ مہربانہ انداز میں مسکرایا اور مسکراتا ہی چلا گیا۔ شجرہ الدرد کو اور زیادہ برا لگا۔

”تم تو بہت غصے والی ہو بھئی۔ دن میں تارے دکھا سکتی ہو اور آئینہ دکھا سکتی ہو اور۔ میرے پاس جملوں کا خزانہ ہے تو تمہارے پاس جملوں کا اسلحہ خانہ۔ منٹوں میں اگلے کے پرچے اڑا سکتی ہو۔ نیست و نابود کر سکتی ہو۔“ وہ خفا نہیں ہوا تھا۔ جھوم گیا تھا۔ جیسے خیام کی رباعی سن لی ہو۔

شجرہ کا چہرہ ہنوز پتھر تھا۔ وہ شاید آستین چڑھا کر لڑنا چاہتی تھی۔ اس کی خاموشی بھی کھل رہی تھی۔ وہ کچھ بھی کہے تاکہ وہ اسے تاک تاک کر جواب دے سکے۔ اور وہ چہرے کی تحریر کا حرف پڑھ رہا تھا۔ سمجھ رہا تھا۔

”میسٹرک میں شروع کے بیس اسٹوڈنٹ میں میرا نام تھا۔ اور انٹر میں اے ون گریڈ۔ آنرز کے لیے یونیورسٹی میں ایڈمیشن بھی ہو گیا تھا۔ مگر شدید خطرناک ایکسپلینڈ کے باعث تقریباً ایک سال بیڈ پر رہا۔ اب نیو ایڈمیشنز میں جاؤں گا۔“

وہ زرب لب مسکراہٹ کے ساتھ بہت سرسری سا پتا رہا تھا۔ شجرہ کے چہرے کے تاثرات نہ بدلے۔ وہ بے یقین تھی۔ کیا پتا سچ کہہ رہا تھا کہ جھوٹ۔ وہ اس کے بارے میں جانتی ہی کیا تھا۔ سنان چہرہ شناسی کے فن میں ماہر تھا یا شجرہ ہی کو پڑھ پاتا تھا۔ وہ یکدم بیک پر لگا بیگ اتارنے لگا۔ پھر نیچے جھک کر اپنی جینز کے پانچے مقدور بھر موڑنے کی کوشش کی۔

”یہ ادھر دیکھو۔“ اسے بکار کر پھر وہ خود ہی اس طرح آگے آگیا کہ شجرہ کی نظر پڑ جائے اور شجرہ سن رہ گئی اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔

دونوں پنڈلیوں کا رنگ باقی جلد کی نسبت زیادہ سیاہ تھا۔ ہڈی میں ہلکا سا خم محسوس ہو رہا تھا۔ اور ٹانگوں کے نشان یوں نمایاں تھے۔ جیسے ابھی ابھی لگائے ہوں۔

”تیز رفتار ڈرائیور اپنے حساب سے میری ٹانگیں کچلتا ہوا ہی گزرا تھا۔ یہ تو شاید میری ماں کی دعا میں تھیں کہ میں زندہ بچ گیا اور معذوری سے بھی بچ گیا۔ وہ بہت ٹھنڈے بے تاثر لہجے میں بتا رہا تھا۔

شجرہ کا ہاتھ ہونٹ پر جار کا۔ وہ غیر ارادی طور پر نزدیک چلی آئی۔ اس کا چہرہ شرمندگی کے احساس سے چٹختے لگا تھا۔ سنان کے ہونٹوں سے مسکراہٹ جدا نہ ہوئی۔ وہ پانچے نیچے کر رہا تھا۔ شجرہ غیر ارادی طور پر ذرا سا پیچھے سرکی۔

”ہاں۔ یہ نشان رہ گئے ہیں جو وقت کے ساتھ یقیناً مندرل ہو جائیں گے اور۔“ وہ مسکراتے ہوئے اپنی بات مکمل کر رہا تھا۔

”اور جہاں تک نقص رہ جانے کی بات ہے تو کوئی بات نہیں۔ یہ معمولی سا لنگ زندگی بھر کی معذوری سے بڑھ کر تو نہیں۔“

صرف اس کا چہرہ اور آنکھیں متنبہ نہیں تھیں۔ اس کا لہجہ بھی تبسم سے بھرپور تھا۔ اور شجرہ جیسے کسی نے پشت سے وار کر کے بھالا اس کے دل میں اتارا تھا۔ اسے بھل بھل کر تاخون دکھائی نہ دیتا تھا وہ صرف بھالے کی خون آلود نوک دیکھتی تھی جو چہرے کے عین سامنے دل کے مقام سے نکل کر کھڑی تھی۔

”لنگ کون سا۔ لنگ۔ کس کے۔ کب۔ کہاں؟“ وہ ایلٹے ڈیلوں کے ساتھ آگے ہو کر اس کی ٹانگوں کو دیکھ رہی تھی۔ اسے تو کوئی لنگ نظر نہ آ رہا تھا۔ کہاں۔

”تم تو یوں ری ایکٹ کر رہی ہو جیسے تمہیں خبر نہیں۔“ وہ ایک بار پھر بیک پشت پر کئے لگا تھا۔

”مجھے خبر نہیں تھی۔“ اس کے جملے میں ٹوٹ پھوٹ تھی۔ آواز جیسے قبر کی اتھاہ گہرائی سے ابھری ہو۔

”مذاق کر رہی ہوناں؟“ وہ جولا پروائی سے باہر نکل رہا تھا۔ آنکھیں چند می کر کے اسے دیکھنے لگا۔

”میں۔ نہیں۔ قسم سے۔“ وہ اس کے قریب کسک آئی۔

خوف اور حیرت میں اب شرم ساری کا عنصر غالب آگیا تھا۔ اور آنکھ سے بنے لگا تھا۔

”یہی۔ یہی تو۔ تم خود میں اتنی گن رہتی ہو یا پھر کہاں رہتی ہو شجرہ۔“ انھیں سامنے بڑی چیز دکھائی نہیں دیتی۔ تم لارواہ ہو۔ یہ تو میں نے مان لیا تھا۔ اندھی ہو۔

یہ مجھے بھی نہیں پتا تھا۔ اب بھی سچ کہہ رہی ہو یا میرا مذاق اڑا رہی ہو؟“ وہ اسے چھیڑ رہا تھا۔

”میں سچ۔“ اس نے اپنے ہونٹ کچلے۔ وہ جملہ خود ہی ادھور اچھوڑ کر ڈیسک پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

اتنے عرصے کے ساتھ میں۔ ساتھ ساتھ چل کر بھی وہ چیز نہ دیکھ سکی تھی۔ جو اس کے فقط تین قدم آگے بڑھانے پر اس نے اب دیکھی تھی۔

بہت معمولی سی۔ بے حد غیر معمولی سی لڑکھڑاہٹ۔ جیسے۔ جیسے۔ اسے کوئی تشبیہ نہ سوچھی۔ اس لڑکھڑاہٹ کا نام نہ تھا۔ مگر وہ تھی۔

”یہی تو تمہارا فالٹ ہے شجرہ الدرد!“ اس نے اس کا نام صحیح تلفظ سے ادا کیا۔

”تم اپنی سوچوں میں۔ اپنے آپ میں شاید اتنی محو رہتی ہو کہ ارد گرد دیکھتے ہی نہیں۔ جو سوچ چکی ہو۔ کہہ چکی ہو۔ اب کار بند ہی رہو گی۔ اور تم ہی ٹھیک ہو اور تمہیں کسی مشورے کی ضرورت نہیں۔ جبکہ۔“

اس نے قصداً جملے روک دیے حالانکہ وہ بہت

سارے تھے۔

”میں ہمیشہ اپنے فیصلے خود کرتی رہی ہوں آج تک تو غلط نہ نکلے۔“ اس نے جواب نہیں دیا تھا۔ یہ خود گلای تھی۔

”بی اے بی ایڈ میں کوئی برائی نہیں۔ قطعاً۔“ نو نور۔ ”وہ دائیں بائیں سر ہلا رہا تھا۔“ ”اسکول ٹیچر ہونے سے زیادہ اہم بنیاد کوئی نہیں۔ مگر شجرہ الدرد۔ ایم اے ایم ایڈ کیوں نہیں۔ بی ایچ ڈی کے بعد ڈاکٹر کیوں نہیں۔ آب حیات کا ایک گھونٹ ہی کیوں نہانت و محنت کا ہنر خدا داد ہے تم سیرابی کیوں نہیں حاصل کرتیں۔“

یہ سنان الیاس کا نیا روپ تھا۔ بیگ کو پشت پر لاوے۔ بغلوں میں فیتوں کو سیٹ کرتا شعر پڑھتا ایک عام سائے بے فکرانظر آنا نوجوان۔

وہ منہ اٹھا کر اسے دیکھ رہی تھی۔ سن تو چکی ہی تھی۔ وہ اسے اشارہ کر رہا تھا۔ دیر ہو رہی ہے۔ بیگ اٹھائے اور چلے اور ہاں نکلنے سے پہلے ذرا اپنی آنکھیں پونچھ لے جو دھل رہی تھیں جن میں سرخیاں تھیں۔ کالی سیاہ گہری آنکھیں عم میں پڑنے کے وہ اتنی گہری ہو گئی تھیں کہ کوئی ڈوبے تو ہاتھ پاؤں چلانے کی مہلت بھی نہ ملے۔

سنان الیاس کو اپنے دل کی دیوار کی کمزوری بخوبی محسوس ہوئی۔ اس بہاؤ کا مقابلہ کرنا اس کے بس سے باہر تھا۔ اس نے نگاہیں چرائی تھیں۔

\*\*\*

”محبت ابر کی صورت۔“

دلوں کی سرزمین پر گھر کے آتی اور برستی ہے۔ چمن کا زہرہ زہرہ جھومتا ہے۔ مسکراتا ہے۔

انزل سے بے نموشی میں سبزہ سراٹھاتا ہے۔ محبت ان کو آباد اور شاداب کرتی ہے۔

جودل ہیں قبر کی صورت۔ محبت ابر کی صورت۔ اسے پانچ برس کی عمر ہی میں دھتکارا نہیں گیا تھا۔ اس سے پہلے بھی۔ جب وہ چھوٹا سا تھا۔ پتنگھوڑے



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شاندار پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ٹھیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریٹخ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

”اپنا نہیں گند اخون۔“ وہ بھڑکا۔ میں ایسے ناجائز بچے کو اپنے گھر میں برداشت نہیں کر سکتا، کجا کہ اسے اپنالوں۔ آخ تھو۔“

”گند اتونہ کہیں۔ اور ناجائز کیوں؟ وہ تو۔“

”گند اہی ہے اور ناجائز تو بالکل ہے۔ میں کسی مثال کو نہیں مانوں گا۔ اور تم اپنے دماغ سے اس خناس کو نکال دو کہ۔“

”صرف میں کیوں سب۔ سب یہی چاہتے ہیں، سب ہی کہہ رہے ہیں۔ کہ ہمیں اللہ کی طرف سے موقع مل رہا ہے تو۔ باہر سے کسی اور سے بچہ مانگیں گے تو کیا گارنٹی ہے کہ وہ۔“ اس نے جملے قصداً روکے ”جبکہ یہ تو۔“

”نہ یہ نہ وہ۔ جلد از جلد اس ماں بچے کو کہو کہ اپنا بندوبست کر لیں۔ میں نہیں سن سکتا۔ بے غیرتی کے طعنے۔ مجھے تو سکون ہی تب ملے گا جب میں دنیا کو بتا دوں کہ میں نے کیسے ان دونوں کو گھر سے نکال دیا ہے۔“

”دنیا تو باتیں کرتی ہے۔ جو مرضی آئے بکواس۔ دنیا حقیقت سے بھی تو واقف ہے نا۔“

اس کے پاس ویسے ہی قائل کرنے کو دلیلیں کم تھیں اور پھر جب سننے والا جھڑک دے اور آگ بکولا ہو جائے تو۔ وہ تو کچھ ماننے کو تیار ہی نہیں تھا۔

وہ چھپ چھپ کر اس کی غیر موجودگی میں اس سے لاڈ کرتی، چوم گنتی اور جو وہ دیکھ لیتا تو نوج کر اس سے الگ کر دیتا اور جا کر اسے اس کی ماں کی گود میں بچہ دیتا جو حیرت سے بس چہرہ دیکھتی۔ بچے کو ہاتھ نہ لگائی وہ اسے یوں ہکتی تھی جیسے عجوبہ ہو۔

وہ اسے دھتکارتی نہیں تھی، مگر اپناقی بھی نہیں تھی وہ تو۔



شاخنی کارڈ ہوانے سے لے کر بینک سے آفرز کے لیے فارم منگوانے سے لے کر سب مرٹ کروانے تک کے سارے کاموں میں سنان الیاس پیش پیش تھا بلکہ مضامین کے چٹاؤ میں بھی انٹر کے ایگزامز کے بعد کے

میں حلق پھاڑ پھاڑ کر روتا تھا۔ اور سب اس کے نزدیک آنے سے گھبراتے تھے۔ یہ بھی چاہتے تھے کہ وہ چپ رہے اور بالکل آواز نہ نکالے۔

آواز نہ تکلیف کی۔ نہ آسودگی کی۔ بس پتا ہی نہ چلے کہ وہ ہے اور وہ اتنا ہی بڑا روندو تھا۔ خوشی میں بھی روتا دکھ میں بھی روتا۔ اس کی ماں نے اسے اپنا دودھ نہیں دیا تھا کہ کہیں وہ عادی نہ ہو جائے۔ وہ ڈبے کا دودھ پیتا تھا مگر وہ اتنا چھوٹا تھا کہ اسے فیڈر ہاتھ میں پکڑایا نہیں جاسکتا تھا۔ گود میں لے کر سینے سے لگا کر پکارتے ہوئے ہلایا جاتا تھا۔

سب اس کے قریب آنا بھی چاہتے اور دور رہنا بھی۔ اور تو اور جنم دینے والی ماں بھی اسے حیرت سے دیکھتی تھی اس کے پورے وجود کو ناک ہونٹ، سر۔ آنکھیں۔ یہ کہاں سے آگیا تھا۔ ایسے کیسے؟ ایسا بھی ہوتا ہے ہو سکتا ہے مگر ہوا کیسے؟

وہ کبھی کسی گم غم کیفیت میں اس تک آ بھی جاتی تو چند لمحوں کے شر او کے بعد وہاں سے بھاگ آتی جیسے بھوت دیکھ آئی ہو۔ چھپ جاتی یا کم از کم چھپ جانے کی خواہش کرتی۔

مگر چھپ جانے سے خطائیں کب چھپتی ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو اسے بھرے جہان میں ایک آدم نظر نہ آتا۔ کون دعوے دار ہو سکتا ہے کہ اس نے کبھی کسی مقام پر لغزش نہ کھائی؟

”میں گلا گھونٹ کر ماروں گا اس کو۔ اس کی آواز بند کروادو۔ مجھے نہ نظر آئے اس کی صورت۔“

اس حکم پر عمل درآمد مشکل تھا۔ صورت تو چھپائی جاسکتی تھی چھپائی جاتی مگر آواز۔

”ہم اسے رکھ لیتے ہیں نا۔“ اتنی نفرت کا اظہار کرنے والے کی بیوی نے فرمائش کر دی۔

”ہم لہو چلایا“ دماغ خراب بے ہمارا کیا۔۔۔۔۔“

”نہیں وہ۔ ہمارے ہاں جب اپنی اولاد نہیں ہو سکتی۔ میرا مطلب ہے نہیں ہے تو۔ گھر میں کھلونا سا ہو جائے گا۔ ورنہ کون کسی کو اپنی اولاد دیتا ہے۔ یہ تو پھر اپنا خون۔“



تقریباً چھ ماہ اس نے علی کے علاوہ آگے پیچھے کے بچوں کو بھی یوشنزدے دے کر سارے اخراجات اٹھنے کر لیے تھے۔

خاص طور پر جب سے اس نے انگلش سیکھی تھی۔  
 ماں باپ تو فٹس کرتے ہی۔۔۔ ایستھ نانتھ کی لڑکیاں  
 نجانے کہاں سے پوچھ پوچھ کر گھر تک آجاتیں جو بسوں  
 میں جا کر دور دور سے کوچنگ نہیں لے پاتی تھیں۔  
 شروع میں مامیاں یا محسنہ ہمراہ بیٹھ جاتیں فیس  
 وغیرہ کا مرحلہ طے کرنے کے لیے مگر شجرہ نے سختی سے  
 منع کر دیا۔ وہ آنے والیوں کی احسان مند دکھائی دیتی  
 تھیں اور فیس کم کرنے کی درخواست میں اسے  
 چٹکیاں کٹ کر قائل کرتیں کہ وہ مان جائے جبکہ شجرہ  
 قصائی بنی ہوتی اسے علم تھا کہ آگے اس کی پڑھائی کس  
 قدر مہنگی ہونے والی ہے۔

”آپ سب لوگ برائے مہربانی مجھے مشورے دینے  
مت آئیں بلکہ میرے پاس آکر بھی نہ بیٹھیں اور اتنا  
شکر گزار کیوں ہوتی ہیں۔ شکر گزار ہمیں نہیں انہیں  
ہونا ہے۔“

وہ قیس کے معاملے میں قطعی تھی اور فیس کی تاریخ پر مزید جلا دوس تاریخ آندھی یا طوفان۔۔۔  
فیس ملے کرتے ہوئے جب قطعی سے انکار کرتے ہوئے انگلش میں کچھ جملے کہہ دیتی تو سب کو کوئی فنانس منسٹر، بینکر نظر آتی۔ علم نے اسے عزت اور دولت بخشی تھی۔

اپنے تمام فیصلوں میں وہ اب اتنی باختیار تھی جیسے کسی بڑے قبیلے کا سردار یا پنجائیت کا سردار۔  
میں جا رہی ہوں۔ آرہی ہوں۔ اب تو دیر سویر کا  
بتانا چھوڑ چکی تھی اور سب نے پوچھنا ہی چھوڑ رکھا تھا  
اے میں جب محسنہ نے بوجھا۔

”لی اے کے لیے نیا یونی فارم سلوانا ہے۔“  
 ”یونی فارم کی اب مجھے ضرورت ہی نہیں ہے۔“  
 ”ہیں...؟“ محسنہ کے سان و تمان میں بھی یہ  
 جواب نہ تھا۔

”میں آنرز کرنے کے لیے یونیورسٹی جا رہی ہوں“  
ای! اور وہاں یونیفارم نہیں ہوتا۔“  
”یونین۔۔۔ سی۔۔۔ سی۔۔۔ سی۔۔۔“ محسنہ نے یونی  
ورسٹی کے فلکڑے کر دیے۔

”وہاں کیا۔ کیا کرتے جاتا ہے؟“

”آئرن۔ آئرنز ای! ڈگری کا نام ہے۔“ وہ آسلن

الفاظ جمع کرنے لگی۔

شام تک سارے گھر کو یونیورسٹی اور آنرز کے  
معنی و مقاصد اور فوائد اذہر ہو چکے تھے۔ رشک آمیز  
حیرت۔ فخر۔ یعنی کہ یونیورسٹی۔

✱ ✱ ✱

بڑے ماموں اور محسن نے اسے اپنے فیصلے سے آگاہ کر کے حیران کر دیا۔ ٹھیک ہے وہ ضرور ایڈمیشن لے مگر وہ دونوں اس کے ہمراہ جا کر ایک باریونی ورشی کو دیکھ تو آئیں اور وہ شانے اچکا کر رہ گئی۔ ”کیسا جا کر دیکھنا؟“ مگر ماموں اور امی دیکھنے آئے تھے اور دیکھ دیکھ کر تھکتے نہیں تھے۔

امی نے اپنا نیا سوٹ زیب تن کیا اور ماموں نے چلتے چلتے واسکٹ بھی چڑھالی تھی۔ ٹانھتھ کلاس سے بھاگے ماموں اور گھر گرہستی میں جتی امی کے لیے یہ ایک نئی دنیا تھی ایک نیا جہان۔

ایک پروفسر

وہ بار بار شجرۂ کے نزدیک ہو جاتے اور اس کے  
ڈاکو منٹس کی فائل تو مستقل پکڑ رکھی تھی۔ یہاں ہر  
طرح کے لڑکے لڑکیاں والدین موجود تھے جن میں  
شجرۂ بھی تھی۔ وہ سادہ لباس سادہ چہرے کے ساتھ

تھی اور سب سے اہم خوبی بااعتمادی اور ایک بے نیازی  
 سی تھی۔ اس پر جیسے گروپ پیش کا اثر تھا ہی نہیں۔ وہ  
 انڈیشن کے حوالے سے ایک کمرے سے دوسرے  
 کمرے کی طرف بھاگتی۔ لائن میں لگتی۔

یہیں ماموں اور امی پہلی بار سنان الیاس سے ملے جو بے نیازی، با اعتمادی و بے فکری میں سب سے آگے تھا۔ وہ گرم جوشی سے ملا۔ ذرا سنا خمیدہ۔ اس نے ان دونوں کو بے حد عزت دی۔

تجربہ نے اپنا بیگ اور کچھ فائلز محسنہ کو پکڑا رکھی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں پانی کی بوتل تھی۔ وہ ہریار جب بھاگ کر آئی بوتل منہ سے اونچی رکھ کے چند گھونٹ حلق میں ٹکالتی۔ کئی بار اس نے بوتل سنان کو بھی دی۔ وہ دونوں مسلسل بول رہے تھے۔ کبھی کسی گروپ میں شامل ہو کر کبھی تنہا ہو کر۔

ماموں کا سرخھر سے بلند تھا۔ آنے والے کئی دنوں تک وہ اپنی بورک شاپ میں بیٹا رہے۔  
 ”اور جب میں یونیورسٹی گیا، دراصل اس دن میں یونیورسٹی گیا۔ میری بھانجی ہے نا وہ بڑھتی ہے وہاں۔  
 لوگ ایسے ہی ماحول کی باتیں کرتے ہیں۔ وہاں تو کسی کو سر کھانے کی فرصت نہیں۔ دراصل۔“

اپنی نئی زندگی میں وہ بری طرح جُت گئی تھی۔ یہاں  
بڑھاپا بہت وقت مانگ رہی تھی۔ یونیورسٹی گھر سے  
اپنی دور تھی کہ فاصلہ سوچتے سوچتے بندہ تھک جائے  
بڑھاپا اور تین بجے تک گھر پہنچاتی۔ ایک گھنٹہ کے  
آرام کے بعد اس کے پاس اب چند اسٹوڈنٹ تھے۔

میسٹرک کے لڑکے لڑکیاں۔ گلی کے کھتے لڑکوں کو خود والد بزرگوار دلیز پر بیٹھ جاتے گھروالے سب حق دق رہ جاتے جب وہ شجرہ کے آگے چیں بھی نہ بول پاتے اس نے چھوٹے موٹے بچوں کو فارغ کر دیا تھا۔ صرف چنیدہ میسٹرک کے بچے۔ فیس منہ مانگی۔ وہ لباس کا خیال رکھنے لگی تھی اس نے ماں سے کہا

تھا، وہ اپنی پڑھائی کے لیے جی جان سے محنت کرتی ہے، مگر رقم کم ہے، وہ اسے ہر ماہ پنشن سے رقم دیں اور فضول کیشیوں میں پیسے مت پھنسا میں۔ محسنہ مایع دار ہو چکی تھیں۔ ان نکلیں۔

وہ چوٹی بنانے میں وقت صرف کرنے لگی تھی۔  
 کاجل سے بے نیاز آنکھیں اب اسے ویران لگنے لگی  
 تھیں۔ حالانکہ ان میں ویپ جلنے لگے تھے۔ انہیں  
 سنوارنے کے لیے اس نے کچھ سامان آرائش خرید لیا  
 تھا۔

سنان الیاس سے جان پہچان دوستی میں اور دوستی  
اس مرحلے میں داخل ہو رہی تھی جب خود کو مقابل کی  
آنکھوں سے دیکھنا اچھا لگتا ہے۔

کتنے دن گزرے انسان الیاس کو اس کی زندگی میں  
قدم رکھے ہوئے۔ وہ اس کا مددگار تھا۔ راہ نما سامع اس  
کی گویائی (اس کے دل کی کہنے والا)

دوستی کے آغاز میں یاد رہتا تھا اب جیسے بھولتا ہی نہیں۔

وہ خیال بد نہیں تھا کہ وہ لاجول بڑھ لیتی۔ وہم بھی نہیں کہ تختی سے سرزنش کر دیتی۔ ایک عجب ناقابل فہم سی کیفیت میں گھر کے اس سوچنا بڑا ہی عجیب تجربہ تھا۔ ایسے میں اسے دیکھنا۔ ملنا بات کرنا اسے لگتا وہ مشکل میں بڑھ جاتی ہے۔

وہ اس کے ساتھ ساتھ رہتا، دونوں میں سے جو پہلے آجاتا۔ وہ مخصوص جگہ پر کھڑا رہ کر انتظار کرتا کہ ڈیپارٹمنٹ تک اکٹھے ہی جائیں واپسی پر اکٹھے بس میں سوار ہوتے۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف  
سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

پنج گھنٹہ



حالات خراب نہ ہوتے تو وہ اس کے ہمراہ اتر جاتا۔ اسے ممکنہ جگہ تک پہنچا دیتا۔ وہ اب کریم آباد کے ٹھیلوں کے علاوہ شہر کے دوسرے ٹھیلوں کی خاک چھاننے بھی جاتے۔ وہ گھر میں اطلاع دے دیتی۔

”بس ڈھونڈنے جا رہی ہوں، اتوار کے دن بازار لگتا ہے، سنان ہے، ماسا تھ۔“

وہ اب بھی شاعری کی کتابیں ڈھونڈتا تھا۔ شجرہ کو اب تک اشعار سمجھ نہ آتے تھے، مگر اس کا دم بیٹھا جذب سے بھرپور لہجہ دل میں اترنے لگا تھا۔ وہ بس بولتا رہے وہ بس سنتی رہے۔

زندگی تھی کہ قیامت تھی کہ فرقت تیری اک اک سانس نے وہ وہ دیے آزار کہ بس

اس سے پہلے بھی محبت کا قرینہ تھا یہی ایسے بے حال ہوئے ہیں مگر اس بار کہ بس

لوگ کہتے تھے فقط ایک ہی پاگل ہے فراز ایسے ایسے ہیں محبت میں گرفتار کہ بس ”کیسے لگے؟“ وہ ہر بار پوچھتا تھا۔ کھوئی ہوئی شجرہ چونکتی۔

”جھے بہت اچھے۔“

وہ ذرا سا چروہ نیچے کر کے اس کی آنکھوں میں جھانکتا، نور سے ہنس دیتا۔

”جب سمجھ میں نہیں آتا تو سنتی کیوں ہو۔ اور گھڑا گھڑا جواب اچھا بہت اچھا۔“

”محبت سمجھنے کی چیز کب ہے؟“ جملہ جیسے پھسل جاتا۔

”ہاں یہ بھی ہے۔“ وہ فوراً قائل ہو جاتا۔

”لیکن۔“ اسے دھیان آتا۔ ”تم نے محبت کو کب سے سمجھنا شروع کر دیا۔“

”پتا نہیں۔“ وہ فوراً مکر جاتی۔ ”میں نے تو بس جملہ کہا ہے۔“

”ہاں۔“ وہ مان جاتا۔ ”تم جملہ ہی کہہ سکتی ہو۔ تمہارا گہرائی سے دور کا واسطہ بھی نہیں۔“

”تو تم اتنا گہرا غوطہ کھاتے ہی کیوں ہو۔ میں ذرا اوپر اوپر کیوں نہیں تیرتے۔“

”تم کیا کہنا چاہتی ہو؟“ اس کے کان کھڑے ہوئے تھے۔

شجرہ اس کی شکل دیکھ کر رہ گئی۔ اس سوال کا جواب سیدھا سیدھا اظہار ہو جاتا۔ لڑکیاں ”محسوس“ کرنے میں ہمیشہ اولیت رکھتی ہیں، لیکن اظہار میں اولیت ان پر چھوٹی نہیں۔ شجرہ نے فوراً بات پلٹ دی۔

”میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ تم مجھے شعر سناتے رہو۔ سمجھاتے رہو۔ کبھی نہ کبھی تو۔“

”مجھے لگتا ہے میں یونیورسٹی میں پڑھنے نہیں آتا پڑھانے آتا ہوں۔ اردو ایڈوانس کا پروفیسر بن کر۔“ وہ غل کر کہتا تھا۔ شجرہ ہنس دیتی۔

☆ ☆ ☆

”ایک منٹ کا سکون حاصل نہیں ہے آخر کب ختم ہو گا یہ اسکول۔“

اکتالی۔ تلخ اور غصیلی یہ آواز آفاق بھائی کی تھی۔ دوپٹے کی بکل لپیٹے تختہ سیاہ کو چاک سے سفید کرنا شجرہ حساب کے سوال کے آخری مرحلے پر تھی۔ وہ رکوع کی سی حالت میں جھکی بالکل نیچے لکھ رہی تھی۔ چونک کر سیدھی کھڑی ہوئی اور آفاق بھائی کو دیکھنے لگی۔ سارے اسٹوڈنٹس کی گردنیں بھی گھوم گئیں۔

شجرہ کے متوجہ ہو جانے پر انہوں نے سوال دہرایا نہیں کہ تاثرات میں تفصیل سے درج تھا۔ وضاحت کے ساتھ۔ شجرہ نے گردن موڑ کر باقی اہل خانہ کو دیکھا۔ وہ سب چونکے تھے۔ حیران ہوئے تھے اور ایک پنج بستہ بے بس آہ بھر کے ایک بار پھر اپنے اپنے اعمال میں مگن ہو گئے۔ شجرہ نے دل میں امنڈ کر آئی ناگواری کو تھکا اور اسٹوڈنٹ کو ڈپٹا۔

”واپس گھومو تم سب لوگ۔ سوال سمجھ میں آیا ہے تو اتار لو اور اگر کہیں کنفیوژن ہے تو ابھی کلیئر کروالو۔ آج یہ ایکسٹرنل ختم کر دینی ہے۔“ سب نے کورس میں مگر جیسے زیر لب ”طیس نیچر“ کہا۔

اسد کھڑا ہو گیا۔

”سارا سمجھ آ گیا ہے بس یہ جب فارمولے کے ساتھ الیج کر کے کرتے ہیں تب۔“

وہ کھا جانے والی نگاہوں سے گھورتے نیچر کے بھائی سے خائف ہو کر ایک ایک کریمت آہستہ سے بول رہا تھا۔

”ٹھیک ہے۔ تم میرے پاس آ جاؤ۔“ شجرہ نے کہا۔ پلاسٹک کی دو کرسیوں کے بیچ میل تھی۔ اپنی کاپیاں سنبھالتا اسد گرتا پڑتا کرسی تک آیا۔ باقی سب سوال آتے تھے۔

”ہاں۔ اب بولو۔ کہاں آکر نہیں سمجھ پاتے تم؟“

”اور وہ جو میں نے بکواس کی ہے۔ اس کا کوئی اثر ہے بھی کہ نہیں۔“ آفاق بھائی اب مروت کو طاق رکھتے سب کے سر پر پہنچ گئے تھے۔

شجرہ نے نگاہیں اٹھائیں۔ ان میں غصیل پن، ناگواری اور اپنے کام سے کام رکھنے کی تنبیہ با آسانی بڑھی جا رہی تھی، مگر جب وہ بولی تو لہجہ، جملہ اور آواز بالکل سادہ تھی۔

”بس چھٹی ہونے ہی والی ہے۔“

یہ اتنے بڑے شہر میں تم لوگوں کو کوئی اور استانی نہیں مل رہی جو۔“

اسٹوڈنٹ لڑکے منہ اٹھا کر آفاق بھائی کو دیکھنے لگے اور لڑکیاں سر جھکا کر خاموش ہو گئیں۔ ایسا پہلے تو کبھی نہیں ہوا۔ بڑے پرسکون ماحول میں ٹیوشن ملتی تھی۔

”کیوں شور کرنا اوھر آ گیا ہے آفاق۔ چلو بچو! تم لوگ اپنا کام بنناؤ، بخار ہے تمہارے آفاق بھائی کو۔ بس ذرا اس لیے۔“ بڑی مائی کہیں اندر سے سب سنتی آئی تھیں۔ کہنے کے ساتھ ساتھ وہ انہیں اندر بھی دھکیلنے لگیں۔

شجرہ کے چہرے پر غصے نے سرخی پیدا کر دی تھی۔ اس نے محنت کو گھورا تھا اور چھوٹی مائی کو بھی جن کے چہرے تاسف اور فکر مندی میں گم ہو گئے تھے۔

☆ ☆ ☆

آنے والے اگلے دن سب کے لیے مشکل بن کر

آ رہے تھے، مشکل۔ ناقابل حل۔ بے بسی۔ ایک سناٹا در دیوار سے کائی کی طرح لپٹ گیا تھا۔ سائے کی مانند سر سر تن گیا تھا۔ حیرت آمیز بے بسی کے ہو کے ہما بھائی کے چہرے پر جھانکی خاموشی اور آنکھوں سے جھانکتی وحشت وہ جسمی کبھار بے روح نظر آتیں اور آفاق بھائی۔

آفاق بھائی کسی بد روح کی طرح ہر سو منڈلاتے۔ وہ کبھی سر پکڑ کر بیٹھ جاتے۔ کبھی دیوار پر مکا مارتے اور کبھی سامنے آئی کسی بھی شے کو ٹھوکر۔ ایسے میں مامیاں اور محنت منہ چھپا چھپا کر آنسو پیتیں۔ پچکیاں روکنے کو کھانتیں۔

وہ انکشاف کا عذاب جھیل رہے تھے اور کسی کو بخشے پر تیار نہ تھے سب ہی عتاب کا نشانہ، مگر شجرہ کو لگا کہ وہ ان کی ہٹ لٹ پر آمنی ہو۔ اس نے محنت سے شکایت کی۔ وہ اس کے ہاتھ کو تھپتھا کر بس خاموشی کی تلقین کر دیتیں، مگر شجرہ کو برداشت کی عادت نہ تھی اسے سوچ لینے کی عادت تھی۔ کہہ دینے کی خواہ خود کلامی ہو، مگر اب اس کے پاس ایک سامع تھا نا۔ بہت کچھ تھا اسے بتانے کو، پوچھنے کو، سمجھنے کو، خود اس کے حوالے سے بھی۔

☆ ☆ ☆

”تمہیں یہ کیوں لگتا ہے کہ جو غم تم پر پڑا ہے، وہ ہی سب سے بڑا ہے؟ دنیا میں ایک سے ایک بڑی باتیں ایسے ایسے دکھ کہ فقط سن کر کلیجہ منہ کو آجائے اور تمہارے آفاق بھائی کے لیے تو پھر یہ بہت بڑی بات ہے۔“

”تو وہ میرا جینا کیوں حرام کر رہے ہیں۔“

”یار! ان کی اپنی زندگی حرام ہو چکی ہے۔ کوئی بھی انسان اپنے لیے کبھی کم پر راضی نہیں ہوتا۔ اسے پرفیکشن چاہیے ہوتی ہے، مادی چیزوں کا کہہ رہا ہوں۔ اور اگر بات پھر اپنے ذاتی وقار پر۔“

آجائے تو۔“

”تو میرا کیا قصور؟“ وہ چلائی تھی۔



”قصور وار تو وہ بھی نہیں ہیں شجرہ۔! شان کالجہ زخمی ہو گیا۔ وہ قصداً مسکرایا۔

”کسی مرد کے لیے یہ احساس کہ وہ اپنی بے اولادی کا ذمہ دار ہے۔ اس کی موت ہے بس یہ ہے کہ اسے دیا نہیں جاسکتا۔“ شجرہ نے نگاہیں چرائی تھیں، اس نے شدید غصے میں جب بولنا شروع کیا تو سب ہی بول گئی، لیکن اب ذرا ٹھنڈے ہونے پر اسے کسی قدر خیالت نے گھر لیا تھا۔

”وہ جتنا بھی رد عمل دس کم ہے۔ ہاں یہ ہے کہ کچھ وقت کے بعد وہ جب تسلیم کر لیں گے تو پھر ہر شے اپنی جگہ پر آجائے گی انہیں وقت دینا ہو گا۔“

”تم اتنی آسانی سے یہ سب کیسے کہہ رہے ہو بڑے تجربہ کار ہو؟“

”میری بہن ہیں بڑی۔ چھ سال ہو گئے ہیں وہ ماں نہیں بن پائیں۔ بظاہر کوئی نقص نہیں ہے۔ وہ جس طرح کی زندگی جی رہی ہیں۔ اسے محسوس کرنے ہی میں جتنی اذیت ہے، وہ تم نہیں سمجھ سکو گی۔ تمہارا مسئلہ یہ ہے کہ تم ہر چیز کو اپنے حوالے سے دیکھتی ہو۔ تم یہ سمجھتی ہو کہ اکیلے ہی دیکھی ہو، مخفی ہو، تم ہی مشکل میں ہو، تمہارے ہی مسائل ہیں جبکہ دنیا کا ہر شخص ایک امتحان میں پڑا ہے۔ ہر انسان کی اپنی مصیبت اپنے دکھڑے۔“

”کیوں! تمہیں کیا دکھ؟“

”کیوں اپنی آپا کی پریشانی میرے دل کو نہیں چیرتی۔ اس پر یہ خیال۔ کہ میں ان کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ پریشانی تو کوئی بھی ہو سکتی ہے نا؟ اب یہی دیکھو۔ میری اماں آج کل کتنی پریشان ہیں۔“ وہ ہنس پڑا۔

”اماں پریشان ہیں اور تم ہنس کر رہے ہو۔“ وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ ”میں کیا پریشانی ہے خیریت؟“

”ان کی پریشانی۔“ شان ہنستے ہوئے آسمان کو دیکھنے

لگا۔ ”تم بھی ہنس دو گی، میں نے کہا نا، ہر شخص کے لیے اس کا دکھ سب سے بڑا۔ اپنی آنکھ کا شکا شہتیر ہی ہوتا ہے۔“

”تم بتاؤ تو۔ عجیب آدمی ہو۔ ماں کی پریشانی کا ذکر کرتے ہو اور دل کھول کر ہنستے ہو۔ پاگل ہو۔“

”میں نو بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا ہوں۔ امی اتنی بوڑھی ہیں جیسے میری دادی ہوں۔ انہیں آج کل بس یہ فکر ہے کہ مجھے کون بیاہے گا۔ ہاہاہا!“

”لڑکے بیاہ کر لاتے ہیں۔ اپنی گراںمرد درست کرو اور تم میں کیا برائی ہے جو وہ ابھی سے فکر مند ہو رہی ہیں۔“ شجرہ نے اندر کی آنکھ کھول کر اسے دیکھا ویسے وہ باہر کی آنکھ کو بھی پیارا لگتا تھا۔

شان نے تاسف سے نفی میں گردن ہلائی پھر اپنی لنگوالی ٹانگ سامنے سیدھی کر دی۔

”تمہیں سامنے کی چیز نظر نہیں آتی۔ تم گہری باتیں کیسے سمجھ سکو گی؟“

”یہ۔! وہ حیرت سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ وہ لنگ کتے کتے رکی۔ یہ سچ تھا۔ وہ قطعاً نمایاں ہونے والی چیز نہیں تھا، مگر۔“

”یہ تو نظر ہی نہیں آتا۔ پتا ہی نہیں لگتا؟ اور۔۔۔ تم۔۔۔“

”تم کمال ہو شجرہ الدرد۔ یہ اتنا نظر آتا ہے کہ اس کے سامنے میں نظر نہیں آتا۔“

”کس کو؟“

”ان سب کو جو پہلے مجھے دیکھتی تھیں۔“

”دیکھتی تھیں؟“

”ہاں۔ میری کزنز اور ان کی امیاں اور باجیاں۔“ وہ مزے سے بول رہا تھا۔

”اور اب وہ تمہیں نہیں دیکھتیں؟“

شان نے جواب نہیں دیا۔ وہ چھوٹے چھوٹے سنکڑا اٹھا کر رو مارنے لگا تھا۔

”میں تمہیں دیکھتی ہوں شان۔“ وہ شاید تسلی دے رہی تھی۔

”جانتا ہوں۔ تم دیکھتی ہو۔ مگر صرف چہرہ۔ تم پورا

جائزہ لینے کی عادی جو نہیں ہو۔“

اس نے ایک جملے میں شجرہ الدرد کی پوری شخصیت کو واضح کر دیا تھا۔ شجرہ کے پاس ایک فوری خوب صورت جواب تیار ہوا مگر اس نے لب بھینچ کر جیسے اپنی خامی کو مٹا۔

اس کا خراب موڈ بحال ہو چکا تھا۔ وہ آفاق بھائی کی کیفیت اور دکھ کو جیسے سمجھنے لگی تھی۔

آفاق بھائی غم و اندوہ کے اندھیروں میں ڈوب گئے تھے۔ خاموش، متفکر، بے چین یا پھر چیختے ہوئے، ٹھوکریں مارتے ہوئے، بات بے بات کاٹ کھانے کو دوڑتے۔

مغلظات بکتے تھے۔ ان کا عتاب ہر ایک کے لیے تھا۔

بلاوجہ ہما بھائی کو پیٹ ڈالا جو منہ پھیر کر آنسو چھپا رہی تھیں۔

درک شاپ میں کسٹرز سے اچھے اور بڑا ہتھوڑا ہاتھ میں اٹھالیا۔ (سر پھاڑنے کے لیے) غازیہ مازیہ میکے آئیں۔

”میرا تماشا دیکھنے آئی ہو؟ اچھا اپنے بچے دکھانے لائی ہو۔“

”نہیں بھائی۔“ وہ دونوں سکتے میں آگئیں۔

آفاق کوئی گھٹیا فلمی پلان۔ میکر تو تھے نہیں کہ اپنی ڈاکٹری رپورٹ چھپا لیتے جو ڈاکٹر نے کہا۔ وہ سان و گمان میں بھی نہ تھا جب موت کی سی حالت میں گھر پہنچے تو ماں کے استفسار پر بولتے چلے گئے سب کچھ۔

اب سوچ رہے تھے ”سب اچھا“ کی رپورٹ دے دیتے۔ کون رپورٹ کو انوسٹی گیٹ کرنے جاتا سب صبر شکر کر کے بیٹھ جاتے۔ وہ ماں باپ کو اعتماد لے کر کہہ سن لیتے، مگر اس صدقاتی جذباتی لمحے میں وہ سب کے سامنے سب کچھ بول گئے۔

ایک نارسائی کا دکھ۔ دوسرے سب کے با علم ہونے کی پریشانی، سب کے دشمن ہو گئے، مگر شجرہ الدرد

کے ساتھ تو۔۔۔

انہوں نے گھر کی کلاس کو نشانہ بنایا۔ ”۳۲ تھے بڑے بڑے جوان جہاں گھوڑے لڑکے (میسٹرک اور نانٹھ) دندناتے گھر میں گھس آتے ہیں، کوئی شرم حیا ہے کہ نہیں۔“

شجرہ بلیک بورڈ پر جھکی ہوئی تھی۔ پیچھے دو لڑکے آپس میں کچھ سرگوشی کر رہے تھے۔ کوئی شرارت۔ ایسے ہی۔ آفاق نے دیکھ لیا۔ انہوں نے ایک دھاڑ لگائی اور پھر انہیں جس طرح پیٹنا شروع کیا۔ اللہ دے اور سندھ لے۔

ایک ہنگامہ۔ افسوس، شرمندگی، جھگڑا بے عزتی اور بے روزگاری۔ شجرہ کے لیے سراسر نقصان، اس کا تو بیزا غرق ہو جاتا۔

وہ چیخ کر سب کے سامنے اپنی صفائی اور ان کی زیادتی بتا رہی تھی۔

”اس طرح کے بی ہیویر سے کون آئے گا پھر ادھر۔“

”تو آئے ہی کیوں؟“ آفاق اکڑے کھڑے تھے۔

”میرا روزگار ہے یہ۔ میرا ہنر۔ میں خود کو انورڈ کرتی ہوں اس سے۔ گل چھڑے۔ ضرورت ہے میری یہ آمدنی۔“ سب اس کے بیان کی تائید کر رہے تھے۔ (دل میں)

”ہاں گل چھڑے اڑانے کو وہ لڑکا ہے جس کے ساتھ دن کے آٹھ نو گھنٹے گزارتی ہو۔“

”آٹھ نو گھنٹے؟ میں یونیورسٹی جاتی ہوں۔“ اس نے چبا چبا کر کہا۔ ”پڑھنے کے لیے۔“

”ہاں۔ پڑھ۔ سن۔ نے۔؟“ آفاق کا انداز استہزائیہ تھا۔

”پڑھائی کلاس میں ہوتی ہے، جانتا ہوں۔ پھر کینٹین میں اور پارک میں اور لمبے رستے میں ٹہلتے ہوئے پھر ایک ہی بس۔ وہ اکثر ساتھ چھوڑنے آ جاتا ہے۔ راستے میں کون سا لیکچر چل رہا ہوتا ہے۔ یہاں گھر میں تو ایسے چپ رہتی ہے جیسے منہ میں زبان ہی نہیں اور اس کے ساتھ کیسے لڑ لڑ زبان چلتی ہے۔“



”جب کلاس ایک ہے مضامین ایک ہیں۔ راستہ ایک ہے۔ بس کا روٹ ایک ہے تو ساتھ تو رہے گا نا۔“ اس نے جیسے منہ توڑ جواب دیا تھا۔

”ہا۔!“ وہ منہ کھول کر رہے۔ ”ہمدانی صاحب کی دو بیٹیاں یونیورسٹی جاتی ہیں ان کو تو کبھی ہم سفر نہ بنایا۔“

شجرہ نے کچھ کہنے کو لب کھولے پھر بچھڑ گئے۔

ہمدانی صاحب ناظم کا ایکشن لڑ چکے تھے۔ ہار گئے تھے مگر رہتے یوں تھے جیسے ایم ان اے ہوں۔ یہی بزرگوار رویہ بیٹیوں کا تھا۔ ڈان بن کر رہتیں۔ شجرہ کا گزارہ کیسے ہو سکتا تھا ان کی طرح مگر اب یہ کیسے بتایا اور سمجھایا جائے۔

”ایک پلیٹ میں بریانی لی جاتی ہے اور پونے گھنٹے میں ختم ہوتی ہے۔ چھٹانک بھر کی وہ پلیٹ۔ باتیں جو ختم نہیں ہوتیں۔“

شجرہ بری طرح چونکی وہ اب بھی پراٹھا لے کر جاتی تھی مگر کل کل پیر پیر کی ہڑونگ میں جب وہ بھاگی تو جگہ کا اخبار میں رول پر اٹھانجانے کہاں رہ گیا بھوک نے پاگل کر دیا تب ہی اس نے بجٹ پر لعنت بھیجتے ہوئے مگر۔

”آفاق بھائی کو کون دے رہا ہے ایسی خبریں؟“ اس کے سر پر ڈنڈا سا برس۔

آفاق بڑی جراتی نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

جب ہم خود دکھ میں پڑتے ہیں تو دل چاہتا ہے ہر ایک دکھی ہی نظر آئے ہنستے چہرے زہر لگتے لگتے ہیں۔

جب ہم اپنا اعتماد کھودیں تو دوسروں کی خود اعتمادی تازیانہ بن کر لگتی ہے۔

شجرہ کی مضبوط شخصیت اور اعتماد سب سے زیادہ کھلنے لگا تھا۔

اسے ذرا برابر بھی پروا نہیں کہ وہ کس مصیبت میں پڑے ہیں۔

سراسر بے وقوفی۔ احمقانہ خیال اور بے شرم سا شکوہ۔

مگر وہی ناکہ اس کی گنگ پھلتی پھولتی بحالی کی راہ پر گامزن زندگی سے یونہی حسد ہونے لگا عناد پال لیا۔

پھر یہ بھی تھا کہ سب چپ ہو کر سن رہے تھے جبکہ شجرہ اللہ رکھے سے تابڑ توڑ جواب دیتی سانس تک نہ لیتی سوچ بچار تو لمبی کمالی رہی۔

آفاق بھائی نے یوشن والے لڑکوں کو دروازے پر چالیا اندر گھستوں کو سینے پر پنجہ دھر کے پیچھے دھکیلا۔ منہ سے کچھ نہ بولے۔ چنگی بھائی پھر سٹی اور سخت قطعیت سے بھرپور تاثرات کے ساتھ واپسی کا اشارہ کیا۔

”ختم یوشن۔ کہیں اور بندوبست کرو۔“

لڑکیوں سے کچھ نہ کہا۔ وہ خود ہی گھبرا گئیں۔

اس دن پڑھائی نہ کی جاسکی۔

لیکن ہم کسے تلاش کر رہے ہیں۔“ سنان اس کے پیچھے لپکتے ہوئے چلایا تھا۔ ”اور کیوں؟“

”بس تم ساتھ چلو۔“ وہ مڑے بغیر غلت سے بولی۔

”ہوتا مشکل کام بھی نہیں۔ شجرہ کی ذہانت کو کون پیچ سکتا ہے۔“ اگلا جملہ حسب عادت خود کلامی تھا۔ سنان نے شانے اچکائے۔

شجرہ گھر سے سارا حساب کتاب لگا کر نکلی تھی۔ سو اسے الجھنے کا ڈر نہیں تھا چونکہ اس کے ذہن میں ٹارگٹ کلیر تھا لہذا وہ سیدھے پولیس موبائل تک گئی۔ یونیورسٹی میں کسی بھی قسم کی بد امنی ڈنگا فساد نہ پیدا ہو۔ اس مقصد کے لیے جگہ جگہ پولیس اور رینجرز کی جو کیاں قائم تھیں۔ شجرہ کا مقصد اسی موبائل میں کسی کی تلاش تھی یا پھر وہ چونکی جو کینٹین کے نزدیک ہو۔

اسے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی۔ وہ تلاش کے لیے رجوش تو تھی مگر ہوش میں بھی تھی۔ اس نے خود کو مخفی رکھا تھا۔

ایک دم اس کے نتھنے پھڑکنے لگے۔ سنان لہٹنے لگا۔

کر رک جانے پر اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

”بندوق اس کے ہاتھ میں ہے۔“

الٹ میرے وطن کا بانگ سپاہی اور مار دینے کے عزائم تمہاری آنکھوں میں؟ یہ کیا کمالی ہے خاتون۔“

سنان نے شوخ لہجے میں پوچھا۔ شجرہ سپاہی پرویز خان کو گھور رہی تھی۔ کھا جانے والی نگاہوں سے غصیلے تاثرات اتنے کڑے سے کڑے ہوتے جارہے تھے کہ کسی پل وہ آگے بڑھے اور وہی گن جسے تھامے وہ کھڑا ہے اسی پر خالی کر دے۔

”کیا ہوا شجرہ۔ کیا بات ہے؟“ سنان نے سنجیدگی سے کہا۔

”کچھ نہیں ہوا۔ آؤ چلیں۔“

”لیکن ہم یہاں آئے ہی کیوں تھے کرنا کیا تھا؟“

”جس لیے آئے تھے وہ کر کے ہی جارہے ہیں۔“

شجرہ کا لہجہ ٹھنڈا نکار تھا۔

شجرہ نے گھر آکر ہنگامہ کر دیا۔

”وہ پرویز خان۔ آفاق بھائی کا بچپن کا دوست ایک سال سے ہے وہاں تعینات۔ پہلے تو کچھ نہ بولا۔ آفاق بھائی میری خبری کروانے لگے ہیں اس سے۔“ وہ آگ بگولا ہو رہی تھی۔ ”پہلے میرے رزق روزی پر لات مارنے کی کوشش کی۔ بچوں کو ڈرا کر بھاگا دیا اللہ جانتا ہے۔ کس مشکل سے وہ دوبارہ آئے ہیں۔ پہلے میرا ہاتھ اوپر تھا اب وہ مجھ پر احسان جتا کر آرہے ہیں میں نے آج تک کسی کی بات نہیں سنی اور اب؟“

اس نے جھرجھری سی لی۔

”اور کل تو حد ہو گئی۔ دس نمبر پر کھڑے تھے مجھے وارج کر رہے تھے کہ کیسے آتی ہوں۔ جیسے روز آتی ہوں دیے ہی آتی ہوں۔ سنان ساتھ ہی تھا۔ وہ آگے بفرزون کی جانب جاتا ہے۔ میں اتر جاتی ہوں۔ یہ بات سب جانتے ہیں۔ آپ بھی جانتی ہیں۔“

”میں ملی ہوں شجرہ۔ اس لڑکے سنان سے بہت اچھا ہے۔ وہ کسی اچھے گھر سے ہے۔ تمیز دار بھی ہے

اور تم نے بتایا بہت لائق بھی۔ ہم جماعت سے تو ملنا چلنا تو رہے گا۔ کوئی قباحت نہیں لیکن ذرا کم کرو۔ بھائی کو اچھا نہیں لگتا تو۔“

”امی! میرے اچھے برے میں کوئی نہیں ہے میں خود ذمہ دار ہوں۔ کسی کو کیا تکلیف۔ میں اب بچی نہیں ہوں۔“

”ہاں!“ محسنہ نے سانس بھری۔ ”یہی تو کہہ رہے ہیں اب تم بچی نہیں ہو۔“

”اس بات کا کیا مطلب؟ خیر آپ سمجھالیں ان کو۔ میں اپنی زندگی کے معاملات میں آزاد ہوں۔“ وہ چلائی۔

مگر آنے والے کچھ دنوں میں بڑے اور چھوٹے دونوں ماموں بھی آفاق بھائی کے ہم خیال ہو گئے۔ اشفاق نے بھی دونوں کو پیدل آتے دیکھا اسے بھی بہت برا لگا۔

ذرا سی بات بڑھ کر داستان بن رہی تھی۔ بیوی اور بیٹی کے سفر میں ایسا مشکل موڑ پہلے تو کبھی نہ آیا تھا۔ سہل پر سکون خراں خراں زندگی۔

سب ایک جانب۔ شجرہ ایک جانب۔ درمیان میں محسنہ۔

اب جیسے اپنی ساری توانائی اس چھوٹی سی لڑکی کو پچھاڑنے میں لگانے لگے۔

ہنگامہ۔ فیصلہ۔ شور۔ احسان۔ سے احسان فراموش تک کا طعنہ۔ محسنہ کی جان مصیبت میں۔ آفاق غلط بھی نہیں تھے۔

”تو تو مان کیوں نہیں جاتی شجرہ۔ بحث کیسی؟“

”نہیں مان سکتی امی۔ نہیں چھوڑ سکتی اس سے ملنا۔ وہ میرا سامع ہے میرا راہ نما۔ میرا راستہ۔ وہ میرے بارے میں وہ سب جانتا ہے جو آپ بھی نہیں جانتی ہیں۔ میں بھی نہیں جانتی ہوں۔ میں اس کے اندر اپنے سارے رشتے دیکھتی ہوں۔ وہ کبھی ”آپ“ بن جاتا ہے۔ کبھی ”بہن“ بن جاتا ہے کبھی بھائی۔ پھر تو وہ ہوتا ہی ہے۔ حیرت سے کیوں دیکھ رہی ہیں۔ کبھی کبھار تو وہ مجھے ”ابو لگنے لگتا“ ہے۔ دوست کموں



گی تو اس رشتے کی مرد و عورت کے بیچ جگہ نہیں ہوتی۔ اس کے میرے بیچ کوئی ”رشتہ“ نہیں ہے مگر امی! جو سب ابھی میں نے بتائے وہ کیا رشتے نہیں ہیں؟“ اس کے جملوں میں ساری قیمتی تنہائی نارسائی کی داستان سمٹ آئی۔

”بالکل نہیں ہیں۔ ان سب کو فقط جذباتی باتیں کہا جائے گا۔ ان رشتوں کو نہ اللہ مانتا ہے نہ اس کی کتاب میں ان رشتوں کے اصول و ضوابط لکھے ہیں اور یہی دنیا۔ اللہ اور اس کی کتاب کی جواب دہی آخرت میں ہوگی۔ دنیا میں جیسا مرضی کھل کھیلو مگر دنیا۔ یہ ہمارے ارد گرد کے لوگ۔“

یہ ہر روز کی بنیاد پر سوال نامہ ترتیب دیتے ہیں بلکہ ہر منٹ پلوں کی جنبش اور سانسوں کی رفتار پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ انہیں روز کی بنیاد پر جواب دینے ہوتے ہیں۔ اس پر کمال یہ کہ گہری گھما پھرائی گئی باتیں تو سمجھتے ہی نہیں۔ سیدھا اور صاف جواب چاہتے ہیں تم ان رشتوں کی کوئی وضاحت ان کو نہ دے سکو گی۔ دنیا سے ڈر کر چلنا پڑتا ہے بلکہ دنیا کے بتائے دکھائے طے شدہ راستے پر ہی چلنا ہوتا ہے تم۔“

”میں نے نہیں مانتی کسی دنیا کو اور دنیا کی باتوں کو۔ میری اپنی دنیا اپنی زندگی ہے جس کو میں اپنی مرضی سے جیتی ہوں۔ دنیا کون ہوتی ہے سوال کرنے والی۔“ شجرہ نے بات کاٹ کر درشتی سے کہا تھا اسے ننگے لگ گئے تھے مگر ساتھ ہی وہ محسنہ کے جملوں کی سادگی مگر گہرائی سے حیران بھی ہوئی تھی۔ وہ جو بہت کم بڑھی لکھی تھیں اور ہمہ وقت نمک مرچ میں جتی رہتی تھیں ایسی مدلل گفتگو بھی کر سکتی ہیں؟

شجرہ بے وقوف تھی۔ اسے خبر نہیں تھی۔ محسنہ کو عام حالات میں اس موضوع پر بونے کے لیے کھڑا کیا جاتا تو وہ جھینپ کر معذرت کرتیں۔ وہ کیا کہیں؟

مگر اس وقت وہ ”ماں“ تھیں جو بیٹیوں کی عزت و مرتبہ کی حفاظت کے لیے ہر میدان مارنا جانتی ہے خواہ ہاتھ سے مارنا ہو یا زبان سے۔

شجرہ کو پتا نہیں تھا۔ ایسی صورت حال میں مائیں

بڑھی بڑھائی ہوتی ہیں کیوں نہیں مانتیں دنیا۔ دنیا ہی سب کچھ ہے۔ ”دنیا کے سامنے“ جتنی صحیح زندگی گزار رہی ہوگی۔ آخرت کا سوال نامہ اتنا ہی ہلکا ہوگا۔ کیوں پہنتی ہو لباس۔ استری کر کے سلیقے سے۔ پتے کیوں نہیں باندھ لیتیں۔ جسم ہی تو ڈھانپنا ہے نا۔ دنیا کے ڈر سے سوچو پتے باندھ کر نکلیں تو۔“ محسنہ نے قصداً جملہ ادھورا چھوڑا۔

”سائن کٹوری میں کیوں لیتی ہو۔ ہاتھ میں ڈالو الیا کرو۔ مگر نہیں ”کٹوری“ طریقہ ہے۔ سلیقہ ہے۔ علم اور عقل۔ کٹوری دنیا ہے۔

کیسے کہہ دیا کہ دنیا کی پروا نہیں ہے؟ دنیا سب کچھ ہے۔ اس کے طے کیے راستے پر ہی چلنا پڑتا ہے۔ آج لوگ بے خبر ہیں۔ کل کو جب با علم ہوں گے تب سب باتیں کریں گے۔ تم کیسے وضاحت دو گی۔“

محسنہ کے جملے سوشالوجی کی کسی کتاب میں کوٹیشن کے طور پر درج کیے جانے کے لائق تھے۔ شجرہ منہ کھول کر ماں کو دیکھ رہی تھی۔

سامنے بولتی عورت محسنہ نہیں تھیں۔ وہ ایک ”ماں“ تھی جو اپنی بیٹی کو وہ سبق پڑھا رہی تھیں جو کسی کتاب کے نصاب کا حصہ نہیں ہوتا۔ شجرہ کی بولتی بند ہو گئی تھی۔

”رشتہ کیا بہت ضروری ہے امی؟“ اس کا لہجہ ٹوٹ گیا۔

”ہاں! محسنہ نے کہا۔ ”رشتہ بہت ضروری ہوتا ہے۔ شجرہ! سیدھی سادی زندگی کو کیوں مشکل بنا رہی ہے بچی! آج فقط آفاق چلایا ہے اس کی وجہ کچھ بھی رہی ہو۔ انداز اور طریقہ غلط ہے مگر بات غلط نہیں ہے۔ کل کو کوئی انہیں روک کر کہہ دے تمہاری بہن کو دیکھا تھا فلاں لڑکے کے ساتھ۔ بھائی بے پروائی سے تم پر یقین کر بھی لیں گے تو اگلے کو کبھی بھی نہیں دلو اسکیں گے بحث نہ کرو۔ چھوڑو اس ضد کو۔ ہم جماعت ہے اچھا لڑکا ہے بس جماعت تک ہی محدود رکھ۔“

”نہیں چھوڑ سکتی۔“ محسنہ کے جملے پر وہ سماعت سے ٹکرا کر زمین بوس ہو گئے تھے۔ وہ اپنی ہی دھن میں تھی۔ کھو گئی تھی۔ آواز دھیمی تھی مگر عزم بلند۔ محسنہ نے سر ہاتھوں پر گر لیا۔

”میں اس سے محبت کرتی ہوں امی!“

”محبت؟ وہ کیا ہوتی ہے؟“ ابھی کچھ دیر پہلے عالم و فاضل جملوں گہری حکایتوں کا ڈھیر لگا دینے والی محسنہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا۔



محبت اوس کی صورت

پاسی ہنکھڑی کے ہونٹ کو سیراب کرتی ہے گلوں کی آستینوں میں انوکھے رنگ بھرتی ہے

حر کے جھٹ پٹے میں گنگنائی ہے۔ مسکراتی ہے۔

جنگلاتی ہے۔

محبت کے دلوں میں دشت بھی محسوس ہوتا ہے کسی فردوس کی صورت۔ محبت اوس کی صورت۔ اسے دس برس کی اس عمر میں نظر انداز کیے جانے کا احساس ہوتا تھا۔ اس کے وجود کی نفی۔ بے معنی حیثیت۔ اسے لگتا۔ وہ کسی کے دست طلب کی دعا نہیں ہے۔ یونہی فالتو سائب وہ زیادہ گہرائی سے سوچنے لگا تھا اور کھوجنے کی سعی۔ اسے کڑیاں جوڑنا نہیں آتی تھیں۔ پنل حل کرنے آتے تھے مگر پنل کے بکھرے ٹکڑے اس کے پاس نہیں تھے۔

دھتکارے جانے کا احساس۔ لایعنی سے کچھ شکوک حقیقت تھے جب وہ پانچ برس کا تھا تو اسے لوٹا دیا گیا یعنی دھتکار دیا گیا لیکن نہیں۔ جب وہ بہت چھوٹا سا تھا۔ پسنگھوڑے میں تھا۔

نہیں۔ تب بھی نہیں۔ جب وہ پیدا ہوا تھا۔ تب بھی ایک انکار تھا۔ حیرت تھا۔ ناپسندگی بے عزتی اور شرم تھا۔ ایسا سوال جس کا جواب منہ چھپانے پر مجبور کر دے، بغلیں جھانکنے پر۔ دنیا اسے ناجائز سمجھتی تھی۔ جبکہ۔ (وہ ناجائز تو نہیں تھا۔ تو کیا جائز تھا؟)

مگر اس مشکل سوال سے زیادہ مشکل میں اس کی ماں تھی اس سے اور دیگر لوگ۔ کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ درد سے تڑپتی اس کی ماں کو اسپتال جانے پر کیسے قائل کیا جائے۔ اور گھر کی دالی مائی۔

اور ابھی تو فقط جانے کا مسئلہ تھا۔ واپس لوٹنے پر کیا ہوگا۔ اس کے باپ کو گھر کے اندر آنے کی اجازت نہ تھی۔ وہ گلی کے کونے میں گاڑی کے شیشے گرائے بیٹھا تھا۔

نویں مہینے کی آغاز پر ہی وہ سوچنے لگی تھی کہ بس کون سی گھڑی ہو اور وہ اس مصیبت سے چھٹکارا پائے۔ ڈاکٹر اور دالی دونوں کے خیال میں نویں مہینے میں کسی بھی وقت ڈیوری ہو سکتی ہے۔

مگر اس بچے کو دنیا میں آنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ یا پھر شاید وہ جانتا تھا کہ دنیا میں اس کے لیے فقط تھو تو ہی ہے۔ حقارت۔ طعنے نفرت۔ بوجھ۔ وہ دنیا میں آنے سے پہلے اتنی بڑی آزمائش تھا۔ تو بعد میں تو۔ اسے نویں ماہ کے آغاز ہی سے درد کے چھوٹے چھوٹے وقفے محسوس ہونے لگے تھے شروع میں یہ درد بہت کم وقت کے لیے محسوس ہوتا۔ اور پھر دھیرے دھیرے دورانہ بڑھنے لگا۔ لیکن درد کی شدت جیسی بھی رہی ہو۔ درد جب رک جاتا تو لگتا کہ ہوا ہی نہیں تھا۔ اس کی ماں ہر بار دالی کو بلا لیتی اور وہ بڑے آرام سے کہہ کر چلتی بنتی ”ابھی وقت ہے۔“

اس کے ہاتھ میں ایک کانڈ تھا جس پر مہینے کی آخری تاریخیں درج تھیں۔ اسے ہر صورت وہاں جانا تھا مگر یہ مصیبت۔ دنیا سے چھپ کر گھر کے سب سے اندویشی گھرے میں بیٹھی تھی۔ مگر ایک بار ڈاکٹر کے پاس بھی چلی گئی۔ بچتی بچائی۔ اس کی بے حد بے چینی پر اس نے الزا ساؤنڈ لکھ دیا۔ اور الزا ساؤنڈ نے جو کنفرم تاریخ دی۔ وہ وہی تاریخ تھی جو اس کانڈ پر درج تھی۔ ہفت آسمان نظروں کے آگے گھومنا سمجھ میں آگیا۔ وہ چکرا گئی۔

”اس سے پہلے بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے بعد



نہیں۔ اس کے بعد پھر ہم فوراً سی سیکشن کی طرف جاتے ہیں۔“  
”سی۔“ وہ تھرا کر رہ گئی۔ آپریشن کی صورت میں وہ ہفتہ بھر اسپتال رہتی اور بعد میں نجانے کب فعال ہوتی جبکہ اسے تو۔

”آ۔ آپ ابھی کر دیں آپریشن آج۔ کل۔“  
”ناگل تو نہیں ہو۔ ہر چیز کا نام اور پراسس ہوتا ہے۔ ماں بننا صبر کا دوسرا نام ہے۔ ابھی سے ٹریننگ کرو۔ بھاگ جاؤ۔“  
ڈاکٹر نے دوائیوں کا بڑا پرچہ لکھ کر اسے جھاڑا اور فیکسٹیشن کے لیے نیل بجادی۔  
وہ گھر آنے تک اور بعد میں جیسے شدید ڈپریشن میں چلی گئی۔ سوچ سوچ کر اس کی حالت غیر ہو گئی۔  
دائی نے وقت پورا ہونے کا کہہ کر ساتھ ہی مشکل کیس بتایا اور آپریشن ہونے کی نوید سنائی اور وہ دہل کر رہ گئی۔

”نہیں اماں!“ اس نے دائی کے ہاتھ تھام لیے۔  
”آپ مجھے اس مشکل سے نکالے۔ خدا کے لیے۔“  
”اری زندہ رہے گی تو جائے گی ناں۔“  
”مرحباں تو سارے مسئلے ہی حل ہو گئے ناں۔  
لیکن ہائے۔“ وہ بڑبڑا رہی تھی۔

”عجیب لوگ ہو تم لوگ۔ دایوں کو بدنام کرتے ہیں کہ کیس خراب کر دیتی ہیں۔ میں اپنے منہ سے کہہ رہی ہوں کہ لے جاؤ اور تم پہلے بچے کی دفعہ کون رسک لیتا ہے اور آپریشن پر کون سے زیادہ پیسے لگتے ہیں۔ دس بارہ ہزار کا خرچا ہے وہ بھی اچھے اسپتال میں۔“

”بات پیسوں کی نہیں ہے۔“ وہ چلائی تھی۔ پسینے سے ترو وجود خشک لب۔ اسے جھٹکے سے لگنے لگے۔  
دونوں عورتیں اس کے نزدیک آگئیں۔ اس کی ماں نے تیزی سے کہنا شروع کیا۔

”پیسوں کا مسئلہ نہیں ہے۔ اس کا باپ نوٹوں سے بھرا تھیلالے کر کھڑا ہے۔“  
دائی کے کھلتے لب بند ہو گئے۔ اب بولنے کا نہیں

کرنے کا وقت تھا۔ اور پتا نہیں گھڑی کی سوئیاں کتنا آگے سرکی تھیں۔ جب کمرے میں نومولود کے رونے کی آواز گونجنے لگی۔ چار عالم میں اپنی آمد کا اعلان کرتا لڑکا۔

پیدائش کے عمل کے بعد مائیں بے دم مساکت ٹھنڈے برف وجود کے ساتھ اسٹریچر پر پڑی سوئی ہیں۔ نڈھال بند آنکھیں۔

مگر یہ انوکھی ماں تھی۔ اس کی آنکھوں میں زندگی لوٹ آئی تھی۔ اسے اپنے اندر چوکریاں بھرتے ہرن کی سی توانائی محسوس ہو رہی تھی۔ ہاتھ بڑھا کر تارہ توڑ سکتی تھی اور ہاتھ جھکا کر سمندر کی اتھاہ گہرائیوں سے سیپ کاموتی۔

اس کی نظریں کیلنڈر پر تھیں۔ اور آنکھوں میں فاتحانہ چمک۔



شجرۃ نے الف سے بے تک کا سارا قصہ بیان کیا۔ (ماسوائے وہ آخری جملے)۔ جو محسنہ کے لیے شاک تھے۔ تو خود اس کے لیے بھی کہ اتنی آسانی سے کہہ دیے گئے)

اس کی آواز دکھ سے بوجھل ہو جاتی، کبھی لرز جاتی۔  
”نہم ہو جاتی۔“

کبھی بہت چیختا ہوا اونچا لہجہ۔ اور اب اختتامی جملے کہہ لینے کے بعد وہ سنان کی جانب سے تائید کی نظر تھی۔ وہ ہاں میں ہاں ملائے اور سراپے کہ اس نے بالکل درست کیا۔

لیکن جب وہ بولا۔  
”تو ٹھیک ہے پھر تم مجھ سے ملنا چھوڑ دو۔“

”کیا؟“ شجرۃ سن رہ گئی۔ ”یہ تم کہہ رہے ہو۔ کیسے کہہ سکتے ہو تم یہ۔“

”تمہارے بھائی ٹھیک کہہ رہے ہیں شجرۃ! ہمارا معاشرہ اس رشتے کو ہضم نہیں کر سکتا اور یہ سچ ہے کہ تمہارے اور میرے بیچ جو ہے وہ سب کچھ ہو سکتا ہے مگر رشتہ بہر حال نہیں۔“

وہ اپنے تئیں ہاتھ جھاڑ کر فارغ تھا۔ شجرۃ کی نگاہوں میں ہفت آسمان گھوم گئے۔

اس نے داستان بیانی کے دوران شعوری کوشش سے اسے اکسانے کا عنصر نمایاں رکھا تھا کہ سنان الیاس کچھ کہہ دے۔ آگے بڑھ کر مگر۔

شعر سنانے والا۔ گہری باتیں کرنے والا۔ اتنا احمق تھا کہ سر لیا اقرار نی شجرۃ کو جواب نہ دے پاتا تھا۔ وہ کیوں اتنا بے خبر نظر آتا تھا۔

”دنیا واقعی اپنی آنکھ سے اپنی پسند کا منظر خود سے گھر کر دیکھتی ہے۔“ سنان کی خود کلامی۔  
ہوا کو لکھنا جو آگیا ہے۔

اب اس کی مرضی کہ وہ خزاں کو بہار لکھ دے۔  
بہار کو انتظار لکھ دے۔

ہوا کی مرضی کہ وصل موسم میں ہجر کو حصہ دار لکھ دے۔

محبوبوں میں گزرنے والی رتوں کو تائیدار لکھ دے۔  
شجر کو کم سایہ دار لکھ دے۔ ہوا کو لکھنا جو آگیا ہے۔  
ہوا کو لکھنا سکھانے والا!  
ہوا کو لکھنا جو آگیا ہے۔

”کیا تمہیں مجھے یہی جواب دینا چاہیے تھا سنان؟“  
شجرۃ نے پلکیں جھپکیں وہ چیخ کر اس کا گریبان تھام کر اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ وہ کہے۔ اور وہ شعر بڑھ رہا تھا۔

دونوں ٹوٹے تنے پر بیٹھے تھے اور وہ شہادت کی انگلی سے تنے کی کھردری سطح کو مس کر رہا تھا۔ جواب نہ دیا جس نگاہ اٹھا کر دیکھا۔

شجرۃ کا دل پھٹ جانے کا حد تک پھیلا۔ اتنا احمق وہ کم از کم نہیں تھا۔ اس نے سیدھے سادھے جملوں کے بیچ۔ یونہی ہنستے گزرتے راستوں میں کبھی لپیٹ کہہ کبھی گھما پھرا کے۔ کئی بار اپنے جذبے عیاں کرنے کی کوشش کی تھی۔ زبان سے کہا تھا دو معنی انداز میں۔ بے وقوفی کی تھی۔ آنکھوں سے اس کا سارا اندر عیاں ہوتا تھا۔ پھر اس بے نیازی کی وجہ۔  
لا پرواہی کا کارن؟

وہ اتنی جرات مند تھی کہ صاف اپنے منہ سے کہہ دیتی کہ۔

لیکن ایک دم اس کے اندر کا عورت پن عود کر آیا۔ وہ اب لفظ بھی نہ کہے گی۔ وہ سرعت سے اپنا بیگ اور فائلز سمیٹ کر تنے سے اچھل کر کودی۔

”اے۔ کہاں جا رہی ہو؟“ سنان بری طرح چونکا۔  
کلاس میں تو ابھی بہت وقت تھا۔

”جاری ہوں۔“ اس نے اپنی آواز کی ساری سلوٹیں دور کر کے کہا۔ ”تمہیں چھوڑ کر۔ یہی کہا ہے ناں میرے بھائی نے۔ اور۔ اور تم نے تائید کی ہے۔“  
اس نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

”یوں۔ ایسے۔ ایک دم۔ اچانک۔“ وہ بھی اب اچھل کر تنے سے اتر۔

”ہاں جب فیصلہ کر لیا تو دیر کیسی۔ ابھی یا کبھی۔ خدا حافظ۔“ وہ کئی قدم آگے بڑھی۔

”ابھی تو سیارہ لپچ تو کر لیں۔“ وہ بھاگ کر آیا تھا۔  
”کیوں؟ کیسا بچ؟ جب طے کر چکے تو کر چکے۔ ابھی اور اسی وقت دی اینڈ۔“ اس نے دل برف کی سل ٹھہرا دی تھی۔ آگ آنکھوں کے راستے نکلنے لگی؟ آہ۔

”میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“  
”مگر میں نے یہی سمجھا۔“ وہ تن کر کھڑی ہو گئی۔

آنکھیں بہتی ہیں تو بہتی رہیں۔ وہ ڈلی رہے گی۔  
”میں خود کو تمہارے قابل نہیں سمجھتا شجرۃ!“ وہ

شکست خور وہ لہجے میں کہہ رہا تھا۔  
”یہی کیا کمی ہے کہ تم خود کو۔ میرے۔ قابل نہیں سمجھتے؟“ وہ حیرت سے پوچھ رہی تھی۔

”تم نے شاید کبھی مجھے غور سے دیکھا نہیں۔“ اس نے کہا اور پھر اس کے بدستور سوالیہ چہرے کو دیکھ کر خاموشی سے اپنی ٹانگ سامنے کر دی۔

اس کی نظروں کے تعاقب میں شجرۃ نے ٹانگ کو دیکھا۔ وہ بل بھر میں اس کے دل کا سارا بھید جان گئی۔  
اس کی ہچکچی ہٹ، امرامع سنان الیاس کی آنکھوں میں جذبے بولنے لگے تھے۔ جن سے وہ خود کو کتراتا رہا تھا۔  
وہ لمحہ فیض تو یاد نہیں جب دل نے دھڑکن کی لے



بدلی۔ مگر دنیا یکدم اچھی لگنے لگے تو۔  
 ”میں نے واقعی تمہیں غور سے نہیں دیکھا۔“  
 شجرہ کی آواز کھٹنے سی لگی۔ ”مگر اس لیے کہ وہاں تک  
 نگاہ کبھی گئی ہی نہیں۔“ شجرہ کا لہجہ ہچکچاہٹ کے  
 سارے پردے چیرتا ہوا بے حجاب کھڑا تھا۔  
 اس نے صاف گوئی کی حد کر دی تھی۔  
 ”تو تمہیں میرے ساتھ چلتے ہوئے شرم نہیں  
 آئے گی؟“ فیصلے کی راہ پر چلتے ہوئے اس نے بھی  
 راست گوئی کو اپنایا۔ وہ خیال جو اس کی راہ میں حائل  
 ہو جاتا تھا۔  
 اظہار کی راہ میں۔  
 اقرار کی راہ میں۔

اس محبت کی راہ میں جو ہر روز سان الیاس کے دل  
 میں شجرہ الدر کے لیے امنڈ امنڈ کر آتی تھی۔  
 ”شرم!“ شجرہ کا سوال حیرت میں گندھا ہوا تھا۔  
 ”کیسی شرم؟“

”یہی کہ دولہن کے ساتھ رہسپشن پر آتا دولہا  
 تھری پیس پین کر چلا ہوا یوں لگے جیسے لنگڑی پالا کھیلتا  
 آ رہا ہو۔ یا سب کے بھنگڑے ختم ہو جائیں مگر وہ پھر  
 بھی بھنگڑے کرتا ہی نظر آئے۔ لوگ پوچھیں کہ آخر  
 دولہا کب تک بیٹھے گا۔ جواب آئے جی دولہا تو آرام  
 ہی سے ہے۔ شرمیلا ہی بہت ہے۔ اس نے کیا خاک  
 بھنگڑاؤں لٹائے۔ دراصل دولہا کی چال ہی ایسی ہے کہ ہر  
 وقت حالت بھنگڑا ہی میں ہوتا ہے۔ لنگڑا ہے ناں ایک  
 ٹانگ سے۔“

سان الیاس کو حرف حرف ازیر تھا۔ کبھی بھولا ہی  
 نہیں۔ شجرہ کی طرف مائل ہوتے دل کی راہ میں حائل  
 یہی تو وہ دل چیر دینے والے جملے تھے جو آگے بڑھنے  
 سے روکتے تھے۔ ورنہ شجرہ کی آنکھوں سے چھلکنے  
 والے جذبے تو بہت پہلے سمجھ میں آنے لگے تھے۔

شجرہ کا چہرہ اچھنبے کی تصویر بن گیا۔  
 ”یہ کیسی باتیں کر رہے ہو تم۔ کون کے گا ایسے؟  
 اتنی گندی بات۔ گھٹیا بات کیوں کے گا؟“ سان کے  
 جملے جیسے ذہن میں بازگشت کرنے لگے اس کا رواں

رواں کھڑا ہونے لگا۔  
 ”لوگ کیا کہیں گے۔ دنیا۔“  
 ”بھاڑ میں گئی دنیا۔ میں نہیں کرتی پروا کسی کی بھی  
 باتوں۔ اور اندازوں کی۔ میں ہمیشہ اپنے طے شدہ  
 راستے پر چلی ہوں۔“ وہ بھڑکی۔ ”اور تم نے اتنی عجیب  
 بات سوچی بھی کیسے؟“ اسے یاد آیا۔  
 ”میں نے نہیں سوچی۔ مجھے بتائی گئی۔“  
 ”کس نے۔ کس نے بتائی؟“ اس کا لہجہ جارحانہ  
 ہو گیا۔ بس ایک بار بتا لگے تو وہ ایسی کی ایسی کر آئے۔  
 ”نہیں نے۔“  
 ”کون نہیں؟“

”نہیں جو میری منگیتر ہونے والی تھی۔ مگر پھر  
 ایک سیڈنٹ کے بعد اس نے یہ جملے کہہ کر  
 ایکسکیوز کر لیا۔“  
 شجرہ سناٹے میں رہ گئی۔

”اس نے ان جملوں کو ایکسکیوز کے لیے  
 استعمال کیا تھا۔ ہا۔“ حیرت اور دکھ کی بنا پر اس کی آواز  
 پھٹ سی گئی۔ سان نے جواب نہ دیا۔ وہ اپنی لنگ والی  
 ٹانگ کو بے پروائی سے ہلارہا تھا۔  
 ”میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا سان!“ وہ اس کی  
 ٹانگ کو دیکھنے لگی۔ ”جب میں انجان تھی تب بھی اور  
 جب کہ میں جان گئی۔“ اس کے جملے میں اس کا حال  
 دل تھا۔ ”اور نہ کبھی دیکھوں گی۔“ جملے میں عہد بھی  
 تھا۔

سان نے چونک کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہ  
 ڈٹ گئی تھی اپنے کمرے پر۔ جان گئی تھی اس کے گریز کا  
 کارن۔ دکھی ہوئی تھی۔ لیکن اب جواب کی بھی منتظر  
 تھی۔ ایک خاموش پل۔ ہاں اور ناں کا فیصلہ۔ گھڑی پر  
 دیکھتے تو شاید چند منٹ ہی آگے سر کے ہوں۔ مگر شجرہ کو  
 لگا۔

پہاڑوں پر صدیوں سے جی برف پکھل کر دریاؤں  
 سے ہوتی سمندر میں گرنے لگی۔ یہ انتظار کا پل اتنا  
 ہی طویل لگتا ہے۔ وہ ہانپنے لگی تھی اور شاید ہارنے  
 بھی۔

چ تھا ٹانگ میں لنگ آگیا تھا۔ مگر وہ بے حد  
 معمولی تھا اور ذرا غور کرنے پر ہی دکھائی پڑا تھا۔ مگر اس  
 معمولی سی خامی نے لوگوں کے دلوں کی بڑی بڑی  
 خامیوں کو آشکار کر دیا تھا۔  
 زمین کے ہنسی سے بھرپور لہجے میں کہے گئے  
 جملے۔ اس کی آنکھوں میں اپنی ہی بات کا مزہ لیتا وہ تاثر  
 ۔ سان کو بھولا تو نہیں تھا۔  
 ہاں اور بہنوں کے خدشات پر وہ چونکا تھا۔ ”مگر ٹانگ  
 میں نقص رہ گیا تو؟“

”تو کیا ہوا وہ زندہ تو ہے ناں؟“  
 لیکن زمین کے جملوں کے بعد پیچھے ہٹ جانے  
 والے اور دوسرے۔ جو پہلے اس پر ثار ہوتے تھے۔  
 لڑکیوں کی آنکھوں میں اس کے لیے وہی جذبے  
 رہ گئے تھے۔ ترحم یا کتنا پھر وہ بھی پیچھے ہٹ کر اپنی دنیا  
 میں کھو گیا۔ وہ اپنا اعتماد کھو چکا تھا۔ ایسے میں شجرہ کا  
 بھری کلاس میں سر سے کہنا کہ وہ کتاب افورڈ نہیں  
 کر سکتی۔ اس کے اعتماد نے اسے متوجہ کیا تھا۔ اس کی  
 محنت نے ہار نہ ماننے کی فطرت نے اسے اس کی  
 جانب مائل کیا تھا اور توجہ بڑھ کر سننے جذبے میں ڈھلنے  
 لگی تو وہ خود کو جبراً باز رکھنے لگا۔

لیکن۔ آج۔ ابھی جب وہ سوال لیے کھڑی تھی۔  
 زندگی میں اب تک ایسا مشکل مرحلہ پہلے کبھی نہ پڑا  
 تھا۔

وہ متوقع نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ دنیا سے  
 نہ ڈرنے کا دعوا کرتی تھی مگر دنیا کو منہ توڑ جواب دینے  
 کے لیے اس کی ہاں چاہتی تھی۔  
 ”میں نے یقین کر لیا۔ تم آئندہ بھی اسے (لنگ کو)  
 نہیں دیکھو گی۔“ اس نے کہہ دیا۔  
 بہت مشکل چیزیں۔ اتنی آسان بھی ہو جاتی ہیں  
 کبھی کبھار۔



اتفاق کی جانے انجانے میں بھڑکائی جانے والی آگ  
 جو سب خاکستر کر دینے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ مگر

جیسے کسی مجرے سے ٹھنڈی ہو گئی انگارے پھولوں  
 میں بدل گئے۔ جس پر وہ ہاتھ تھامے اب زندگی بھر چلنے  
 والے تھے۔

متوسط آمدنی۔ متوسط گھرانہ۔ متوسط ماحول۔ اس  
 بے حد درمیانی طرز زندگی کے حامل لوگوں کے بیچ شجرہ  
 الدر کچھ الگ تھی۔ اس کے چہرے کے خدوخال بھی  
 یہاں کسی سے نہیں ملتے تھے۔ اس کی عادات و اطوار  
 بھی۔ زندگی گزار دینے کا طریقہ بھی اور اس کے  
 مستقبل کی دھندلی شکل۔

طبقاتی تقسیم کے لحاظ سے ان دو گھرانوں کا آپس  
 میں کچھ میل نہ تھا۔ مگر جب کچھ چیزیں قدرت طے  
 کر دے تو۔ لیکن لگانے والوں نے نئی اندازے اور  
 قیافے لگائے تھے جس میں سے کچھ درست تھے اور  
 کچھ غلط۔ اصل بات۔

سان کی والدہ بہت بوڑھی تھیں۔ سب اولادوں کو  
 پاپائے کے بعد وہ سان کے حوالے سے۔ فکر مند  
 تھیں۔ معاشی مسائل نہیں تھے۔ سب اچھے عہدے  
 پر فائز تھے۔ اپنا کاروبار کر رہے تھے۔ تعلیمی لحاظ سے  
 بھی نام تھا۔ میاں مرتے وقت جائیداد کی منصفانہ  
 تقسیم کر گئے تھے۔ ایک سراسر بے فکری کے ماحول  
 میں سان کا ایکسیڈنٹ اور پھر سرسری نگاہ کی وہ  
 انتہائی معمولی معذوری جو ان کے نزدیک جان بچ جانے  
 کا شکرانہ تھی۔ لوگوں کی نظر میں طعن بن جائے کی سیہ  
 تو سان و گمان میں بھی نہ تھا۔

زمین کے انکار اور بے حد بد تمیز جملوں کو بھلا کر  
 جب وہ دوسرے طالب گاروں کی جانب بڑھیں۔ جو  
 پہلے ہاتھ ملتے دکھائی دیتے تھے۔ اب زمین سے زیادہ  
 طوطا بچم ثابت ہوئے۔

وہ صدے سے زیادہ حیرت کی تصویر بن گئیں۔  
 باقی کی آٹھ اولادیں اپنی گھریلو کی تھیں۔ وہ ان کی  
 پریشانی کے جواب میں بڑے متوکل بنے کھڑے۔  
 ”اللہ مالک ہے۔“ مگر خود سے ہاتھ چلانے کا وقت بھی  
 نہ تھا اور نہ ہی شوق جذبہ یا فکر۔ ماں کی تابعداری بھی  
 نہیں تھی۔ اس حوالے سے کہ ان کا بوجھ ہانٹنے کو لڑکی



تلاش کرنے نکل پڑتے۔ سنان ابھی شادی کے لحاظ سے کم عمر تھا۔ مگر مسز الیاس کو ایک چٹائی لگ گئی۔ راتوں کی نیند اڑ گئی۔ معمولی سی لڑکھڑاہٹ پوری زندگی کو ڈھاوے کی؟

وہ صبح شام فکر مندی کی چادر اوڑھے رہتی تھیں۔ سنان کی خاموشی۔ زمین کی بے ہودہ گوئی کے بعد کلشن۔ ”ہوں۔ ہاں۔ جی۔ اچھا۔“ وہ ایسا تو نہیں تھا۔

اور کیا یہ ایسے ہی رہ جائے گا۔ اپنی اپنی زندگیوں میں مگن۔ بہن بھائی۔

گھر میں وہ دونوں ماں بیٹا رہتے تھے تو اتنی خاموشی۔ اور جب کل کو وہ بھی نہ ہوں گی تو اکیلا۔ خاموش سنان۔ نہیں نہیں نہیں۔

انہیں شجرۃ الدرد میں کوئی برائی نظر ہی نہ آئی۔ کچھ بھی قابل اعتراض نہ لگا۔ وہ چار بیٹے بیاہ کر سارے ارمان نکال چکی تھیں۔

انہیں شجرۃ کی آنکھیں پسند آئیں۔ (سنان کی تصویر سے بچی۔)

مسکراہٹ نے دل موہ لیا۔ (سنان کے نام پر چرے پر کوند اسالکتا تھا)

تعلیمی قابلیت اور مستقبل کی شکل بھی اچھی لگی۔ بہو کمتر نہیں تھی۔ استاد باپ کی بیٹی۔ محسنہ اور دونوں ماموں کی عاجزی اور شرافت نے بھی دل کو بڑا کیا۔ وہ

سب بھی سنان کا چہرہ اور دل دیکھ رہے تھے۔ ان سب لوگوں سے بہت اچھے جوان کے اپنے خونی رشتے تھے اور سنان کی چال دیکھتے تھے اونہ۔

ادھر شجرۃ کے گھر میں۔ ایک حیرت آمیز خوشی تھی۔

وہ سب سے الگ دکھتی تھی۔ الگ رہتی تھی۔ الگ دنیا۔ مگن مطمئن۔

مازیہ نے خوشی سے سنا تھا۔ وہ دونوں بمشکل میٹرک تھیں۔ ایک کاشوہر سیزمین تھا۔ غازیہ کا ورکشاپ چلاتا تھا۔ پڑھا لکھا سنان۔ مسز الیاس جیسی ساس شجرۃ کی دو نندیں امریکہ میں تھیں ایک جیٹھ اسلام آباد میں

ایک عہدے پر تھے۔

سب اتنا دھیمبا بولتے تھے نزاکت سے ہنستے اور وہ کسی بھی تفریق کے بغیر بہت نارمل لہجے سے سب سے ملے تھے۔

”شجرۃ کے لیے ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔“ ماموں نے سوچا۔

آفاق کی بولتی بند ہو گئی تھی۔ اشفاق خوش ہو گیا۔ وہ اب دوست کو کہہ دے گا۔ وہ اس کا بہنوئی ہے۔

بات ملے ہونا مگنی کے خیال میں ڈھلا تھا۔ تہ نازیہ نے اسے اپنے تئیں چھیڑا۔

”مگنی پر خوش نہ ہو شجرۃ! پتا ہے ماں ہمارے ہاں مگنیتر سے کیا پردہ کرواتے ہیں۔ چھاپا دیتے ہیں۔ جیسے گناہ ہو۔ ہی ہی ہی۔“ وہ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئی تھی۔

شجرۃ کے کان کھڑے ہو گئے۔ یہ تو سوچا ہی نہیں۔ ”ہم تو ساتھ بڑھتے ہیں اور شادی تک پڑھتے ہی رہیں گے۔“ اس کے منہ سے نکلا۔

”پڑھتے رہنا۔ مگر ابوجی بھی ایڈمیشن لے لیں گے اور تم دونوں کے درمیان والی کرسی پر بیٹھیں گے۔“

”ہی ہی۔“ اسے گد گدیاں ہو رہی تھیں۔ ”ہیں! شجرۃ کو قصور نے ٹھہرا دیا۔“

اس نے سنان کے آگے ساری صورت حال دکھا دی۔

”یار! تمہارے گھر والے پاگل ہیں۔“ وہ بھانگیا۔ ”یہ وہ والی نسل تو نہیں ہے ناں جو میاں سے بھی رہ کر رہتی ہے۔ نام تک نہیں لیتی۔ اے جی وہ جی کہہ کر

زندگی گزار دیتی ہے۔ ایک لطیفہ سناؤں؟“

ایک عورت نے زندگی بھر مکھن کو مکھن نہ کہا کہ سرتاج کا نام مکھن سنگھ تھا۔ بے ادبی ہوئی کیا کہتی

مکھن دے دو۔ مکھن کھانا ہے۔ کہیں یہ مکھن تمہارے دادا پر دادے میں سے تو نہیں تھے؟“

معصومیت سے پوچھ رہا تھا۔

شجرۃ برائے بغیر کھکھلا کر ہنس دی۔

”ہنو نہیں۔ اب میں کیا کر سکتا ہوں۔“

دلچ ہوئے ہیں اور لوگ ان سے سرکنا گناہ سمجھتے ہیں۔

”بچہ نہ کرو۔ میں صرف تمہیں بتا رہی ہوں۔“

”پھر تو یہ مزے کی بات ہو گئی۔“ اس نے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ ”ہم چھپ چھپ کر ملیں گے۔“

”تم اور چھپ کر ملنے والے۔“ شجرۃ کو مزہ آگیا۔ (وہ بہت والا کہ چھپ کر ملنے آئے گا۔ اظہار تک تو کیا نہیں۔ بس مجبوراً“ حالات نے ایسی کروٹ لی تو یہاں تک پہنچ گئے)

”مطلب! کیا میں چھپ کر نہیں مل سکتا؟“

”تمہاری چھپ چھپ کر ملنے والی شکل ہی نہیں ہے۔“ وہ اسے چڑا رہی تھی۔

”تم مجھے جانتی ہی نہیں ہو۔ سنان الیاس فل ہیج ہے سرورق پر مت جاؤ۔ کچھ ورق پلٹ کر دیکھو۔“

اس کا لہجہ ہی نہیں آنکھیں بھی بدلی تھیں۔ ”شجرۃ کسمسا گئی۔“ کیسی باتیں کر رہے ہو۔

”بدمعاشی طرح دیکھو۔“

”بس۔ اتنی سی ہمت۔“ اس نے نظروں میں مزید حرکت کر اسے دیکھا۔

”چلو جاؤ۔ جانے دیا۔“ اسے ایک گہرا غوطہ دے کر جیسے بل بھر میں کھینچ لیا تھا۔

”تم مجھے جانتی نہیں ہو شجرۃ الدرد!“ اس کا لہجہ لالوں سے نہیں دل سے سننے والا تھا۔ شجرۃ کو واقعی وہ

کچھ اور لگا۔ نیا نیا سا۔ اجنبی۔ مگر بہت اچھا۔

مسز الیاس کے فون نے سب کو حیرت انگیز مسرت میں مبتلا کر دیا۔

”زندگی کا کیا بھروسہ۔ وہ بیمار رہتی ہیں۔ مگنی نہیں کریں گی۔ نکاح ہو گا دھوم دھام سے۔ رخصتی پڑھائی کے بعد۔“

\*\*\*

زندگی کا نیا رنگ۔

اس نے بہت بچپن میں زندگی کی ترجیحات طے کر لی۔ مسکست سیدھا ستھرا راستہ۔ پڑھنا اور ابو کی طرح

نیچر بننا۔ خود مختار ہونا۔ پھر سنان الیاس نے بتایا۔

پڑھائی کی کوئی حد نہیں اور خود مختاری کی سوشلٹیں۔

شادی۔ آبادی۔ نئے رشتے۔ وہ اس پہلو پر تو کبھی گئی ہی نہیں۔ سب کی شادیاں ہوتی ہیں۔ اس کی بھی ہو جائے گی۔ بس۔ مگر زندگی کا یہ مرحلہ سب سے پہلے

آئے گا اور وہ بھی اتنی خوب صورتی سے۔ سنان الیاس کی صورت۔ اور سنان الیاس۔ گھنا مسنایا منافق۔

نہیں نہیں منافق تو نہیں۔ بس وہ انسان جو اچانک چپ کر گیا تھا۔ دنیا کی آنکھ نے اسے دکھ دیا تھا اور زبان

نے چیر دیا تھا۔ وہ کتنا خاموش اور ہلکا سا لگتا تھا۔ دیکھنے میں ایک عام سانو جوان۔ وہ کتنا بولنے والا نکلا اور کتنا

گہرا اور۔ اور۔

بے رنگ زندگی میں آنے والے رنگ۔

خوشی اور ہنسی بے یقینی۔ وہ کتنی ہی بار شہادت کی پور دانت میں داب کر لیتیں لیتی۔ حقیقت ہی ہے ناں۔ خواب تو نہیں۔

وہ راستہ۔ چوراہے۔ گلیاں لوگ مگر۔ مگر۔

”یہ پہاڑی کتنی پیاری لگتی ہے ناں جیسے مری میں ہوں۔“ (یونیورسٹی کے اندر موجود پہاڑی تو ہمیشہ سے

یہیں تھی۔ اسے اب نظر آنے لگی تھی)

”تم جو ساتھ ہو۔“ سنان دریا کو کوزے میں بند کر دیتا۔

”مجھے نہیں پتا تھا بھل دوپہری کے اتنے بہت سارے رنگ ہوتے ہیں۔“ (مین گیٹ سے اردو

ڈیپارٹمنٹ کے موڑ تک دو روپہ سڑک کے درمیان لمبی گیارہ میں گل دوپہری کے تمام رنگ شروع ہی

سے تھے اس کی بینائی گویا اب لونی تھی)

”میں جو ساتھ ہوں۔“ سنان کے چند حنی جواب میں کوئی کسر نہ تھی۔

”اب اس راستے پر چلتے ہوئے میں تھکتی نہیں سنان۔“

”ہم اکٹھے ہو کر جو چلتے ہیں۔“

”اور یہ جو۔“ اسے کوئی نئی بات یاد آئی۔

”اے سنو۔“ سنان یکدم رکا۔ اس کے عین



سامنے آکھڑا ہوا۔ اس کے شانے پر دونوں ہاتھ جمادیے۔  
”سب کچھ وہی ہے۔ وہیں ہے۔ مگر ہم نئے ہو گئے ہیں۔ محبت میں داخل ہو رہے ہیں۔ یہ سب خوب صورتی منظر میں نہیں نظر میں ہے۔ محبت میں ہے۔ ہاں محبت۔ وہ جو تمہیں مجھ سے اور مجھ سے تم سے ہو رہی ہے۔ ایک دوسرے سے ہو گئی ہے۔“  
”محبت“ شجرہ نے ہولے سے دہرایا۔  
”ہاں محبت!“ اس نے یقین کی مرثبت کر دی تھی۔

\*\*\*

رہٹ کے تیل کی طرح آنکھوں پر پٹی باندھے گرد پیش سے نا آشنا کھومتے رہنے والی شجرہ الدر۔ لا بریری میں بند ہونٹوں کے ساتھ ٹھنڈا پراٹھا چباتی شجرہ الدر۔  
کسی سنگی ساتھی کے بغیر چپ چاپ دوسروں کو دیکھنے اور سننے والی خود کلامی کرتی۔ تنہا اور کم صم نظر آتی شجرہ الدر۔

جیسے کسی ناپیدہ چادر میں چھپی تھی۔ سنان الیاس کے ساتھ نے اس چادر کو دور کر لیا ہوا میں اڑا دیا۔ شجرہ الدر واضح ہو کر سامنے آ گئی۔  
اسے ہنسنا بھی آتا تھا اور بولنا بھی۔ قہقہے لگانا بھی۔ دوسرے تو کیا وہ خود اپنے اس نئے روپ کو دیکھ کر حیران تھی۔

اس کی زندگی میں اچانک ایک رشتہ آگیا تھا۔ ایسا رشتہ جو اس جہان فانی کی بنیاد ہوتا ہے جو نازک ہوتا ہے۔ بلبلے کی طرح اور مضبوط۔ پہاڑ کی طرح۔ معاشرتی لحاظ سے ان کا تعلق ابھی کچھ حدود کا پابند تھا لیکن مذہبی حوالے سے ہر شے کی چھوٹ۔ نکاح کے بعد کسی چیز کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔  
وہ اکٹھے آتے جاتے۔ کھاتے پیتے بڑھتے گھڑی کی ٹیک ٹیک پر نگاہ کیے بغیر مستقبل کی منصوبہ بندی کرتے۔

محبت کے لیے سب سے اہم نسخہ تھا نکاح۔ پہلے ایک دوسرے کو دیکھ کر محسوس ہوتی تھی۔ پسندیدگی تھی۔ دوستی۔ کشش۔ اب جو ہوتی تھی محبت تھی۔ محبت بے حد ہے۔ پناہ۔ ہر روز ہوتی ہوئی۔

وہ اس رشتے کا جی بھر کے لطف اٹھا رہے تھے۔ وہ سنان الیاس کے ہم قدم ساحل کی ریت پر چلتے دونوں ہاتھوں سے اس کے بازو کو جکڑ کر شانے پر رکھے ہوئے اڑتے بالوں سے بے پروا۔  
وہ اسے شعر سنانا۔ نظمیں۔ غزلیں۔ وہ آنکھیں موندے سنتی۔

اس کی تشخیص میں شاید مرض آجائے جنوں کی ساری علامتیں بھی لکھ دوں گا بڑا گھٹن ہے نثر میں حال دل لکھنا یہ صورت غزل دل کی حکایتیں لکھ دوں گا

اپنی کہانی کیا پوچھتے ہو کتنی اچھی کتنی پیاری ہم نے جسے چاہا تھا ہم نے اسے اپنا لیا بھی

میری زبان وہ قطعاً سمجھ نہیں پاتے اور ان کی اپنی تو کوئی زبان ہے ہی نہیں کبھی کبھار وہ یکدم چپ کر جاتا۔ اسے بانو سے کراہنے سامنے کر لیتا۔

”کچھ سمجھ میں آیا؟“ وہ ہونٹ کا کونا دانت میں دباتی۔ اس کی آنکھوں میں جھانکتی۔ جو کڑے تو دل سے مشکوک ہوتا۔ وہ نفی میں سر ہلاتی۔ (کچھ سمجھ میں نہیں آیا ہوتا) شریر مسکراہٹ کے ہمراہ۔

”تو پھر سن کر جھومتی کیوں ہو؟“ وہ خفا ہونے لگا۔ ”تمہیں سننا اچھا لگتا ہے۔“  
”اور شاعر کی صلاحیت؟“

”بھاڑ میں گئی۔ مجھے تو بس تمہاری آواز سے تمہارے لہجے سے غرض ہے۔“

”یہ جانے بغیر میں کیا کہہ رہا ہوں۔“ حیرت کی زیادتی سے وہ چلا اٹھا۔

”اوں ہوں۔ مجھے پتا ہے۔ تم محبت کے علاوہ کچھ نہیں کہتے۔“ اس کا یقین اسے بھونچکا کر دیتا۔  
”تمہیں یقین ہے کہ میں محبت کہہ رہا ہوتا ہوں۔“

”جیسے؟“  
”تمہارا لہجہ بتاتا ہے۔ آواز اور آنکھیں۔“ وہ اس کی ناک کو شرارت سے پکڑ لیتی۔

”تو یقین شجرہ۔“ وہ سب بھول جاتا۔ ”کب سے؟“

”ہمیشہ سے۔“ وہ دوبارہ شانہ دو بوج کر قدم بڑھانے لگتی۔

پوری آب و تاب سے چمکتا جاتا سورج۔ غندے سے بڑھال ہو جانا اس کی آنکھ میں سرخی آجاتی مگر آنکھیں موندنے کی حد تک وہ ان دونوں کو دیکھتا رہتا۔

دن بدن بڑھتا میل جول۔ دونوں پردھائی کے معاملے میں سنجیدہ تھے۔

”تم سی ایس ایس کا امتحان کیوں نہیں دیتیں شجرہ؟“ اس نے آنرز میں فرسٹ پوزیشن لی تھی۔  
”وہ تو بہت امیر لوگ دیتے ہیں۔“

”بے وقوف! وہ بہت ذہین لوگ دیتے ہیں۔“  
”میں اتنی ذہین ہوں؟“

”کتنی زیادہ ہو۔“  
”اور پھر کیا بنوں گی؟ افسر؟“

”تو اور کیا۔“  
”تو پھر تم بھی دے لو۔ تم کیا کرو گے؟“

”تمہاری چاکری۔ جی حضوری۔ میڈم!“ وہ مہذب بنا حالت رکوع میں چلا جاتا۔ دونوں ہاتھ پر ہاتھ مار کے ہنس پڑتے۔

نکاح نے انہیں دیکھنے کی چھوٹ کی اجازت دے دی تھی۔ اللہ کے نزدیک کوئی حد نہ تھی۔ (مگر معاشرے کا مقررہ کردہ وقت ابھی دور تھا۔ بہت دور)

ایمان نے سنان الیاس سے نکاح کیا تھا اور پھر محبت کی گئی بہت زیادہ۔ وہ اس کا چہرہ دیکھتی تھی۔ اور آنکھیں۔

اس نے کبھی اس کی چال کی لڑکھاہٹ کو نہیں

دیکھا تھا کہ محبت عیب پوش ہوتی ہے۔ اور وہی دیکھتی ہے جو دیکھنا چاہیے یعنی دل۔ محبت سے لبریز دل۔

وہ ساتھ چلتے بہت پیارے لگتے تھے۔ وہ دراز قد تھا اور نمایاں تھا۔ اس کی اداس بناوٹ والی آنکھوں میں ہنسی کا مستقل ڈیرا۔ دھوپ چھاؤں کا منظر تھا جیسے۔

دنیا انہیں دیکھتی تھی۔ رشک سے۔ حسد سے۔ حیرت سے۔ شک کے بغیر۔

لیکن کوئی تھا جو انہیں تملکا کر دیکھتا تھا۔ جلیبلا کر۔ گھور کر۔ وہ جوان کی ناک میں تھا۔ حالانکہ موقع گنوا چکا تھا۔

مگر اسے موقع پیدا کرنے آتے تھے۔ وہ دونوں تو بہت آسان شکار لگے تھے۔

وہ بہترین منصوبہ ساز تھا۔ اور اس کا نام۔

\*\*\*

وہ شروع دن سے ان دونوں کے ساتھ تھا۔ گونگا ناپیدہ بن کر بس ایک پہرے دار کی طرح اور اس دن بھی جب سنان الیاس نے شجرہ الدر کو پکارا تھا۔ اور اپنی کتابیں دے دی تھیں کہ وہ پڑھے اور سہولت سے واپس کر دے۔

پھر جب دونوں ریڑھیوں پر کتابیں ڈھونڈ رہے تھے باتیں کر رہے تھے۔ ہنس رہے تھے۔ تعلق بن رہا تھا۔ نانا جڑ رہا تھا۔ وہ ایک دوسرے کے دوست ہو رہے تھے۔

وہ تب بھی وہیں موجود تھا۔ دونوں کی دوستی کا رشتہ اچانک تھا اور بے ضرر تھا۔

کلاس روم میں وہ کہیں ادھر ادھر بیٹھتے تھے۔ پھر ساتھ ساتھ کرسیاں جوڑنے لگے۔ وہ دونوں کے درمیان میں تو نہ کھس کر بیٹھ سکا۔ ہاں کسی نہ کسی درز یا کونے کھد رے سے انہیں دیکھتا ضرور رہتا۔

وہ دونوں کم عمر تھے۔ کم عقل اور کم علم بھی تھے۔ دنیا کے علم سے واقف تھے نہ دین کے علم سے۔



معاشرتی حدود و قوانین کی بھی اتنی سمجھ نہ تھی۔ ہاں اس یقین سے ضرور جیتے تھے کہ جو ہم کر رہے ہیں۔ وہ درست ہے اور کسی کو روکنے ٹوکنے کی ضرورت نہیں۔ ادھر اسے بھی کچھ جلدی نہیں تھی۔ یہ تو اس کے لیے بہت ہی آسان شکار تھے۔ ایک چٹکی کی مار۔

اس نے ان دونوں کے درمیان اپنی منصوبہ بندی رکھ لی تھی۔ بساط بچھا ڈالی تھی جس کے کسی بھی پانے کو کھیلنا جاتا۔ جیت اس کو ملتی۔

ان دونوں کے درمیان کوئی رشتہ نہیں تھا اور جو تھا وہ ناجائز تھا اور گناہ تھا۔ ایسا گناہ جو مزید گناہ کی راہ کو ہموار کرتے ہوئے انت تک پہنچا کر دم لیتا ہے۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ گیم کا باقاعدہ آغاز کرتا۔ اس کی ساری کی ساری منصوبہ بندی دھری کی دھری رہ گئی۔ وہ دونوں یکدم ایک ایسے رشتے میں بندھ گئے جو اس کے ارض میں اس کا سب سے ناپسندیدہ رشتہ تھا۔ اس کی روح پر تازیانے برساتا تھا۔ اسے بال نوپنے سر ٹکرانے اور سینہ کو پی پر مجبور کرتا تھا۔

ان دونوں کے نکاح نے اسے بچھاڑیں کھانے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ ایسی کہہ سکتا تھا کہ کوئی اور گدھے الو اور راتوں کو رونے والے گیدڑ کہتے بھی پناہ مانگتے تھے۔ ایجاب و قبول کے وقت۔ شدت غم سے اس کا چہرہ کائنات کی سب سے بد شکل ہولناک صورت میں دھل گیا تھا۔

نکاح کے بعد جب ان دونوں کو ایک صوفے پر ہمراہ بٹھادیا اور سنان نے سب کی نظر بچا کر شجرۂ کاہتھ تھام لیا اور اسے شرارتاً "حتی سے پکڑ کر شجرۂ کے چہرے کے تاثرات کو جانچنے کے لیے بار بار اس کا چہرہ دیکھنے کی سعی کی۔ تب حاضرین اس کی چوری اور شرارت پر دل کھول کر ہنستے تھے۔ اس منظر کی خوب صورتی نے اس کی شکست کا اعلان کر دیا۔ وہ جھکے شانوں اور بگڑی صورت کے ساتھ واپس ہوا تھا۔

لیکن وہ اتنی آسانی سے ہار ماننے والا تھا تو نہیں۔ اس نے روز ازل اللہ کے سامنے عہد کیا تھا وہ اس کے بندوں کو

بہکائے گا اور ہر ممکن کوشش کرے گا۔ شجرۂ اور سنان کے معاملے میں وہ ہار گیا تھا تب ہی ایک خیال نے اس کے ڈوبتے دل کو قرار دیا۔

اسے ان دونوں کے بیچ منگوائش نظر آئی تھی۔ بہت تھوڑی سی دیر تھی کسر تھی۔ مگر اس کے لیے کافی تھی۔ بہت کافی تھی۔

نکاح اللہ کا پسندیدہ ترین تعلق ہے جو انسان جوڑتے ہیں۔

نکاح شیطان کے سینے پر پہاڑی سیل ہے جسے توڑنے یا وجود ہی میں نہ آنے دینے کی اس نے قسم کھا رکھی ہے اسے ناجائز رشتے اور تعلق بھاتے نہیں۔ دنیا کے کسی بھی مذہب میں جب بھی انسان اس جائز تعلق کو اپنے طریقے سے جوڑتے ہیں تب وہ بچھاڑیں کھاتا ہے اور مرد و زن کے بیچ یہ رشتہ ناجائز ٹو پائے تو شادیانے بجاتا ہے۔

یہ نکاح اس کے عراجم کے منہ پر طمانچہ تھا۔ وہ منہ کی کھا گیا تھا۔ وہ دونوں اب اس کے لیے قطعاً بے کار تھے۔ وہ کسی اور شکار کی ناک میں نکلنے کو تھا تب ہی اسے ان دونوں کے بیچ ایک راہ دکھائی دی اور۔ وہ ہارتی بازی جیت سکتا تھا۔ ارے اتنی سادگی کی بات دکھائی کیوں نہ دی؟ وہ شادی مرگ میں گھر کر بڑے لاڈ سے اپنی سرزیش کرتے ہوئے اپنی پیشانی پر ہاتھ مارتا تھا۔

مذہبی لحاظ سے ایک مکمل رشتے کو بے ٹوک بنانے کو اگر "خیال" منصوبہ بندی میں گھرا تو اور واضح ہوا۔ برا مزہ آیا۔ آنے لگا۔

مذہبی لحاظ سے مکمل رشتے کی راہ میں معاشرتی و بندہ حائل تھی اور معاشرے میں رہنے کے لیے معاشرے کے طے شدہ اصول و ضوابط کو ملحوظ خاطر رکھنا پڑتا ہے۔

غلط تو غلط ہی ہوتا ہے۔ گناہ تو گناہ ہی ہے۔ کیا انہ آئے اگر وہ صحیح کو درست کو جائز کو غلط ثابت کر دے نیکی کو بدی کا لبادہ اوڑھا دے۔

اسے بدنامیاں بھاتی ہیں، رسوائیوں کا تماشا۔

عزت کے جنازے کو کندھا دینے وہ سب سے پہلے آگے بڑھتا تھا۔

ہر اتفاقی دین نے اس سے پناہ مانگنے کا درس دیا ہے۔

ہر کام شروع کرنے سے پہلے اللہ کا قرب مانگتے ہیں اور اسے دھتکارا جاتا ہے پھر بھی وہ باز نہیں آتا سیدھ لگاتا ہے موقع تلاش کرتا ہے۔

آخر کو اس نے قسم جو کھا رکھی ہے کس۔

ایک سجدے سے انکار کے بعد وہ سر لیا تا فرمائی ہے اسے فرماں برداری کسی بھی روپ میں ہو، کبھی نہیں بھائی۔

وہ شیطان مردود تھا جس نے ان کے رشتے کو تھملا کر اور جھلکا کر دکھا تھا۔

\*\*\*

اتنی بڑی کامیابی کا احساس، نشہ، لطف، بے یقینی، تشکر۔

خیال کی دنیا پینگ دے رہی تھی۔ وہ ہریار آسمان چھو کر آئی اور آسمان چھونے میں جو مزہ ہے۔ وہ تو وہی جانے جو زمین پر رہتے رہتے آسمان کو ہاتھ لگالے۔ اس نے ماسٹرز میں ٹاپ کیا۔ گولڈ میڈل لیا تھا۔ پوری یونیورسٹی میں ٹاپ۔

پیسے بچانے کے لیے ٹھنڈا کرٹا پر اٹھا کھانے والی شجرۂ الدرد۔ کڑی دوسروں میں سورج کے سامنے ڈٹی پیدل مارچ کرتی شجرۂ الدرد۔ ایک اعلا سول سرونٹ ہوئی یہ کسی نے تو کیا خود اس نے بھی نہ سوچا تھا اس نے تو بی اے بی ایڈ کر کے ماسٹر عبد الرحیم کی طرح ٹیچر بننا تھا۔

یہ کامیابی قسمت تھی یا محنت؟ نہیں۔ یہ دونوں باتیں ثانوی ہو جاتیں اگر سنان الیاس اس کے ہمراہ نہ ہوتا۔ اس کا رہنما، دوست، محبوب اور جیون ساتھی۔

شجرۂ کے چہرے کی کم مائیگی، افسردگی، بے زاری تو بہت عرصہ پہلے ہی غائب ہو گئی تھی۔ اس چہرے پر اب اعتماد تھا۔ خوب صورتی تھی۔ محبت تھی اور

محبوب اسے محبوبیت سے تنکنا تھا کہ دل بھرتا ہی نہ تھا۔

سرخ لباس میں تیز سرخ لپ اسٹک کے ہمراہ اس نے بال کھلے چھوڑ رکھے تھے۔ اس کے ہاتھ میں سرخ پھولوں کا بکے تھا۔ آج سنان گاڑی لایا تھا ویسے تو وہ اسے بائیک پر اڑائے پھرتا تھا مگر آج تو سیلبریشن کا دن تھا۔

شجرۂ ایک شان دار کینڈل لائٹ رویا ننگ ڈنر کے بعد اب اپنی ساس سے ملنے جا رہی تھی۔ وہ بہت بوڑھی ہو چکی تھیں اور بستر پر تھیں۔ شجرۂ نے پنگ پھولوں کا ایک دوسرا بکے انہیں دیا اور خود سے جھک کر ان کے گل کا بوسہ لیا۔ انہوں نے اس کا چہرہ اپنے لاغر ہاتھوں میں تھام کر چوم لیا۔ کچھ لوگوں نے کئی بار کہا تھا۔ چھوٹی بہو بہت کچلے طبقے سے جتنی گئی ہے مگر انہوں نے اس کی روشن پیشانی اور چمکتی ذہین آنکھیں دیکھ لی تھیں۔ آج وہ لڑکی کیا ہو گئی تھی۔

وہ بیٹے اور بہو کو محبت پاش نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔

\*\*\*

جشن کے اس دن کے بعد کامیابی کی یہ شام حوررات کا لبادہ اوڑھنے کو تیار کھڑی تھی اور ہچکیوں سے روتی شجرۂ الدرد۔ وہ سارا دن اتنا ہنسی تھی کہ تھک کر چور ہو گئی تھی۔ کبھی کبھار ہم ہنستے ہوئے بھی تھکتے ہیں اور رونے کو دل کرنا ہے۔

"یقیناً یہ خوشی کے آنسو ہوں گے۔" وہ آخر کب تک اسے رونا دیکھا۔

"نہیں۔۔۔ خوشی کے نہیں ہیں۔" اس نے سرخ آنکھوں سے اسے دیکھا۔

"غم کے ہیں؟" وہ حیرت سے پوچھنے لگا۔

"نہیں، حیرت کے۔۔۔ بے یقینی کے۔۔۔ تشکر کے۔۔۔ اور تم سے محبت کے۔"

"اتنے نام اور آنسو؟ وضاحت دیں گی آپ مجھ کم علم کو تو خاک سمجھ میں نہ آیا۔" وہ کچھ نہ بولی۔ ناک



سکوڑی لمبا سانس لیا۔ بولنے کے لیے لب واکے مگر آواز حلق ہی میں گھٹ گئی تھی۔

”حیرت کہ میں یہاں تک پہنچ گئی۔ جہاں۔ جہاں کا میں نے کبھی خواب تک نہ دیکھا تھا۔“

بے یقینی کہ۔ یہ سب میں نے حاصل کر لیا۔ میں نے۔ جو احساس کمتری میں خاموشی سے دنیا سے کترا کر گزرا کرتی تھی۔ آج اس طرح نمایاں ہو گئی۔ اور تشکر کہ۔“

وہ بچکوں کے درمیان ہی بول رہی تھی یہاں پہنچ کر آواز بالکل گھٹ گئی کہ

”مجھے تم ملے سن۔ اگر آج تم نہ ہوتے تو میں۔ سب کچھ ہو سکتی تھی، مگر وہ نہیں جو میں ہو گئی۔“ وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

سنان کے چہرے کی مسکراہٹ گہری ہوتی چلی گئی۔ وہ اس کی کیفیت سمجھ رہا تھا، مگر اس کا رونا اسے تکلیف دے رہا تھا۔ وہ بس چپ کر جائے پھر بات کی جائے، مگر وہ جمعرات کی جھڑی بن گئی تھی۔ چھڑ گئی تو

وہ ایک ٹک اسے دیکھنے لگا۔ سرخ لباس سرخ لب اور سرخ آنکھیں۔

”اور اور جو آنسو محبت کے تھے ان کی وضاحت نہیں کی۔ مجھے رہنما بناتی ہو دوست، ہمدرد، ساتھی، جب بھی ہوتی ہو مشکور ہوتی ہو۔ محبوب کیوں نہیں بنائیں؟ ممنون تو نظر آتی ہو۔ مبہوت کیوں نہیں۔ تمہیں محبت نے کبھی سحر زدہ نہیں کیا۔ اتنا سا بھی کہ چند لفظ اس کے لیے بھی۔“

وہ شکوہ کر رہا تھا۔ فرمائش یا اظہار۔ شجرہ کی ہستی بل گئی۔ اس کا چہرہ تہمتا اٹھا اور لب تھرا گئے۔

محبت۔ وہ تو اتنی تھی کہ وہ ساری عمر بیٹھ کر اسے لکھتی تو اختتام پذیر نہ ہوتی۔

اسے شعر کہنے نہیں آئے تھے اور اتنی طویل نثر وہ اس کی شان میں کیسے کہتی۔

آئی لو یو کہہ دے۔ کبھی کما تو نہیں۔ کبھی بھی

نہیں اور اگر وہ کہہ دے۔ نہیں۔

ہست ہلاکالگاہیہ سادہ سا اظہار۔ تو خاص والا کیا ہو گا؟

امتحان میں جملے بنائے والا سوال کبھی اتنا مشکل نہ لگا تھا۔ وہ شان دار اور اچھوتے جملے بناتی تھی۔ ممتحن کا دل موہ لیتی تھی۔

مگر ابھی۔ اتنے سالوں کے ناتے میں سنان الیاس کا پہلا شکوہ اور جائز شکوہ۔ اس کی آنکھوں میں شرمندگی ڈولنے لگی اور دل میں محبت جوش مارنے لگی مگر کہے کیسے۔ ناکامی۔ لیکن شجرہ ناکامی قبول کرنے والی کب تھی۔ وہ اسے دیکھنے لگی جو اسے زیر لب تبسم کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ متوقع نگاہوں سے۔ شرارت سے۔ عنقریب تھا وہ ہار کا اعلان کرتی کہ اس کے پاس الفاظ نہیں اور وہ اس قابل کہاں کہ اظہار کر سکے اس سب کا جو وہ محسوس کرتی تھی اور بتائے کہ سنان الیاس شجرہ الدرد کی زندگی میں کیا حیثیت رکھتا ہے۔

”جائے دے۔ ساری ذہانت کس کام کی، جب میرے لیے تمہارے پاس چند الفاظ بھی نہیں۔“

سنان کا چہرہ بولنے لگا تھا۔ اس سے پہلے کہ زبان بھی کہتی۔ شجرہ جھٹکا سا کھا کر پلٹی اور۔ گرفت اتنی پر جوش اور اچانک تھی۔ وہ لڑکھڑاسا گیا، پہل شجرہ کی جانب سے ہوئی تھی۔

”تم سچ کہتے ہو سنان۔! میرے پاس واقعی الفاظ نہیں ہیں، تمہارے لیے کسی بھی جذبے کے اظہار کے لیے۔“ سرگوشی سنان کے کان میں ابھری۔ ”مگر میں۔“ اب وہ کچھ کہہ نہیں رہی تھی وہ اس سے اتنی قریب بھی اور۔ اور۔

ہنوز حیران و محسوس کھڑے سنان الیاس کے لیے یہ عمل حیرت اور شدید حیرت کے بعد اب رد عمل کا خواہاں تھا جیسے۔

وہ۔

بہت عرصہ انتظار کیا تھا اس نے۔ سرخ لباس، تہائی جوش و ہوش کی جنگ میں آج نقب لگانی جا سکتی تھی۔



بحیثیت عورت یہ اس کی جانب سے کی جانے والی پہلی پیش قدمی تھی۔ ایسی پیش قدمی جس میں جوش، جذبہ، بے خودی، سپردگی سب کچھ موجود تھا۔ اس پر یہ موزوں ماحول۔ لباس، رات، خوشبو، تنہائی اور سرشاری کامیابی اور خوشی محبت اور احسان مندی۔ ان کا رشتہ ہر عمل کی اجازت کلاسنس تھا۔

ان دونوں کے رشتے میں تو کوئی قباحت، کسر تھی ہی نہیں۔ ان دونوں کا نکل ہو چکا تھا۔

جب دوستی تھی۔ ہم قدم چلا کرتے ہتے بولتے تھے کسی غلطی کے بغیر پھر جب ایک ایسے رشتے میں بندھ گئے جس میں گنجائش ہی گنجائش تھی کوئی روک ٹوک نہ تھی نہ دنیا کی نگاہ میں اور اللہ کی جانب سے تو چھوٹ تھی ہی۔ تب بھی وہ معاشرتی حد بندی کے احترام میں اپنی حد سے آگے نہ بڑھے۔

مگر وہ حد جس کے لیے ”وقت مقرر“ کر دیا گیا تھا اسے پار نہ کیا اور کامیابی کے جشن کی اس رات جب زبان کی پاس داری کا وہ لمحہ ہاتھ سے پھسل گیا تو دونوں حق دق تھے۔

شرمندگی تھی۔ یہ اچانک کیا ہو گیا اور کیسے ہو گیا۔ وہ بچے تو نہیں تھے۔ ذی شعور انسان تھے پہلے۔ اتنے سالوں میں۔ پہلے تو کبھی ایسا نہ ہوا تھا۔

وہ شرم سار کمرے میں تنہا بیٹھی تھی۔ وہ نظریں چڑا کر کمرے سے نکل گیا تھا۔ سرشاری، شرم ساری میں بدل کر کوڑے برسا رہی تھی جو کچھ ہوا تھا وہ قطعاً ”گناہ“ نہیں تھا، مگر یہ اس کا وقت بھی تو نہیں تھا۔ دنیا۔ ہاں دنیا بے خبر تھی، مگر اپنے آپ سے نگاہیں ملانے کی ہمت نہ تھی۔ ایک دوسرے کو نظر بھر کے دیکھنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ قیامت کا بل۔

واپسی کے سفر میں وہ بار بار اپنا لباس درست کر رہی تھی۔ کبھی دو پٹا شانوں پر پھیلائی۔ کبھی ماتھے پر کھینچی، کبھی آستین کو کھینچ کر انگلیاں تک چھپانے کی سعی کرتی۔ وہ کار میں دروازے سے چپک کر درمیان سے جاتی الامکان فاصلہ رکھ کے بیٹھی تھی اور مزید چپکتی تھی۔ پھر اسے پتا بھی نہ چلا کہ کب آنکھیں برسنے

لگیں۔

وہ رو رہی تھی زار و قطار۔ بے حد و حساب۔ اس کے رونے کی آواز میں ماتم اور بین تھے۔ وہ کوس رہی تھی خود کو یا اس کو؟

ایئر ٹنک پر جے سنان کے ہاتھ یوں بھیج گئے کہ ایک ایک رگ نمایاں ہو گئی۔ وہ اسے رونے سے باز رکھنے کے لیے بہت کچھ کہنا چاہتا تھا۔ کچھ الفاظ شرمندگی کے۔ کچھ جملے معذرت کے۔ اور۔ اور۔ کچھ پیرا گراف یہ کہ۔ کوئی بات نہیں۔ کوئی گناہ تو نہیں ہوا سب عین شریعت اور عین فطرت۔

غین غلط کی کوئی حیثیت نہیں اور پھر جب اس کا رونا بڑھتا ہی گیا تو اس نے کہہ بھی دیا۔

وہ اسے بتا رہا تھا کہ وہ آئینہ آئینا میاں بیوی ہیں، کوئی گناہ نہیں کر بیٹھے کہ ضمیر ملامت کرے اور دنیا ذلیل۔ وہ سن رہی تھی اور سمجھ رہی تھی۔ اور سنان الیاس کو قائل کرنا آتا تھا اور شجرہ الدرد کو اسے سمجھنا ہمیشہ آسان لگتا تھا۔ سو گھر کے پاس اترنے تک وہ خود کو نارمل کر چکی تھی۔

اسے بچپن سے خود کو کمپوز کرنا آتا تھا۔ حال دل چھپا کر مسکراتا۔ اپنے قدموں کی لڑکھڑاہٹ پر قابو پا کر وہ سب گھیر والوں کے بیچ بیٹھی ہنس رہی تھی۔ سب کو سن رہی تھی۔

”یعنی کہ اب میں شادی کی تیاریاں شروع کروں؟“ امی نے سب حاضرین کو اطلاع دی اور پوچھ بھی لیا۔

”بالکل۔ ہاں۔ ہاں۔“ کچھ دل کھول کر مسکرائے، کچھ نے زور و شور سے سر ہلایا۔ شجرہ کے مسکراتے لب بھیج گئے۔ اس کے چہرے پر سایہ سا لہرایا تھا۔

”کس۔ کس کی شادی؟“

”تمہاری اور کس کی؟“

”ایسے ایک دم کیوں؟“

”ایک دم کا کیا مطلب؟ یہی طے ہوا تھا نا کہ شادی پڑھائی کے بعد۔ تو وہ ہو گئی مکمل۔“ محسنہ نے اپنی گود



میں بڑا گولڈ میڈل لٹکا کر دکھایا۔  
شجرہ کے لبوں سے سر آہ سی نکل گئی سب محسنہ کے حامی تھے۔  
”آپ کے خیال میں میں نے اس دس گرام کے سونے کے ٹکڑے کو پانے کے لیے اتنے سال دن رات ایک کیے ہیں۔“  
سب کے منہ کھل گئے یہ سونے کا ٹکڑا تھا۔  
شجرہ نے سب کے سوالیہ چروں پر نگاہ دوڑائی۔  
”اصل امتحان تو اب شروع ہو گا۔ سارے سال کی محنت پر پانی پھر جائے گا اگر خدا نخواستہ آگے ایک پل کو بھی ناکام ہوئی تو۔“  
”یعنی اب آگے اور بڑھنا ہے؟ مگر کیا۔ اب کون سا امتحان باقی ہے؟“ الگ الگ سوال غلٹ سے پوچھ گئے تھے۔  
”مقابلے کا امتحان امی۔ مجھے مقابلے کا امتحان دینا ہے۔“  
سب کے منہ کھلے رہ گئے یہ کون سے امتحان کا نام تھا؟

وہ بے چین تھی۔ کس کوٹ سکون نہ تھا۔ اس کی روح بے قرار تھی۔ ہانپتی تھی۔ کانپتی تھی۔ وہ شرمسار تھی۔ کبھی غصہ ہو جاتی۔  
اپنی کیفیت سمجھنے سے قاصر تھی۔ سارا الزام سنان پر نہیں رکھ سکتی تھی وہ اکیلا تو شریک کار نہیں تھا۔ تالی ہمبھی ایک ہاتھ سے بچتی ہے۔ دونوں سالوں سے ساتھ تھے اور اس رشتے کو بندھے بھی عرصہ گزرا۔  
پھر آج یہ کیا ہو گیا تھا۔  
اس کے رونے پر وہ تسلیاں دے رہا تھا اور صبح دے رہا تھا۔  
کوئی گناہ تو نہیں ہو گیا تھا۔  
”ہاں واقعی گناہ تو نہیں ہو گیا تھا۔“ وہ اس پر اب خود کو دوبارہ سے دلا سے دے رہی تھی۔  
نیند سنان الیاس کی آنکھوں سے بھی بھاگ گئی

تھی۔  
کچھ غلط تو نہیں ہوا تھا مگر غلطی بہر حال ہوئی تھی۔  
اسے اس وقت بھی احساس تھا اور اب رات کے اس تنہا خاموشی پر میں اور زیادہ۔  
شرمندگی شجرہ سے بھی اور خود سے بھی۔  
اسے اپنا ذہن اس وقت سے اب تک ایک ٹھنڈی سی کیفیت میں جم لگا تھا۔ باوجود اس کے کہ اس نے شعوری کوشش سے ذہن کو حاضر رکھتے ہوئے شجرہ کو تسلی دی تھی بے فکری کی تلقین کی تھی۔ کچھ نہیں ہوا۔ کچھ نہیں ہوتا کادرس بھی دیا تھا۔  
مگر اس وقت خود کو آئینے میں کھورتے ہوئے وہ ٹھنڈی سانس بھر رہا تھا۔  
مجھ کو خود اپنے آپ سے شرمندگی ہوئی وہ اس طرح کہ تجھ پہ بھروسہ بلا کا تھا تالی ایک ہاتھ سے کب بچتی ہے۔

وہ شیطان مردود تھا اور رات کے اس پر جشن مناتے ہوئے شیطانی قہقہے لگا رہا تھا۔  
اس کے اسی جیسے مردود منحوس کہہ صورت والے چیلے۔ کسی قدر حیرت میں مبتلا تھے مگر احترام شاگردی کے تحت دل میں اٹھتے ان گنت سوالوں کوئی الوقت پس پشت ڈالے ہوئے قہقہوں میں شریک تھے۔  
ادھر ایک آنکھ کا شیطان ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ اس کی ہنسی تھمنے میں آتی ہی نہ تھی۔ ذرا سا سانس لینے کو توقف کرتا اور پھر سے شروع ہو جاتا۔  
ساری کائنات کے جانداروں سے قوت گویائی چھین لی جائے اور ہر سو کتوں گدھوں الووں گیدڑوں اور کوؤں کو بولنے پر لگا دیا جائے تو کیسا ساں ہو گا۔ ایسا ہی ہو گا جو اس محفل میں تھا۔  
”ہمارا تو یہ خیال تھا کہ تم ان دونوں کے بیچ طلاق کروانا چاہتے ہو مگر۔“ ایک چیلے نے پوچھ لیا۔

”کیونکہ تمہیں نکاح سے نفرت اور طلاق سے محبت ہے۔“ دوسرے نے وجہ بھی بیان کر دی۔  
”اور پھر جو کچھ بھی آج ہوا۔ وہ تو کہیں سے بھی گناہ نہیں تو تم خوش کیوں ہو؟“  
تیسرے کا سوال سب کا ترجمان تھا۔  
”ہا ہا ہا۔“ وہ مزید ہنسا۔  
”ہاں اے شیطان۔ ہم سچ میں تیری خوشی کا سبب نہیں جان سکے۔ تیرے کہنے پر ان دونوں کے ساتھ سائے کی طرح لگے رہے۔ بہت مشکل کام تھا وہ تو بس ہمہ وقت اپنے لکھنے پڑھنے میں مگن رہتے۔ ایک دوسرے کو ہاتھ بھی نہ لگاتے تھے۔“  
”مگر اب لگا چکے ہیں ہا ہا ہا۔“ وہ ایک بار پھر جھومنے لگا تو تمام چیلے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ اپنی خوشی میں مست شیطان مردود جواب دیتا ہی نہ تھا۔  
”تم سب میرے چیلے ہو اور جانتے ہو کہ میں کوئی کام بغیر سبب اور فائدے کے نہیں کرتا۔ میں طویل المعیار منصوبے بناتا ہوں اور صبر سے نتیجے کا انتظار کرتا ہوں۔ ویسے تو صبر مومن کی خوبی ہے۔ ہمارا اس سے کیا کام۔ مگر یہ مزے کی چیز کہ اس کا پھل واقعی میٹھا ہوتا ہے۔ سو تم سب بھی دیکھو کہ کیا ہونے والا ہے اور کیا ہو گا؟“  
”تو کیا اب یہ مشن ختم ہوا یعنی ان دونوں پر ہمارا کام ختم ہو گیا۔“  
”ارے نہیں یہ کس نے کہا؟“ مردود بری طرح چونکا۔ ”ہمارا کام۔ اصل کام تو شروع ہی اب ہوا ہے۔ ہا ہا ہا۔“  
الیس مردود جھوم رہا تھا۔ نجانے تصور کی آنکھ کس چیز کی منظر کشی کر رہی تھی۔ اعوز باللہ من الشیطن الرجیم۔

اب یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ وہ ایک دوسرے سے ملنا ترک کر دیتے یا جہاں بھی اک دو جے کو پاتے تو راہ بدل لیتے۔ لا حول پڑھ لیتے۔

نظریں چرا کر۔ ہچکچا کر۔ وہ ایک بار پھر رو رہے تھے۔  
بھلے سے بیچ میں بہت دن کا وقفہ آگیا تھا۔ سنان ماسٹرز کے بعد اپنے بھائی کے ساتھ آفس۔ جانے لگا تھا اور فقط ایک دو دن کے آرام کے بعد شجرہ اب نئے مشن کی تیاریوں میں لگ گئی تھی۔ اسے مقابلے کا امتحان دینا تھا اور آخری مرحلے تک کی کامیابی حاصل کرنا تھی۔ مکمل کامیابی۔  
اور سنان الیاس ہر مرحلے میں اس کے شانہ بشانہ تھا۔ ہمیشہ سے۔ تو اب کیوں نہ ہوتا۔ وہ اس کی فائزر پکڑ لیتا اور اپنی ہلکا سا جھٹکا کھاتی ٹانگ کے ساتھ اس کے قدم سے قدم ملا کر چلتا۔  
شرمندگی کے احساس کے ساتھ ساتھ شجرہ کو اب اس سے حیا بھی آنے لگی تھی۔ اسے لگنے لگا تھا وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات نہیں کر پاتی ہے۔ ساتھ چلتے چلتے وہ غیر ارادی طور پر ذرا سادھیمما ہو جاتی اور پھر اسے جی بھر کے دیکھ لیتی۔  
کچھ ایسا ہی حال سنان کا تھا۔ وہ اس سے یوں مخاطب ہوتا جیسے کسی غیر سے۔ ضروری سے ضروری بات کرتے ہوئے ہر جگہ دیکھتا بس اس کے چہرے کو نہ دیکھتا اور جیسے ہی وہ اپنے کسی دھیان میں مگن ہوتی۔ وہ کسی شاطر چور کی طرح کامیاب واردات کر لیتا۔ جی بھر کے اسے دیکھتا ایسے جیسے نقش نقش ازبر کر لیتا چاہتا ہو۔ گھول کر لیٹا چاہتا ہو۔  
اس کا دیکھنے کا نظریہ بدل گیا تھا یا وہ ہی کچھ اور ہو گئی تھی۔ نئی سی، انوکھی، اچھوٹی پھر دونوں نے جیسے ایک دن دونوں ہی کی چوری کو پکڑ لیا۔  
”ایسا کون سا غضب ہو گیا آخر۔ کہ تم منہ چھپائے پھرتی ہو؟“  
”تم نہیں۔ ہم۔ ہم دونوں ہی۔“ اس نے ذرا سی نگاہ اٹھائی تھی۔  
وہ ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گیا۔ ”ہاں ہم دونوں ہی۔ مگر شجرہ۔ کوئی سوچا سمجھا ارادہ نہیں تھا بس ایک دم۔ مگر اب کیا بھی کیا جاسکتا ہے؟“  
وہ اسی بات کا تو دھک ہے کہ اب کچھ بھی پلٹایا نہیں



جاسکتا، سیدھے ساٹ ورق کو اگر ایک بار موڑ دیا جائے صدیوں بعد بھی پھر جب اس کتاب کو کھولیں۔ نشان موجود رہتا ہے۔ اس نے جیسے معذرت کے اگلے سارے جملوں۔ تسلی کے پیروں کا راستہ بند کر دیا۔ واقعی کیا وقت لوٹ کر نہیں آسکتا کہ جو کچھ ہو گیا۔ ہو گیا۔

نشان واقعی لا جواب ہو گیا۔

اس نے اپنی نگاہیں اس کے چہرے پر گاڑ دیں اور اس بار شجرہ نے نگاہیں نہیں چرائیں جیسے وہ بھی جواب کی منتظر تھی۔

جو خوف دل میں چھپا ہے، وہ کیسے دور کریں اب اس کے واسطے کیا پھر کوئی قصور کریں؟ شجرہ لڑکھڑاسی گئی۔ اس کی پلکیں یک دم جھک گئیں اور ہونٹ لرز اٹھے پھر جب اسے نظروں کے مسلسل اپنے چہرے پر بھرنے کا احساس ہوا تو نظریں اٹھا کر اسے دیکھنے لگی کہ اس کا لہجہ بہت عجیب سا لگتا تھا اور آواز بھی نئی نئی تھی۔ پہلے تو کبھی نہیں سنا تھا نہ محسوس کیا تھا۔

”جانا بوجھا منصوبہ نہیں تھا شجرہ۔!“ وہ اس کے نزدیک تر ہو گیا۔ ”ورنہ بہت پہلے ہی سب ہو جاتا بس۔“ وہ کیا کہتے ہیں کہ۔۔۔ وہ کچھ سوچنے لگا۔

صبح کی بزم سرشاری تھی، بیگلی رات کا حال نہ پوچھ جبہ، خرقہ، گپڑی، ٹوپی مستی میں انعام ہوئی ”تو اسی بات کے لیے تو روتی ہوں اور نظریں چراتی ہوں۔“ اس نے پہلے کبھی اتنی جلدی شعر نہیں سمجھا تھا وہ رخ پھیر کے گویا ہوئی۔ ”ایسی بھی کیا مستی؟ کہ ہوش ہی کھودیں۔ ایسے کہ کچھ نہ بچے۔“ وہ ایک بار پھر سب یاد آنے پر خود کو نظریں ملانے کے قائل نہ پاتی تھی۔

”کیا کھو دیا یا۔۔۔ کیا نہ بچا؟ سب کچھ وہی تو ہے تم اور میں۔“

”نہیں۔ کچھ بھی نہیں ہے پہلے جیسا۔ مجھے لگتا ہے میں۔ میں خراب ہو چکی ہوں۔ میں۔۔۔“ وہ رونے لگی۔ ”مجھے اپنے آپ سے شرم آتی ہے اور تم

سے تم سے بھی۔۔۔“

”کیسی بے وقوفی ہے میں سمجھ رہا ہوں تمہاری کیفیت مگر اب کم از کم ایسے نام بھی نہ دو۔ بیوی ہو تم میری ایسی بھی کیا بات۔ کوئی مذاق ہے بھلا؟“

”نہیں۔“ وہ گھبرا کر ذرا سی پیچھے سرکی۔ ”لوگ کیا کہیں گے اگر جو کسی کو پتا چل جائے تو۔۔۔ رخصتی سے پہلے۔“

”کم آن شجرہ۔!“ وہ اپنا سر پیٹ لینے سے بدقت رکا تھا۔ ”نکاح کے بعد۔ یہ کیوں بھولتی ہو؟“ وہ اسے پچکارنے لگا۔ دلا سا دینے لگا۔ بے فکری کا درس۔ ہمیشہ کی طرح وہ اسے قائل کر رہا تھا۔

”میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ تمہیں کیا لگتا ہے دھوکا دے کر بھاگ جاؤں گا۔ یا بیوی ہو تم میری۔“ وہ پورے دل سے مسکرایا تھا اور اس کی آنکھیں بھی بولتی تھیں۔ وہ لفظ بیوی کہہ کر سارا قصہ سمیٹ دیتا تھا۔

شجرہ کو دوسری بار یہ لفظ سن کر عجیب سی تسلی کا احساس ہوا اور یہ چیز آنکھوں سے بھی جھلکنے لگی۔ پچکارنے اور دلا سا دینے کا انداز غیر محسوس طریقے سے بدلا ہوا سا تھا۔ وہ جسمانی لحاظ سے ایک دوسرے سے زیادہ قریب تھے وہ جو اک حجاب مائل تھا وہ پردہ تو سرک چکا تھا۔

اس کے چھونے میں استحقاق تھا۔ اس کے محسوسات میں بے دھیانی تھی اور پھر اسی بے دھیانی اور حق کی کوکھ سے ایسے پھتوے دینے والے مزید واقعات کا ظہور کچھ اس طرح ہوا کہ جو ایک پشیمانی کا احساس ہر بل ستا رہا تھا۔ معدوم ہوتے ہوئے ختم ہو گیا۔

ہر بار آئندہ کے لیے تائب ہو جاتے اور نظریں چرائیتے پھر کچھ روز بعد سب نارمل آجھے ذی ہوش شریف سلجھے ہوئے عاقل و بالغ انسان تھے۔ عمل زندگی کے سارے عوامل و شرائط کی خبر رکھتے تھے سیدھا راستہ اپنا لیتے۔ کوئی رکاوٹ تو نہیں تھی۔ ایک بار اس پہلو پر سوچتے تو شادی کیا دنیا کے کام کرنے

سے منع کرتی ہے۔ شادی ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھنے کا نام تو نہیں کہ شادی کے بعد کچھ کرنے سکیں گے کرنے والے سب کرتے ہیں۔

مگر نہیں۔ شان کو ابھی بزنس میں سیٹ ہونا تھا وہ گھر کا چھوٹا بچہ بن کر سالوں عیش کر چکا تھا، مگر اب چھوٹا بچہ رہا نہیں تھا۔

ادھر شجرہ دن رات دنیا بھلائے بڑھتی۔ اسے کسی چیز کا ہوش نہ تھا۔ صرف بڑھائی، امتحان باقی سب بعد کی باتیں ہیں (پہلے ہو بھی چکی تھیں۔)

لیکن اس قطعیت کے بیچ جب وہ دونوں ملتے تھے۔ نجانے کیسے ”حد“ کئی بار حد سے آگے بڑھ گئی۔

اتنی کہ احساس بھی جاتا رہا۔

\*\*\*

امتحان ہر بار اس کی جان پر عذاب بن کر ٹوٹتے تھے، مگر اس بار کا امتحان تو جیسے ساری توانائی نچوڑ رہا تھا۔ اس کے پاس غلطی کی گنجائش نہیں تھی اس نے بہت آگے کی منصوبہ بندی کر رکھی تھی۔ اسٹیپ بائے اسٹیپ۔

کمرے میں بڑھتی میٹھی پر بیٹھ کر پڑھتی۔ چھت پر ٹل کر۔ اخبار لگوار کئے تھے۔ محسنہ خوش ہو تیں چلو تھوڑا سا تو دلیکشین۔۔۔ بعد میں پتا چلا وہ بھی امتحان کی تیاری کا ایک حصہ ہے۔

محسنہ کو اب اس کی محنت کا خیال تھا۔ وہ اس کے کھانے پینے کا خود سے خیال رکھنے لگی تھیں۔ پوری ٹرے سجا کر مینوں ٹائم لے جاتیں۔ الگ سے دودھ بھی لگایا، مگر ان سب باتوں کے باوجود وہ دن بدن لاغر ہوتی جا رہی تھی۔ اس کا چہرہ اترا اترا سا رہتا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ ترین حلقے رت جگمگے کی علامت تھے (وہ رات گئے تک کچھ نہ کچھ لکھتی پڑھتی تھی)

کتاب منہ پر ڈال کر دل میں پڑھتی۔ کبھی بچوں کی طرح کچھ اونچے جملے بولتے، پھر مدہم ہو جاتی پھر غافل۔ مگر غفلت تھوڑی دیر کی ہوتی۔ جھر جھری

لے کر بیدار ہوتی پھر بڑھنے لگتی۔ محسنہ دودھ پینے پر زور دیتیں وہ کالا کرنا تو وہی کر نیند بھگاتی۔

”نیند کو بھگاتی ہوں امی۔ پتا نہیں کیا بات ہے۔ کتاب کھولتے ہی جمائیاں آنے لگتی ہیں، میرا تو جبراً دکھ گیا۔“

”تو ضرورت کیا ہے امتحان کو اتنا سرر سوار کرنے کی۔ ابھی تو بہت دن پڑے ہیں ہو جائے گی تیاری۔“

ہا بھابھی سلی دیتیں۔ سب مائیڈا“ سر ہلاتے۔ ”جان ہوگی تو جہان ہوگا“ میں تو کہتی ہوں اسے ڈاکٹر کو دکھا دیں۔ رات بھر کتابیں پڑھتی ہے۔ نیند پوری ہوتی نہیں۔ دن میں جمائیاں۔ بھلے سے بڑھے لکھے نہیں ہیں، مگر یہ تو معلوم ہے نا پڑھنے کا بھی طریقہ ہوتا ہے۔“ مائی نے بھی کہا۔

سب نے مائیڈی۔ محسنہ کے خیال کو بھی راہ ملی۔ حیرت انگیز طور پر وہ بھی ڈاکٹر کے پاس جانے کو تیار ہو گئی کہ خود بھی اپنی کیفیت سے عاجز آئی پڑی تھی۔ خواہ مخواہ میں بیماری طول پکڑ لیتی اور امتحانوں کی راہ میں حائل ہو جاتی۔

\*\*\*

فضائیں تیرتی ہے  
دیر تک یہ گرد کی صورت  
محبت درد کی صورت  
محبت خواب کی صورت  
نگاہوں میں اترتی ہے کسی مہتاب کی صورت  
ستارے آرزو کے۔

\*\*\*

وہ جو اسے اپنا آب دھتکارا ہوا سا لگتا تھا، ذہن اور سوچ اتنی پختہ نہیں تھی کہ اپنی الجھنوں اور سوالوں کو ترتیب سے بٹھاتا اور ایک ایک شکل گھر کر فیصلہ صادر کرتا، نتیجے پر پہنچ جاتا کہ ہاں وہ جو کچھ سوچتا ہے یا جن چیزوں کا اسے یونہی گمان ہوتا ہے وہ دراصل درحقیقت یوں ہیں یوں تھیں۔



اسے لگتا اس سے محبت تو کی جاتی ہے مگر ایسی محبت جو عیاں نہ ہو جائے کسی کو اس محبت کی خبر نہ ہو جائے۔ بس محبت ہے دل کے نمل خانوں میں۔ اظہار کی کیا ضرورت۔

اپنے اچھے ہوئے خیالوں اور سوالوں کو سلجھانے کے لیے وہ تو بس "حال" پر نظر رکھتا تھا یا ماضی کہ تب اور جب اور کب۔ بس اس کے بعد ذہن کی سلیٹ خالی ہو جاتی تھی۔

دس برس کی عمر میں اسے لگتا تھا اسے نظر انداز کیا جاتا ہے۔ بوجھ سمجھا جاتا ہے اس کے پاس ثبوت اور گواہ نہیں تھے فقط گمان اور قیاس۔

اور سچ یہ تھا کہ وہ واقعی انجان تھا مگر اسے دھتکارا گیا تھا نا جب وہ پانچ برس کا تھا اور جب وہ پیدا ہوا تھا اور جب وہ پیدا ہو رہا تھا اور اس کی ماں کا بس نہ چلتا تھا کہ اسے کوچ کر خود سے دور کر دے۔

دھتکارنے "دامن" جھٹکنے کا عمل تو اس وقت ہی شروع ہو گیا تھا جب اس کی ماں کو اس کے اپنے وجود میں سانس لینے کا سہلا احساس ہوا تھا۔

ماں ہی کیوں۔ گرد پیش کے سب لوگ جو اس کے متوقع رشتے تھے وہ دنیا میں آجاتا تو سب سے اس کا کوئی نہ کوئی رشتہ ہوتا۔ خوب صورت رشتے مگر وہ سب حیرت سے اس کی ماں کے چہرے کو دیکھ رہے تھے۔

"مجھے نہیں چاہیے سن۔ یہ۔ یہ کیا ہو گیا۔" وہ چل چل کر رو رہی تھی۔ بے قراری سے پوچھ رہی تھی۔ "سب پوچھ رہے ہیں اس کا باپ کون ہے؟" اس کی آواز بھی گھٹ کر نکلتی تھی۔

سنان کے سر پر ڈنڈا برس۔

"تو؟ کون کا کیا مطلب۔ میں ہوں میرے علاوہ کون ہو گا۔"

"آف؟" شجرۃ الدر کے ارد گرد جلتے شکوک کے بھانبروں پر پانی پڑ گیا۔ مایوں نے پوچھا تھا "بچے کا باپ کون ہے؟" وہ کمر مگر نہ دیکھتی تھی۔ مگر منہ سے نکل

گیا۔

"من۔ سن۔" اور مایوں کے منہ پر ہاتھ پڑا اور محسن کے دل پر۔

یہ کیسی کمائی تھی۔ وہ بیٹی سے کیا باز پرس کریں اسے بے عزت کریں۔ ذلیل و خوار کو سیں مگر کیا کہہ کر کو سیں کہ اس نے عزت کا جناح نکال دیا اور موٹی کو ذرا لاج نہ آئی منہ کالا کر کے آئے مگر جملے زبان کی لوک پر آکر رک جاتے۔

منہ کالا تو نہیں کیا تھا اور لاج کس چیز کی وہ بیوی تھی اس کی مگر عزت کا جناح بے حال تیار کھڑا تھا۔ کندھوں پر سواری۔ راستے۔ گلیاں چوک۔ چوراہے۔ گتے ہی کندھے بدل جاتے۔ دفن کرنے کے مرحلے تک۔

اور شجرۃ الدر کا دماغ سن تھا۔ سب ہی نے ہزار باتیں کیں مگر مای کا ایک جملہ دماغ میں جا کر اٹک گیا تھا۔

"سنان کا ہے؟ یہ تو اس نے کہہ دیا۔ وہ بھی مانے گا نا۔ یا پھر۔؟"

اور یہ تو فقط شجرۃ جانتی تھی کہ وہ سنان ہی کا بچہ تھا۔ سنان اور شجرۃ کا۔

محسن منہ پر کپڑا رکھ کے بے آواز روئی تھیں اور دکھ یہ بھی تھا کہ کوئے نے روئے اور بین ڈالنے کے لیے کوئی جملہ موزوں نہ لگتا تھا۔

وہ کن الفاظ میں بیٹی کو تاریں کہ کیا کر بیٹھی ہے۔ ڈاکٹر پرانی جاننے والی تھیں۔ مایاں تک ان کے پاس جلیا کرتی تھیں۔

"نکاح کا تو مجھے پتا تھا، رخصتی میں بلایا نہیں محسن۔ ماشاء اللہ اتنی قابل بچی ہے تمہاری۔ ماں باپ ذہین و محنتی ہوں تو بچہ تو خود بخود قابل پیدا ہو گا نا۔"

"رخصتی اور بچہ۔؟" محسنہ ٹکر ٹکر ڈاکٹر کو دیکھ رہی تھیں۔

"چھی طرح کھایا پیا کرو اور یہ تمہاری امی کیا کہہ رہی ہیں امتحان کی ٹینشن اب کون سا امتحان ہوئے رہی

ہو۔"

"سی ایس ایس۔" اس کے ہونٹوں سے پھسلا۔ "مجھے یقین ہے تم اس میں بھی کامیاب ہو گی مگر پھر بچہ بعد میں کرنا تھا نا۔" ڈاکٹر بی بیلیٹ کو اس کے بازو سے کھول رہی تھی۔ "ہاں مگر یہ بھی ملے ہے کہ جس روح نے جب دنیا میں آنا ہو۔" وہ محسنہ سے شجرۃ سے اور کیا سے مخاطب تھیں۔ آیا جو محلے دار تھی اور اسپتال کے بعد کیس بھی کر سکتی تھی اس وقت سب سے زیادہ منہ اس کا کھلا تھا۔ (رخصتی تو ہوئی ہی نہیں تھی ابھی اور رخصتی ضروری تھی)

چھپنے والی بات ہی نہیں تھی اور کاش چھپانا آسان ہوتا۔

سنان نے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی تھی۔ نہیں۔ دونوں ہی نے۔

"تنی بے مبری تھی تو اس کے گھر جا کر ہی مرنی نا؟" من مایاں کرنے کا تو پہلے دن سے شوق ہے۔ اپنے منہ سے پھوٹ دیتی۔ "آفاق نے آسمان سربراٹھ لیا تھا۔ وہ کیا کچھ بک رہے تھے۔ اس کا انہیں اور اک بھی نہیں تھا۔"

"بلاؤ اس خبیث کو۔" گھسی پڑی رہتی تھی ساتھ آ رہے ہیں۔ ساتھ جارہے ہیں کھارہے ہیں رنگ تو چڑھنا تھا ہی۔ اس سے کوئے کر جائے اپنے گناہ کی پوٹ کو۔ میرے گھر میں یہ بے شرمی کا شیج نہیں ہے گا۔ کیا کہوں گا دنیا سے کنواری بہن کا بچہ مایوں بول رہا ہے۔ آخ تھو۔"

"کنواری تو نہیں تھی۔ نکاح کیا تھا۔ گناہ تو نہ کہو۔" محسنہ بلبلاتی ہیں۔

"تو منہ چھپا کر رو کیوں رہی ہیں۔ خلوائی بٹھالیں دروازے کے باہر۔ نانی بننے والی ہیں خیر۔" آفاق کے دانتوں کی کچکا پھاٹ سب کو محسوس ہو رہی تھی۔ محسنہ کے رونے میں اور شدت آگئی۔ یہ بھی نہیں کر سکتی تھیں۔

"ہر فن مولا تارے توڑتی بیٹی کے کہے پر آنکھ بند کر کے یقین کر لیا ہے۔ پکا پتا لے لیں۔ اس کا بچہ ہے

نا۔ کل کو آکر وہ بھی انکار کر جائے کہ میں تو جانتا ہی نہیں۔" شجرۃ کوئے میں گئی بیٹھی تھی۔ تڑپ کر رہ گئی۔

"آفاق! زبان سنبھال کر۔" بڑے ماموں کی پیشانی عرق عرق ہو گئی۔

"شجرۃ غلطی کر سکتی ہے۔ گناہ نہیں۔" ان کے جملے میں شجرۃ کے لیے گواہی تھی۔ اس کی آنکھیں جھمر جھمر بنے لگیں۔

سنان نے آفاق بھائی کے زوردار دھکے سے بمشکل گرنے سے خود کو روکا تھا۔

"شجرۃ کا کوئی قصور نہیں۔ میری ہی غلطی تھی۔" شرمندگی نے اس کے چہرے کو تپا دیا تھا۔ دھواں دھواں آنکھیں۔ "میں ہر سزا کے لیے تیار ہوں۔"

"اور کوئی سزاؤں نہیں۔ اٹھاؤ پوریا بستر اور نکلوا دھر سے۔ ابھی اور اسی وقت۔ دوبارہ شکل بھی نہ دکھانا۔"

"میں کل۔ کل امی کو لے کر آؤں گا۔" "کیوں۔ باجوں گاہوں کے ساتھ بارات لانی ہے۔ اب بھی ارمان باقی ہیں۔ بہت خوب!"

"آفاق۔!" بڑے ماموں کا چہرہ نفرت سے لرز گیا۔ ان کے بیٹے کے جملے۔

"کئی لوگوں نے کہا تھا اتنی قابل لڑکی کے لیے یہ لتناڑی رہ گیا تھا۔ ایک سے ایک شلن دار مرد مل جاتے۔ کہیں تم نے بھی تو نہیں سن لیا تھا یہ اعتراض۔" تمام حاضرین چونکے تھے۔ سرائے تھے پھر نظریں جھکی تھیں۔

"اوہ۔!" بہت خراب حالوں میں بیٹھی شجرۃ نے پل بھر میں آفاق بھائی کا سارا اندر پڑھ لیا۔

غیرت و عزت کے احساس سے بڑھ کر حسد ابھرا بھر کروار کرتا تھا اور وہ وار کو ان دونوں کی جانب پلٹاتے تھے مگر ایک پل سکون نہ ملتا تھا۔

"بہر حال امی کو لایا ابو کو۔ یہاں کوئی نہیں ہو گا، پھولوں کے ہار لے کر استقبال کے لیے۔ چھپی کامنہ نہ ہوتا تو جوتوں کا ہار ڈال کر من روڈ تک لے کر جاتا۔



اب بات کچھ یوں ہے کہ یہ بیٹھی ہے سامنے ہاتھ پکڑو اور نکل لوں یہاں (پیدل پیدل)۔ اتفاق نے چنکی بجاکر شجرہ کو متوجہ کیا اور دروازہ دکھایا۔

”اتفاق!“ چھوٹے ماموں نے سر ہاتھوں پر گر لیا۔ اچھے جملے اور برے جملے ان کے پاس بھی تھے مگر کوئی بھی نوک زبان پر آتا نہ تھا۔ قوت گویائی سلب ہو گئی تھی جیسے۔

”اور تم اپنی ماں کو لاؤ اور۔“ وہ بات ادھوری چھوڑ کر سنان کی صورت دیکھنے لگے۔ ”کیا کہہ کر لاؤ گے۔ وہ آجائیں گی نا۔ بہت بیمار ہیں نا وہ۔“ (سنان کی امی مکمل طور پر بیڈ پر تھیں۔ ایک نرس رکھ کر دی گئی تھی)

”لے آؤں گا۔ وہیل چیئر پر موڈ کر لیتی ہیں اور سچ کہہ کر لاؤں گا۔“ اس نے جھکا سر اٹھا کر بہت اعتماد سے کہا تھا اور لفظ ”سچ“ کہتے ہوئے سب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالی تھیں۔

”کیا رکھتی لو گے؟“ چھوٹی ماں نے پہلی بار لب کھولے۔

سنان اثبات میں سر ہلانے والا تھا۔ لیکن محسنہ کے جملے نے سر کو جھکا دیا۔

”شادی کے پانچ ماہ بعد بچہ تھوڑی پید ہوتا ہے۔“ تو کیا اب یہ ہمارا مسئلہ ہے۔ اس گھر سے نکالیں اس کو۔ بچہ کل پیدا کرے یا چار سال بعد۔ میں اس بدنامی کو پوٹ کو یہاں برداشت نہیں کروں گا۔“

اتفاق کے جملوں سے زیادہ لہجہ خطرناک اور ارادے ہولناک تھے۔ ماتھے کی پھڑکتی رگ۔ جھنجھی مٹھیاں۔ پھولتے پھکتے نتھنے۔ مجلس برخواست۔ اتفاق گھر سے باہر نکل گئے تھے۔

محسنہ سر پر ہاتھ رکھ کے آواز دبا دیا کے رونے لگیں۔ موت کا سانسنا ہر سو چھا گیا تھا۔ ہا ہا بھی حسرت آمیز نگاہوں سے شجرہ کو دیکھتی تھیں۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بے آواز گر رہے تھے۔ بڑی ماں نے نگاہوں کا مفہوم پڑھا تو۔ سرد آہ بھر کے رہ گئیں۔ واہ اللہ تیرے رنگ۔

سنان آنگن میں اکیلا کھڑا رہ گیا تھا۔ وہ شجرہ سے بات کرنا چاہتا تھا۔ کوئی تسلی یا کنفی یا کچھ بھی۔ مگر وہ گھر سے باہر نکلا تو شام اندھیرے کی بکلی میں منہ چھپانے والی تھی۔ اس کا چہرہ تفکر کے جال میں چھپا پڑا تھا۔

سنان کو بتا نہیں چلا۔ اس کے نکلنے کے کتنے لوگ منتظر تھے۔ کتنی کھڑکیاں اور دروازے پینا ہو گئے تھے۔ اچک اچک کر اسے دیکھتے تھے اشارے کرتے تھے۔ وہ تو چلا گیا۔ اب پیچھے اتنا چٹ پٹا مزے دار انوکھا قصہ زبان زد عام تھا۔

\*\*\*

”مجھے شادی نہیں کرنی سنان۔ میرے پیارے سنان!“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ ”بس مجھے اس سے چھٹکارا دلوا دو کسی بھی طرح۔ میں یہ سب انورڈ نہیں کر سکتی۔“

نفی میں سر ہلاتے ہلاتے وہ اچانک جنونی سی ہو گئی اور اپنا دامن یوں جھٹکنے لگی۔ جیسے کوئی کیرا پتنگا جھاڑنا ہو۔

”اے۔ اے۔ اے کو شجرہ قاتل ہو گئی ہو۔ آرام سے۔“ محل سے۔ ”وہ اسے باز رکھنے لگا مگر عجیب بات تھی۔ چھوٹے سے ڈر رہا تھا۔“

”تمہارے خیال میں شادی تمہارے راستوں میں حائل ہوگی۔ میں تمہاری راہ میں حائل ہوں گا؟“ اس کے سوال میں ارادہ بھی چھپا ہوا تھا۔ وہ اس کی آنکھوں میں بغور جھانک رہا تھا۔ شجرہ کی آنکھیں نہیں کہتے ہوئے جھک گئیں وہ رو رو کر سوچتی ہوئی تھیں۔

”لیکن اس نے۔ اس نے تو میرا تماشا بنا دیا۔ سب مجھے دیکھ رہے ہیں۔ ساری دنیا میری بات کر رہی ہے۔ لوگوں کے پاس اب اور کوئی موضوع ہی نہیں۔ سامیاں کہہ رہی ہیں۔ میری اس حرکت نے انہیں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔ ایک عالم مجھ پر ٹھوٹھو کر رہا ہے۔“

اتفاق بھائی اسے گناہ کہہ رہے ہیں۔ یہ گناہ ہے

”سنان؟“

”کوئی نہیں۔ بالکل نہیں۔“ سنان ضبط کی انتہاؤں پر تھا۔ ”تم منفی باتیں مت سوچو شجرہ! بالکل غلط کہتے ہیں وہ۔ یہ کہاں سے گناہ ہو گیا۔ بس۔“ اسے اگلا جملہ نہ سوچا۔ ”یہ تو محبت ہے وہ جو ہم دونوں کو ایک دوسرے سے بہت ساری۔“

”یہ محبت ہے؟“ وہ چلانے سے بمشکل باز رہی۔

”تی ذلت میری۔ محبت۔“

محبت ایسی ہوتی ہے۔ ”وہ کر لائی۔ سنان کے لب بھینچ گئے۔“ میں دنیا کی باتیں نہیں سن سکتی سنان۔“

وہ ایک بار پھر رونے لگی۔ سنان کچھ نہ کہہ سکا۔ دنیا اور دنیا کی باتیں۔

آدی کتنا ہی اچھا ہو فرشتہ تو نہیں پہلا پتھر مارنے کو دل بھی پتھر چاہیے

\*\*\*

سنان کی امی ماؤں کی اس قسم سے تعلق رکھتی تھیں جو بہوؤں اور بیٹیوں دونوں بس ایک ہی مطالبہ کرتی تھیں کہ بچے جو جی چاہے کرتے رہیں۔ تنہا تنہا کرویں۔ بگاڑ دیں یا اجاڑ دیں انہیں تیزھی آنکھ سے بھی نہ دیکھا جائے۔ کچھ کہنا سنا تو خیال سے بھی دور کسی کے بھی حمل کی خبر سن کر ایسا شاہی پروٹوکول دیتیں کہ ماں سوچتی زندگی بھر ڈیوری نہ ہو۔

ماں کے پاس مسئلہ لے جانے سے پہلے سنان نے بہت سے جملے ترتیب دیے۔ شجرہ کے گھر والوں نے رخصتی کی ڈیمانڈ کر دی تھی۔ ماں کو کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ وہ بستر پر پڑی تھیں اور چاہتی تھیں کہ رخصتی کروائی جائے سنان ہی نے شجرہ الدرد کے امتحان کا کہہ کر روک رکھا تھا۔ وہ ماں کو لاعلم رکھ کر شادی کا اقرار نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اپنے گھر کی اس آخری شادی کو بہت دھوم دھام سے کرنے کا ارادہ رکھتی تھیں سب خاندان کی موجودگی میں۔

اتنا تو اسے اندازہ ہو چکا تھا۔ ماں کے آگے حرف بہ حرف سچ کہنا ہو گا۔ یہ فیصلہ کر کے دل مطمئن ہو گیا

تھا۔ مگر اسے یقین تھا ماں کے مزاج کے پیش نظر بچے ہی کا ذکر انہیں قابل کرے گا۔ کہ انہیں اپنی نسل بہت پاری تھی۔ مگر۔

وہ تیلے پھٹی آنکھوں اور کھلے ہونٹوں سے اسے دیکھتی رہیں۔ کیا وہ وہی کچھ سمجھ رہی تھیں جو وہ کہہ رہا تھا۔ پھر جیسے ان کے اندر حیوانی طاقت آگئی تھی۔ وہ اپنے گال پیٹ رہی تھیں اور سر پر زور زور سے ہاتھ مارتی تھیں۔ توبہ توبہ کرتی تھیں اور سردائیں باتیں پختی تھیں۔

”سچ خاندان۔ بد کردار ایسی اندھیر عیادی۔ بے شرم، بے حیا میں تو اسے بہت شریف سمجھتی تھی۔“

”ماں!“ اس نے بے ساختہ سراٹھا کر احتجاج کیا۔ ”وہ اکیلی قصور وار نہیں ہے ماں۔ میں بھی تو۔“

”ارے ہٹاؤ۔“ ماں نے حقارت سے ہاتھ چلایا۔ ”کس نے کہہ دیا عورت اتنی آسانی سے ہاتھ آجانے والی چیز ہے۔ اور رہے تم۔“ ان کے لہجے میں بیٹے کے لیے بھی حقارت، نفرت اور مایوسی آگئی۔

”مرد تو زندگی بھر جال ڈالتے ہی رہتے ہیں۔ اس کی عقل کیا گھاس چرنے لگی تھی۔“

”ہو گیا ناں امی۔ جو کچھ ہونا تھا۔ آپ ایسے الفاظ استعمال کریں گی۔ تو میں باقی دنیا سے کیا امید رکھوں۔ میں تو سمجھتا تھا کہ آپ میری غلطی کو ڈھانپ لیں گی۔“

وہ یکدم کسی چھوٹے بچے کی طرح شکوہ کنناں ہو گیا۔ زندگی میں بھی اسے کسی نے سخت نہ کہا تھا۔ اور آج اپنی سگی ماں نے مانو برہنہ کر دیا اور کوڑے مارے۔

”غلطی ڈھانپ لوں گی۔“ اپنی سانسیں بحال کرتی امی کو جیسے کرنٹ لگا چمک کر بولیں۔

”تم بڑوسیوں کا شیشہ توڑ کر آئے ہو۔؟ کہ نیا لگوادوں انہیں یا مگر جاؤں کہ میرا بیٹا تو ایسا کر ہی نہیں سکتا۔“

سنان الیاس لا جواب ہو گیا۔

”کیا جواب دوں گی میں دنیا کو۔ کون سی آفت آگئی مجھ پر۔“ وہ خود کلامی کر رہی تھیں اور تیز مگر کپکپاتے



ہاتھوں سے کبھی سائیڈ بورڈ پر اور کبھی ٹکیے اٹھا کر کچھ ڈھونڈ رہی تھیں۔ گولی یا انہیلو۔

گولی ہاتھ پر رکھ کے وہ پانی لینا چاہتی تھیں۔ سنان سرعت سے گلاس کی طرف بڑھا۔ تو انہوں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ وہ خود پانی پی سکتی ہیں۔

سنان شکست خوردہ سائیڈ گیا۔ وہ خود میں سنا سنا جا رہا تھا۔

”ہم کہہ دیں گے کہ آپ کی ناسازی طبع کے باعث رخصتی جلد کر لی۔“ بہت دیر بعد سنان کی جھجکی آواز ابھری۔

ای بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر آنکھیں موندے خود کو بحال کرنے کی تک وہ دو میں تھیں۔ بری طرح چونکیں پھر چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ آگئی۔

”بہت خوب اور بہترین حل آپ کے اپنے دماغ کی تجویز تو لگتا نہیں۔ کسی اور ہی نے دماغ لڑایا ہے۔“ وہ محسنہ آئی اور اورامیاں۔

”ہاں ہاں۔ وہی دے سکتی ہیں ایسے پلان۔ مگر یہ تو بتاؤ تخت جگر۔ دنیا کو یہ کیسے بتاؤں گی۔ موت نے اتنی حسرت پیدا کر دی کہ پوتا بھی پانچ ماہ بعد بلو الیا اللہ کے

ہاں سے کہ اپنے جیتے جی بیٹے کا گھر بستا دیکھنے کا ارمان تھا اور پوتے کا منہ بھی دیکھنے کی طلب تھی۔ سوا تین جلدی مچائی کہ شادی کے پانچویں مہینے وادی بھی بن گئی تھی

واہ۔ میں تو ولی ہو گئی۔ مرتے وقت کوئی حسرت حسرت نہ رہی۔ سارے ارمان ہی پورے کر دیے۔ مثالیں دیں گے لوگ میری۔ واہ۔ خوف خدا نہ ہوا اور تم برابر کے شریک کار نہ ہوتے اور ہوتی میں کوئی ذلیل عورت

تو کاغذ منہ پر مار کر ہاتھ جھاڑ کے آئی۔ کیسی شادی کہاں کی رخصتی۔

”اماں کون کے گا دنیا کو کوئی تکلیف ہے؟ میں جانتا ہوں میرا بچہ ہے۔“

”ارے دنیا ہی کے تو سارے مسئلے ہیں۔ دنیا ہی کی فکر میں تو گھل رہے ہو جو رخصتی کی کہانی ڈالنے آگئے۔ دنیا کو کچھ نہیں سمجھتے۔ دنیا ہی تو سب کچھ ہوتی ہے۔ ہائے! وہ گردن تکیے پر ڈال کر جیسے تازہ دم ہو کر

ہائے ہائے کرنے لگیں۔

\*\*\*

شجرہ نے رو رو کر کہا تھا۔ اسے اس مصیبت سے چھٹکارا چاہیے۔ کسی بھی قیمت پر۔ تب اس نے مصیبت کو محبت بتا کر اسے شانت کیا تھا۔

محبت کی نشانی۔ محبت کی مجسم صورت۔ تحفہ۔ عطیہ۔ محبت عزت کے ساتھ ملی تھی۔ پھر صورت بدل کر ذلت کیسے بن گئی۔

یہ اک شکست جو ہم کو ہوئی محبت میں زمانے بھر کی فتوحات سے زیادہ ہے

ہر مقام پر فلاح کامیابی کا جھنڈا گاڑ کے سینہ تن کر جانے والی شجرہ الدرد نے ہر شے کو اپنی مرضی کے مطابق گر لیتا ہوش سنبھالنے سے پہلے سیکھ لیا تھا۔ نفی۔ یا ہار کا صفحہ اس کی زندگی کی کتاب کا حصہ تھانی نہیں۔

لیکن اب کی بار۔ وہ سب ہو گیا۔ جو قطعاً نہیں ہونا چاہیے تھا۔ یا پھر اس کا نتیجہ اس طرح سامنے نہ آتا۔ سیدھی۔ ہموار۔ رواں زندگی کے اندر اتنی بڑی غلطی۔

سیدھی زندگی کی رنگینی سے پیدا ہونے والی جینینی۔ جس کے ارتکاب کے بعد ”احساس“ تک پیدا نہ ہوا۔

لکس میں ہوس نہیں تھی۔ محبت تھی۔ محبت طلب میں بدل گئی۔ غلطی پر شرمندگی تھی۔ رونا دھونا۔ پچھتاوا۔ دوبارہ نہ کرنے کا عہد۔ اور ایک دوسرے کو تسلیاں۔ محض تسلیاں۔

تو کیا ہوا۔ کوئی بات نہیں۔ ہمارا انکسار ہو چکا ہے۔ کون سا گناہ ہو گیا؟

لیکن وہ باتیں جو شجرۃ الدرد سن رہی تھی۔ وہ کانوں میں پکھلا سیسے تھیں۔

اور جو سنان الیاس۔ مسز الیاس کے منہ سے سن کر آیا تھا۔ دھیما بولتی حلیم الطبع منڈب نیا نکلا بولنے والی

ماں کے جملے اور انداز۔

انہوں نے اس سے نجات کا راستہ تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔

محبت نارمل پانی کی طرح ہوتی ہے۔ سخت خول میں ڈھکا چھپا۔ چلو بھر محفوظ پانی۔ سخت خول دراصل ”عزت“ ہوتا ہے۔

محبت عزت کے سخت خول سے جدا ہو جائے تو ایسے ہی خوار ہوتی ہے۔ جیسے چھلکا ہٹانے میں بے احتیاطی کریں تو نارمل پانی پیروں میں جا کر تباہ ہے۔

اور ان دونوں کی محبت پیروں میں گری پڑی تھی۔ پیروں سے زمین پہنچ چکی تھی۔

ڈاکٹر نے صاف قطعی الفاظ میں انکار کرتے ہوئے ایک لمبا پرچہ دو ایوں کا لکھ دیا۔ زبانی ہدایت نامہ اس کے علاوہ تھا۔

”ہم دو سرے ڈاکٹر کی پاس چلتے ہیں۔“ شجرہ ڈاکٹر بوڑھی اور مذہبی۔ ہاتھ میں تسبیح تھی۔ وہ آدھی بات سن کر ہی ہتھ سے اکھڑ گئی۔

”تم لوگ پاگل تو نہیں ہو۔ خدا کا شکر ادا کرو وہ صاحب اولاد کر رہا ہے۔ عبرت پکڑو ان لوگوں سے جو ترستے ہیں۔ قبروں پر بیٹھ کر چلے کاٹتے ہیں۔ اپنی گود سنوارنے کے لیے دوسروں کی کوکھ تک اجاڑ دیتے ہیں

اور تم بچہ ضائع کروانے آگئیں، وہ بھی میرے پاس۔ میں نے کیا اس لیے پڑھا تھا کہ ڈاکٹر بن کر بچے ضائع کرواؤں گی ہاں۔“

یہ ڈاکٹر کی تقریر کا ابتدا یہ تھا۔ تقریر کے ساڑھے تین سو صفحات ابھی باقی تھے اور جنہیں وہ سنالیتا چاہتی تھی۔ سنان نے سانس کے وقفے کا فائدہ اٹھایا۔ ڈاکٹر بولنے کا موقع دیتی ہی نہ تھی۔

”میں سمجھ سکتا ہوں ڈاکٹر! آئی ایم سوری کہ ہم نے آپ کو ہرٹ کیا۔ دراصل میری مسز کے پیپر ز ہو رہے ہیں۔ ہمیں پتا ہی نہ چلا بے بی کالہ یہ شدید اسٹریس میں آگئی ہے۔ سو۔“ اس نے قصداً ”جملہ اوروں پر چھوڑ دیا۔ شجرہ الدرد یوں چپ تھی جیسے منہ میں زبان نہ ہو۔

ہر جگہ سنان ہی بولا تھا۔

”لوہ ویری گڈ۔! اس نے شجرہ کے متے چہرے کو دیکھا۔“

”کس چیز کا ایگزام ہے۔“ ”کسی ایس ایس۔ سنان بولا۔“ ”لوہ کریٹ۔ کب ہیں پیپر ز۔؟“ ڈاکٹر کی آنکھوں سے ستائش جھلکنے لگی۔

”تو دن بعد۔“ شجرہ کے لب سے جیسے سسکی نکلی۔ ”تو پھر ریشانی کی کیا بات۔ آخر یہ نئے زمانے کی لڑکیاں پر پگھنسی کو بیماری کیوں سمجھ لیتی ہیں۔ اس

نیچل پر اسس، مگر عورتیں اس حالت میں بستروں میں پڑ جائیں تو کیا ہو گا۔ اللہ نے دنیا کام کرنے کے لیے بنائی ہے تاکہ آرام کرنے کے لیے۔“ ڈاکٹر ڈپٹ کر کہہ رہی تھی۔

”میں خود اپنے لاسٹ منتہ میں ایک ایک دن میں چھ چھ سیزرین کرتی تھی اور میرے اپنے چھ ہی بچے ہیں۔ اور میں اسی طرح جاب پر آئی تھی اور اپنا ایس جی کروالیتی تھی۔ مگر آہ یہ آج کل کی لڑکیاں۔“

ڈاکٹر نے پرچا لکھنا شروع کیا۔ اتنا بڑا نسخہ کہ پرچے کی دوسری جانب بھی لکھنا پڑا۔

”دوائیاں برابر استعمال کرو۔ دودھ اور پھل زیادہ۔ اور اب مزید کسی ڈاکٹر کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔ میں نے یہ یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے یہ بچہ ضائع نہیں ہو سکتا۔ ماں کی جان کو سخت خطرہ۔ نہیں ایگزام پاس کرنا ہے کہ نہیں لڑکی۔!“

”اب ہم کہاں جا رہے ہیں؟“ ”کیس نہیں۔ میں یہ دوائیاں خرید لوں ذرا۔“ سنان نے نظریں چر کر کہا تھا۔

وہ جہاں کی تھیں وہ گئی۔

\*\*\*

شجرہ الدرد نے مقابلے کے امتحان کو سب سے بڑا اور مشکل امتحان کہا تھا۔ اور وہ سردھڑکی بازی لگا کر اس میں انت تک کی کامیابیاں چاہتی تھی۔ مگر اسے یہ



نہیں پتا تھا کہ وہ اس سے بھی بڑے امتحان میں پڑ جائے گی۔

مقابلے کے امتحان میں آنے والے ممکنہ اور غیر ممکنہ تمام سوال اس نے جیسے پانی کی طرح گھول کر پی لیے تھے۔

مگر یہ کیسے سوال تھے۔ جو دنیا اس سے پوچھ رہی تھی اور پوچھ لینا چاہتی تھی۔ یہ کیسا امتحان تھا جس کی تیاری کا اسے خیال تک نہ رہا۔ وہ اپنی ساری ذہانت اور خود اعتمادی بروئے کار لا کر بھی ایک حد تک جواب نہ کہہ پاتی۔

اسے دو ٹوک جواب دینا آتے تھے۔ اس کی شخصیت میں بہت نوعمری میں ہی ایک ایسا رعب پنپ گیا تھا جو مقابل کو ٹھکنے پر مجبور کر دیتا تھا مگر وہ کچھ نہ کہہ پاتی۔

دونوں ماموں اور بڑی مائی اور محسنہ مسز الیاس کے پاس گئے تھے۔ مگر مسز الیاس جو اس روز کفن پھاڑ کر بولی تھیں ان سب کے سامنے ایک لفظ نہ بولیں۔ اس دن کے جوش نے جیسے ساری توانائی چھوڑ لی تھی۔ اور سچ بات یہ تھی کہ شدید صدمے اور شرمندگی نے بھی انہیں نچوڑ دیا تھا۔ بیمار تو وہ پہلے ہی تھیں۔ اس روز تو سارا الزام شجرہ الدرد پر رکھ کر ہاتھ جھاڑ لیے تھے۔ مگر اتنا تو جانتی تھیں۔ بیٹا۔ زلیخا کے قصے کا ”یوسف“ نہیں ہے۔

یہ سب ان کے بید کے گرد کرسیوں پر خاموش ہی بیٹھے رہے۔

مسز الیاس کے چہرے پر خیر مقدمی تاثر آیا۔ پھر شرمندگی پھر تکلیف بے بسی کے احساس سے آنسو۔ وہ بہت مجبور محسوس ہو رہی تھیں۔ طبیعت بہت خراب تھی۔ عمر بہت زیادہ ہو چکی تھی۔ اور ہر بار طبیعت خراب ہونے پر سب کو یقین ہونے لگتا۔ بس۔ لیکن وہ ابھر آتی تھیں۔

”مسئلہ رخصت کروانے کا نہیں ہے۔ ابھی کروا لاؤ۔ مگر پانچ ماہ بعد دنیا کو جواب دہی کیسے کرو گے۔ تمہیں سب آسان لگتا ہے۔ اتنا بڑا خاندان ہے۔ آٹھ

تمہارے اپنے بہن بھائی آگے ان کے شوہر۔ بیویاں اور بچے پھر ان کے خاندان۔ اور شا اور غزل۔ اقرا۔ سمیل۔ عذیر۔ تمہارے ہم عمر ہیں۔ وہ کیا اثر لیں گے تم نے سوچا۔“ انہوں نے نتیجے بھانجیوں کا ذکر کیا۔

”میں غلطی انسانوں ہی سے ہوتی ہے۔“ سنن انہیں کسی بھی طرح قائل کرنا چاہتا تھا۔

”ہاں۔ اور غلطی انسانوں ہی کو بھگتنا پڑتی ہے۔“ سنن کے ہونٹ باہم پیوست ہو گئے۔ وہ کیا کرے۔

”والدین اولاد کی بڑی سے بڑی غلطی کو بھی تسلیم نہیں کرتے۔ لڑنے مرنے پر آجاتے ہیں۔ کجا کہ اولاد ہی کو غلطی“ کہہ دیا جائے یہ تم نے کیا کر دیا سنن! وہ تول بول کر تھک گئی تھیں۔ ان کے پاس اور بھی بہت کچھ تھا کہنے کو مگر۔ اس دنیا کے لیے ان کے الفاظ بس یہیں تک کے لیے۔

”اللہ وانا الیہ راجعون۔“

\*\*\*

ہم سب زندگی میں بہت سی چیزوں سے خوف کھاتے ہیں کہ ایسا نہ ہو جائے اور ویسا نہ ہو جائے۔ اللہ نہ کرے۔ لیکن جب وہ چیزیں وہ باتیں ہو جاتی ہیں۔

یا۔

ہو رہی ہوتی ہیں تب۔

تب! وہ فیصلے کی گھڑی ہوتی ہے کہ ہم نے اب کیا کرنا ہے؟

شجرہ الدرد کے لیے یہ فیصلے کا وقت تھا اور اس نے اپنے حوالے سے ہوش بہت فیصلے کیے تھے خود اپنی سوچ پر اپنے ارادے پر یقین کر کے۔

وہ ڈوب رہی تھی اور کوئی مددگار نہیں تھا۔ چاہ کر بھی کوئی اس کی مدد نہیں کر سکتا تھا سوا اسے خود ہی ابھرنا ہوگا۔

اس کے پییر میں تین دن رہتے تھے۔ تیاری مکمل تھی۔ ہاں وہ گزشتہ کئی دنوں سے شدید دباؤ کا شکار تھی۔

مگر ٹھیک ہے۔ وہ دنیا سے نہیں جیت سکتی مگر خود سے ہار جائے یہ آج تک کبھی نہیں ہوا تھا۔

سنن نے ہار مان کر دوا کیوں کا ڈھیر ڈوہ اور جوس کے ڈبے اور بہت سارے نوٹ اس کے حوالے کر دیے تھے۔

ماموں۔ مامیاں اور محسنہ ایک دوسرے سے نظریں چرائے خاموش ہو بیٹھے تھے۔

زندگی ان کے لیے وہ وقت لائی تھی۔ جہاں انہیں صرف سامع کا کردار نبھانا تھا۔ (جو بھی کہا جائے)

جان چھڑوانے کی کوششیں۔ منصوبے۔ رخصتی۔ اور مسز الیاس کی موت۔ سوئم۔ سب ختم ہو گیا تھا۔

زندگی بعض اوقات ایسے بھی سمٹ جاتی ہے۔ اب کیا ہوگا؟ آگے کیا کرنا ہے؟

سب حیران رہ گئے پلکیں بھی نہ جھپک سکے وقت جو دکھائے دکھانا پڑتا ہے۔ لیکن یہ بھی تو دکھنا چاہیے کہ ہم کیا دکھنا چاہتے ہیں۔

اس نے اپنے بھرے بال سمیٹ کر پونی میں کسے چہرے پر ہاتھ پھیرے لمبے سانس بھرے۔ وہ جگہ جگہ پڑی اپنی کتابیں سمیٹ رہی تھی۔ اپنے نوٹس ڈھونڈ رہی تھی۔ اپنا بیگ تیار کر رہی تھی۔ امتحانی گتہ ایڈمٹ کارڈ پاؤنچ۔

پھر اس نے چارپائی پر تکیہ سیٹ کیا۔ گھٹنے موڑ کر موٹی کتاب نکالی اور وہ پڑھ رہی تھی۔ دھیمّا اونچا۔ تیز۔ آنکھیں موند کر۔ پھر چونک کر کوئی نوٹس لیتی۔

اسے خود پر اختیار تھا۔ ہمیشہ سے حالات کو اپنی مرضی کا کر لینا فطرت بن چکی تھی۔

شجرہ الدرد نے طے کر لیا تھا۔ وہ وہی دیکھے گی۔ جس کے دیکھنے کا اس نے خواب دکھا تھا۔

\*\*\*

پیپرز کے دوران ہی شجرہ اور محسنہ اوپری کمرے میں شفٹ ہو گئیں۔ اتفاق پیپر دینے والے ڈرامے سے لاعلم تھا۔ صبح جب شجرہ نکلتی وہ سویا ہوتا۔ مگر اسے پتا لگ ہی گیا۔ اس نے وہ طوفان اٹھایا کہ بس۔ ماموں گھر

پر نہیں تھے وہ نچلے کمرے سے شجرہ اور محسنہ کا سامان اٹھا اٹھا کر باہر صحن میں بھیج کر رہا تھا۔ ساتھ ساتھ بول رہا تھا۔ اور کون تھا جو اسے روکتا۔ بولنے سے اور پھینکنے سے۔

”یعنی ابھی بھی ارمان پورے نہیں ہوئے۔ امتحان دینے ہیں۔ افسر بننا ہے۔ میں نہیں رکھ سکتا غلاظت کی اس بوٹ کو اپنے گھر میں۔ میں کیا بے غیرت ہوں۔؟“

محسنہ تھر تھر کانپتی تھیں اور روتی تھیں۔ ان کا رنگ لٹھے کی طرح سفید تھا۔ اور شجرہ کمرے کے اندر نیم تاریکی میں کرسی کی پتھروں پر ہاتھ جمائے بے حس و حرکت آفاق کے جنون کو بس دیکھتی جاتی تھی۔ وہ عملی لڑکی تھی اور اس پل فقط یہ سوچ رہی تھی کہ کہاں جایا جائے۔

”ہم کہاں جائیں گے شجرہ؟“

”اللہ کی زمین بہت بڑی ہے امی۔“

”اتنے سال بھائی نے رکھا اور اب۔“

”جب تک انہوں نے رکھا۔ ہم رہ لیے اور حسبہ نہیں رکھنا چاہتے تو ہم کیسے رہ سکتے ہیں۔“

”شجرہ۔“ محسنہ سے کچھ اور کہا ہی نہ گیا۔

دونوں ماموں کی بروقت مداخلت نے اتفاق کو باز رکھا۔

”میں نے کسی جرگے میں جا کر چار لوگوں کے بیچ قسم نہیں کھائی تھی کہ بہن کی بیوی کو سہارا دوں گا۔ اور بھانجی کی ذمہ داری نبھاؤں گا۔ بس خود اپنے آپ سے عہد کیا تھا اور رہی۔ اس کی بیٹی۔ اسے امتحان دینا ہے تو دلاؤں گا۔ اور پھر اپنے گھر سے رخصت کروں گا۔ جیسے کہ بیٹیوں کو کرتے ہیں۔“

”حالانکہ رخصتی کی ضرورت تو نہیں ہے۔“ ماموں کے بے حد شرے قطعی لہجے کے جواب میں اتفاق بھائی نے جیسے سر پر کوڑا مارا ہو۔ ان کے لہجے کی کٹ اور آنکھوں کی استہزائے شجرہ کو پسینہ پسینہ کر دیا۔

”اور اوپر شفٹ کرنے کے بجائے آپ اسے اصل جگہ ہی کیوں نہیں بھیج دیتے۔ بلا میں اس (گلی) کو



کس چیز کا انتظار ہے؟ اپنے گھر جا کر کرے جو کرنا ہے امتحان دے یا نہ دے ہمیں کیوں امتحان میں ڈالا ہوا ہے۔ افسر نے پاچراں اس۔ ہماری جان چھوڑے!“

”آفاق ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ بڑی مامی نے لب کھولے۔ تب چھوٹی مامی نے بھی تائیداً سر ہلادیا۔

”نہیں بھیج سکتے۔“ ماموں کی آواز بالکل مدہم ہو گئی جیسے خود کلامی ہو۔

”وہاں اب تک کوئی۔ اس صورت حال کے بارے میں نہیں جانتا۔ کیا جواب دے گی یہ۔ کس کس کی باتیں سننے کی؟“

”کیا؟“ ماموں کے مدہم ترین لہجے کا الٹ آفاق بھائی کا بلند ترین ”کیا تھا“ تو کیا جواب دہی کے لیے ہم ہی رہ گئے ہیں دنیا کی باتیں سننے کو۔ اور ”اس“ کا کیا ہو گا۔ آفاق نے ”اس“ کا نام نہیں لیا مگر سب جان گئے وہ آنے والے بچے کا کہہ رہے تھے۔

”اسے محسن پال لے گی یا پھر بعد کی بعد میں دیکھیں گے وہاں (سرال) شجرۃ کی بہت عزت ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ۔“

آگے ماموں خاموش ہو گئے اور آفاق بھائی بولنا۔ اور وہ زہرا گل رہے تھے۔ فحش جملے گھنیا مثالیں۔ شرمناک قصہ۔ مگر حرف بہ حرف صداقت۔ جو وہ دنیا سے سن رہے تھے اور جو سمجھ رہے تھے۔ ماموں نے جیسے مزید کچھ نہ بولنے کی قسم کھالی تھی۔ مامیاں دل ہی دل میں سب سوچتی تھیں آج آفاق کی بہت کے بعد انہیں کم از کم ہاں میں ہاں ملانے کا حق تو ملا وہ سب اپنی اپنی مشکل میں تھیں۔ شادی شدہ بیٹیوں کی سرالیں تھیں۔ ان کی زبانیں مطمئن کنواری بیٹی کی شادی کے سلسلے میں مسائل ہو سکتے تھے۔



دنیا میں آنے کے بعد زین سان تمام احساسات سے ماورا تھا۔ سرد گرم سے بچانے کے لیے ثانی محسنہ نے اسے خوب اچھی طرح لپیٹ رکھا تھا۔ سردیوں سے باندھ کر ٹوپی پہنا دی۔ بڑے ماموں نے اذان دی تو

شہد بھی چٹا دیا۔ اگلا احساس بھوک کا تھا۔ تب ثانی نے چھوٹی چچی سے قطرہ قطرہ دودھ حلق میں ٹپکادیا۔ اور سیری پالینے کے بعد وہ بے خبر ہونے لگا۔

دوسری جانب کروٹ کے بل اس کی ماں شجرۃ الدرد بھی گہری پرسکون نیند کے زیر اثر تھی۔ اتنی طویل مشقت۔ وہ بہت اچھی نیند لیتا چاہتی تھی۔ اس نے اس بل کا بہت انتظار کیا تھا (کب جان چھوٹے گی)۔ اسے مزید بہت سی چیزوں کا انتظار تھا جس کی راہ میں اب کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔

زین سان کو قطعاً خبر نہیں تھی کہ جس آغوش میں اسے سکون آتا ہے وہاں کی نہیں ثانی کی ہے اور چچ اور فیڈر کے علاوہ بھی دودھ پینے کا ایک اصل اور فطری طریقہ بھی ہے کیونکہ ماں اس سے بے نیاز اس کی پیدائش کے تیسرے ہی دن الماری کھولے کھڑی تھی۔ اس نے بہترین لباس کا انتخاب کیا۔ شان دار جوتا۔ اسٹائلش بیگ۔ ماں بڑے طریقے سے اسے چھٹی نسلانا چاہتی تھیں اور وہ ہر شے سے بے نیاز چوٹھے ہی دن خود پر نیم گرم پانی کی دھار بہاتے ہوئے جیسے صدیوں کی میل امار رہی تھی۔ ٹھکن اتار رہی تھی تازہ دم ہو رہی تھی۔

اسے تازگی کی ضرورت تھی۔ جسمانی بوجھ اس نے اتار پھینکا تھا اور ذہن پر کوئی ”نیا بوجھ طاری“ ہونے نہیں دیا تھا۔

اس نے تو اس روز سے اپنا ذہن ہلکا پھلکا کر لیا تھا جب اس نے اپنی کتابیں جھاڑ جھاڑ کر نکالی تھیں اور نئے سرے سے رٹنے لگانے شروع کر دیے تھے۔ سب کے کھلے منہ اور آنکھوں سے چھلکتے سوالوں کو نظر انداز کرنا اس کے پائیں ہاتھ کا کام تھا۔ اس نے پہلے بھی کب پرواہ کی تھی دنیا کی۔

جب ایک پتھر کو ٹھوکریں مارتی کالج سے گھر تک لے آتی تھی۔ کبھی کبھار پتھر زیادہ زور لگنے سے راہ بدل لیتا یا بچ راستے پر جاڑ تابت وہ گرد و پیش کی قطعاً فکر نہ کرتے ہوئے پتھر کے پیچھے جاتی تھی اور اسے راہ راست پر لاتی تھی۔

دیکھنے والے اس کھیل کو دیکھ کر جو بھی رائے دے۔ پاگل، خطی، بے وقوف، کچھ بھی۔ اسے اچھا لگتا تھا۔ سو وہ ایسا ہی کرے گی۔

وہ دوپٹے کو پیٹ پر پھیلا کر کتابیں سینے سے لگا کر بیگ شانے پر اور آنکھوں پر بہت چوڑے فریم کے گنگر چڑھا کر گھر سے نکل گئی۔

لوگ اسے یوں دیکھتے تھے جیسے آنکھوں عجوبہ ہو وہ اس قدر با اعتماد تھی کہ سب سنا سنایا جھوٹ لگا۔ یا وہ ”دامن“ جھاڑ کر گھر سے نکلی تھی؟ کچھ پتا نہ لگا صرف یہ کہ چار ماہ بعد آنے والے زلزلے میں شروع کے آٹھ نمبروں میں سے تھی۔

دراصل شجرۃ الدرد نے اپنی زندگی کے ایک اصول کو یاد رکھا تھا۔

جب ہار جانے کا خوف قوی ہو جائے تو لازماً ہار جاتے ہیں۔ اسی طرح جیت کا عزم کر لیں تو شکست سر نہیواڑے دور کھڑی رہتی ہے۔ اس نے یقین رکھا تھا وہ جیت جائے گی سو جیت گئی اور آگے۔ آگے کہ ہر مرحلے کے لیے بھی اس نے خود کو فتح باب ہی دیکھا تھا وہ خود کو کامیابی کی چوٹی پر چڑھتا نہیں دیکھ رہی تھی کہ کوئی بھی پیر چھینچ لیتا۔ وہ کامیابی کی چوٹی چڑھ چکی تھی بس جھنڈا لگا۔ بانی تھا۔

زین سان کی ڈیووری ڈیسٹ۔ اور سی ایس ایس کے انٹرویو کی ڈیسٹ آپس میں ٹکرا رہی تھیں۔ وہ بس اس بار متزلزل ہوئی تھی، لیکن جب اس چیز سے نکل آئی تو آگے کوئی رکاوٹ ہو۔ ہو ہی نہیں سکتا۔ ناممکن۔

پیرز سے لے کر زین کی ڈیووری تک وہ محسنہ کے ساتھ اوپر شفٹ ہو گئی تھی۔ اس پر چاروں جانب سے پتھر برسائے جا رہے تھے۔ سخت ترین رویہ۔ بڑے ماموں ڈھال بنے کھڑے تھے تو چھوٹے ماموں قطعاً خاموش تھے بالکل پتا نہ لگتا۔ وہ کس پارٹی کی جانب ہیں۔ مامیاں خاموش تھیں لیکن جب رشتے والی مامی نے تازیہ کے حوالے سے بتایا۔

”رشتے تو دو ایک میری نظر میں ہیں مگر اس شجرۃ

والے واقعے کی دھول بیٹھ جائے تو بات بڑھاؤں میں۔“

تب پہلی بار مامی نے شدید ترین نفرت کے اہل اپنے اندر اچھے محسوس کیے۔ شجرۃ الدرد نے کبھی کسی کی ”بات“ نہیں سنی تھی۔ وہ بہت ساری باتوں کے جواب میں ایک منہ توڑ جواب دے سکتی تھی۔ وہی جواب اور جوان۔ جو سان الیاس نے اسے دیا تھا کہ ”کیا ہوا ہمارا نکاح ہو چکا ہے، کوئی گناہ تو نہیں، مگر تب یہ یقین دہانی اتنا ہلکا پھلکا کر گئی تھی کہ پچھتاوے کا احساس جاتا رہا، لیکن اب۔۔۔ وہ آگے بڑھ کر یہ جملہ کہہ کر اگلے کامنہ بند کر دیتی، لیکن جواب زبان کی نوک پر اگر گم ہو جاتا۔

مامی اس جملے کے جواب میں اتنا لمبا اور کھلا ڈالا پیرا گراف سناتا شروع کر دیتی جو کانوں کی لوہوں کو دھکا دیتا تھا۔

اور شجرۃ الدرد کی فطرت میں بہت سی خوبیاں تھیں اور خامیاں بھی۔ وہ ذہین تھی، مخنتی تھی۔ وہ بہت مضبوط قوت ارادی بھی رکھتی تھیں۔ اسے ڈٹ جانا آتا تھا ہار ماننا فطرت میں تھا ہی نہیں۔ حالات کو اپنے تابع کرنا بہت پہلے سیکھا تھا۔ ہاں شجرۃ الدرد۔ اس نے عرصہ ہوا خود کلامیاں کرنا چھوڑ دی تھیں، مگر اس نے خود کو بہت تسلی سے سمجھایا تھا۔

”تم پیچھے نہیں ہٹو گی، کامیابیوں کی راہوں میں رکاوٹیں آیا ہی کرتی ہیں اور یہ تو بس صبر کا امتحان ہے، طرف کا امتحان۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا، دنیا جو مرضی کہتی رہے وہ پیچھے نہیں ہٹے گی کبھی بھی۔“

اور پھر اس نے امتحان دیا۔ رات گئے تک کمرے کی بتی جلتی رہتی۔ اس نے شان دار نمبروں سے کامیابیاں حاصل کی، دنیا انگشت بدنداں تھی۔ سان کا اس گھر میں داخلہ بند تھا، مگر وہ اس کی جانب سے غافل نہیں تھا، بل بل کی خبر رکھتا۔ بے چین رہتا۔ شجرۃ الدرد نے خوف کی چادر کو اتار پھینکا تھا۔ اس نے خود سے ہم کلام ہو کر خود کو بتایا تھا جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ اس لیے۔ زین سان کی پیدائش کے ہفتے بھر بعد وہ انٹرویو







”شش۔!“ ہا بھابی کی انگلی اپنے ہونٹوں سے جڑی تھی۔ ”وہ ادھر ہے سو رہا ہے۔“

”صبح سے سو رہا ہے۔“

”ہاں۔ میں نے اسے سونے والی دوائی چٹا دی تھی۔“

”میرے کمرے میں ہے۔“

”اور۔ اتفاق بھابی؟“

”وہ آج مردوں کے ساتھ پڑوسیوں کی بیٹھک میں سو رہے ہیں گھر بھرا ہوا ہے تاہم نزدیک کے سب رشتے دار۔“

”اور صبح تک نئی کہانی؟“

”نجان لوگوں کی زبان پر تھی بھابی نے کس نے گھڑی۔ سنائی اور پھیلائی۔“

”ہمارے بچے گود لیا ہے نا۔“

”تو دیکھ کا موقع ہی نہ بن سکا۔ اتفاق ہونٹ بھیج کر رہ گیا۔“

”ہمارے بچے کو گود لینے والی بات سنان الیاس کی آپا نے سنی تھی پھر انہوں نے بچے کو دیکھ بھی لیا۔“

”ڈرتے ڈرتے چھوٹا پھر محتاط روی سے گود میں بھر لیا۔ اس کی صورت اتنی موہنی تھی اور وہ دل میں اس طرح کھس رہا تھا کہ دل بانی پانی ہو رہا تھا۔“

”اسے آغوش میں پیچتے ہوئے انہیں پتا ہی نہ لگا کہ آگے آنکھ سے آنسو بہنے لگے۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا، وہ اتنا اپنا اپنا کیوں لگتا تھا۔“

”شاید بے اولاد ممتا کو قرار مل رہا تھا۔ انہوں نے خود کو باور کرایا۔“

”بچے کو جو موتی تھیں تو ایک مانوس خوشبودل دھول کو معطر کرتی تھی۔“

\*\*\*

”میں اسے گود لیتا جا ہتی ہوں شجرہ! تم ابو سے بات کرو نا۔ اتفاق ان کی بات مان لیں گے۔ وہ مجھے باہر سے بھی کسی کا بچہ نہیں لینے دیتے نہ کہیں اور سے لیتے ہیں۔ بھابی نے کس کا۔ شجرہ! تو تمہارا بیٹا ہے نا۔ تم سے میں اسے اپنے دل سے لگا کر رکھوں گی۔ اور پھر تم اسے کیسے پالو گی۔ تمہیں تو ابھی بہت سے امتحان ہیں۔“

کرنے ہیں۔ ٹریننگ رہ جاتا ہے۔“

”اتفاق بھابی کبھی تمہیں مانیں گے۔“ بھابی جو کہہ رہی تھیں۔ شجرہ وہ سب سوچ سوچ کر ہلکان ہو چکی تھی۔ (ہاں اگر ایسا ہو جائے تو۔ اور۔ سنان۔ وہ اس کی بات کو کبھی نہیں ٹال سکتا)

”اور یہ ہا بھابی کی خام خیالی تھی۔ اتفاق تو اس کا گلا گھونٹ دینا چاہتے تھے انہوں نے کہا کہ ”وہ گلی سے کتا لے کر پال لیں گے گھر۔“

”کتے والی مثال پر بڑے ماموں لرز کر رہ گئے۔ بھابی کیسے طاقت سی آگئی اپنے ہی بیٹے کے منہ پر تھپڑ جڑ دیا۔“

”اس لیے تجھے اللہ نے اولاد نہیں دی کم ظرف! کہ تجھے۔ کتے کے بچے اور انسان کے بچے کا فرق نہیں معلوم۔“

”ہاں ہاں۔ اب ایک آپ ہی رہ گئے تھے مجھے طعنہ دینے کو۔ نہیں ہوں اس قاتل۔“

”جیسے کسی نے بھس میں چنگاری ڈالی۔ شعلے تھے آسمان کو چھوتے تھے وہ قیامت کا رن کہ بس وہ ہمارا کو بھی کوٹ رہے تھے اور گھر کے در و دیوار کو گھر ہی کی چیزوں سے توڑ دینے والے تھے۔ شجرہ کو سنان سے ملنا پڑا۔“

\*\*\*

یہاں سنان کے پاس ایک اور نئی کہانی تھی۔ ماں مر گئی تھیں اور باقی بہن بھائی اپنی زندگیوں میں بری طرح لگن تھے سنان کی آپا دل کا حال کس سے کہیں۔ بے اولاد کا دکھ۔ وہ سنان کے آگے ہی رو پڑیں۔

”جہاں سے شجرہ کی بھابی نے اتنا پیارا بچہ لیا ہے۔ مجھے بھی دلوا دو سنی۔! نام نسب معلوم ہو۔ بس یتیم لاوارش۔ مجھ سے اب اتنی خالی زندگی برداشت نہیں ہوتی۔ تمہارے بھائی کسی ادارے سے لینے نہیں دیتے ہیں۔ ہمیں کیا پتا۔ پتانے والے بچ کہہ رہے ہیں یتیم ہے یا کسی کے گناہ کی؟ سنی! بچہ تو بچہ ہوتا ہے نا۔ جب میں اسے گود لوں گی تو میرا ہو گا نا۔ تمہارے بھائی

کے خاندان میں بچے پہلے ہی کم ہیں۔ مجھے کیوں دیں گے؟“

”ارمان کی بیوی کہنے لگی ”ہماری تو یہی فیملی ہے۔ ایک بچہ۔ ایک بچی۔ مزید کا ارادہ ہی نہیں۔ میں نے کہا۔ تم اپنے دو ہی رکھو۔ ایک مجھے پیدا کر کے دے دو تو کہتی ہے کیا گارنٹی ہے۔ بیٹا ہو گا اور بیٹی ہو گئی تو آپ تو خیر سکی پھوپھی ہوں گی۔ پھوپھی سے کیا رشتہ۔ اور پھر ہنس پڑتی ہے اور بچ ہے کون دیتا ہے کسی کو بچہ۔ لیکن۔ لیکن سنی! تم مجھے بھی دیں سے بچہ لا دو جہاں سے ہمارے لوگوں نے لیا۔ ہیں! سنی لا دو گے نا؟“

”وہ تیز بول رہی تھیں۔ روتی جاتی تھیں اور آخر میں التجائی کچھ میں دونوں ہاتھ تھام کر گڑ گڑانے لگیں۔“

”اور اگر وہی لا دوں تو۔؟“ سنان کے لبوں سے پھسلا۔

”وہ وہ کیسے؟ وہ تو ہمارا ہے نا۔ بس اس جیسا لا دو۔ میرا! میرا دل کرتا تھا سنی! اپنا سینہ کھول کر اسے کہیں اندر چھپالوں۔ کسی کو دکھائی نہ دے۔ پتا نہیں کیوں ایسا ہوا۔ پہلے تو کبھی نہ ہوا۔“

”اور سنان الیاس ایک مشکل ترین مرحلے سے نکل سکتا تھا۔ اس نے شجرہ الدر کے بلاوے پر یہ سمجھاؤ اس کے سامنے رکھا جو نا بھیجی کے عالم میں سب سن رہی تھی اور جب سب سمجھ میں آیا تو جیسے شادی مرگ طاری ہو گئی۔ وہ جوش میں کھڑی ہو گئی۔

”وہ دونوں ہاتھوں سے دے دینے کا اشارہ کر رہی تھی۔“ دے دے دے دوستانہ لہوے وہ تمہاری آپا ہیں۔ فکر کی کیا بات۔“

”لیکن! سنان کے چہرے کی سنجیدگی میں فرق نہ آیا۔ ”آپا کو پھر سب بتانا پڑے گا۔“

”شجرہ پل بھر کو ٹھکی۔ ”بت۔ بتا دینا صرف آپا کو۔“

”اور آپا کی نظروں میں ہفت آسمان گھوم گئے تھے۔“

”اسی جی جانتی تھیں۔“

”اسی جانتی تھیں؟“ آپا نے اس کے الفاظ سرگوشی میں دہرائے ”ان کا چہرہ حیرت کی زیادتی سے اس قدر بگڑ



گیا تھا کہ پہچانی نہ جاتی تھیں۔ سنان نے خود کو لعنت کے حرف کے لیے تیار کر لیا، مگر جب آپا بولیں۔ وہ تیزی سے کھڑی ہوئی تھیں۔ انہوں نے جھپٹنے کے سے انداز میں اس کے دونوں شانے تھام لیے تھے۔

”تو پھر وہ۔ وہ ہمارے پاس کیوں ہے؟ مجھے مجھے لا کر دو۔ وہ تو پھر میرا ہوا نا۔ تم نے ہمارے پاس کوئی دے دیا؟“ سنان کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ آپا نے ٹھوڑی پکڑ کے چہرہ رو کر کیا۔ وہ نیچے بیٹھ گئیں۔ اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگیں۔ وہ اپنی ارزاں اتنی فقیر اور حقیر لگ رہی تھیں کہ سنان کا دل پانی ہونے لگا۔

”میں نے نہیں دیا۔ وہ تو محسنہ آنٹی کی وفات۔“

”نہیر۔ میں کچھ نہیں جانتی۔ مجھے بس وہ چاہیے۔ سنی! تمہارا ہوا تو میرا ہوا نا۔ تم اور میں کوئی دو ہیں۔ ہیں؟“

سنان کی گردن بے ارادہ نفی میں ہل گئی۔ آپا اور وہ دو ہو بھی کیسے سکتے تھے اور آپا اس سوال تک تو پہنچی ہی نہیں تھیں کہ وہ کہاں سے آگیا۔ کیوں؟ اور کیسے؟ کسی کو بھی خبر نہ ہوئی۔ وہ خود دوبار جا کر شجرہ سے ملی تھیں حساب جوڑا جائے تو وہ اس وقت یقیناً حاملہ تھی، مگر یہاں نہ چلا۔ چائے پانی محسنہ اور ہمارے سامنے رکھا تھا۔ شجرہ سارا وقت بیٹھی ہی رہی۔ ہاں محسنہ نے بخار کا بتا کر آرام کرنے کا بتایا تھا تو۔ یعنی کہ اس وقت۔

”لیکن دفع کرو۔ انہوں نے جڑتی کڑیوں کا سرا چھوڑ دیا۔ اہم یہ نہیں تھا کہ کب؟ کیوں؟ اہم یہ تھا کہ وہ ہمارے پاس کیوں تھا۔ اسے تو ان کے پاس ہونا چاہیے تھا۔ وہ بے تابانہ سنان پر زور دینے لگیں۔ ان کی زبان اور ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے۔ وہ اسے چھو کر ہاتھ پکڑ پکڑ کر بس جلد از جلد بھیجنا چاہتی تھیں فوراً۔“

”بھائی صاحب ایک غیر بچے کو کیوں پالیں گے؟“ اس کی آواز بہت ہلکی تھی۔

”غیر کیوں؟“ آپا تڑپ اٹھیں۔ ”میرا بھتیجا ہے۔“

”یہ سارا واقعہ کوئی نہیں جانتا آپا! اور جو نہیں جانتے وہ نہ ہی جانیں تو۔“

آپا چونکیں۔ جذباتی جنون سے ذرا سا ابھریں۔ ہاں وہ کیا کہیں گی؟ ان کے میاں تو کبھی بھی ایسے ویسے بچے کو گھر میں نہ گھسنے دیں گے۔

”ہم۔ ہم صرف انہیں بتادیں گے، وہ تو بہت خوش ہو جائیں گے سنی!“ آپا میں دوبارہ جوش بھرا۔ ”وہ تو میرا اپنا خون ہے ناسنی۔“ وہ جھکے چہرے کو پکڑ پکڑ کر اپنی جانب متوجہ کرتی تھیں۔ نڈھال، خاموش پر مرموہ سی آپا بے حد تازہ دم لگتی تھیں۔

”میرے ہاں پیدا ہوا یا تمہارے ہاں؟ اس میں کیا فرق ہے بھلا۔ تم تو میرا اپنا خون ہونا۔“

\*\*\*

اور زین سنان۔ محسنہ کے بعد صرف ہمارے آغوش کے لمس سے واقف تھا۔ شجرہ کے بارے میں تو کوئی خبر رکھتا ہی نہ تھا۔ سو جب آپا اور سنان اسے لینے آئے تو۔ وہ ہمارے گود سے نکلتے ہی بلک بلک کر رونا شروع کر دیتا اور اس سے بڑھ کر ہماروتی۔ زین کا رونا دل کو اتنی تکلیف دینے لگتا کہ طوعاً و کرہاً ایک بار ہمارے جانب اسے بڑھا دیا جاتا۔ شجرہ کا کردار یہاں ایک تماش بین کا سا تھا۔ ہاں مرنے لگی تھی اور جیسے اب یہاں اس کے رہنے کا جواز بھی ختم ہوا۔ (آفاق رہنے دے بھی نہیں رہا تھا۔ ساموں بھی اب کی بار چپ تھے)

زین سنان پھوپھی کے گھر چلا جاتا تو شجرہ آرام سے اپنے ٹارگٹ کی طرف قدم بڑھاتی۔ زندگی کے اگلے صفحات پر کاتب تقدیر نے کامیابی لکھ کر نیچے مہربانی لگا دی تھی اور یہ بات شجرہ الدرد جان گئی تھی۔

بحیثیت ماں زین سنان اس کا سگھار تھا، لیکن جب اس نے اسے گلے کا ہار نہ بنایا تو پیر کی زنجیر کیسے بننے

دیتی؟

کبھی ہمارے گود۔ کبھی آپا کی۔ کب تک چلتا یہ تماش؟

گھر کے بڑے دی اینڈ کے منظر تھے کہ جو بھی ہو

ایک کنارہ تو ملے۔ ایک کہانی کا منطقی انجام۔ ہاں بس یہاں سے نکلا جائے۔ سنان سوچ رہا تھا۔

آپا بچے کو جھپٹ کر پیچھے مڑے بغیر سرپٹ دوڑ لگا دینا چاہتی تھیں مگر تب ہی خیال آتا۔ ہمارے میاں تو ہاں ہے نا۔ وہ خود سے ہی بچہ دے دے۔

دو بندے اور تھے جن کی جلدی کی خواہش سب سے زیادہ تھی۔ ایک شجرہ الدرد اور ایک آفاق بھائی۔

یہ تماش تو پھر رات بھر چلتا رہتا۔ ہمارے اندر بچہ دینے کی ہمت نہیں تھی اور باقی سب مروت آخر کب تک نہایتے۔

ساری رات ہمارے اہل خانہ کی منتیں کرتی رہی۔ روتی اور آفاق کے پھٹکھٹاتی رہی۔ کھاتی اس لیے رہی کہ پہلے ایک پھٹکے بعد بھیکلی ملی بن جاتی تھی۔ دیکھ جاتی۔ لب سی لگتی، مگر جب یہ احساس ہوا کہ صبح یہ بچہ چلا جائے گا وہ روتی تھی۔ پتی تھی برصہ سے پیچھے نہ پتی تھی۔ اسے یہ بچہ چاہیے ہی تھا۔

آفاق کی ضبط کی حد ختم ہو گئی۔ وہ جارحانہ انداز میں آگے بڑھ گیا۔ زین سنان کو ان کی گود سے جھپٹ لیا۔ آپا کی گود میں ڈال کر ہاتھ کے اشارے سے نکل جانے کو کہا۔ دوسرے بازو کو دروازہ سے لگا کر باہر کو لپکتی ہمارے راہ کو مسدود کر دیا تھا۔

گاڑی اشارت ہوئی تو ہمارے غش کھا کر گر گئی۔ شجرہ الدرد نے اوپر کی جانب قدم بڑھائے۔ اسے اپنی تیاریاں کرنی تھیں۔

آفاق نے دروازہ بند کر کے ہاتھ آپس میں مسل کر جھاڑے۔

”خس کم جہاں پاک“

وہ جو ایک مبہم سا دھتکارے جانے کا احساس زین سنان کو ہوتا تھا۔ وہ یونہی فالتو کا وہم ٹھوڑا ہی تھا۔

\*\*\*

زین سنان کی آمد نے جہاں آپا کی زندگی کو خوشیوں سے بھر دیا تھا وہیں ان کے سسرال کو ورطہ حیرت میں

جھلا کر دیا۔ اتنی حیرت کہ اپنی ہی انگلیاں دانتوں میں چبا کر یقین کی کوشش کریں اور ہر بار کریں؟

پورا سسرال مگر خاص طور پر نندیں۔ اور پھر امی ابا (ساس سسر)

ہو ماں نہیں بن سکتی تھی تو دوسری کر لیتا نا۔ خرابی بیٹے میں تو نہ تھی نا۔ اب ہم کیسے لاؤ کریں۔ اللہ جانے کس کا بچہ ہے کہاں سے اٹھالے آئے۔ توبہ توبہ۔ پتا نہیں کیا گھول کر پلا دیا حسین کو۔ سارے طور طریقے، اصول حکم۔ شریعت سب بھول بیٹھا۔ اور سب سے اہم سوال یہی تھا۔

آپا اتنے سال سے علاج کروا رہی تھیں۔ حسین نہ تو دوسری شادی پر راضی ہوتے کہ ہاں خوش ہونے آپا کی یہ مانتے کہ کسی کا بچہ گود لیا جائے ایک قطعی جواب ”ہو گا تو تم ہی۔“

اور بہت روئے پینے پر محرم نامحرم، حکم شریعت، باپ کا نام، روز حشر ماں کا نام پکارا جائے گا بتا کر آپا کی بولتی بند کر دیتے اور مذہبی رجحانات کے حامل سسرال میں رہ کر۔ کچھ اولاد کی دوری کے باعث آپا ذاتی حیثیت میں بھی مذہب کے نزدیک تھیں، کوئی نہ بھی بتاتا تو گود لینے والے سب احکام سے واقف تھیں۔

اور یہی وہ سوال تھا جو سب کو ٹھنکا تھا۔ حسین نے بیوی کے عشق میں احکام شریعت بھی بھلا دیے۔

نجانے کس کالڑکا اٹھا کر لے آئی وہ۔ پھلے بہت چھوٹا سا ہے پالنے میں۔ لیکن کل کو بڑا بھی تو ہو گا اور بھابھی اسے نہلاتی ہے اور بستر میں ساتھ سلاتی ہے۔ منہ سر تو اتنا چومتی ہے کہ پٹیل سے بنے ہوتے تو اب تک مٹ جاتے یا کھس جاتے۔ پیار میں ایسا والہانہ پن۔ کہ جو انہیں اپنی خود کی پیدا کی ہوئی اولادوں سے بھی شاید محسوس نہ ہوتا تھا اور بھائی حسین یہ سب دیکھتا ہے اور مسکراتا ہے۔ جو ان لوگوں میں سے ہے جو سات برس کے بچے کا بستر الگ کر دیتے ہیں اور بارہ کے بعد بغیر دستک کے اندر آنے پر کوٹ دیتے ہیں۔

زین بھائی بھابھی کا گود لیا بچہ تھا نا کہ ان کا اپنا خون۔ انہیں اس پر کیوں خواہ مخواہ میں پیار آتا؟ دلغ



خراب ہے کیا؟ عجیب چیز ہوتی تھی اسے بھائی کے گھر کا اکلوتا لڑلا بچہ بنے دیکھ کر اس کے بہترین لباس خوراک اور بے حد خوب صورتی صحت مندی۔

بچے کے حوالے سے سب کا رویہ اور سوچ ایسی ہی تھی مگر آپا کی چھوٹی مند کا انداز سب سے جارحانہ تھا وہ گھر میں چھوٹی تھی اور یہ ڈیمانڈ کرتی تھی کہ اسے ہی سب سے زیادہ اہمیت دی جائے اور جب بچوں والی ہوئی تو یہ مطالبہ اپنے بچوں کے لیے سوچنے لگی جبکہ آپا کو زین کے علاوہ اب دنیا میں اور کوئی نظر آتا ہی نہ تھا۔ حسین بھی خاموش تھے۔ مطمئن تھے بیوی سے واقعی محبت تھی اور یہ سوچ بھی کہ خرابی اگر ان میں ہوتی؟

بچہ بہت خراب صورت حال میں دنیا میں آیا تھا مگر جائز تھا پھر بیوی کا اپنا خون تھا۔ غلطی انسان ہی سے ہوتی ہے اور دین کی راہ پر چلنے کا وہ صرف پرچار نہیں کرتے تھے۔ اس کی روح کو سمجھتے ہوئے عمل کی کوشش بھی کرتے تھے۔ فطرتاً چغل خو یا عیب جو نہیں تھے اور اللہ عیب پوش ہے اور عیب پوشی ہی کو پسند کرتا ہے۔

وہ اپنے اہل خانہ کے ڈھیروں سوالوں کے جواب میں ایک چپ کی پالیسی پر عمل پیرا رہا۔ انہیں کسی بھی حال میں مناسب نہ لگا کہ وہ بتاتے بچہ کہاں سے آیا۔ بس ان کا اپنا دل مطمئن تھا تو کافی ہے اور حسین کا یہی رویہ سب کو اصل آزار پہنچاتا تھا خصوصاً چھوٹی والی کو۔ سب مصلحت آمیز لہجے میں ناگواری کا اظہار کرتے وہ بر ملا۔

پھر کچھ بڑا ہونے پر اس کی ذہانت بھی نمایاں ہوتی گئی اور خوب صورتی اور نقوش کی وضاحت۔ وہ عام بچوں کی نسبت زیادہ ذہین تھا اور بہت خوب صورت مگر نقوش۔ نقوش۔ چھوٹی آنکھیں چند ہی کر کے اسے بغور دیکھتی اور گھنٹوں سوچتی مگر کوئی سرانہ ملتا۔

اس کی آنکھوں کی بناوٹ۔ کالی سیاہ گھور اداس تاثر۔ ذہانت سے پُرس۔ گہری اور باقی تمام چہرہ اور

رنگ۔ اسے لگتا اس نے یہ چہرہ پہلے بھی دیکھ رکھا ہے۔ مگر کہاں کب۔ یہ متھی کبھی نہ سیکھا سکی۔

\*\*\*

یہ زین سان کو اتنی محبت سے پالنے کا انعام تھا کہ جب وہ اپنی خودی اولاد کی طلب کو بھول بیٹھی تھیں۔ تب اللہ نے انہیں سببیت سے نواز دیا۔ اب وہ دو بیٹوں کی ماں کہلائی جائیں گی مگر۔

انھنے والا دنیا شو شاس۔ مدلل اعتراض۔ اب تو ان کی اپنی گود ہری ہے تو کیوں پرانی اولاد پر وقت ضائع کیا جائے۔ وہ منہ توڑ جواب دینا چاہتی تھیں مگر اس بار حسین بھی سب کے ہم خیال نکلے۔ آہ ایک بہت بڑا ہنگامہ۔ اور پھر

بچہ واپس کر دیا گیا جہاں سے لایا گیا تھا۔ اس کے آنے سے زیادہ اس کے چلے جانے حیران کیا تھا۔ وہ آخر آیا کہاں سے تھا اور بھائی جو اس پر اپنی جان وارتی تھیں اتنی مطمئن کیسے ہیں۔ سب بھول بھال گئے۔ اپنی اولاد پھر اپنی ہوتی ہے لیکن چھوٹی مند کو چین نہ تھا۔

وہ بہر حال جاننا چاہتی تھی۔ اچھا آنے کو تو چھوٹو۔ کیا کہہ رہا؟ اور چونکہ اس کھونج کی دھن سر میں ساگنی تھی۔ سو معلوم ہو گیا وہ بچہ شہر کے مشہور و معروف تعلیمی ادارے سے وابستہ ہاسٹل میں تھا۔ چھ برس کا بچہ۔ ہاسٹل میں تو جاسکتا تھا مگر چھٹیوں میں جب گھر آئے گا تب۔ لیکن وہ بھائی بھانج کے گھر نہ آیا۔

اسے پتا چلا کہ بچے کو داخل کروانے والے جوڑے کا نام سان الیاس ہے اور شجرۃ الدر اور تب ہی بھائی اتنی مطمئن ہیں۔ یقیناً بھائی حسین فنانشلی سپورٹ کرتے ہوں گے۔ سان نے بہن کی خاطر مانا ہو گا مگر اس کی بیوی کیسے مان گئی سنا تھا وہ بہت بڑی افسر ہے بہت قابل، مختاری اور ذہین لڑکی۔

چھوٹی نے سالوں پہلے بھائی کی چھوٹی بھابی کو دیکھا تھا سوہ پتا نہیں اب کہاں ہوتی تھی۔

باوجود کوشش کہ یہ متھی نہ سمجھ سکی۔ یہاں تک کہ زین ایک یاد رہ گیا جو سب کی یادداشت کے در کو بھی تھہرا رکھتا رہتی۔

ہاں پر چھوٹی جب جب سببیت کو دیکھتی اسے زین ہی طرح یاد آتا۔ اسے سببیت کے اندر زین کی بے حد شبہات نظر آتی تھی۔

\*\*\*

چھوٹی کی خواہش سے پرے۔ شیطان کی منصوبہ بندی سے بہت دور۔ قدرت کا اپنا ایک نظام ہونا ہے جس سے ایک انج بھی سرکا نہیں جاسکتا۔ قدرت تماش بین نہیں ہوتی مگر حقیقتیں وقت مقررہ پر خود بخود ظہور پذیر ہونے لگ جاتی ہیں۔

زندگی کے ہر معاملے کی منصوبہ بندی کرنے والی ہر شے کا لائحہ عمل طے کرنے والی شجرۃ الدر زین سان کے حوالے سے کبھی بھی کچھ طے نہ کر سکی۔ اپنی تمام تر ذہانت اور حساب کتاب کے باوجود اس کا ذہن سپاٹ ہو جاتا تھا۔

ایک سیدھی بہت واضح کہانی جس میں دور دور تک ٹک و شبہ کی گنجائش نہیں تھی۔ (ستائش ہی ستائش) آپا نے بچہ گود لیا۔ اپنی اولاد ہو گئی تو سسرال کے پرہیز پر واپس کرنا پڑا، لیکن آپا کو بچے سے بہت محبت تھی سو اوہرا دھڑلانے کے بجائے بھائی کے حوالے کر دیا جو صاحب حیثیت تھا۔ وہ بچے کا سر پرست بن گیا۔ ویری گڈ۔

اور شجرۃ کے برخلاف سان سوچتا تھا وہ ضرور ہی زندگی کے کسی مقام پر بیٹے کو حقیقت بتا دے گا۔ تب کیا ہو گا۔ کیوں اور کیسے؟ تب کی تب دیکھی جائے گی۔ وہ اللہ سے رحم مانگے اور بیٹے سے معذرت۔ پھر جو بھی فیصلہ کرے۔

غلطی کی ہے تو سزا بھی ملے گی ہی۔ جرم کبھی چھپتا نہیں۔

اور اب جب شجرۃ کے پاس کوئی منصوبہ بندی نہیں

اور سان کسی مناسب وقت کے انتظار میں تھا۔ قدرت کے امتحان کا (یا سزا) کا وقت شروع ہو گیا۔ ان دونوں ہی نے سوچا۔ لوگ تو کہتے ہیں سزا کے لیے قیامت کا دن مقرر ہے جب ہر شے کی جواب دہی کرنی ہوگی تو ان کے لیے ابھی سے قیامت آگئی کیا؟

زین سان بارہویں برس میں داخل ہو رہا تھا۔ وہ ذہین تھا۔ شجرۃ الدر کی طرح۔ کوئی دورائے نہیں کہ اپنی پڑھائی کے حوالے سے وہ ہر انداز میں شجرۃ تھا۔

لیکن بڑے ہونے کے اس مرحلے میں وہ ہر روز سان الیاس کے روپ میں ڈھلتا جاتا تھا۔ بس ایک آنکھیں نکال کر کہ وہ شجرۃ الدر ہی کی تھیں۔

مگر چہرہ ہونٹ، دانتوں کی قطار، مسکراتے ہوئے لبوں کا پھیلنا اور ایسے میں چہرے کی بدلی حالت۔ دوران گفتگو وہ آنکھوں سے بھی سمجھنا جیسے کہ سان کرتا تھا۔ بات کو مدلل کرنے کے لیے وہ سان ہی کی طرح بھنوں کو سیکڑتا تھا پھر ہاتھوں کے ذریعے بات کو سمجھاتا۔ وہ چلتا بھی سان کی طرح تھا پھر سب سے بڑھ کر اور سب سے زیادہ نمایاں ہونے والی چیز اس کی آواز تھی۔ ایک قدرتی طور پر۔ اور دوسرے وہ باپ کو کاپی بھی کرتا تھا۔

کن لفظوں پر زور دیتا ہے کن کو کھینچتا ہے؟ کہاں بات روک کر دوبارہ شروع کرتی ہے۔

آواز انداز اور لہجے میں اتنی مماثلت تھی کہ وہ با آسانی سان الیاس بن کر کسی کو بھی بے وقوف بنا سکتا تھا۔

خود اس نے ہو ہو سان کے لہجے میں آواز ذرا بھاری کر کے جب شجرۃ کو پکارا تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ دل پر ہاتھ رکھے اسے دیکھتی تھی۔

”کوئی نہیں پہچان سکتا ناں کہ میں بولا ہوں یا آپا بولے“ وہ بے حد لطف اندوز ہو رہا تھا۔ ”میں بالکل اپنے جیسا ہوں نا ماں؟“

اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے شجرۃ کی سانس نکلی۔



جیسے موت کے فرشتے نے دم نکالنے کے لیے پہلا جھنکا دیا ہو۔

اس کا نام 'مقام' مرتبہ۔ وقت حالات اس چیز کی اجازت دیتے تھے کہ کیا وہ ایک اسکینڈل کی شکل ہو سکتی تھی۔

اور وہ دنیا کو کیا جواب دے گی۔  
اور وہ زمین سنن کو کیا بتائے گی کہ۔  
اور میرے اللہ۔



شجرہ کا بچپن سستے زمانوں کا بچپن تھا۔ بچے سادہ خوراک کھاتے۔ سادہ لباس پہنتے۔ کپڑے کی گڑیا اور امیر غریب سب کے بچے کم و بیش ایک ہی طرح پلتے۔ مگر شجرہ تو پھر یتیم تھی۔ اپنے بچوں کے بچپن کو دیکھتے ہوئے وہ سوچتی۔ وہ بس پیدا ہوئی تھی۔ اور بچپن اسی وقت ختم ہو گیا۔ جب ابو فوت ہوئے۔ بعد کی زندگی تو بس ایک دوڑ جیسی تھی۔ جو اسے بس جیتنا تھی۔ بچپن میں اس نے حسرتوں کو خود سے دور کر دیا تھا۔ مگر جب آج وہ صاحب حیثیت تھی۔ سوچتی کہ اپنے بچوں بالخصوص سدرہ کی زندگی میں کوئی خواہش ادھوری نہیں رہنے دے گی۔ اور پھر اب اس کا سوشل سرکل۔ جس طرح کی زندگی گزار رہا تھا۔ اسے بھی وہی ڈگر اپنائی تھی۔ بلکہ بڑھ چڑھ کر اپنائی تھی۔

دو اولادیں تھیں۔ نہیں تین۔ مگر سدرہ سے اسے بے حد لگاؤ تھا۔ اور اس کا ہر تھ ڈے سلیبیشن۔ اس نے ابونٹ میجنٹ والوں کو کال کیا تھا۔ کمر تھیم بے بی پنک تھی فار وومن اینڈ جینٹلس ان سوٹ گھر پر ہی آرینج منٹ کیا گیا تھا۔ بچوں اور بچیوں کے لیے گیمز۔ اندر داخل ہوتے ہی یوں محسوس ہوتا جیسے یہ باری ورلڈ ہو۔ ہر سو گلابی رنگ بکھرا تھا۔ درودیوار پر ایسے نقوش ابھارے گئے تھے۔ جن سے احساس ہوتا۔ یہ دور دیس کا پریوں کا شہر ہے۔ میوزک۔۔۔ غبار سے جو کر۔

سنن کا کاروباری حلقہ۔ اور شجرہ نے اپنے حلقہ

احباب سے ایک جم غفیر اکٹھا کر رکھا تھا۔ ہر شے کو کر اس کے اندر ایک طمانیت اور فخر ابھرا تھا۔ شہانہ انداز میں گردن اٹھائے ہر شے کو دیکھ رہی تھی۔ ایک کٹ چکا تھا۔ اور بہت سارے گیمز تھے۔ بچوں اور بڑوں کے لیے۔ اس تقریب میں ہر شخص جیسے چہرے گھٹنوں کے لیے دنیا کے تمام دکھوں پریشانیوں کو محمول کر بس انجوائے کر رہا تھا۔ تفکرات سے بہت پرے۔ اور سب سے زیادہ ہلکی ہلکی خود شجرہ الدر تھی۔ اس نے زین سے وعدہ کیا تھا۔ وہ سدرہ کی برقعہ ڈے اس کے بغیر نہیں کرے گی اور اسے لانا بلوالے گی اسے ہر تھ ڈے کراچی میں کرنا تھی۔ وہ جس فیلڈ سے وابستہ تھی۔ اس کے عمدے کا تقاضا تھا ایک گھر یلو تقریبات میں۔ افسران بالا اور دیگر عملے اور فائدہ پہنچانے والے لوگوں کو بلوائے۔ اور سب سے تعلقات بنا کر ہی رکھے جائیں۔ سو یہ تقریب جہاں سدرہ کے لیے تھی وہیں سب سے ایک غیر رسمی ملاقات سلام دعا کا بہانہ بھی۔ ہم جیسی دنیا میں رہتے ہیں۔ ہمیں اسی حساب سے جینا ہوتا ہے۔ سو شجرہ اس مقولے پر عمل پیرا تھی۔

سدرہ کی ہر تھ ڈے میں تاریخ کے حساب سے ابھی ایک ہفتہ باقی تھا۔ اور زین اس میں شرکت کی ضد نہ کرے۔ سو وہ وعدہ وعید کرتے وقت ہی یہ سب طے کر چکی تھی۔ زین کو بعد میں کہہ دیتی کہ چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر ہر تھ ڈے سلیبیشن کی ہی نہیں جاری۔ وہ اگر آجاتا تو اسے خوش کرنے کے لیے فوری طور پر ایک منگوا کر کچھ ہنگامہ کر لیا جاتا۔

بے حد خوب صورت تقریب اپنے جوبن پر تھی۔ گلابی ساڑھی سیاہ کڑھائی سے بو جھل تھی۔ سیاہ سوٹ میں ملبوس سنن الیاس کی کہنی میں ہاتھ پھنسا کر چلتی۔ وہ فارغ لگتی تھی۔ سنن کی ٹانگ کی وہ ہلکی لنگر اہٹ آج بھی اسے نظر نہیں آتی تھی۔ وہ اس کا خیر تھا۔ اس کی محبت۔ اس کی جیت اس کی خواہش۔ دعا۔

میوزیکل چیئر کا گیم بچوں کے لیے تھا۔ مگر یہ نہیں کیسے اس میں بڑے بھی شامل ہو گئے۔ اور اب گیم کچھ

ہل تھا کہ کھلڑا کھیل رہے تھے۔ سب ان پر بھی زور ڈالنے لگے کہ وہ بھی شامل ہوں۔

سنن نے گیند شجرہ کے کورٹ میں ڈال دی۔ "مگر پھیلے گی تو بندہ بھی حاضر ہے۔ دراصل بندہ حکم کا بندہ ہے۔ آپ تو سب سمجھتے ہیں ناں سومو صاحب۔"

سومو صاحب نے اپنی بیگم کی جانب مصنوعی بے پارگی سے دیکھا اور قہقہہ لگایا۔

"میں نے ساڑھی نہ باندھی ہوئی تو۔" شجرہ نے زناکت سے پلو والا بازو اٹھایا۔

"یعنی آپ پہلے سے پیش بندی کر کے آئی ہیں۔"

"آپ جو کہیں۔" شجرہ مسکرائی، تالیوں کا شور قہقہے۔ بک آپ کرنے کے لیے لہرے اس پر میوزک۔ جب میوزک رکتا۔ تب ہنسی کا نیا طوفان۔

مڑے کی بات یہ تھی چھ ٹیموں میں سے چھ کی چھ مسز مسز پیل بہت دلی تلی تھیں اور مسز پیل بہت ہونے لگی میوزک رکنے پر کرسی پر مسز پیل تھے۔ بل بھر کی حیرت کے بعد شدید قہقہے شروع ہو جانے لگے۔ مگر میوزک رکتے ہی سنن نے گوجی آواز نے سب کو چونکا دیا۔

"ہام!" شجرہ اور سنن دونوں کے ہاتھ پہلو میں گر گئے اور شاید کمرے کی چھت بھی ان کے سر کے اوپر۔ سب کی گردنیں مڑی تھیں۔ دروازے کے بیچ دو چار زین سنن کھڑا تھا۔ اور اس کی حالت۔ جہاں اندر سب گلابی اور سیاہ سوٹ میں ملبوس بچے بڑے سب۔ ہاں زین کا لباس اور حلیہ۔

بلو جینز پر سفید آدھی آستین والی شرٹ۔ کمر کی پشت سے بیگ چپکا تھا۔ پیروں میں جاگرز اور اس کی حالت دیگر گروں تھی۔ وہ کیا مٹی میں لونیایا لگا کر آیا تھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں۔ وہ شاید لاٹا رہا تھا (رو بھی رہا تھا) اور یقیناً "بھاگتا آیا تھا کہ اب تک باپ رہا تھا۔ سانس ابھی تک متوازی نہ ہوئی تھی۔ اور اس پر شدید ترین صدماتی کیفیت۔ اس نے

چاروں طرف دیکھا چھت تک کو پھر اس کی نگاہ باری کا روپ دھارے کھڑی سدرہ پر پڑی۔

پھر اس نے ماں باپ کو دیکھا۔ تو اس کے چہرے کا رنگ یوں ہو گیا۔ جیسے کہ دل بس پھٹ جانے کو ہے۔ ایک دوتیں۔

"آپ نے میرے بغیر سدرہ کی ہر تھ ڈے کر لی۔ میں شامل نہ ہو سکوں ایک ہفتہ پہلے ہی کر لی۔ وہ تو میں نے سر پرانہ دینے کے لیے گفت خریدنے کے لیے گھر فون کیا تو خیرن بولی۔ ہر تھ ڈے تو کل ہو رہی ہے کراچی میں۔

آپ نے تو مجھ سے وعدہ کیا تھا نام؟ اور بابا! آپ نے بھی؟"

"نہیں۔ تمہیں یہ کیا ہوا ہے؟" سنن نے پوچھا تھا۔ مگر شجرہ ٹرانس سے ابھر کر اب اس کی جانب جیسے بھاگی تھی۔ اس کے بالوں میں بھی تنکے اور مٹی تھی۔ اور پیشانی پر رگڑ کا نشان تھا۔ اور کہنی پر گہرا زخم۔ ٹھوڑی کے پاس بھی ایک لمبی سرخ لکیر تھی۔

"کس نے مارا ہے تمہیں؟"

"کسی نے بھی نہیں مارا۔ میں بھاگ بھاگ کر آ رہا تھا۔ مجھے لگا۔ ہر تھ ڈے ختم ہو جائے گی۔ وہاں روڈ کے اینڈ میں کھدائی ہو رہی تھی۔ میں اندر گر گیا۔ کسی نے نکالا بھی نہیں۔ پہلے میں نے سوچا۔ صبح جب مزور آئیں گے تو مجھے نکال لیں گے۔ پھر مجھے خیال آیا۔ ہر تھ ڈے ختم ہو جائے گی۔ تو میرا گفٹ۔ پھر میں بڑی مشکل سے نکلا۔ پھر دوبارہ بھاگا۔"

وہ سانس لیے بغیر بولنا چاہتا تھا۔ آنسو تو اتار سے بہہ ہی رہے تھے۔

"اور پھر بھی۔" اس نے پیچھے لٹکتے بیگ کو آگے کیا۔ اس میں سے ایک ڈبا برآمد کیا۔ جس میں کالج بچ رہے تھے۔ اس نے بوجلت ڈبا کھولا۔ اس کا بدترین خدشہ حقیقت کا روپ دھار چکا تھا۔ ڈھکن ہٹتے ہی بہت سے نازک کالج زمین پر گرنے لگے۔ تو ساتھ ہی وہ بھی گھٹنوں کے بل گر سا گیا۔ وہ کالج کو ٹٹول رہا تھا۔ کسی بھی احتیاط کے بغیر۔



”پھر بھی میرا گفٹ ٹوٹ گیا۔“ یہ کرشل سے بنی بابلی ڈول تھی۔ وہ اس کے چہرے کو اٹھا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

”اب میں سدرہ کو کیا دوں گا۔ اتنے پیسے جمع کر کے میں نے میم سے یہ ڈول منگوائی۔ میری ڈول۔“ وہ کسی قدر جنون سے اسے جیسے جوڑنا چاہتا تھا۔

”سی۔ ہائے!“ کالج پوروں میں کھس گیا تھا شاید۔ اور سامنے کھڑی ساکت و جامد شجرہ میں جیسے روح واپس آئی۔

”چھوڑو زین۔!“ اس نے تیزی سے کہا تھا اور اسی کی طرح گھٹنوں کے بل گری تھی۔ سنان بھی آگے بڑھا تھا۔ وہ ایک گھٹنا موڑ کر اور دوسرے کے وزن پر ان کے قریب آ بیٹھا تھا۔

”ایسے کالج کو ہاتھ نہیں لگاتے زین! تمہیں چوٹ لگے گی۔ خون نکلے گا۔“

”لگاتے ہیں۔۔۔ کالج کو ہاتھ لگاتے ہیں۔“ وہ صمدی اور جنونی ہو گیا۔

”میں نے اپنی پاکٹ منی جمع کی تھی۔ اب میں سدرہ کو کیا دوں؟ اور اب تو برتھ ڈے بھی ختم ہو گئی۔۔۔ میں۔“ وہ تیزی سے ڈبا پلٹ کر باقی ٹکڑے نکالنے لگا۔ گڑیا کی ٹانگیں سلامت تھیں۔ چہرہ بھی لیکن درمیانی حصہ فقط کریچوں کی صورت تھا۔

”میں جوڑوں گا۔ میں اسے جوڑوں گا۔ ابھی ابھی جوڑوں گا۔“

یقیناً اسے گڑیا کے ٹوٹنے کا صدمہ اتنا نہیں تھا۔ صدمے کی اصل وجہ تو اس کے بغیر برتھ ڈے تھی۔ اسے کڑیاں جوڑنی نہیں آتی تھیں۔ لیکن کڑیاں جمع کرنا تو آ رہا تھا ناں۔ وہ خود ہی پہنچ جاتا ایک روز حقیقت تک۔ مگر۔

صدمے نے اس کے حواس معطل کر دیے تھے جیسے اسے بس گڑیا جوڑنی تھی۔ ہر صورت۔ اس نے کالج کے باریک باریک ٹکڑوں پر یوں ہاتھ پھیرا۔ جیسے ملائم گوندھی مٹی سے فرش کو لپ رہا ہو۔ اور نتیجہ۔

وہ ہاتھ مار مار کے ٹکڑے سمیٹ رہا تھا۔ اور مار مار کے سفید فرش پر خون کی لکیریں بنتی جاتی تھیں۔ پھر خون کا پوچا لگایا جا رہا ہو۔

اور ماں باپ کو اس کا جنون ہولائے دے رہا تھا۔ روکنے کی سعی کرنا چاہتے تھے اور سعی تو لوگوں کے سوال کے جواب کے لیے بھی کرنی تھی۔ جو ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے۔

”یہ کیا ہو رہا ہے؟ کون ہے یہ لڑکا؟ ماں کیوں کہہ رہے؟ روکیوں رہا ہے؟ اور شجرہ کی یہ حالت۔ اور سنان الیاس کی بے بس کیفیت۔“

”ارے ہاں۔ سناتو تھا۔ ایک بچہ ایڈاپٹ کر رہا تھا۔“

”نہیں۔ گارجین بنے ہوئے ہیں دونوں۔“

”نہیں۔ اصل کہانی یہ ہے کہ یہ سنان کی سزا کسی کو یہاں تک کے معاملے کی خبر تھی۔ اور شجرہ کے کانوں تک یہ قیاس آرائیاں۔ اچھے بے یقین سوال پہنچ رہے تھے مگر وہ جیسے کچھ سن رہی تھی۔

وہ تو بس اسے باز رکھنا چاہ رہی تھی۔ جو اپنے خون سے ہولی کھیل لیتا چاہتا تھا۔

”پنی جان لو گے کیا؟“ وہ بدقت بولی۔ اسے غل آ رہے تھے اور کلیجہ جیسے کسی شے میں جا پہنچا تھا۔ اچھا تو لے پالک ہے یہ۔ ”موسلی بے ہتکم سزا چٹائے نے سارا معاملہ گویا سلجھا کر خود بھی سکھ سانس لیا۔ اور اطلاع بہم پہنچائی۔ سب نے سن لیا۔ کیا زین نے بھی؟ شجرہ کے سر پہ گرز لگا تھا۔ اس نے ایک نظر سب لوگوں کو دیکھا۔ شدید ترین اذیت اور شرم ساری سے پرستان الیاس کا چہرہ ہر شے سے زیادہ نیاز و زین سنان الیاس (اگر وہ سن لیتا) ایک غلطی کے بعد۔ دوسری سنگین غلطی۔

اس نے یک دم زین کو خود میں بھیج لیا۔ اپنے ساتھ لیے کھڑی ہو گئی۔ اس کے خون سے تر ہاتھوں نے گلابی ساری کو داغ دار کر دیا اور وہ ہر شے سے زیادہ نیاز حلق پھاڑ کر چیختے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”لے پالک نہیں ہے یہ۔ میرا اپنا بیٹا ہے۔ یہ میرا بیٹا ہے۔ وہ بیٹا جسے میں نے نوماہ اپنے پیٹ میں رکھا۔ کل گھول کر سب سن لیں۔ یہ میرا بیٹا ہے۔ شجرہ الدر اور سنان الیاس کا اپنا بیٹا۔ جھوٹ بول رہے ہیں ہم بارہ سالوں سے کہ۔“

وہ اتنی زور سے بولی تھی کہ گلے میں خراشیں پڑ گئی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی اس کے حواس جیسے ساتھ چھوڑنے لگے۔ وہ زین کو سہارا دے رہی تھی۔ اگلے لمحوں کے کندھے پر ڈھس گئی۔ اور وہ اپنا غم بھول کر لے رونے لگا۔

”مام۔ بابا! دیکھیں بابا! مام کو کیا ہو رہا ہے آئی ایم سوری مام۔ میں نے آپ کو ہرٹ کیا۔ مام پلیز۔“ اور تقریب ہی میں موجود ایک ڈاکٹر صاحب آگے بڑھے تھے۔ ان کے لیے دو مریض تھے۔ ایک ہوش و خود سے بے گاہ تھا۔ اور دوسرے کے ہاتھ بری طرح زخمی تھے۔

شجرہ کے خاندان نے سالوں ہوئے تمام ناتے توڑ ڈالے تھے۔ مگر سنان کے تمام بہن بھائی موجود تھے۔ وہ ایسی کو اس انوہوں کو سن کر لا حول بڑھ لیتے تھے۔ اکثر ایسی آواز آ جاتی تھی۔ کہ یہ بچہ دراصل شجرہ اور سنان کا ہے۔ مگر اسے تو آپا لے گویا تھا۔

لیکن آج شجرہ کا چھٹا مزید سوال کی گنجائش رہی ہی نہیں۔ دنیا کو بھی الف مل جانا چاہیے۔ بے شک وہ خود ہی پہنچ جاتی ہے۔ خواہ جیسے بھی پہنچے صحیح یا غلط۔ سو یہاں جتنے منہ تھے اس سے دو گنی چو گنی باتیں تھیں۔ جو جس کے منہ میں آ رہا تھا، کہے جاتا تھا۔

شجرہ الدر کے اپنے منہ سے برملا اظہار کے باوجود یہ ہم قسم تھا۔ اور اب مام دور کرنے کے لیے چھوٹی موجود تھی۔ اس نے اپنے ساتھ بیٹھی خاتون کے کان میں کھس کر وہ معلومات سجا بنا کر پیش کر دیں۔ جو اسے ایک اتفاقی ملاقات میں ہما بھابھی سے پتا لگی تھی۔ (اتفاق بھائی انہیں طلاق دے چکے تھے)

چھوٹی سے شجرہ الدر کے ایسے تعلقات نہیں تھے کہ وہ اسے سالگرہ میں بلاتی۔ مگر ہوا کچھ یوں کہ جب

وہ دونوں آپا کو کارڈ دینے گئے۔ تب چھوٹی بھائی کے گھر موجود تھی۔ اس نے سنان سے شکوہ کیا۔

”پنی آپا ہی کو بلا رہے ہو۔ کیا میں تمہاری بہن نہیں؟“ یہ دونوں بری طرح شرمندہ ہوئے۔

اگلے روز سنان خود جا کر کارڈ دے کر آیا۔ چھوٹی کا دلی ارمان تو بس زین کو دیکھنا تھا۔ مگر یہاں زین کو بھی دیکھ لیا۔ اور باقی سب کچھ بھی دیکھ لیا۔ اوپنی مسند پر بیٹھی شجرہ الدر کی گھٹنوں کے بل جھکی دگرگوں حالت نے حسد کی عجیب سی آگ پر پانی کے چھینٹے مارے تھے۔ بڑا مزہ آیا۔



”آج کے دن کی بات نہ کرو۔ یہ کہانی جب بھی کھلی تھی۔ ایسا ہی تماشا ہوتا تھا۔ اور کہانی کھل جانے کے ڈر نے مجھے کبھی کھل کر سانس بھی نہ لینے دیا۔ لیکن ابھی میں اتنی ہلکی پھلکی ہوں کہ بس۔“ وہ کرسی پر بیٹھی تھی کہنی ٹیبل پر کھڑی تھی اور وہی ہاتھ سر پر دھرا ہوا تھا۔ سر جھکا ہوا تھا۔ اور وہ مسلسل بول رہی تھی۔

یہ سنان کی لائبریری تھی۔ پورا کمرہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ صرف ٹیبل کے عین اوپر لٹکتے لیمپ کی روشنی ان دونوں پر پڑ رہی تھی۔

”پتا ہے میں نے پہلے ہی اسے کن دقتوں سے یہ بتایا اور باقی سب بھلایا۔ کہ وہ میرا بیٹا ہے۔ میں مامی نہیں مام ہوں۔ مگر میں کالج میں پڑھتی تھی ناں۔ تو اس لیے اسے پھوپھو کے پاس رہنا پڑا تو وہ پھوپھو کو امی کہنے لگا۔ مگر مام بس میں ہوں۔“

اور وہ مجھے ہمیشہ ایک بوجھ لگا۔ جو میرے اعصاب پر سوار تھا۔ پھر بوجھ نے شکل بدل لی اور وہ میرے دل کا بوجھ بن گیا۔ اگر آج سچ نہ کہتی تو اسے بے موت مار دیتی۔ وہ تو پہلے ہی میرے حوالے سے ہمارے حوالے سے شکوک کا شکار تھا۔

پھوپھی ماں نہیں ہے۔ مامی ماں ہے۔ پھر لے پالک کہہ کر میں ماں بھی بدل دیتی۔ تو کیا وہ پوچھنے نہ آتا کہ پھر ماں کون ہے۔ اسی کا پتا بتاؤ۔



بیوٹی بکس کا تیار کردہ

## سوہنی ہیرائل

SOHNI HAIR OIL

- گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- بے بال آگاتا ہے
- بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے
- مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے
- یکساں مفید
- ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے



قیمت = 100 روپے

**سوہنی ہیرائل 12 جڑی بوٹیوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ تعویذی مقدار میں تیار ہوتا ہے، یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دستی خرید جاسکتا ہے، ایک بوتل کی قیمت صرف = 100 روپے ہے، دوسرے شہروں کے لئے منی آرڈر بھیج کر جسر پارسل سے منگوالیں، رجسٹرڈ سے منگوانے والے منی آرڈر اس حساب سے بھجائیں۔**

2 بوتلوں کے لئے = 250 روپے

3 بوتلوں کے لئے = 350 روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارج شامل ہیں۔

منی آرڈر بھجئے کے لئے ہمارا پتہ:

بیوٹی بکس، 53- اورنگزیب مارکیٹ، سیکٹر فور، ایم اے جناح روڈ، کراچی  
دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیرائل ان جگہوں سے حاصل کریں  
بیوٹی بکس، 53- اورنگزیب مارکیٹ، سیکٹر فور، ایم اے جناح روڈ، کراچی  
مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی  
فون نمبر: 32735021

اور میں آپ کو سنانا چاہتی تھی کہ یہ مائے کی چیز نہیں ہے کہ اب ضرورت پوری ہو گئی تو واپس لے لو۔ یہ جیتا جان انسان ہے اور بہت لمبی تقریر تیار کر کے لے کر آئی تھی۔ میرے دل میں کیا چل رہا تھا۔ میں نے نہیں نہیں بتایا۔ اور پھر مجھے دنیا کی جواب دہی کا بھی خیال تھا۔ اور آپ کے پاس پورا پلان تھا۔ ہم بچہ کیسے رکھ سکتے ہیں۔ مجھے وہ سن کر بھی غصہ آ رہا تھا۔ میں غصے سے کھولتی۔ پیر پختی کمرے سے نکل گئی۔ باہر لان میں کھلنے لگی۔

اور باہر لان میں ایک کونے میں وہ اپنی کتابیں کھولے بیٹھا تھا۔ میں اسے کتنی ہی دیر تک دیکھتی رہی۔ کبھی لگتا وہ تم ہو اور کبھی لگتا میں آئینہ دیکھ رہی ہوں۔ وہ بڑھ رہا تھا۔ مجھے لگا وہ رو بھی رہا تھا۔ ہاتھ کی پشت سے آنسو پوچھتا تھا اور پھر سے سوال کرتا تھا۔ نکلنے کس جذبے کے تحت میں اس تک چلی گئی۔ وہ واقعی رو رہا تھا۔ حساب کی کاپی پر جگہ جگہ ٹپ ٹپ آنسو کر رہے تھے۔

”کیوں رو رہے ہو؟“

”مجھے تھری فنگر زوالے پس کے سوال نہیں آتے اور کل ٹیسٹ ہے۔“

”نچرنے نہیں بتائے۔ ٹیوشن نہیں پڑھتے تم؟“

”بتایا تھا۔ ٹیوشن بھی پڑھتا ہوں۔ مگر یہ سوال مجھے فیل ہونا اچھا نہیں لگتا۔“

”تو پھر کیسے حل کر رہے ہو۔ ایک ہی سوالوں کو بار بار پاریوں لکھ رہے ہو؟“

وہ اس سوال پر ذرا سا ہچکچایا۔ کچھ سوال جواب کے ساتھ متعدد بار لکھے تھے۔

”میں انہیں اتنی بار لکھ لوں گا۔ کہ جب امتحان میں آئیں گے تو مجھے معلوم ہوگا کہ اس کا آئسرو (جواب) کیا ہے۔“

”کیا؟“ میں حق دق رہ گئی۔ ”اور اگر فنگر زچینج کر کے سوال آگئے تو؟“

”تو کیا۔“ اس کے حلق میں آنسوؤں کا پھندہ بن گیا۔ اسی خدشے سے تو رونا آ رہا تھا۔ ”فیل ہو کر

ڈھونڈ کر ابھرنا میں نے بہت بچپن میں سیکھ لیا تھا۔ اس کی آنکھوں کا شکوہ اس کے جملے اس کا حلیہ۔ وہ ہمارا بیٹا ہو کر۔ ہم سے اتنا الگ کیوں لگتا تھا؟

تم صحیح کہتے ہو مجھے خود پر قابو پانا چاہیے تھا۔ کہہ رہی ہوں۔ اس کی صورت دیکھتے ہی میرا دل کمپیوٹر بن گیا۔ جمع تفریق جوڑ توڑ۔ اسے یہ کہہ کر بسلاؤں گی۔ اور دنیا کو وہ کہہ کر شلادوں گی۔ لیکن۔ تو روتے لگی۔ لیکن جب میں۔ میں نے جیسے شدید تکلیف میں گھر کر آنکھیں میچی تھیں۔ میں کا خون دیکھا لال سرخ گاڑا۔ بری طرح بہتا ہوا خون۔ بس سنان! میں بھول گئی کہ دنیا تماشا گاہ ہے۔ دنیا کے پاس سنگسار کرنے کا اجازت نامہ بھی ہے۔ میں بھول گئی تھی۔ میں ایک دنیا کے سامنے کھڑی ہوں اپنا نام بھول گئی۔ اپنا مقام، عہدہ، قدر و منزلت۔ سدرہ کو بھول گئی تھی۔ شہیر کو بھی۔ تم بھی یاد نہ رہے، کچھ یاد نہیں رہا۔ کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ نظر آتا تھا تو بس خون۔ وہ خون جو میرا اپنا تھا۔ وہ تکلیف کے احساس سے ماورا ہو کر۔ کرچیوں سے کھیل رہا تھا۔ اور موت میری ہو رہی تھی، تکلیف ایسی تھی جیسے ملک الموت نے سانس نہ رگ پر لا کر روک دیا ہو۔ نہ میں زندوں میں۔ نہ مردوں میں اور یہ سب میری وجہ سے۔ ”وہاں ہی انداز میں اپنا ہاتھ سر پر مارنے لگی۔

”ہماری وجہ سے شجرہ؟“ سنان کا لہجہ چور چور تھا۔ شجرہ نے ہاتھ ہوا میں چلایا۔ جیسے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وجہ کے لیے میں کا صیغہ استعمال کیا جائے یا ہم کا۔

”تپانے ہمیں بلایا تھا۔“ وہ اپنے آنسو پونچھ کر۔ گلا صاف کر کے دوبارہ بولنا شروع ہوئی۔ ”وہ کہہ رہی تھیں۔ وہ اسے اب مزید نہیں رکھ سکتیں۔ میں تم سے لڑتی الجھتی گئی تھی سنان! بلکہ جانا چاہتی بھی نہیں تھی۔ میں بیورو کرسی کی ایک افسر بن چکی تھی اور افسر بننے کے بعد آپ کو پتا لگتا ہے۔ اب مزید آپ اور کیا کیا بن سکتے ہیں۔ ایسے میں بچہ۔ ایک نیا جینٹلمن

جو تماشا گلے گلے شاید فی وی پر خصوصی پلیٹن چلے یا اخبار کی مین اسٹوری بن جائے۔ پورے ملک سے چھانٹ کر بنائے جانے والے افسر۔ جو ہر ہلو سے نمبروں بے عیب ہوں تب ہی چنے جاتے ہیں۔ اور اپنی ذاتی زندگی میں وہ ایسے کام کرتے ہیں۔ اس پر پھر دنیا کی ہر ذرہ سرائی۔“

”کوئی بات نہیں نکاح ہو چکا ہے۔“ اس جملے نے کتنی بے فکری دے دی۔ نکاح اللہ کے لیے تھا اور رخصتی دنیا کے لیے۔

”میری ذہانت نے بڑے بڑوں کو بچھا ڈیا۔ اور تم یہ ڈھیر کتابیں لئے بیٹھے ہو نکاح ہماری سیف سائیڈ بن گیا۔ جب کہ وہ سب جو ہوا سراسر لاپرواہی تھی۔ معاشرے کے اصول و قوانین۔ اقدار۔ روایات۔

دن کو سنوارنا ہو تو دنیا بہتر رکھنی پڑتی ہے اور دنیا کو سنوار کر رکھا جائے تو آخرت بہتر ہو جاتی ہے۔

ہم دین کے احکام اور دنیا کے چلن کو ساتھ لے کر چلنے والے کامیاب و کامران ہوتے ہیں۔ ایک کو رکھ گئے ایک کو چھوڑ دیا جائے تو انجام کار وہی ہوتا ہے جو آج ہوا۔ جو تماشا ہوا۔ اور جو مزید ہونے والا ہے۔“

اس کی آواز ٹھہرائی تھی۔

”جب ہم سب ملے کر چکے تھے۔ کہ میں اپنا بزنس باہر سیٹ کر لوں گا۔ اور تم کہیں باہر پوسٹنگ کرواؤ گی۔ پھر ہم تینوں بچوں کو ساتھ رکھیں گے۔ تو آج خود پر قابو رکھتیں ناں۔“ سنان نے نیبل پر دھرے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

شجرہ نے جملہ تحمل سے سنا۔ وہ اپنے اور اس کے ہاتھ کو دیکھ رہی تھی۔ (ہاتھ پکڑنے سے تو ابتدا ہوئی تھی۔ سہلا قدم)

”نہیں رکھ سکی قابو۔“ اس نے بہت جارحانہ انداز سے اپنا ہاتھ کھینچا اور دل پر رکھ لیا۔ ”وہ کبھی نہیں رویا۔ خود کو کمپوز کر کے مروانہ وار کھڑا ہونا اس کی فطرت ہے یہ عادت اس نے مجھ سے لی سنان! میں بھی تب روتی تھی جب ہر جانب سے راہیں محدود ہو جاتیں۔ رونے کے بجائے کسی بھی شے کا حل

جو تماشا گلے گلے شاید فی وی پر خصوصی پلیٹن چلے یا اخبار کی مین اسٹوری بن جائے۔ پورے ملک سے چھانٹ کر بنائے جانے والے افسر۔ جو ہر ہلو سے نمبروں بے عیب ہوں تب ہی چنے جاتے ہیں۔ اور اپنی ذاتی زندگی میں وہ ایسے کام کرتے ہیں۔ اس پر پھر دنیا کی ہر ذرہ سرائی۔“

”کوئی بات نہیں نکاح ہو چکا ہے۔“ اس جملے نے کتنی بے فکری دے دی۔ نکاح اللہ کے لیے تھا اور رخصتی دنیا کے لیے۔

”میری ذہانت نے بڑے بڑوں کو بچھا ڈیا۔ اور تم یہ ڈھیر کتابیں لئے بیٹھے ہو نکاح ہماری سیف سائیڈ بن گیا۔ جب کہ وہ سب جو ہوا سراسر لاپرواہی تھی۔ معاشرے کے اصول و قوانین۔ اقدار۔ روایات۔

دن کو سنوارنا ہو تو دنیا بہتر رکھنی پڑتی ہے اور دنیا کو سنوار کر رکھا جائے تو آخرت بہتر ہو جاتی ہے۔

ہم دین کے احکام اور دنیا کے چلن کو ساتھ لے کر چلنے والے کامیاب و کامران ہوتے ہیں۔ ایک کو رکھ گئے ایک کو چھوڑ دیا جائے تو انجام کار وہی ہوتا ہے جو آج ہوا۔ جو تماشا ہوا۔ اور جو مزید ہونے والا ہے۔“

اس کی آواز ٹھہرائی تھی۔

”جب ہم سب ملے کر چکے تھے۔ کہ میں اپنا بزنس باہر سیٹ کر لوں گا۔ اور تم کہیں باہر پوسٹنگ کرواؤ گی۔ پھر ہم تینوں بچوں کو ساتھ رکھیں گے۔ تو آج خود پر قابو رکھتیں ناں۔“ سنان نے نیبل پر دھرے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

شجرہ نے جملہ تحمل سے سنا۔ وہ اپنے اور اس کے ہاتھ کو دیکھ رہی تھی۔ (ہاتھ پکڑنے سے تو ابتدا ہوئی تھی۔ سہلا قدم)

”نہیں رکھ سکی قابو۔“ اس نے بہت جارحانہ انداز سے اپنا ہاتھ کھینچا اور دل پر رکھ لیا۔ ”وہ کبھی نہیں رویا۔ خود کو کمپوز کر کے مروانہ وار کھڑا ہونا اس کی فطرت ہے یہ عادت اس نے مجھ سے لی سنان! میں بھی تب روتی تھی جب ہر جانب سے راہیں محدود ہو جاتیں۔ رونے کے بجائے کسی بھی شے کا حل

جو تماشا گلے گلے شاید فی وی پر خصوصی پلیٹن چلے یا اخبار کی مین اسٹوری بن جائے۔ پورے ملک سے چھانٹ کر بنائے جانے والے افسر۔ جو ہر ہلو سے نمبروں بے عیب ہوں تب ہی چنے جاتے ہیں۔ اور اپنی ذاتی زندگی میں وہ ایسے کام کرتے ہیں۔ اس پر پھر دنیا کی ہر ذرہ سرائی۔“

”کوئی بات نہیں نکاح ہو چکا ہے۔“ اس جملے نے کتنی بے فکری دے دی۔ نکاح اللہ کے لیے تھا اور رخصتی دنیا کے لیے۔

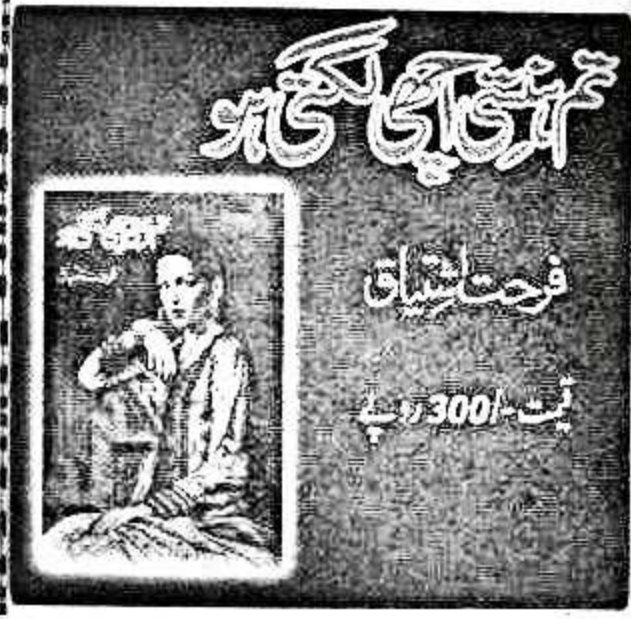


آجائیں گا۔“  
اور میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ یہ تو وہی طریقہ تھا۔ جو میں کرتی تھی۔ حل شدہ سوالوں کو اتنی بار لکھتی تھی۔ کہ مجھے ان کا لکھنا یاد رہ جاتا تھا۔ میں انگلیش کے ٹینس سمجھتی نہیں تھی۔ رٹے لگا کر اڑ کر کھیتی تھی اسی وقت مجھے یہ بھی خیال آیا کہ میرے ابو فوت ہو چکے تھے۔ اور کوئی مجھے پرہیز نہیں تھا۔ سمجھتا نہیں تھا۔ اور میں بھی اسی طرح کسی خفیہ کونے میں بیٹھ کر ایسے ہی لکھتی تھی۔ اور خدشوں میں گھر کے بے آواز روٹی تھی۔  
مجھے احساس ہوا کہ میرے ابو اللہ کی طرف سے نہیں تھے اور اس کے ماں اور باپ دونوں تھے اور وہ ہو ہو مجھ پر گیا تھا۔ وہ میرا بیٹا تھا۔ سن! اور وہ ایک لمحہ تھا جب میرے دل کی زمین متحی ہوئی۔ وہ اندر سا گیا۔ میں نے اسے گود میں اٹھالیا۔ اور کہا۔ میں اسے سوال سمجھا دوں گی۔ اور گود میں بھرنے کے بعد احساس ہوا کہ وہ کتنی بڑی نعمت تھا۔ خوشی تھا۔ خوشبو تھا۔ میرا رخت جگر۔  
لیکن اسے بڑا اپنانے کی راہ میں اتنے سال گزر گئے۔ وہ ہانپ گئی اور ہچکیوں سے رونے لگی۔  
”میں نے اپنی پوری زندگی میں کبھی دھوکا نہیں دیا۔ میں کچھ معاملات میں خود غرض ضرور تھی۔ مگر کھینڈ بھی تھی۔ جو ایک بار کر لیا۔ کہہ دیا۔ وہی کروں گی۔“  
”تمہیں آج تک ایک بات کی خبر نہیں۔“  
وہ روتے چہرے کے ساتھ بہت دل سے مسکرائی۔  
”سن! نے حیرت سے اسے دیکھا۔  
”اتنی کامیابیوں کو بھرتے ہوئے راستے میں بہت لوگ ملے۔ کہتے تھے مجھے تو کچھ بھی مل سکتا ہے۔ قابل ذہن، اتنی ی ی ی بڑی افسر۔ اور بہت خوبصورت بینک۔ پھر ایک درمیانے درجے کے بزنس مین کے ساتھ۔ جو کچھ بناتا نہیں۔“  
وہ بات روک کر پھر سے مسکرائی۔ سن! کے چہرے کو دیکھا جس پر سایہ سا ہوا تھا۔  
”پتا ہے میں نے کیا کیا۔ ان لوگوں سے۔ اور خود

سے بھی۔ تم میرے دوست تھے۔ رہو رہو ہنسنا۔ جس کا ہاتھ پکڑ کر میں نے دنیا دیکھی۔ میری طلبہ۔ میری خواہش۔ میری محبت۔ اور۔“  
(سن! کا چہرہ اپنے رنگ میں واپس لوٹ گیا۔ شجرہ نے کبھی ایسے الفاظ میں اظہار نہیں کیا تھا۔ سن! نے زندگی بھر اسے شعر سنانا کر بتلایا تھا)  
”اور میری ایمان داری۔“ شجرہ نے جملہ مکمل کیا۔  
”میں نے زندگی میں جو کام بھی کیا۔ پورے دل سے ایمان داری کے ساتھ۔ جو عہد کیا اسے پورا کیا۔ کسی چیز کو راستے میں نہیں چھوڑا۔ پھر میری سیدھی زندگی میں مجھ سے اتنا بڑا بلندر کیسے ہو گیا۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی اور میں نے زندگی میں ایک نئی بات یہ بھی سیکھی کہ۔  
سچ بہت مشکل ہوتا ہے۔ لیکن یہ آپ کو مزید بہت ساری مشکلوں سے بچا لیتا ہے۔ خطا وار کو سزاوار بھی ہونا چاہیے۔  
غلطی ہم نے کی ہے تو ہم ہی بھگتیں ہیں زمین کا کیا تصور ہے کہ وہ مجھے سوالوں میں عمر کا یہ خوب صورت دور برباد کر دے۔ میں اسے ہاسٹل سے نکال لوں گی۔ میں اسے گھر لے آؤں گی۔ میرے تین بچے ہیں! میں اولاد میں بھید بھاؤ نہیں کرتی۔ مگر سن! مجھے اپنی تینوں اولادوں میں زمین سب سے پیارا ہے۔“  
اس کا لہجہ معذرت خواہانہ ہو گیا۔  
”میں سمجھ سکتا ہوں۔“  
”وہ ہماری غلطی ضرور ہے مگر اس میں خود اس کی کوئی غلطی نہیں اور اس کے ساتھ مزید کچھ برا نہیں ہونا چاہیے۔ دنیا کو جواب دہی ہم کریں گے۔“  
”میں نے اسے کبھی غلطی نہیں سمجھا وہ محبت تھا۔ جو آج بھی ہم دونوں کے سچ زندہ ہے۔“  
”محبت! شجرہ نے زرب لب کہا۔  
(ہاں وہ ضرور محبت تھا۔ لیکن انسان ہر بار محبت کے نام پر دھوکا ہی کیوں کھاتا ہے۔ غلطی ہی کیوں کرتا ہے۔ محبت بھگتتی ہی کیوں پڑتی ہے)  
”اب تم شعر نہیں سناتے سن! بہت سال پہلے

ایک نظم سنائی تھی۔ مجھے شعر سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ مگر وہ نظم دل میں اتر گئی۔ میں ان دنوں اس نظم کے زیر اثر زندگی کو جینے لگی تھی۔ ہر لفظ میرے دل میں اتر رہا تھا۔ روح میں گل رہا تھا۔ آج وہی نظم دوبارہ سناؤ۔“ اتنی کبیر صورت حال میں انوکھی فرمائش۔  
سن! چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ وہ متوقع نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔  
”کون سی نظم؟“  
”وہی وہ والی۔ محبت خواب کی صورت۔“  
سن! کو شعر اور نظمیں غریب کبھی نہیں بھولی تھیں۔ اس نے انہیں سنانا چھوڑ دیا تھا۔ بڑھتا نہیں۔  
”سناؤ سن! اس میں محبت کی ہر شکل کو بتایا گیا ہے۔ ہر روپ کو۔ مگر ایک وہ روپ بھی ہے جو میں نے اتنے سالوں بعد سمجھا۔ ایک نئی تشریح۔ ایک نئے معنی۔“  
اس کے چہرے پہ اذیت رقم ہو گئی۔ ساتھ ہی بے چینی کہ وہ نظم سنانا شروع کرے۔  
سن! کے لب کھلے۔ اس نے بے حد خوب صورت لہجے میں شراؤ کے ساتھ لفظوں کی انغمگی کو برقرار رکھتے ہوئے سنانا شروع کیا تھا۔  
محبت خواب کی صورت۔  
رات کے سن! نے اس کی آواز نے عجب ماحول پیدا کر دیا تھا۔ نظم مکمل ہوئی تو وہ شجرہ الدرد کی شکل دیکھنے لگا۔ وہ اب کیا کہے گی۔ وہ رو چکی تھی۔ حال دل سنا چکی تھی۔ اک نئی صبح رات کی گرفت سے دامن چھڑانے ہی والی تھی۔ ایک نئی صبح، امتحان، لعن طعن آزمائش، لٹھیک سوال، اشارے کرتے ہنسنے اڑاتے لوگ۔ جواب دہی کی نئی صبح۔  
سن! کو اندازہ تھا آنے والی صبح اور آگے کی مزید زندگی کیسی ہو سکتی ہے؟  
”اس نظم میں ایک اضافے کی شدید ضرورت ہے۔ شاعر نے محبت کی ہر صورت بتادی مگر مجھے تو اب بس یہی لگا۔ محبت کے نئے معنی۔“ شجرہ نے بولنا

شروع کیا اس کے چہرے کے تاثرات عجیب تھے اور آنکھوں میں خود اذیتی۔  
”محبت دماغ کی صورت۔“  
میری جمع تفریق کا تو یہی جواب آیا۔ محبت دماغ کی صورت۔“  
سن! ششدر اس کی صورت دیکھنے لگا۔ اسے لگا وہ شاید سالوں تک ایک حرف بھی نہ کہہ سکے۔ دونوں نے خاموشی اوڑھ لی۔ چھت کے عین اوپر جھولتے لیمپ کی روشنی اتنی زرد پلے تو کبھی نہیں تھی۔  
☆ ☆ ☆  
اور جشن کی اس رات کا خاتمہ بس ہونے کو تھا۔ ابلیس مردود اپنے چیلوں کے برہنہ رقص کو دیکھ رہا تھا۔ آگ، شراب، نجاست، غلاظت سے سجا ابلیس کا دربار وہ خوشی سے جھوم رہا تھا۔ لوٹیاں لگا رہا تھا۔  
”دنیا میں ہر روز ناجائز بچے پیدا ہوتے ہیں اور پھر اپنی شناخت کا سوال لے کر در در کی خاک چھانتے ہیں دنیا انہیں خوب ذلیل و رسوا کرتی ہے۔ پر تو تب تو اتنا خوش نہیں ہوتا۔“ ایک منہ چڑھا چیل سب کا ترجمان بن کر پوچھ ہی بیٹھا۔  
”ہو تو تم سب میرے شاگرد مگر تمہارے سیکھنے کو بہت کچھ باقی ہے ابھی۔ بچے ہو تم سب ابھی بچے۔“  
وہ مکر وہ آواز میں تہقکہ لگا رہا تھا۔  
”یہی تو اصل بات ہے میرے نادان، کم عقل، پیرو





# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ ٹائمہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ٹھیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رٹریوم ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریخ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں ایڈوڈنگ
- ☆ پیریم کوالٹی نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریخ
- ☆ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

**WWW.PAKSOCIETY.COM**

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

کار! ایک جائز کو ناجائز۔ صحیح کو غلط بتا کر جو مزہ اس بار لوٹا وہ تو شاید صدیوں تک یادگار ہوگا۔ اور تم سب کے لیے قابل تقلید بھی۔ غلط کو تو دنیا غلط کہتی ہے۔ مزہ تو یہ آیا کہ ہم نے صحیح کو غلط بتایا، دکھلایا اور حتمی۔ کسی کو یاد نہیں کہ نکاح ہو چکا تھا۔ وہ میاں بیوی تھے۔ یاد ہے تو بس یہ کہ شادی سے پہلے ہی رنگ رلیاں۔ ہاہاہا۔ واہ بھی واہ۔

وہ ہنستے ہنستے دہرا ہو گیا۔

”اور اگر کوئی دل بڑا کر کے نکاح یاد بھی کروا دیتا ہے تو تب بھی وہ تھو تھو ہوتی ہے کہ دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔“

لوگوں نے طلاقیں دیں۔ حرام کاری کی ہر شکل اختیار کی۔ ایک سے بڑھ کے ایک گناہ۔ کہ میرے لیے میرے لیے تفریق کرنا مشکل ہو گئی کہ کس گناہ اور غلطی کو نبھوں کہوں۔ مگر جو لطف میں نے اس بار اٹھایا۔ ”وہ سرور میں آکر جھومنے لگا۔“

”لیکن اس اوپر والے کے سامنے تو سب ٹھیک ہے؟“

نسبتاً ”نئے“ جیلے ذرا دھیسے سے کہا تھا۔

”بے وقوف!“ وہ بری طرح ناراض ہوا۔ ”اوپر والے کے پاس جب جائیں گے تب جائیں گے۔ ابھی فی الوقت تو دنیا کو جو ایدہ ہوں گے۔“

”تو کیا ہمارا کام ختم۔ اب اس ٹارگٹ پر کام نہیں کرنا کیا؟“

”بظاہر ختم ہو گیا۔ لیکن ابھی دیکھیں گے دنیا اس جائز کام پر کتنے پھر رہی ہے۔ پھر ان کے منہ سے سوال کروائیں گے۔ انہیں چین سے نہیں رہنے دیں گے۔“

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ صبح اسے دنیا کی زبان سے شجرہ الدر اور ستان الیاس کے لیے گھناؤنے سے گھناؤنے جملے نکلوانے تھے۔ ذلیل کرنے کے نئے نئے خیال دلوں میں ڈالنے تھے۔

آخر کو وہ دنیا میں اسی کام کے لیے تو بھیجا گیا تھا۔ اللہ کے دربار سے دھتکارا گیا تھا۔

”لیکن“ اگر تو ناراض نہ ہو تو ایک بات پوچھ لوں؟

نئے جیلے کی الجھن ہنوز تھی۔

”تو پوچھ پوچھ۔ تو ابھی بچہ ہے۔ سیکھے گا۔ وقت کے گا مگر تو سیکھ ہی لے گا۔“ اس نے مسکراتے ہوئے برہاوا دیا۔

”اللہ۔ میرا مطلب اللہ کے نزدیک تو وہ مجرم نہیں ہیں بل تو۔“

”لیکن دنیا کے نزدیک تو ہیں بل!“ شیطان نے تیزی سے بات کاٹ کر کہا۔

”یاد رکھ دنیا کے کسی بھی مذہب کو مانتے ہو مذہب کے احکامات کو پوری طرح ماننا ضروری ہے۔ نکاح میں گواہ اس کا اعلان اور تعلق کے بعد واپس اس تعلق کا اعلان ہے۔ غلطی تھی۔ گناہ نہیں تھا لیکن اس تعلق کے بعد اسے چھپایا گیا۔ دین کے ساتھ دنیا بھی ضروری ہے دنیا کے طور طریقے بھی اپنانے پڑتے ہیں۔ اگر وہ پوری طرح دین پر عمل کرتے۔ رخصتی کراتے۔ ایک غلطی کو گناہ نہ مانتے لیکن انہوں نے اپنی غلطی کو گناہ بنا دیا۔ اسے چھپانے کی کوشش کی۔“

”تو اللہ کے احکام ہیں۔ مذہب پر چلنا۔ تو کیا تو اللہ کے حکم کو مانتا ہے۔ تو تو منکر اول ہے ناں؟ پھر تیرے منہ سے ایسی باتیں؟“

سب چیلوں کے منہ حیرت سے کھل گئے تھے۔ شیطان نے ایسی سیکھ تو پہلے کبھی نہیں دی تھی۔

”بے وقوف! مردود۔ میں اس کا حکم نہیں مانتا۔ میں نے انکار کی قسم کھائی ہے۔ لیکن اسے تو مانتا ہوں ناں۔ روز حشر تک مومنوں کو بھڑکاتا رہوں گا۔ میں نے قسم کھائی ہے۔ مگر ان انسانوں کی کہانی سنو۔ میں تو ہوں ہی منکر۔ یہ سالے نہ تو منکری کا اقرار کرتے ہیں اور نہ ہی مانتے ہیں۔“

وہ بات ختم کر کے دربار سے باہر کو چلا۔ چیلوں کے لیے اور شاید ہم سب کے لیے بھی۔ ایک سوال چھوڑ کر۔



عفت سحر طاہر

## پریمائی دھما

اقیاز احمد اور سفینہ کے تین بچے ہیں۔ معیز، زارا اور ایزد۔ صالحہ، اقیاز احمد کی بچپن کی مگیت تھی مگر اس سے شادی نہ ہو سکی تھی اور سفینہ کو یقین ہے کہ وہ آج بھی ان کے دل میں بستی ہے۔ صالحہ مریچی ہے۔ ابیہا اس کی بیٹی ہے۔ جواری باپ سے بچانے کے لیے صالحہ، ابیہا کو اقیاز احمد کے سپرد کر جاتی ہے۔ تین برس قبل کے اس واقعے میں ان کا بیٹا معیز ان کا راز دار ہے۔

ابیہا ہاسٹل میں رہتی ہے۔ حنا اس کی روم میٹ ہے اور اچھی لڑکی نہیں ہے۔ زارا اور سفیر احسن کے نکاح میں اقیاز احمد، ابیہا کو بھی مدعو کرتے ہیں مگر معیز اسے بے عزت کر کے گیٹ سے ہی واپس بھیج دیتا ہے۔ زارا کی نند رباب، معیز میں دلچسپی لینے لگتی ہے۔

رباب، ابیہا کی کالج فیلو ہے۔ زارا کے اصرار پر معیز احمد مجبوراً "رباب کو کالج چھوڑنے پر آمادہ ہے تو ابیہا دیکھ لیتی ہے۔ وہ سخت غصے میں اقیاز احمد کو فون کر کے طلاق کا مطالبہ کر دیتی ہے۔ اتفاق سے وہ فون معیز احمد اینڈ گریٹ ہے۔ ابیہا اپنی اس حرکت پر سخت پشیمان ہوتی ہے۔ معیز رباب میں دلچسپی لینے لگتا ہے۔

صالحہ ایک شوخ المردی لڑکی ہے۔ وہ زندگی کو بھرپور انداز میں گزارنے کی خواہش مند ہے مگر اس کے گھر کا ماحول روایتی ہے۔ اس کی دادی اور ماما اس کا اقیاز احمد سے بے تکلف ہونا پسند نہیں ہے۔ اقیاز احمد بھی اس بات کا خیال رکھتے ہیں۔ مگر وہ ان کی مصلحت پسندی اور نرم طبیعت کو بزدلی سمجھتی ہے۔ نتیجتاً وہ اقیاز احمد سے محبت کے باوجود بدگمان ہونے لگتی ہے۔ اسی دوران اس کی ملاقات اپنی سہیلی شازیہ کے دور کے کزن مراد صدیقی سے ہوتی ہے۔ مراد صدیقی اسے اپنے آئیڈل کے قریب محسوس ہوتا ہے۔ وہ اس کی طرف مائل ہونے لگتی ہے۔ صالحہ کی ضد پر شازیہ اس کی ماں





سے مراد کا ذکر کرتی ہے۔ وہ غصہ میں صالحہ کو تھپڑ مار دیتی ہیں۔  
 امتیاز احمد اپنے فلیٹ پر ابیہا کو بلواتے ہیں مگر ابیہا وہاں معیض احمد کو دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتی ہے۔  
 معیض نے ابیہا کو صرف از خود طلاق کا مطالبہ کرنے پر مجبور کرنے کے لیے وہاں بلایا ہوتا ہے۔ اس کا ارادہ قطعاً منظور  
 نہ تھا مگر بات پوری ہونے سے قبل ہی امتیاز احمد ڈرائیور کی اطلاع پر وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ معیض بہت شرمندہ ہوتا ہے۔  
 امتیاز احمد ابیہا کو لے کر وہاں سے چلے جاتے ہیں۔  
 ابیہا کالج میں رہا رہا اور اس کی سہیلیوں کی باتیں سن لیتی ہے جو محض تفریح کی خاطر لڑکوں سے دوستیاں کر کے ان  
 سے پیسے پتھر کر رہا تھا۔ عموماً یہ ٹارگٹ رہا رہا کو اس کی خوب صورتی کی وجہ سے دیا جاتا ہے جسے وہ بڑی کامیابی  
 سے جیت لیا کرتی ہے۔

صالحہ کی ہٹ دھرمی سے گھبرا کر اس کے والدین امتیاز احمد سے اس کی تائید ختم کر دیتے ہیں۔ مگر وہ امتیاز احمد کو مراد کے  
 بارے میں بتا کر ان سے شادی کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔ امتیاز احمد دلبرداشتہ ہو کر سفینہ سے نکاح کر کے صالحہ کا راستہ  
 صاف کر دیتے ہیں مگر شادی کے کچھ ہی عرصے بعد مراد صدیقی اپنی اصلیت دکھانے لگتا ہے۔  
 ابیہا معیض احمد کی گاڑی سے ٹکرا کر زخمی ہو جاتی ہے۔

مراد صدیقی جواری ہوتا ہے۔ وہ صالحہ کا بھی سودا کر لیتا ہے۔ صالحہ اپنی بیٹی ابیہا کی وجہ سے مجبور ہو جاتی ہے مگر پھر  
 ایک روز جوئے کے اوڑے پر ہنگامے کی وجہ سے پولیس مراد کو پکڑ کر لے جاتی ہے۔ صالحہ شکر ادا کرتے ہوئے ایک فیکٹری  
 میں جاب کرنے لگتی ہے۔ فیکٹری میں ساتھ کام کرنے والی ایک سہیلی کسی دوسری فیکٹری میں چلی جاتی ہے۔ جو امتیاز احمد کی  
 ہوتی ہے۔ صالحہ کی سہیلی اسے امتیاز احمد کا کارڈ دیتی ہے جسے صالحہ محفوظ کر لیتی۔ ابیہا میٹرک میں ہوتی ہے جب مراد ہا  
 ہو کر واپس آ جاتا ہے اور پرانے دھندے شروع کر دیتا ہے۔ دس لاکھ کے بدلے جب وہ ابیہا کا سودا کرنے لگتا ہے تو صالحہ  
 مجبور ہو کر امتیاز احمد کو فون کرتی ہے۔ وہ فوراً آ جاتے ہیں اور ابیہا سے نکاح کر کے اسے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔  
 اس دوران معیض بھی ان کے ساتھ ہوتا ہے۔ امتیاز احمد ابیہا کو کالج میں داخلہ دلوا کر ہاسٹل میں اس کی رہائش کا بندوبست  
 کر دیتے ہیں۔ صالحہ مر جاتی ہے۔

معیض احمد ابیہا کو اسپتال لے کر جاتا ہے مگر وہاں پہنچ کر عون کو آگے کر دیتا ہے۔ ابیہا اس بات سے بے خبر ہوتی ہے  
 کہ وہ معیض احمد کی گاڑی سے ٹکرائی تھی۔ ابیہا کا پرس ایکسیڈنٹ کے دوران کہیں گر جاتا ہے۔ وہ نہ تو ہاسٹل کے  
 واجبات ادا کر پاتی ہے نہ ایگزامز کی فیس۔ بہت مجبور ہو کر امتیاز احمد کو فون کرتی ہے۔ امتیاز احمد دل کا دورہ پڑنے پر اسپتال  
 میں داخل ہوتے ہیں۔ ابیہا کو ہاسٹل اور ایگزامز چھوڑ کر بحالت مجبوری حنا کے گھر جانا پڑتا ہے۔  
 وہاں حنا کی اصلیت کھل کر سامنے آ جاتی ہے۔ اس کی ماما جو کہ اصل میں "میم" ہوتی ہیں، زور زبردستی کر کے ابیہا کو  
 اپنے راستے پر چلانے پر مجبور کرتی ہیں۔ ابیہا روتی پیتی ہے مگر ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔

امتیاز احمد معیض سے اصرار کرتے ہیں کہ ابیہا کو گھر لے آوے۔ وہ متذبذب ہو جاتا ہے۔ سفینہ بھڑک اٹھتی ہیں۔ امتیاز  
 احمد انتقال کر جاتے ہیں۔ مرنے سے قبل وہ ابیہا کے نام پچاس لاکھ روپے گھر میں حصہ اور دس ہزار ماہانہ کر جاتے ہیں۔  
 جس سے سفینہ اور ناراض ہو جاتی ہیں۔ معیض ابیہا کے ہاسٹل جاتا ہے۔ کالج میں معلوم کرتا ہے مگر وہ اسے نہیں مل  
 پاتی۔ ابیہا کا موبائل بھی حنا کے گھر میں گم ہو جاتا ہے۔ معیض یا توں باتوں میں رہا رہا اس کے بارے میں پوچھتا ہے کہ  
 اس کی رہائش سے لاعلمی کا اظہار کرتی ہے مگر حید میں غیر ارادی طور پر اس کی تعریف کر جاتی ہے۔  
 عون خاندان والوں کے بیچ ثانیہ سے معافی مانگنے کا اعلان کرتا ہے۔ ثانیہ سخت جربز ہو جاتی ہے۔  
 حنا کی میم ابیہا پر بہت سختی کرتی ہیں۔ اسے مارتی بھی ہیں۔ ابیہا کے پاس کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ مجبور ہو کر سفینہ کے  
 آفس میں ملازمت کرنے پر رضامند ہو جاتی ہے۔

معیض کے نظر انداز کرنے پر رہا رہا اسے اس کا شکوہ کرتی ہے۔ زارا ماں سے تذکرہ کرتی ہے۔ سفینہ معیض سے  
 بات کرتی ہیں۔ وہ اس سے واضح لفظوں میں رہا رہا سے شادی کا کہتی ہیں مگر معیض دو ٹوک انداز میں انہیں منع کر دیتا ہے۔

تاہم ان کے کہنے پر وہ رہا رہا کو منانے پر راضی ہو جاتا ہے۔

عون نے سب کے سامنے یہ کہہ کر معاملہ ٹال دیا کہ اسے ثانیہ کی مرضی اور خوشی مطلوب ہے۔  
 سفینہ ابیہا کو زبردستی پارٹی میں لے کر جاتا ہے۔ جہاں معیض احمد بھی عون کے ساتھ آیا ہوتا ہے مگر وہ ابیہا کو بالکل  
 پہچان نہیں پاتے۔ کیونکہ ابیہا اس وقت نیکسٹ کلف انڈازو حلیے میں ہوتی ہے۔ تاہم اس کی گھبراہٹ کو معیض اور عون  
 محسوس کر لیتے ہیں۔ ابیہا پارٹی میں بلا وجہ بے تکلف ہونے پر ایک ادھیڑ عمر شخص کو تھپڑ مار دیتی ہے۔ جواباً "سفینہ بھی اسی  
 وقت ابیہا کو ایک زوردار تھپڑ مار دیتا ہے۔ عون اور معیض احمد کو اس لڑکی کی تذلیل پر بہت افسوس ہوتا ہے۔

## نویں قسط

معیض کی آواز کی صورت ابیہا نے ایک مڑے جاں فرما سن لیا تھا گویا۔ بہت کچھ کہنا چاہتی تھی۔ مگر جذبات کی  
 شدت نے اسے گنگ کر ڈالا۔ اور ابھی اس نے معیض کی اس پکار کا جواب دے کر اپنے "ہونے" پر مہر اثبات بھی  
 ثبت نہیں کی تھی کہ اس کے کمرے کا دروازہ بے دردی سے پٹیا جانے لگا۔  
 موبائل اس کے ہاتھ سے پھسل کر چکنے فرش پر جا گرا۔ موبائل کی بیک کھل گئی اور بیٹری الگ ہو گئی۔  
 معیض سے رابطہ منقطع ہو گیا تھا۔ مگر فی الحال تو سر پہ آئی قیامت کا سامنا کرنا تھا۔ اس نے جلدی سے لرزے  
 کانپتے ہاتھوں سے موبائل کے حصے اکٹھے کر کے کونے میں پڑے کور والے ڈسٹ بن میں ڈالے اور فوراً "واش  
 روم" سے باہر نکل آئی۔ مگر ہر نکلنے سے پہلے وہ فلتس سٹم کاٹن دبانہ نہیں بھولی تھی۔  
 باہر سے آنے والی آواز حنا کی تھی۔

وہ یقیناً "اندر آنے کی کوشش میں دروازہ لاکڈیا کر مٹھو کر ہو گئی تھی۔  
 خود کو معتدل کیفیت میں لاتے ہوئے ابیہا نے تاب گھما کر لاک کھولا اور دروازہ کھلتے ہی اسے حنا کی خوشگین  
 نگاہوں کا سامنا کرنا پڑا۔

"کیا مصیبت آگئی ہے۔ اب بندہ واش روم بھی نہیں جاسکتا۔"  
 ابیہا نے اسے گھورا۔ جواباً "حنا اسے دونوں ہاتھوں سے دھکا مارنے کے اشارے میں دھکیل کر کمرے کے  
 اندر تک لے آئی۔

"تم جانتی ہو کہ یہاں دروازہ لاک کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ پھر بھی تم نے ایسا کیا۔"  
 "مجھے دھیان نہیں رہا تھا۔ پتا نہیں کیسے لاک دب گیا۔" ابیہا کی دھڑکنیں ابھی بھی بے ترتیب تھیں۔  
 اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ فون پر معیض تھا۔ یعنی کہ امتیاز احمد اسے تلاش کر رہے تھے۔ اس کا دل اطمینان سے  
 بھرنے لگا۔

"ابھی تو شکر کرو میم کو پتا نہیں چلا اور نہ تمہاری ہڈی پہلی ایک کر دیتیں۔"  
 دھمکی دینے والے انداز میں کہتے ہوئے حنا اور ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ پھر بھی شک دور نہیں ہوا تو واش روم کی  
 طرف بڑھی اور دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ ابیہا کا دل گویا ہاتھ پیروں میں دھڑکنے لگا۔



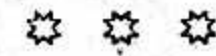
"ہیلو۔ ہیلو۔ ابیہا۔"



لائن ایک دم سے کٹ گئی تھی۔ معیذ اسے بے اختیار پکارے گیا۔  
مگر دوسری طرف ایک جامد خاموشی تھی۔

ثانیہ نے گہری سانس بھری۔ "لائن ڈراپ ہو گئی ہے شاید۔"  
"ہوں۔ یہ شاید کوئی آگیا ہو گا۔" معیذ اس وقت اسے صرف ایک مظلوم اور مدد کی طالب لڑکی کی طرح سوچ رہا تھا۔  
وہ جو بھی تھی جیسی بھی تھی۔ ایک "زندگی" تھی۔ اور کسی "زندگی" کو موت سے بچانا یقیناً "انسانیت کی دلیل" تھا۔

"اونو۔ پھر تو اس کے لیے مشکل ہو گئی ہوگی۔" ثانیہ بھی پریشان ہوئی۔  
"نی بیویز۔ تھنکس ثانیہ۔ آپ بھی ڈسٹرب ہوئیں۔" معیذ کو اس کا دھیان آیا۔  
"ارے نہیں معیذ بھائی! اتنی پیاری اور معصوم سی لڑکی ہے وہ اور مجھے یقین ہے کہ بہت برے لوگوں کے چنگل میں پھنس گئی ہے۔ اسے بچانا تو ہمارا فرض ہے۔" ثانیہ نے خلوص دل سے کہا۔  
"اوکے۔ پھر دیکھتے ہیں کیا صورت حال ہے۔" معیذ نے بات سمیٹ دی۔  
ثانیہ نے اللہ حافظ کہہ کے فون بند کر دیا۔  
معیذ کا دل طرح طرح کے ادبام میں گہرے لگا۔ بمشکل وہ خود کو لیٹنے پر آمادہ کر سکا۔ ایک تو اب اس کی نیند ویسے بھی کم ہو چکی تھی اوپر سے یہ ناگمانی حالات۔



حتاواش روم سے باہر آئی تو خالی ہاتھ تھی۔ ایسا ہانے بے اختیار اطمینان کی سانس لی۔  
"میرے خیال میں مجھے تمہارے ساتھ اسی کمرے میں آجانا چاہیے۔ میم سے بات کرتی ہوں میں۔"  
حتا نے کہا تو ایسا تھوک نکل کے رہ گئی۔  
اگر اس کے دل میں چور نہ ہوتا تو وہ پہلے کی طرح اسے یہاں سے دفع ہو جانے اور اپنی شکل کبھی نہ دکھانے کا کہہ دیتی۔ مگر فی الحال تو اس سے نگاہ بھی نہ ملا سکی۔ کمزور لہجے میں بولی۔  
"ہر بات تو مان رہی ہوں تم لوگوں کی۔ پھر بھی تمہیں کیا چاہتی ہو۔"  
"تمہاری حرکات ہی مشکوک ہیں ایسا میڈم۔ کمرے کا دروازہ لاک کر کے تم پورے ہوش و حواس میں جاگ رہی ہو۔ بستر پر ایک بھی شکن نہیں یعنی تم ابھی تک لیٹ نہیں تھیں۔" حتا واقعی انداز سے بڑھ کے خراٹہ تھی۔

"میں واش روم میں تھی۔ نیند نہیں آرہی تھی۔ گھر والے یاد آرہے تھے۔ سارے میرے اپنے من سے بات کرنے کو دل کر رہا تھا۔ اگر میرا موبائل مل جاتا تو شاید کسی کافون آہی جاتا۔" اس کی آواز واقعی رندہ گئی۔  
معیذ کافون آجانا مرنے کے منہ میں پانی ڈالنے والی بات تھی۔  
اسے احساس ہوا کہ وہ بے نام و نشان نہیں تھی۔ امتیاز احمد اپنے رشتے کی پاس داری کر رہے تھے۔ یقیناً "انہوں نے ہی معیذ کو اسے دھوڑنے پر لگایا ہو گا۔ اسے اپنی ماں کی بات یاد آئی۔  
صالح نے اسے بتایا تھا اس نے نکاح سے پہلے۔

"میں نے ایک روز غصے میں امتیاز احمد سے کہا تھا کہ تمہیں رشتے نبھانے نہیں آتے۔ مگر ایسا۔۔۔ وہ تو میری

سوچ سے بڑھ کے نکلا۔ اس نے مجھ بد نصیب کو بتا دیا کہ رشتے کیسے نبھائے جاتے ہیں۔ اور تم دیکھنا۔ وہ مرتے دم تک اس رشتے کو نبھائے گا۔"

"بھول جاؤ اب وہ سب۔ تمہارے گھر والے تو روپیٹ کے صبر شکر کر چکے ہوں گے اب تک کسی اخبار میں اشتہار نہیں لگا۔" تمہارا حتا نے اطمینان سے کہا۔

"حتا۔ تمہارا دل نہیں کرتا اس دلدل سے نکلنے کو؟" ایسا کو جانے کیا دھیان آیا۔  
"ہو نہ۔ اس لئے پشہ وجود کے ساتھ۔؟" وہ تلخی سے مسکرائی۔

"حتا! اگر کپڑا دل دار ہو جائے تو اسے دھوا جاتا ہے۔ پھینکا نہیں جاتا۔" وہ بے اختیار بولی۔  
"اپنی عزت جانے کے بعد اس وجود کو سنبھال کے کیا کروں گی اب۔" حتا نے آکٹا کر اسے دیکھا۔ اسے یقیناً یہ

بیکرا چھان نہیں لگ رہا تھا۔  
"تم کیا سمجھتی ہو اگر لڑکی کی عزت ایک بار چلی جائے تو بعد میں اسے اپنی عزت کا "احساس" بھی گنوا دینا چاہیے؟ اگر کوئی چلتے چلتے ہمیں دھکا دے کر گرا دے تو کیا ہمیں دوبارہ اٹھ کے کھڑا نہیں ہونا چاہیے؟"

ایسا ہانے بولی ہوئی تھی۔  
حتا خاموشی سے اسے دیکھنے لگی تو ایسا کا حوصلہ کچھ اور بڑھا۔ اس نے آگے بڑھ کے حتا کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے۔

"تم بھی خالموں کے ہاتھوں میں پھنس چکی ہو۔ مگر تم چاہو تو ہم دونوں اس ذلت کی زندگی سے نکل سکتی ہیں۔ تم نے سرے سے ایک زندگی شروع کر سکتی ہو۔ ایک شرم ناک زندگی کو چھوڑ کر۔"

"تم سے کس نے کہا یہ زندگی میرے لیے شرم ناک ہے؟" حتا نے پرسکون انداز میں کہا تو وہ صدے کا شکار ہوئی۔

"تم ہی نے تو کہا تھا کہ تمہاری سوتیلی ماں نے تمہیں مام کے حوالے کیا تھا۔"

"لیکن وہ تب کی بات تھی۔ اب میں انگلی تھام کے چلنے والا بچہ نہیں رہی سوٹ ہارٹ۔ اب میں اپنا شکار خود ڈھونڈتی ہوں۔"

حتا نے لطف لینے والے انداز میں کہا تو اس کی ہمدردی سے لبریز ایسا بھک سے اڑی۔  
"لعنت ہو تم پر۔" اس نے ایک جھٹکے سے حتا کے ہاتھ جھٹکے۔

"ویسے تم ہو گن خیالوں میں۔ جبکہ میں نے تمہیں اچھی طرح وارن کر دیا تھا کہ یہاں سے تمہیں اب موت ہی نکال سکتی ہے اور کوئی نہیں۔" حتا نے اسے گھورتے ہوئے دھمکایا اور یہاں آنے کے بعد آج یہ پہلی بار تھا کہ ایسا نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

"اللہ موت سے بھی بڑا ہے حتا۔"

"ہاں۔ تو پھر یہاں بیٹھ کے اللہ مدد کا انتظار کرو، لیکن میں میم کو تمہارے افکار ضرور پہنچا دوں گی۔ شاید وہ تمہارا کوئی بہتر حل سوچ سکیں۔"

وہ اسی دھمکی آمیز انداز میں کہتے ہوئے چلی گئی تو ایسا نے آنکھیں موند کر ایک گہری سانس لی۔  
اس کا شدت سے جی چاہا کہ جا کے موبائل نکال کے دوبارہ سے ثانیہ کو کال کرے، مگر فی الحال وہ ایسا کوئی رسک لینا نہیں چاہتی تھی کہ جس سے کسی کو اس پر شک ہو۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی، مگر پھر بھی وہ لائن آف کر کے بستر پر لیٹ گئی۔ وہ اس کھلنے والے نئے راستے کے متعلق اچھی طرح سوچ کر بلان کرنا چاہتی تھی۔



شام کو ثانیہ پھر عون کے ریٹورنٹ میں موجود تھی۔ کاؤنٹر پر کسی دیگر کو ہدایت دیتے ہوئے عون نے یوں ہی اتفاقاً نظر اٹھا کے دیکھا تو اینڈنٹ آنے والی کسی لڑکی کے لیے دروازہ کھول رہا تھا۔

عون کی نظر نے پلٹ کے آنے سے انکار کیا۔  
ویٹر کو بوجھت رخصت کرتا وہ لپک کر داخل دروازے کی طرف بڑھا۔  
”ہیلو۔“ وہ عین ثانیہ کے سامنے جا کھڑا ہوا جو پورے ہال پر طائرانہ نگاہ دوڑا رہی تھی۔  
”اسلام علیکم! تمہیں ان سے شاید ملنے کی ضرورت تھی۔ مگر عون نے اس طنز کو بھی تحفے کی طرح لیا۔  
”وعلیکم السلام مجھے کال کرتی ہیں آجائے۔“ وہ بے لفظوں میں کہا۔  
”میں یہاں معیض بھائی سے ملنے آئی ہوں۔“ ثانیہ کا انداز حتمی والا زیادہ تھا یا پتہ نہ تھا۔ عون سمجھ نہیں پایا۔ مگر تپ ضرور گیا۔

”تو اس ملاقات کے لیے میرا ریٹورنٹ ہی رہ گیا تھا کیا؟“

”ہکسکوزی۔ کیا ماموں جان نے یہ ریٹورنٹ تمہارے نام کر دیا ہے؟“  
آنکھیں پھیلا کر وہ کچھ اس معصومیت سے اپنی حیرت کا اظہار کر رہی تھی کہ عون کا دل پہلو میں لوٹ پوٹ ہو کر رہ گیا۔ وہ خود ہی ایک کارنر ٹیبل کی طرف بڑھ گئی۔  
”معیض نے مجھ سے تو ذکر نہیں کیا۔“  
عون نے اس کے بیٹھتے ہی اپنے لیے کرسی گھسیٹی تو اسے اپنے سامنے بیٹھتے دیکھ کر ثانیہ گہری سانس بھر کے رہ گئی۔

”میں نے انہیں یہاں بلایا ہے۔ ان کی کزن کے سلسلے میں بات کرنے کے لیے۔“  
”تم کیوں خود کو اس معاملے میں الجھا رہی ہو ثانی۔ جتنا تم نے کرنا تھا کر دیا اب بس کرو۔“ عون مضطرب تھا۔  
”وہ بہت مظلوم لڑکی ہے اور بری طرح سے ان لوگوں کے چنگل میں پھنسی ہوئی ہے۔ اگر میری تھوڑی سی مدد سے وہ وہاں سے نکل سکتی ہے تو میں ہرگز بھی پیچھے نہیں ہٹوں گی۔“ ثانیہ کا انداز اٹل تھا۔  
عون نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر گہری سانس بھری اور ہال میں نظریں دوڑاتے ہوئے بولا۔  
”مجھ سے زیادہ تمہاری ضد سے کون واقف ہو گا۔“ پھر قدرے توقف سے اس کی طرف دیکھا اور جیسے لہجے میں بولا۔

”مگر میں تمہیں کسی مصیبت کا شکار ہوتے نہیں دیکھ سکتا ثانی۔“  
”میں کون سا کسی محاذ پر جانے والی ہوں۔“ ثانیہ کا انداز وہی تھا لا پرواہ۔ پھر وہ اپنی رست و راجح پر قائم دیکھنے لگی۔  
عون نے دیکھا۔ اس کی ایک کلائی میں گولڈ کی ایک خوب صورت سی چوڑی تھی اور دوسرے ہاتھ کی کلائی میں تازک سی گھڑی تھی۔ اس کی انگلیاں البتہ انگوٹھی سے خالی تھیں۔  
”اسلام علیکم۔“ معیض کی آواز پر وہ بری طرح چونکا۔ معیض شرارتی نظروں سے اسی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ جھینپا۔  
ثانیہ کو دیکھتے ہوئے اسے ارد گرد کا ہوش ہی نہیں رہا تھا۔  
”یہ وقت ہے تمہارے آنے کا۔“

اپنی خفت دور کرنے کے لیے وہ رعب سے پوچھنے لگا۔ کرسی گھسیٹ کے بیٹھتے معیض نے خفیف سا برواچکا کر

اسے حیرت سے دیکھا۔

”مجھے نہیں یاد پڑا کہ میں نے تمہیں یہاں ملنے کا کوئی وقت دیا ہو۔“  
ثانیہ نے مسکراہٹ چھپانے کے لیے مہینو کا رڈ کھول کر منہ کے آگے کر لیا۔  
عون نے وانت کچکا پاتے ہوئے معیض کو مکا دکھایا۔ جواباً اس کی حالت سے حظ اٹھاتے ہوئے معیض نے الٹا انگوٹھا دکھادیا۔ وہ زوردار آواز میں کرسی پیچھے دھکیل کے اٹھا۔  
”بھاڑ میں جاؤ تم اور۔“ غصے سے کہتے ہوئے وہ ٹھٹھا ثانیہ نے ترچھی نگاہ اس پر ڈالی تھی۔ پھر وانت پیس کر بات مکمل کی۔  
”اور تم بھی۔“ وہاں پر پختا وہاں سے گیا تھا۔  
”کمال ہے۔ یہ تو کسی کو اپنے آگے بولنے ہی نہیں دیتا۔ آپ کیسے قابو کر لیتے ہیں اسے۔“  
ثانیہ متاثر ہونے والے انداز میں بولی۔

”یار ہے میرا یہ سب تو اس کی ایکٹنگ ہے۔“ معیض مسکرایا۔  
اور اس مسکراہٹ میں دوستی کے سارے رنگ تھے۔ ایک بہترین دوست کے ہمیشہ ساتھ ہونے کا احساس تھا۔

”انتہائی جذباتی مبلد باز غیر مستقل مزاج۔“ ثانیہ سنجیدہ تھی۔  
اس کا یہ تجزیہ عون عباس کے متعلق تھا۔ کھلم کھلا اور بے لاگ تجزیہ۔ معیض قدرے محتاط ہوا۔  
”آپ نے اپنے معاملے میں اسے ایسا پایا ہو گا۔ ورنہ وہ ایک بے حد پر خلوص انسان ہے۔ دوستوں کی پشت پر ہمیشہ کھڑا رہنے والا۔“  
”لحہ بھر کے توقف کے بعد وہ مسکرا کر بولا۔  
”شاید کچھ اس طرح کا شعر ہے کہ!

عدم خلوص کے لوگوں میں ایک خامی ہے  
ستم عریف بڑے جلد باز ہوتے ہیں

”خیر۔ میں یہاں آپ سے کسی اور معاملے پر بات کرنے آئی ہوں۔“  
وہ ایک دم ہی سے اپنا آپ لپیٹ گئی۔ شاید خیال آیا ہو کہ ابھی معیض اتنا قابل اعتبار بھی نہ تھا کہ وہ اپنی پراہمنز شیر کرنا شروع کر دیتی۔

”جی۔ ضرور۔“ معیض اس کی بات فوراً سمجھ گیا تھا۔  
اسی وقت ویٹر نے دونوں کے سامنے ان کے پسندیدہ ڈرنگس لاکر رکھے۔  
”میں نے تو آرڈر نہیں کیا تھا۔“ ثانیہ نے کہنا چاہا۔  
”یہ عون عباس کا خلوص ہے میڈم۔ ابھی کچھ دیر بعد وہ ناہم دونوں سے کفرم کیے عین ہماری پسندیدہ ڈشز پر بنی ڈشز بھی کروائے گا۔“  
ویٹر کے جانے کے بعد معیض نے بڑے فخر کے ساتھ دوست کی بڑائی بیان کی۔ جسے ثانیہ نے قطعاً ”نظر انداز کر دیا۔“

”ظاہر ہے ایک ہوٹل چلانے والا ان کاموں میں ماہر ہی ہو گا۔“ لایروائی سے بات بدلتے ہوئے بولی۔



”پنی دینے۔ ایسہا سے دوبارہ رابطہ ہوا؟“ معین نے پوچھا تو ثانیہ نے نفی میں سر ہلادیا۔  
 ”میں اسے کال بھی نہیں کر رہی۔ کہیں موبائل کسی اور کے ہاتھ نہ لگ گیا ہو۔“  
 ”ہوں۔“ معین کا انداز سوچ تھا۔ ”ایسی صورت میں تو تمہیں کال آچکی ہوتی۔“ وہ بے ساختہ بولا۔ پھر  
 خفیف سا ہو کر معذرت کرنے لگا۔

”آم سوری۔ آئی مین آپ کو کال آچکی ہوتی۔“  
 ”ٹس ٹس اے بگ ڈیل معین بھائی! آپ مجھے تم کہہ سکتے ہیں۔“ وہ مسکرائی۔  
 ”کچھو کچھو کلی میری چھوٹی بہن بھی تمہاری ہی اتج کی ہے۔ اس لیے ہی منہ سے آپ جناب نہیں نکل رہا۔“  
 معین بھی مسکرا کر بولا۔

”اوکے۔ اس کا مطلب ہے کہ اس وقت جب وہ ہم سے بات کر رہی تھی۔ کوئی آگیا تھا اور اب وہ مناسب  
 موقع کی تلاش میں ہے۔“

ثانیہ نے تائیدی انداز میں سر ہلادیا۔  
 ”لگتا تو یہی ہے۔ واقعی اگر موبائل کسی کے ہاتھ لگتا تو وہ سب سے پہلے میرے نمبر پر کال کر کے چیک کرتا۔“  
 ”اس کا مطلب ہے کہ ہمیں اس کی اگلی کال کا انتظار کرنا چاہیے۔“ معین کی پیشانی پر سوچ کی شکنیں تھیں۔  
 ”اور اگر اسے وہاں موقع نہ ملا تو کیا ہم انتظار ہی کرتے رہیں گے؟“ ثانیہ کچھ اور گہرائی میں سوچ رہی تھی  
 شاید۔ معین چونک کے اسے دیکھنے لگا۔

”یہ نہ ہو کہ بہت دیر ہو جائے۔ آپ نہیں جانتے۔ معین بھائی! میں نے اس کی آنکھوں میں کتنا خوف اور  
 دوسوے دیکھے ہیں۔“ ثانیہ مضطرب تھی۔

تب پہلی بار معین کو محسوس ہوا کہ وہ ایسہا سے ملنے کے بعد کافی ڈسٹرب تھی۔  
 ”اس کا خوف بالکل دنیا کی بھیڑ میں کھو جانے والی بچی کا سا ہے۔ معین بھائی! جب اس نے مجھ سے امتیاز احمد  
 کے بارے میں پوچھا تو میں نہیں جانتی تھی کہ وہ آپ کے والد کے متعلق بات کر رہی ہے۔ میرے انکار پر وہ مجھ  
 گئی۔ بلکہ مجھے الفاظ نہیں ملے کہ میں آپ کو اس کی کیفیت بتا سکوں۔“ معین ساکت سا سن رہا تھا۔  
 ”ہمیں مزید انتظار نہیں کرنا چاہیے۔ اسے وہاں سے فوری طور پر نکالنا چاہیے۔“ ثانیہ بے حد سنجیدہ تھی۔  
 پھر وہ اپنا کولڈ ڈرنک کا گلاس خالی کرنے لگی۔ جبکہ معین ابھی تک یوں ہی اسٹراگلاس میں گھما رہا تھا۔  
 ”میں اس معاملے کو پولیس کیس نہیں بنانا چاہتا۔ کل کو بات میرے گھر پہ بھی آسکتی ہے۔“  
 ”بالکل ٹھیک۔“ ثانیہ نے اطمینان سے کہا۔ ”اور میں نے اس کا متبادل سوچ لیا ہے۔“

معین نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”وہ کیا؟“  
 ”وہ یہ کہ میں دوبارہ سفیان حمیدی کے آفس میں جاؤں گی، جاب کے بہانے سے۔“  
 ثانیہ نے ڈرامائی انداز میں حل پیش کیا اور ابھی معین کچھ بولا بھی نہیں تھا کہ عون نے جھک کر ٹیبل پر دونوں  
 ہاتھ نکاتے ہوئے خشکیں انداز میں کہا۔

”خبردار۔ تم ایسا کچھ نہیں کرو گی۔“ وہ دونوں اس کے قطعی انداز پر بری طرح چونکے تھے۔



حنانے جانے میم کے کانوں میں کون سا اسم پھونکا کہ نہ صرف انہوں نے رات کو حنا کو اس کا کمرہ شیر کرنے کا

آرڈر دے دیا، بلکہ ایسہا کی حرکات و سکنات پر نظر بھی کڑی ہو گئی۔

شاید حنا کو ایسہا کی باتوں سے بغاوت کی بو آگئی تھی۔ ایسہا کو اپنی خواہ مخواہ کی جذباتیت پر افسوس ہوا۔ اس نے  
 ناحق حنا کو اس گندگی سے نکلنے کی آفر کی حالانکہ وہ اب تک حنا کی اصلیت اور فطرت دونوں کو اچھی طرح جان گئی  
 تھی۔ ایسہا نے ڈسٹ بن میں سے موبائل نکال کر آف حالت میں ہی ٹشو پیپر زمیں پلیٹ کر اپنے شوڈر بیگ میں  
 ڈال لیا۔

اب کی بار وہ حنا سے دھوکا نہیں کھانا چاہتی تھی۔ اسے علم ہو چکا تھا کہ بہت پلاننگ کے ساتھ اس کا پرانا  
 موبائل چرا کر اسے بے دست و پا کیا گیا تھا۔

آفس کے اندر تک اسے ڈرائیور چھوڑ کے جاتا تھا۔ وہاں سے نکل بھاگنے کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ سو۔  
 ایک آخری امید یہ موبائل فون تھا۔ شاید معین اور امتیاز احمد کچھ کہیں۔

وہ بہت پر امید ہو گئی تھی۔ آفس میں وہ کسی طور بھی موبائل استعمال نہ کر سکتی تھی۔ ہر بل کسی کے آجانے کا  
 ڈر رہتا۔ اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔

وہ ٹشو پیپر زمیں لپٹا موبائل ہاتھ میں لیے لیڈی زواش روم میں چلی آئی۔ یہ ہاتھ روم کوریڈور میں تھا۔  
 دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے پاور کاٹن دیا تو چند۔ سیکنڈز کے بعد اسکرین روشن ہوئی مگر ساتھ ہی موبائل  
 سے ابھرنے والی دلکش سی موسیقی نے اسے گڑبڑادیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں بھیج کر موبائل کو سینے سے لگا کر  
 اس کی آواز دبانے کی کوشش کی۔

موبائل کو سائفلنٹ پر لگا کر اسے قدرے تسلی ہوئی۔ وہ ثانیہ کو کال کرنے کا رسک نہیں لینا چاہتی تھی۔ واٹس  
 روم میں موبائل پر باتیں کرنا کسی کو بھی اس طرف متوجہ کر سکتا تھا۔

تب ہی اس کے موبائل کی اسکرین روشن ہوئی۔  
 ایک دو تین۔ لگاتار کئی میسجز ان باکس میں آ گئے۔

ایسہا نے جلدی سے میسجز دیکھے۔ وہ سب ہی ثانیہ کے تھے۔ جن میں اس کی خیریت پوچھی گئی تھی۔ ایسہا  
 کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس دنیا میں کوئی تو تھا جسے اس کی فکر تھی۔

وہ ایس ایم ایس کرنے میں اٹاڑی تھی۔ بمشکل اپنی خیریت کا پیغام ثانیہ کو بھیج کر پائی۔ اور پھر فوراً ہی واٹس  
 روم سے باہر نکل آئی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

سیفی کمرے کے وسط میں شملارک کرکھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔



عون نے صاف لفظوں میں اسے سفیان حمیدی کے آفس جانے سے منع کر دیا تھا۔  
 ثانیہ نے اختلاف کرنا چاہا، مگر معین نے اسے روک دیا۔

”معون ٹھیک کہہ رہا ہے ثانیہ۔ تمہیں اس کی بات ماننی چاہیے۔“  
 اس وقت تو وہ خاموش ہو گئی۔ کیونکہ وہ معین کے سامنے کوئی ڈراما نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مگر گھر آ کے اس نے

عون کو کال کر کے خوب سنائیں۔  
 ”دیکھو ثانیہ! تم پر ذرا سی بھی آج آئے میں برداشت نہیں کر سکتا۔“ عون کا لہجہ نرم تھا۔

”کوئی مجھے کھانا نہیں جاتا عون عباس۔“ وہ چڑی۔  
 ”یہاں پہلی کیٹنگر می نظروں سے کھانے والوں کی ہے، یہ بات یاد رکھنا۔“ عون نے تنبیہ کی۔



”خیر۔ نظروں کے معاملے میں شریف کیا اور بد معاش کیا۔“ ثانیہ نے طنز کیا۔ جو فریق ثانی تک بحفاظت پہنچا۔  
”نظر۔ نظر میں فرق ہوا کرتا ہے ثانی۔“ وہ اس کے معاملے میں حد درجہ متحمل مزاج بن جاتا تھا۔  
بہر حال عون نے لمبی بحث کے بعد بھی اسے وہاں جا بک کرنے کا ٹانگ کرنے کی قطعی اجازت نہ دی تھی۔  
آفس آنے سے پہلے اس نے دل مضبوط کر کے اپنی دوسری رسم سے اینسہا کے نمبر پر دو چار مسیج بھیجے مگر اسے ایسی ہی ہوئی۔ کوئی جواب نہ آیا تھا۔

اور اب۔  
جبکہ وہ باس کے ساتھ ایک میٹنگ میں سر کھپاتے کے بعد بحال سی بیٹھی تھی تو اس کے موبائل کی مسیج ٹون بجی۔

اس نے ان باکس چیک کیا۔ پورے کا پورا عون کے پیغامات سے بھرا ہوا تھا۔  
اس نے بے ارادہ ایک مسیج کھولا۔

چلو ایسا کرتے ہیں تم پہ مرتے ہیں  
ہم نے ویسے بھی تو مر ہی جانا ہے

”لا حول ولا۔۔۔“ ثانیہ کا دل لرز سا گیا۔ اس نے فی الفور مسیج ڈیلیٹ کیا وہ ٹھکی۔  
اینسہا۔ یہ اینسہا کا مسیج تھا۔ اس نے بے تابی سے مسیج چیک کیا۔  
”میں بالکل ٹھیک ہوں۔ کال پہ رابطہ نہیں کر سکتی۔ حنا ساتھ ہوتی ہے رات میں۔“  
ثانیہ نے پورا ان باکس کھنگال ڈالا۔ مگر اینسہا کا صرف ایک ہی پیغام تھا۔ وہ پیغام معیذ کو فارورڈ کرنے کے بعد ثانیہ نے جلدی سے معیذ کو کال ملائی۔

”اینسہا کا مسیج ملا ہے۔ میں نے آپ کو فارورڈ کر دیا ہے۔“

”چھا۔ کیا لکھا ہے؟“ معیذ الارٹ ہوا۔

”خیریت سے ہے۔ مگر اس کی مگرانی سخت ہے۔ اسی لیے وہ رابطہ نہیں کر پار ہی۔“  
”ہوں۔۔۔“ معیذ نے دلی سانس خارج کی۔

”آپ پولیس ریڈ کیوں نہیں کراتے وہاں؟“ ثانیہ کو یہی آسان حل دکھائی دیا تھا۔

”ان لوگوں کا نیٹ ورک بہت اسٹرونک ہے۔ میں میڈم رعتا پر کافی ریسرچ کر چکا ہوں۔ تم سوچ نہیں سکتیں۔  
اس کے ہاں کون کون سے عہدوں کے لوگ آتے ہیں۔ اس کی جوتیاں سیدھی کرنے والے ہماری مدد کیا کریں  
گے ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ بات پہلے ہی لیک آؤٹ ہو جائے اور میڈم رعتا سے غائب ہی کر دے۔“  
معیذ نے تفصیل سے بتایا تو ثانیہ چپ سی رہ گئی۔ پھر لمحہ بھر کے توقف کے بعد اس نے کہا۔

”معیذ بھائی! آپ عون کو سمجھائیں۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا تھا۔ وہاں جا کر اینسہا کے حالات  
سمجھ کر میں اس کی مناسب انداز میں مدد کر سکتی ہوں۔“

”نہیں ثانیہ! میں اس کام کے لیے عون کو کبھی مجبور نہیں کروں گا۔ ہاں۔۔۔ بات اگر عون کی ہوتی تو میں اسے  
زبردستی مجبور کر سکتا تھا۔“ معیذ نے شائستگی سے پہلو بچالیا۔

”لیکن میں خود اپنی مرضی سے کہہ رہی ہوں۔“ ثانیہ نے احتجاج کیا۔

”لیکن تم اس کے نکاح میں ہو۔ اس کی مرضی اور خوشی کی پابند۔“ معیذ نے بے ساختہ اسے یاد دلایا۔

”شکری الحال میں اپنے والدین کے گھر میں ہوں۔ عون کی پسند و ناپسند مجھ پر اس طرح سے فرض نہیں ہے۔“  
ثانیہ نے خفگی سے کہا۔

”مینی وینس۔ میں تمہاری آفر پر شکریہ ادا کرتا ہوں۔ تم نے خلوص دل سے مجھے یہ پیش کش کی تھی۔ مگر میں  
عون سے متفق ہوں۔ پہلے ہی اینسہا وہاں چھنسی ہوئی ہے۔ ہم مزید کوئی پریشانی انورڈ نہیں کر سکتے۔“  
معیذ نے اسے سراہتے ہوئے نرمی سے بات ختم کر دی۔

”یہ سب عون کا قصور ہے۔ اچھی بھلی ایک معصوم لڑکی کی جان بچانے کی نیکی کرنے والی تھی میں۔ لے کے  
اعتراض جڑو یا۔“ ثانیہ نے دانت پیسے۔

اسی وقت اس کا موبائل بجنے لگا۔

عون کا نام اسکرین پر جگمگاٹا دیکھ کر اس نے گہری سانس بھری۔

”شیطان کو یاد کیا اور شیطان حاضر۔“ اس نے کال اینڈ کرتے ہی طنز جڑا۔

”چلو۔ تم نے کسی بہانے مجھے یاد کرنا شروع تو کیا۔“ عون کی خوش فہمی کے اپنے ہی انداز تھے۔ ثانیہ چڑی۔

”تم کون سا انیس کا پہاڑ ہو جسے یاد کرنا بہت ضروری ہو۔“

اس کی بات پر عون کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

”تمہاری وجہ سے میں ایک بے بس و مجبور لڑکی کی مدد نہیں کر پائی۔ گناہ تمہارے ہی سر جائے گا۔“ اس کا غصہ  
انداز گفتگو سے عیاں تھا۔

”کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہاں دو بے بس و مجبور لڑکیاں ہو جائیں۔“

”میں اتنی کمزور نہیں ہوں۔ اپنی حفاظت کرنا جانتی ہوں۔“ ثانیہ نے تقاخر سے کہا۔ جسے عون نے ہنسی میں  
اڑا دیا۔

”چھا۔۔۔ اپنی بلیک بیلٹ تم نے مجھے تو ابھی تک نہیں دکھائی۔ کراٹے ماٹری بھی ہو تم؟“

”مذاق مت اڑاؤ عون۔ اور تم بھول رہے ہو۔ ہمارے مابین کیا معاہدہ طے پایا تھا؟ پھر ہر معاملے میں نکاح نامہ  
نکال کے لے آتے ہو مجھ پر خواہ مخواہ کی پابندیاں لگانے کے لیے۔“ وہ زنج آکر بولی۔

”خواہ مخواہ کی نہیں صرف جائز۔“ عون نے تصحیح کی۔

”کسی مجبور کی مدد کرنے سے روکنا جائز عمل ہے؟“

”میں نے صرف مدد کرنے کے طریقے سے اختلاف کیا ہے اس کی مدد کرنے سے نہیں۔“ عون نے قہقہے سے  
کہا۔

”اس سے اچھا تھا کہ میں لندن ہی چلی جاتی۔ وہاں پر بھی تم ہی نے ٹانگ اڑائی تھی۔“ ثانیہ جل کر بولی تو عون  
نے فی الفور ٹوکا۔

”ایکسکیوز می۔ تم بھول رہی ہو۔ وہاں میں تمہیں ہنی مون پہ لے جانے کا وعدہ کر چکا ہوں۔“

”تم صرف یہ بتاؤ کہ فون کیوں کیا ہے؟“ ثانیہ کو اپنا غصہ ضبط کرنے میں دقت محسوس ہوئی۔

”کیوں۔۔۔ اب میں بغیر وجہ کے تمہیں فون بھی نہیں کر سکتا؟“ بڑے لاڈ کا مظاہرہ کیا گیا۔

”عون عباس۔۔۔“ ثانیہ کا لبہ لہجہ قہقہہ تھا۔

”بعد میں دیکھنا تمہارے گلے شکوے ہی ختم نہیں ہوں گے۔ دس دفعہ ریٹورنٹ فون کیا کروگی۔ مگر میں بڑی  
ہی ملوں گا۔“ عون نے خفگی سے کہا۔

”کاش۔۔۔“ ثانیہ نے گہری سانس بھری۔



”میری دوسری کل سے میرے فائل ایگزیکٹو اشارت ہو رہے ہیں۔ سوچا اچھے ٹیکن کے طور پر تم سے بات کر لوں۔“ وہ اب شرافت کی خون میں تھا۔  
 ”بہتر ہو تاکہ تم اچھی طرح پرہیزی ہی کر لیتے۔“ مانیہ متاثر نہیں ہوئی تھی۔  
 ”بڑی ظالم ہو یا سہ۔“ وہ کراہا۔ پھر گویا اسے ایک پیش کش کی۔  
 ”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں اور تم اچھے دوست بن جائیں اور اگر اس دوران تم میری محبت میں مبتلا ہو جاؤ۔  
 جو کہ تم ہو ہی جاؤ گی۔ تو ہم رخصتی کروالیں۔ ورنہ اچھے دوستوں کی طرح جدا ہو جائیں۔“ انداز بے حد مظلومانہ تھا۔

مانیہ چپ رہ گئی۔

”اوکے۔ میرے خیال میں تم لیٹ ہو رہی ہو۔ پھر بات کریں گے۔“  
 وہ بڑی خوب صورتی سے اس کے ہاتھ میں ایک نئی سوچ تھما کر رخصت ہوا تھا۔ جبکہ ہاتھ میں بے جان موبائل تھا مانیہ الجھن کا شکار تھی۔

\*\*\*

آفس کے معاملات تو بہت اچھے جارہے تھے۔ مگر ایسا والے معاملے نے معین کو کیا پورے گھر کو پریشان کیا ہوا تھا۔  
 سفینہ وقتی طور پر معین کی بات سمجھ کر خاموش ہو جائیں۔ مگر پھر سوچوں کے کئی دروا ہو جاتے تو ٹینشن کا شکار ہونے لگتیں۔

ان دنوں تو وہ معین سے بات کرنے کی بھی روادار نہ تھیں۔ جب سے اس نے ایسا کے لیے انکی صاف کراوائی تھی۔ ابھی بھی آفس جانے سے پہلے وہ ان کے کمرے میں گیا تو اسے دیکھ کر انہوں نے یوں آنکھوں پہ بازو رکھ لیا جیسے سو رہی ہوں۔  
 مگر وہ دیکھ چکا تھا۔

”ماما پلیز۔ ایسی سخت دل تو آپ کبھی بھی نہیں تھیں۔“ وہ عاجز سا ہو کر ان کے قدموں کی طرف بیٹھ گیا۔ تو انہوں نے تڑپ کر بازو ہٹایا۔

”اچھا۔ میرے گھر پہ جوڑا کا پڑا ہے اس کا کیا؟“  
 ”مانتا ہوں میں کہ مجھ سے غلطی ہوئی ہے۔ میں نے آپ کے مقابلے میں ابو کا ساتھ دیا۔ لیکن میرے لیے آپ دونوں ہی برابر ہیں۔ اگر آپ مجھ سے کچھ کہیں تو میں وہ بھی کرنے سے گریز نہیں کروں گا۔“ وہ جذباتی ہونے لگا۔

سفینہ اٹھ بیٹھیں۔ ”تو پھر نکال باہر کرو اس ناگن کی بیٹی کو ہماری زندگیوں میں سے۔“  
 انہوں نے قطعیت سے کہا۔ معین بے بسی سے انہیں دیکھنے لگا۔

”مجھے ایک مرے ہوئے انسان کی وصیت کا پاس رکھنا ہے ماما۔“  
 ”یعنی تم سے اپنی بات منوانے کے مجھے بھی مرنا پڑے گا۔ وصیت لکھنا پڑے گی۔“ وہ تلخی سے گویا ہوئیں۔  
 ”اللہ نہ کرے ماما۔“ معین نے ان کے پیروں کو اپنے دونوں ہاتھوں میں گرفت کیا۔  
 ”آپ پلیز میری پوزیشن کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ میرا آپ سے وعدہ ہے کہ ہر چیز صحیح کروں گا۔ سب کچھ

پہلے جیسا ہو جائے گا۔“

وہ خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھے گئیں۔ مگر ان کے تاثرات میں کوئی نرمی یا پلک نہ تھی۔  
 چند ثانیوں کے بعد معین اٹھ کھڑا ہوا۔

”میں آفس جا رہا تھا۔ خدا حافظ کہنے آیا تھا۔“

”خدا حافظ۔“ وہ بے تاثر انداز میں بولیں تو معین لب بھینچے کمرے سے نکل آیا۔

اسے درحقیقت ایسا مراد سے پھر سے نفرت محسوس ہوئی تھی یہ لڑکی دانستہ یا غیر دانستہ طور پر ان کے گھر کی پریشانی کا باعث بن رہی تھی۔

مگر وہ مجبور تھا۔ اسے ہر حال میں ایسا کو سیفی کی شیطانی گرفت سے نکالنا تھا۔ پھر چاہے وہ کہیں بھی جاتی۔

\*\*\*

ایسا کا دھیان اب اس دنیا میں کہیں بھی نہیں تھا۔ سوائے اس موبائل فون کے۔  
 مگر اسے کہیں بھی موقع نہ ملتا تھا کہ وہ مانیہ سے رابطہ کر پاتی۔ گھر میں حنا سائے کی طرح اس کے ساتھ ہوتی اور آفس میں سیفی کا خوف۔

اس سے ہر کام التماسیدھا ہونے لگا۔ سیفی سے وہ کئی بار جھاڑ کھا چکی تھی۔ وہ صرف ایک موقع کی تلاش میں تھی۔ وہ دوبارہ مانیہ سے رابطہ کرتی۔ شاید امتیاز احمد اسے آزاد کروانے کے لیے کچھ کر رہے ہیں۔

ڈرائیور کے ساتھ بے دلی سے چلتی وہ گاڑی تک آئی۔ تب ہی گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اسے مخصوص نسوانی قہقہے کی آواز نے چونکایا۔

دروازہ بند کرتے ہوئے اس نے سرسری نظر اٹھا کے دیکھا۔ لمحہ بھر کو لگا اس کی آنکھوں نے کچھ غلط دیکھا ہو۔  
 سیفی کے ساتھ ہنسی کھلکھلاتی وہ رباب احسن تھی۔ ایسا کو اپنی بصارت پر شک گزرا۔ اس نے آنکھیں

سکیریں۔ رباب کا سیفی جیسے بد کردار کے ساتھ کیا تعلق؟

ڈرائیور اب بار کنگ سے گاڑی نکال رہا تھا۔

تو کیا رباب ابھی تک وہی کھیل کھیلتی ہے؟

ایسا کا دل اتھاہ گہرائی میں اترنے لگا۔

وہ سیفی کی اصلیت جانتی تھی۔ مگر رباب نہیں۔ رباب نے تو ہمیشہ کی طرح شاید اسے اپنے ٹارگٹ کے طور پر چنا تھا۔

مگر وہ نہیں جانتی تھی کہ کبھی کبھار شکاری خود بھی شکار ہو جایا کرتا ہے۔

ایسا نے تھک کر سر سیٹ سے نکال دیا۔

گاڑی تیزی سے اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھی۔

\*\*\*

اس نے خدا کا شکر ادا کیا آج حنا موجود نہ تھی۔ ظاہر ہے ایک ”بزنس دو من“ اتنے دنوں فارغ تو نہیں بیٹھی رہ سکتی تھی۔

ایسا کی گاڑی اندر آئی تو وہ سری گاڑی میں بنی سنوری حنا کسی ہینڈ سم سے موب کے ساتھ جاری تھی۔ ایسا نے



اپنے آپ کو آزاد اور ہلکا پھلکا محسوس کیا۔  
 آج وہ ہر حال میں ثانیہ سے رابطہ کرنا چاہتی تھی۔ مگر رات کے کھانے پر میم کی بات نے اس کی جان ہی نکال لی۔  
 ”بہت ہو گئی بھی موج۔ فیل ہو تم اس کام میں۔“ میم نے چیخ اور کانٹے سے کھیلے ہوئے سرسری انداز میں بات شروع کی تو ایسا ہاتھیر سے انہیں دیکھنے لگی۔  
 ”یہ باہر وہ بی بی اور برہیز گاری والا اپنا ڈرامہ اب بند کرو۔ ایک لاکھ کا بھی بزنس نہیں کر کے دیا تم نے۔“ میم کے لب و لہجے میں سختی تھی۔  
 ایسا کا دل لرزنے لگا۔  
 ”میں نے تو اپنی پوری کوشش۔“  
 ”کوشش مائی فٹ۔“ میم نے اس کی بات کاٹ کر ایک لخت غراہٹ آمیز لہجے میں کہا تو ایسا ہاتھ کے ہاتھ میں تھاما چچہ لرزنے لگا۔  
 ”ہمارے بزنس میں خود آگے بڑھ کے گلے کا ہار ہوا جاتا ہے۔ سیٹی تو تنگ آپکا ہے تم سے۔“ وہ تلخی سے بولیں۔

ایسا سے چبایا ہوا والہ حلق سے اتارنا مشکل ہو گیا۔  
 ”کل سے تم آتش نہیں جاؤ گی۔ دو دن گھر بیٹھو۔ اپنا مائنڈ میک اپ کرو اور پھر اپنا بزنس چلاؤ۔ جسٹ لائیک حنا۔“ میم نے بے نیازی سے اس کا ٹائم ٹیبل سیٹ کرتے ہوئے کہا۔  
 ایسا کی رنگت سفید پڑ گئی۔ دل رک رک کے چلا تو سانس بھی تنگ ہوتی محسوس ہونے لگی۔ اس نے ذبح ہونے والے جانور کی طرح میم کی طرف دیکھا۔  
 ”دیکھو ایسا! مجھ سے اب تمہارا کوئی ڈرامہ اور منت سماجت برداشت نہیں ہوگی۔ جو میں نے کہہ دیا ٹھیک دو دنوں کے بعد تم اس پر خوش دلی سے عمل کرو گی۔ ورنہ مجھے خود ہی کچھ سوچنا پڑے گا۔“

وہ اب سوٹ ڈش لے رہی تھیں۔  
 اس وقت عموماً ”میم ہی گھر پر ہوتی تھیں۔ یہاں موجود ڈھپروں لڑکیاں (جن میں سے کچھ مجبور تھیں اور کچھ پیسے کے لیے بخوشی یہ کام کرتی تھیں) اس وقت اپنے ”بزنس“ کے لیے جا چکی تھیں اور اب صبح ہی واپس آتیں۔  
 بلکہ کئی تو میم کی زبان میں اس قدر ”کلی“ تھیں کہ بڑے اعلا عہدے داروں کے ساتھ بیویوں کے بجائے ہنی مون پہ جاتی تھیں۔ ”گلائنگ“  
 ”میرے خیال میں تمہاری لائینگ۔“ بھی ہنی مون ٹرپ سے ہی کی جائے۔ یہ لوگ بیرون ملک اپنی بد صورت بیویوں کو لے کر جانا پسند نہیں کرتے نا۔“  
 میم اب بڑے دوستانہ انداز میں ڈسکشن کر رہی تھیں۔

ایسا کا کھانا پیا اٹنے کو تھا۔  
 ”میم۔“ اس کے منہ سے لفظ نہ نکلتا تھا۔ میم نے سرد نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔  
 ”ٹھو۔ اور اپنے کمرے میں جا کے خوب سوچو۔ میں کسی بھی معاملے میں تمہاری اجازت کی پابند نہیں ہوں تمہیں نہیں مانو گی تو پھر میں جو چاہے وہ کروں گی۔“ ان کا لہجہ ان کی نظروں سے زیادہ ہر فیلا تھا۔

وہ کمرے میں آکر خوف زدہ سی چادر لپیٹ کے بیٹھ گئی۔  
 ایک عجیب سی ان سیکوئیٹی نے اسے گھیر لیا تھا۔ میم کسی بھی وقت اس پر کتے چھوڑ سکتی تھیں اور یقیناً۔  
 وہ کتے انسانی شکل میں ہوتے۔ اسے اپنی ماں یاد آئی۔  
 اس کی پیاری ماں۔ اگر وہ امتیاز احمد سے شادی کر لیتی تو آج ایسا ہاتھ کے لیے حالات بکسر مختلف ہوتے۔  
 ”کاش۔“ اسے کاش میری ماں۔ اس وقت تو نے اپنے دل پہ پاؤں رکھ لیا ہوتا تو بعد میں کوئی تیری عزت نفس پہ پاؤں نہ رکھتا۔“  
 وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ پھر کچھ خیال گزرا تو جلدی سے اٹھ کر وضو کیا اور جائے نماز پہ کھڑی ہو گئی۔ اس کی گریہ زاری تھی کہ بے قابو ہوئی جاتی تھی۔ آنسو ٹھٹھٹے ہی نہ تھے۔  
 ”رحم میرے خدا۔ اے مالک کل کائنات۔ حوا کی اس بیٹی کی طرف بھی کرم کی ایک نظر۔“  
 وہ سجدے میں گر کے بے تحاشا روئی، تڑپ لی۔ اتنا روئی کہ اس کے بعد وہ کوشش بھی کرتی تو آنسو نہ نکلتے تھے۔  
 وہ بے دم سی بڑی تھی۔ مگر دل محو مناجات تھا۔ جانے کن دقتوں سے وہ خود کو کھینچتی بستر تک آئی۔ دور حقیقت اس میں اب مزید گریہ و زاری کی سکت نہ رہی تھی۔  
 ذہن اسی ایک نکتے پر منجمد تھا کہ اب اس کی عزت داؤ پہ لگائی جانے والی تھی۔ وہ یکدم چوکی۔  
 اس کے تکیے میں تھر تھراہٹ سی ہوئی تھی۔  
 اس نے تکیہ پرے کر کے ٹیڈز میں لیٹا موبائل بے تابی سے کھولا تو اس کی اسکرین چمک رہی تھی اور اس پر ثانیہ کا نام جگمگا رہا تھا۔ اس کے وجود میں جیسے جان آگئی۔  
 تیزی سے اتر کر وہ واش روم کی طرف بڑھی۔ دروازہ بند کیا۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے 4 خوبصورت ناول

ساری بھول  
ہماری تھی



راحت جبین  
قیمت - 300 روپے

شریک سفر



زحرہ ممتاز  
قیمت - 550 روپے

کسی راستے کی  
تلاش میں



میمونہ خورشید علی  
قیمت - 350 روپے

میرے خواب  
لوٹا دو



نگہت عبداللہ  
قیمت - 400 روپے

فون نمبر:  
32735021

منتخاب مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37 اردو بازار کراچی



ثانیہ کی کال مسلسل آرہی تھی۔  
ایسہا نے برق رفتاری سے واش بیسن کاتل اور شاور کا پانی کھول دیا۔  
وہ نہیں چاہتی تھی کہ باہر اچانک کسی کے آجانے پر کوئی شک پڑے۔  
اس نے دروازے سے دور ہٹ کے ثانیہ کی کال اٹھانے کی۔

”ہیلو۔“ اسے خود اپنی آواز ہی غیر انسانی لگی۔ کھینچی ہوئی نسلوں کے ساتھ اسے بولنا دنیا کا مشکل ترین کام لگا۔

”ایسہا۔“ ثانیہ کا انداز محتاط تھا۔  
”ہاں۔ میں ایسہا ہوں۔ ثانیہ! میں ایسہا ہوں۔“ خوف سے اسے لرزہ چڑھ رہا تھا۔  
”کیسی ہو ایسہا؟“

”مم۔ میں بہت مشکل میں ہوں۔ میں یہاں سے نکلنا چاہتی ہوں۔ پلیز۔ پلیز۔“ اس کی آواز پھنسی ہوئی تھی۔

”کیا ہوا ہے ایسہا کھل کے بات کرو۔ اگر موقع ملا ہے تو۔“  
ثانیہ نے نرمی اور پیار سے کہا تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔  
عرصہ ہوا تھا بے ریا لہجہ سننے۔

”میں یہاں محفوظ نہیں ہوں۔ میم مجھے کسی کے ہاتھوں بیچنا چاہتی ہیں۔ بس دودن کے بعد۔ خدا کے لیے ثانیہ۔ مجھے بچالو۔ میری عزت داؤپہ لگنے والی ہے۔“ وہ گھٹی گھٹی آواز میں بولی۔

”ڈونٹ وری ایسہا۔ روؤ مت۔ حوصلہ کرو۔ یو آر اے بریو گرل۔ میں ضرور تمہاری ہیلپ کروں گی۔“  
ثانیہ نے بہت پیار سے اسے پککارا۔

”میرا کل سے آفس جانا بند ہو گیا ہے۔ بس دودن کے بعد۔“ وہ ہلک اٹھی۔  
”حوصلہ کرو ایسہا۔“

”کیسے حوصلہ کروں۔ اتنے دنوں سے تم لوگوں کو پتا ہے کہ میں ان کے قبضے میں ہوں تو کچھ کرتے کیوں نہیں تم لوگ۔ معیذ سے کہو میری بے بسی کا تماشا مت دیکھو اور امتیاز احمد کہاں ہیں جو میری ماں سے بچے وعدے کر کے ایک مضبوط بندھن میں باندھ کے مجھے ساتھ لائے تھے؟ کیا وہ میم کو ثبوت دکھا کر دعوے کے ساتھ مجھے یہاں سے چھڑوا نہیں سکتے؟“

وہ پھینچی ہوئی آواز میں اپنی چیخیں روکتی، کبھی غصے اور کبھی بے بسی سے کہہ رہی تھی۔  
ثانیہ گنگ سی سنے لگی۔ یہ کیسے راز چھپے تھے اس کی باتوں میں۔ کون سا مضبوط بندھن، کیا ثبوت اور کیا دعوے؟

”معیذ احمد کو تارو ثانیہ۔ رسول تک کا وقت ہے میرے پاس۔ اگر رسول بارہ بجے تک وہ کچھ نہ کر سکا تو میری خود کشی اس کے سر۔ قیامت کے روز میں ان دونوں باپ بیٹے سے حساب طلب کروں گی۔“ اس نے تھک کر خودی لائن کاٹ دی۔

کہنے سننے کو اور کچھ بچائی کہاں تھا۔  
امتیاز احمد تو جیسے اس سے ہر رشتہ ہی توڑ بیٹھے تھے اور اب جبکہ معیذ کو اس کے بارے میں پتا چل گیا تھا تو وہ بھی محض تماشا ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ بدوم ہونے لگی۔  
”ہیلو۔ ہیلو ایسہا۔“

ثانیہ نے لائن کٹنے پر بے اختیار اسے پکارا مگر دوسری طرف خاموشی تھی۔  
”سن لیا آپ نے معیذ بھائی؟“

ثانیہ نے میٹنگ پر موجود معیذ کو تھکے ہوئے انداز میں متوجہ کیا، جو گنگ سا تھا۔  
”یہ تو بہت برا ہو رہا ہے۔“ وہ بمشکل خود کو کچھ کہنے پر آمادہ کر پایا۔

”میں تو پہلے ہی کہہ رہی تھی کہ اسے فوری طور پر وہاں سے نکالنے کی ضرورت ہے مگر آپ لوگ پتا نہیں کس نفع و نقصان کے چکروں میں پڑے ہیں۔“ ثانیہ کے انداز میں خفگی تھی۔

”لیکن اب آپ نے سن لیا نا۔ اسے پرسوں تک کی ڈیڈ لائن ملی ہے۔“  
”اوکے۔ میں کچھ کرتا ہوں۔“ معیذ کا ذہن سخت پراگندگی کا شکار ہو رہا تھا۔ اس سے منسلک ایک اہم رشتہ۔

اسے احساس ہوا کہ تین سال پہلے اسے امتیاز احمد کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالنے چاہیے تھے۔  
آج وہ بھاڑ میں بھی جاتی تو معیذ کو پروا نہ ہوتی مگر امتیاز احمد جس حیثیت سے اس کی ذمہ داری معیذ پر چھوڑ گئے تھے۔ اسے یوں بھاڑ میں جاتے دیکھنا۔ دل کروے کا کام تھا۔ نہیں۔ یقیناً بہت بے غیرتی اور بے

حمیت کی۔ سوچ سوچ کر اس کا سر پھٹنے کو تھا۔ رات کے اس پر جب سب اپنے کمروں میں اسے سی آن کیے پر سکون نیند لے رہے تھے وہ بے چینی اور اضطراب کی آگ میں جلا جاتا تھا۔

کبھی سوچتا کہ سیدھا جا کے میڈم رینا کے سامنے کھڑا ہو جائے اور کرن ہونے کا دعوہ کر کے ایسہا کو وہاں سے نکال لے مگر کیا وہ اتنی آسانی سے سونے کے انڈے دینے والی مرغی کو ہاتھ سے جانے دیتی؟

اور اگر پولیس لے کے جاتا۔ لیکن اگر پولیس نے ہمیشہ کی طرح ایمان داری سے کام نہ کیا تو۔ اس کے بعد تو میڈم ایسہا کو ایسی تہوں میں چھپائے گی کہ اس کی دھول بھی نہ ملے گی۔ ثانیہ نے صبح اسے اور عون کو اپنے ہاں بلایا تھا۔ وہاں شاید کوئی صورت حال نکل آئے۔ اس نے تھک کر سوچتے ہوئے خود کو بستر پر گرالیا۔

\*\*\*

”لڑکوں کے لیے لڑکی سے اہم کچھ نہیں ہوتا معیذ۔ اور تم ہو کہ تمہارا بیچھا کرنا پڑتا ہے۔“ رباب کے لب لہجے میں خفیف سی تلخی کار جاؤ تھا۔

”آٹم سو ری۔ بہت بڑی تھا میں۔ یقین کرو۔ اور آج تو سر میں شدید درد بھی ہے۔“  
معیذ نے کپٹی دباتے ہوئے تھکاوٹ زدہ لہجے میں معذرت کی۔

وہ آفس آلو گیا تھا، مگر اب کچھ کام نہیں ہو پا رہا تھا۔  
”میری طرف آجاؤ نا۔ اپنے ہاتھ کی بنی چائے پلاؤں گی تو سارا درد بھول جاؤ گے۔“ وہ گنگنائی۔

”آفر تو بہت شان دار ہے مگر آج ایک بہت ضروری میٹنگ ہے۔“  
وہ ہلکے سے مسکرایا۔ جانتا تھا رباب کو چائے پنانے کی الفب کا بھی نہیں پتا مگر وہ اس کے لیے چائے بنانے کا کہہ رہی تھی یہ معیذ کے لیے یقیناً ”فخر کی بات“ تھی۔

”کم آن معیذ۔ یو آر سو پورنگ۔ کوئی اور لڑکا ہو تا تو سر کے بل آتا۔“  
”سو ری۔ مجھے یہ کرتب سیکھنے کا کبھی وقت ہی نہیں ملا۔“ معیذ نے اس کا موڈ ٹھیک کرنا چاہا۔

”معیذ۔ تم میرا موڈ خراب کرنا چاہتے ہو؟ لڑکیاں اپنے بوائے فرینڈز کے بارے میں کیا کیا نہیں بتاتیں اور ایک تم ہو کہ۔“ وہ جذباتیت پر اترنے لگی۔ معیذ سنجیدہ ہو گیا۔



”اول تو یہ کہ میں تمہارا بوائے فرینڈ نہیں ہوں۔ سو سرائیہ کہ لڑکیوں کی اس طرح کی فضول باتوں میں نوے فیصد جھوٹ ہوتا ہے۔“

”پھر بھی۔ تمہو سرے لورز کی طرح نہیں ہو۔“ وہ بے اختیار بولی پھر مٹنے لگی۔

”آئی میں! دو سری لڑکیوں کے لورز کی طرح۔“

”مجھے محبت میں چپ ہونا پسند نہیں ہے رباب۔ محبت میں ایک فاصلہ اور پاکیزگی ضروری ہے۔ ورنہ وہ محبت نہیں رہتی، ہوس بن جاتی ہے۔“ معین نے نرمی سے اسے سمجھایا۔

”پلیز۔“ وہ کرائی۔ ”تو مورو لیکچر معین۔“

”آئی رومانس کی باتیں تو نہیں کیں کبھی جتنا صوفیانہ لیکچر جھاڑتے ہو۔“ وہ خفا تھی۔

”چلو ٹھیک ہے۔ تم ناراض ہی رہنا۔ ملو تو دیکھنا کتنے پیار سے مناتا ہوں۔ پھر خیر سے ساری فرینڈز کو بتانا۔“

وہ اتنے پیار بھرے دھمکے لہجے میں بولا کہ رباب کا دل گدگدا اٹھا۔

”کیسے کیسے؟“ وہ بے تاب ہوئی۔ معین آہستہ سے ہنسا۔

”بھی نہیں۔ سنڈے کو۔ جسٹ ویٹ اینڈ سی۔“ اس نے رباب کے دل کی بے قراری پر ہمدادی تھی۔

معین کا فون بند ہوا تو وہ جلدی سے اسکاٹپ پہ اپنی دوستوں کو بتانے لگی۔ اس کا انداز بہت جوش سے بھرا ہوا تھا۔



اس نے عون کے پاس پہنچ کر اسے چلنے کو کہا تو وہ حیران ہوا۔

”کہاں؟“

”ٹانیہ نے ہمیں انوائیٹ کیا ہے۔ اپنی خالہ یعنی تمہاری پچھو کے گھر۔“

معین ابھی لہجہ ناگہمہ آفس سے اٹھا تھا اور سیدھا عون کے ریسٹورنٹ میں پہنچا۔

”جھے انوائیٹ کیا ہے یا مجھے؟“ عون نے طنز کیا۔

معین سے مسکراہٹ چھپانی مشکل ہو گئی۔ اسے بتا چل گیا تھا کہ ٹانیہ نے بطور خاص عون کو انوائیٹ کرنے کے لیے کال نہیں کی تھی۔ بس معین ہی سے کہہ دیا کہ کل دونوں چلے آنا۔

”تمہاری حالات تو پہلے سے بھی پہلے جارہے ہیں یا نہ۔ بنے گا کیا تم دونوں کا۔“ معین کو عون کی شکل دیکھ کے ہنسی آرہی تھی۔

”معاہلہ کیا ہے کیوں بلایا ہے اس نے؟“ وہ کاٹ کھانے کو تھا۔

”ایسہا والے معاملے یہ بات کرنی ہے۔ وہ بہت مشکل میں ہے۔ اس کا آفس جانا بند کر دیا گیا ہے۔ ایک روز بعد شاید وہ اس کا سودا کر دے۔“

معین یک لخت ہی سنجیدہ ہوا تو وہ سب بھی کہنا پڑا جو وہ نہیں کہنا چاہتا تھا۔

”اوہ! عون کو تأسف ہوا۔“ میں ساتھ چلوں گا معین! جو ہلپ کر سکا کروں گا۔ مگر پلیز رباب! ٹانیہ کو وہاں مت جانے دینا۔ ان لوگوں کا نیٹ ورک بہت اسٹونگ ہے۔ میں اس پہ کوئی آنچ نہیں آنے دینا چاہتا۔ وہ میری گرل فرینڈ نہیں، منکوحہ ہے اور اپنی عزت کے لیے مرد جان سے چلے جایا کرتے ہیں۔“

وہ بے حد سنجیدہ تھا۔ معین نے ایک ٹک اسے دیکھا۔ جانے کون سے لفظوں نے دل کے تاروں کو کیسا جھنجھوڑا تھا۔

عون اس کے ساتھ چل پڑا۔ گیٹ خود ٹانیہ نے کھولا۔

”السلام علیکم۔“

اس کے ہونٹوں پر دونوں کے لیے مسکراہٹ تھی۔ عون ساری خفگی بھولنے لگا۔

”آئی دیر لگا دی۔ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔“

”مگر مجھے ڈائریکٹ دعوت دیتیں تو ناشتے کے فوراً بعد ہی آجاتا۔“

عون نے کہا تو وہ اطمینان سے بولی۔

”میں جانتی تھی۔ تب ہی معین بھائی کو کہا۔“

عون نے مسکراہٹ دباتے معین کو گھورتے ہوئے کہا۔

”جاننا ہوں میں۔ مجھے تو بس باڈی گارڈ کے طور پہ بلایا ہے تمہارے۔“

”چلو۔ بہت اچھی بات ہے۔ اب جاؤ دونوں ہاتھ منہ دھو کے فریش ہو کے آجاؤ۔ خالہ جان تو کھانا کھا کے میڈیسن لے کر لیٹ چکیں۔“

ٹانیہ کے ہونٹوں پہ پھیلی ہلکی سی مسکراہٹ عون کو بہت حوصلہ دے رہی تھی اور یقیناً ”کسی تبدیلی کا اعلان بھی“

تھی۔

”چ کیا تھا۔ گھر کے کھانے کی بہترین ورائٹی تھی۔“

”یہ سب آج میں نے اسپیشلی آپ لوگوں کے لیے بنایا ہے۔“

ٹانیہ نے کہا تو معین نے رشک سے عون کو دیکھا۔ دونوں نے دل کھول کے لذیذ کھانا کھایا اور میٹھے میں ٹرانزفل۔ اس کے بعد چائے کے گگ لیے وہ لاؤنج میں آ بیٹھے۔

”مسئلہ کیا ہوا ہے اب؟“ عون نے پوچھا تو ٹانیہ نے اپنے موبائل میں ریکارڈ ایسہا کی کال آن کر دی۔ وہ

اشہاک سے سننے لگا۔

”اور میں نے جتنی بار بھی اس کال کو سنا ہے مجھے محسوس ہوا ہے کہ ہم لوگ پوری حقیقت سے واقف نہیں ہیں معین بھائی!“

ٹانیہ نے بے حد سنجیدگی سے معین کو دیکھا۔ وہ یقیناً ”ایک ذہن لڑکی تھی۔ معین نے دل ہی دل میں اعتراف کیا۔“

”وہ کس بندھن اور کن ثبوتوں کی بات کرتی ہے وہ بھی اتنے دعوے کے ساتھ؟“

”ابو اسے اپنی ذمہ داری پہ ہاں ملائے تھے۔“ معین آنکھیں چرا گیا۔ ”وہ اپنی دوست کے ہاتھوں دھوکا کھا گئی۔“

ورنہ ابو ہاشل اور کالج کی فیس ادا کر رہے تھے۔“

”معین یار! اس کا صاف اور سیدھا حل یہی ہے کہ پولیس ریڈ کرائی جائے اور ایسہا کو وہاں سے برآمد کر لیا جائے۔“

عون نے صاف گوئی سے کہا۔

”میں کوئی رسک نہیں لینا چاہتا۔ سب سے زیادہ کالی بھینٹیں اسی محکمے میں ہیں۔ ریڈ سے پہلے ہی میڈم کو کال دے دی جائے گی۔ اور پھر شاید ہم آئندہ کبھی ایسہا کو نہ دیکھ پائیں۔“

”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ ٹانیہ نے اس کی بات سے اتفاق کیا۔

”اس مسئلے کو فٹل پروف طریقے سے حل کرنے کی ضرورت ہے۔“ عون نے رائے دی۔

”نہ وہاں سے باہر آسکتی ہے اور نہ ہی کوئی وہاں جاسکتا ہے۔“ معین نے یاد دلایا۔



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شاندار پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ٹھیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریٹخ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ پیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریٹخ
- ☆ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

”تم سیفی کو بھول رہے ہو۔ وہ ہمارا شکار بن سکتا ہے۔“ عون نے فو معنی انداز میں کہا تو وہ چونکا۔

”وہ کیسے؟“

”وہ تو تمہیں سوچتا ہے۔ کیونکہ وہی ایک شخص ہے جو تمہیں اندر بھی لے جاسکتا ہے اور ایسا ہوا ہر بھی لاسکتا ہے تمہارے کہنے پر۔“ عون کا ذہن واقعی کام کر گیا تھا۔

”اسے باہر لا کر وہ میرے حوالے ہی تو نہیں کر دے گا نا۔ واپسی بھی تو ہوگی۔“ معینہ الجھا۔

”پیسے۔ پیسے لگاؤ میری جان! وہ لوگ بزنس چلا رہے ہیں۔ انہیں صرف پیسہ چاہیے۔“ عون نے حقیقت بیان کی۔

”میرے ہاتھ کی بنی چائے پی کر تمہارے دماغ نے بہت تیزی سے کام کرنا شروع کر دیا ہے۔“ ثانیہ مسکراہٹ دباتے ہوئے بولی پھر اس نے معینہ کو دیکھا۔

”مگر میں پھر بھی کہوں گی کہ اس لڑکی کی کہانی میں سے بہت کچھ مسنگ ہے۔“ معینہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

”اس نے آپ سے ایسے شکوہ کیا تھا جیسے اسے بہت مان ہو آپ پر۔ اور اس نے یہ بھی کہا تھا کہ امتیاز احمد میڈم کو ثبوت دکھانے کے لئے وہاں سے نکال سکتے ہیں۔“ ثانیہ ابھی تک اسی سچ رہی تھی۔

”اس کا کیا مطلب ہوا؟“ عون نے نا سمجھنے والے انداز میں پوچھا۔

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ انکل کے پاس ایسا کچھ ثبوت ہے جس کی بنا پر ایسا کا کلیم کر کے اسے وہاں سے نکال سکتے ہیں۔“

ثانیہ نے صاف لفظوں میں وضاحت کی۔ عون نے منتظر نظروں سے معینہ کو دیکھا۔

”اب تم بتاؤ۔“

”کیا انکل نے اسے اپنی کزن سے ایڈاپٹ کر لیا تھا؟ اگر ایسا کوئی تحریری ثبوت ہے تو پھر بھی کام بن سکتا ہے۔ ایک بار ایسا وہاں سے نکل آئے تو پھر تحریری ثبوت دکھا کر اس کی واپسی کو روکا جاسکتا ہے۔“ ثانیہ نے جوش سے کہا۔

مگر معینہ چیپ تھا۔ بالکل چیپ۔

”وہ بہت مشکل میں ہے معینہ بھائی! آپ سب نفع نقصان چھوڑ کر صرف یہ سوچیں کہ وہاں محض اس کی جان کو خطرہ نہیں ہے۔“

ثانیہ دے لفظوں میں کچھ نہ کہتے ہوئے بھی بہت کچھ کہہ گئی۔

معینہ کی رگوں میں دوڑتا سیال تپ اٹھا۔

اس کا ہاتھ بے اختیار اپنی پینٹ کی جیب میں رنگ گیا اور جب باہر آیا تو اس میں ایک پیپر دبایا ہوا تھا۔

”یہ لو۔ شاید یہ کچھ کام آجائے۔“ اس نے وہ پیپر عون کی طرف بڑھایا۔ عون اس کے بدلے ہوئے تاثرات پہ غور کرتا حیران سا ہو کر وہ پیپر دیکھنے لگا۔

اور اس پیپر کا متن پڑھتے ہی جیسے اسے چار سو چالیس والٹ کا جھٹکا لگا۔ اس نے بے اختیار بے یقینی سے معینہ کی طرف دیکھا۔

(باقی اگلے ماہ ان شاء اللہ)





## مکھنکا

باقر لودھی اپنے بچے بچے تقی کی غیر ذمہ دارانہ طبیعت سے سخت نالاں ہیں اور اسے ہر وقت ہڈ حرامی کے طعنے دیتے رہتے ہیں۔ تقی کو شوہر میں کام کرنے کا شوق ہے جبکہ لودھی صاحب اس کام کے سخت مخالف ہیں۔ دونوں باپ بیٹے میں اکثر جھڑپیں ہوتی رہتی ہیں۔ رضی اور جری سے البتہ باقر صاحب کو کوئی شکایت نہیں۔

شفا کو عمیر نے والدین کے بعد باپ بن کر پالا ہے۔ وہ عمیر کی بے حد لادلی ہے مگر عمیر کی بیوی ساہر کو اس سے شدید جھگڑا ہے۔ وہ عمیر سے جھوٹ بول کر اسے شفا سے بدظن کرنے کی کوششیں کرتی رہتی ہے۔ عمیر کو اپنی بیوی پر پورا یقین ہے۔

ساہر اور عمیر کی شادی کے ابتدائی دنوں میں شفا ساہر سے بہت بدتمیزی کیا کرتی تھی۔ وہ اسے ہر وقت عمیر کی نظروں سے گرانے کی کوشش کرتی اور جھوٹی سچی کہانیاں بنا کر اسے عمیر سے ڈانٹ پڑا دیتی۔ رات کے کھانے پر پاستا بنانے پر اس نے ساہر سے بدلہ لینے کا ارادہ کیا اور میسر میوں سے حادثاتی طور پر گر جانے کا الزام ساہر پر لگا دیا کہ ساہر نے اسے دھکا دیا ہے۔ اس بات پر عمیر ساہر کو دو تھپڑ مار دیتے ہیں۔ ساہر کو بہت دکھ ہوا ہے۔ شفا خود بھی گنگ ہو جاتی ہے۔ تقی کے گہرے دوست میسر کے ابا اپنی پسند سے اس کی منگنی کر دیتے ہیں۔

## چودھویں اور آخری قسطیں





اس روز شفا بے وار ہوئی تو ہدیہ اس کے ساتھ نہیں گئی۔ وہ شفا کے ساتھ سوئی تھی اور ہر روز صبح شفا ہی اسے اسکول کے لیے جگاتی تھی لیکن آج وہ اس کے ساتھ نہیں گئی تو یہ حیرانی کی بات تھی۔ شفا نے اسے تلاش کرتے ہوئے دو تین آوازیں دیں۔ ہاتھ روم میں دکھا لیکن ہدیہ وہاں بھی نہیں تھی۔ شفا پریشانی کے عالم میں اسے تلاش کرتی ہوئی کمرے سے نکلی۔

ہدیہ لاؤنچ میں کارنوالے صوفے کے پیچھے چھپ کر بیٹھی گھٹ گھٹ کر رو رہی تھی۔

”ہدیہ۔ میری جان!“ شفا نے اسے سینے سے لگا لیا۔ ”کیا ہوا ہے میری گڑیا کو۔“

”پھپھو!“ وہ اس کے کندھے سے چمٹ کر اور شدت سے رونے لگی۔

”ہدیہ جانو۔ کیا ہوا۔ پھپھو کو نہیں بتاؤ گی؟“

شفا بری طرح پریشان ہو گئی تھی۔

”مجھے ماما یاد آ رہی ہیں۔“ ہدیہ نے روتے ہوئے کہا۔

”وہ۔“ شفا کا دل اپنی جگہ سٹا۔ ”پہلے آپ چلی گئی تھیں۔ اب ماما چلی گئی ہیں۔ پاپا میرے ساتھ بات نہیں کرتے۔ کھیلتے بھی نہیں ہیں۔ پاپا سے کہیں عادل کی طرح مجھے بھی ماما کے پاس چھوڑ آئیں۔ میری فریڈ کتی ہے جن کی ماما چلی جاتی ہیں۔ ان کے پاپا پھر نئی ماما لے آتے ہیں۔ پھپھو! کیا پاپا بھی نئی ماما لے آئیں گے؟“ وہ روتے ہوئے معصومیت اور کسی قدر خوف کے ساتھ پوچھ رہی تھی۔

”نہیں میری جان!“ اس نے پیار سے پوچھا لیکن ہدیہ کی تان ایک ہی نقطے پر اٹکی ہوئی تھی۔

”آپ کو نہیں پتا۔ میں نے خواب میں دیکھا ہے۔ پاپا نئی ماما لے آئے ہیں۔ نئی ماما مجھے مارتی ہیں دھکا بھی دیتی ہیں۔ ان کے لیے بے دانت ہیں۔ گندے سے بڑے بڑے ناخن۔ پھپھو! آپ اللہ تعالیٰ سے کہیں مجھے اپنے پاس بلا لیں لیکن میں نئی ماما کے پاس نہیں جاؤں گی۔ مجھے اپنی ماما کے پاس ہی جانا ہے۔“

”تمہیں تو اب فرصت ہی نہیں ملتی۔“ منک نے

جس کا چھوٹا سا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ ”نہ ملتے ہو نہ کال کرتے ہو۔ اتنے مصروف ہو گئے ہو؟“ وہ دونوں کئی دنوں بعد مل رہے تھے۔ کارنوالی ٹیبل پر ذرا ہٹ کر بیٹھے تھے کیونکہ تقی اب پبلک پلیس پر پہچان لیا جاتا تھا پھر اس کے گرد جمع گھٹا لگ جاتا تھا تو منک کو الجھن میں مبتلا کرتا تھا۔

”تمہیں پتا ہے یار! میڈیا کی جاب اتنی بھی آسان نہیں ہے۔ دن رات شوٹنگز، ڈانس اور زبردستی پروموشن کے سوجھ بوجھ۔“ تقی کچھ تھکا ہوا سا لگ رہا تھا۔

”پھر بھی تقی! انسان تھوڑا ٹائم تو نکال لیتا ہے۔“

”تم خود کون سا فارغ رہتی ہو۔ جب مجھے فرصت ملتی ہے تو تم وقت دینے کو تیار نہیں ہوتی۔“

”تمہیں پتا ہے میں نے پاپا کی فرم جوائن کر لی ہے۔ اب پہلے کی طرح ٹائم ملنا تو مشکل ہے۔“ اس نے ذرا اپنی مصروفیت کا قصہ بھی کہہ سنایا۔

”اچھا سنو۔ میں سوچ رہا تھا امی ابابا کو تمہاری طرف بھیجوں۔“ تقی کو اچانک خیال آیا۔

”کس لیے۔“

”شادی کی تاریخ طے کر لی جائے۔“

منک کو جوس پیتے بے اختیار کھانسی آگئی۔

”شادی کی تاریخ۔“ اس نے سانس بحال کی۔

”تنی جلدی کیا ہے؟“

”مجھے تو خیر جلدی نہیں ہے۔ امی کو ہے۔ وہ جلد از جلد ہو گھر لانا چاہتی ہیں۔“ تقی نے ہنس کر بتایا۔ اس کا خیال تھا اس کی ماں کی معصوم سی خواہش منک کو بھی مسرور کرے گی لیکن وہ بھول گیا وہ منک بھی شفا نہیں۔

”اوہ۔ میں سمجھ گئی۔ اولڈ ٹل کلاس مینٹلٹی۔“ اس نے ہنس کر بظاہر عام سے لہجے میں کہا تھا۔

”بیٹا بڑھ لکھ کر کمانے لگا ہے تو بس شادی کرو اور ہو گھر لے آؤ۔ اپنی لائف تو انجوائے کرنے دو۔ اسے تھوڑی اسپیس دو تاکہ وہ لائف اپنے طریقے سے گزار سکے۔ مجھے تو یہ بہت عجیب بات لگتی ہے۔“

”اس میں عجیب بات تو کوئی نہیں ہے۔“ تقی کو

اس کا انداز اچھا نہیں لگا۔ بے شک وہ دونوں محبت کی دور میں بندھے ہوئے کے دعوے دار تھے لیکن ابھی وہ منزل نہیں آئی تھی جہاں بے دھڑک دل کی بات کہہ دی جائے۔

”جو بات تمہیں عجیب لگ رہی ہے، وہ ہمارے یہاں ماؤں کی خوشی مانی جاتی ہے کہ بیٹا برسر روزگار ہو گیا تو اسے شادی کرنا دیکھیں۔“

”نہمنکس گاڈ! ہماری کلاس کی ماما ایسی باتوں پر خوش نہیں ہوتیں۔ ایک چوکی ان کی اور بہت ایکٹیوٹیز ہوتی ہیں جو انہیں خوش رکھتی ہیں۔“

”ہاں مگر تم اپنی ماما کے رولز فالو نہیں کیاؤ گی کیونکہ شادی کے بعد تو تمہاری بھی وہی کلاس ہوگی جو میری ہے۔“ اس نے دو ٹوک لہجے میں کہا تھا۔

”Not really“ منک نے ہنس کر کہا لیکن اس کا انداز بات ٹالنے والا تھا۔

”پھر کب بھیجوں؟“ تقی نے بھی اس کی بات نظر انداز ہی کی تھی۔

”تنی جلدی بھی کیا ہے۔ شادی بھی ہو جائے گی۔“ اس نے بات کا اثر زائل کرنے کے لیے موبائل اٹھا کر میسج کرنا شروع کر دیا۔ تین چار منٹ بعد دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

”تمہارے دوست کی شادی کب ہے؟“

”پرسوں مندی ہے۔“

”پرسوں۔۔۔ پرسوں میں فری ہوں۔ ٹھیک ہے۔ میں بھی چلتی ہوں۔“ اس نے مزے سے کہا۔

”آل۔۔۔ تم؟“ وہ تذبذب میں پڑ گیا۔

”کیوں۔ کیا نہیں جاسکتی؟ بنا بلائے جانے پر وہ لوگ سائنڈ کریں گے کیا؟“

”ارے ایسی بات نہیں ہے۔“ تقی نے کچھ سوچ کر کہا۔

”ٹھیک ہے تم بھی چلو۔“

”دیری گز۔“ وہ پر جوش ہو کر بولی۔ ”مجھے بہت شوق تھا کوئی مل کلاس شادی اینڈ کرنے کا۔ یہ شوق بھی پورا ہو جائے گا۔“ اس نے خوش ہو کر بتایا اور



جوس پئے تھے۔  
لگی اسے دیکھ کر رہ گیا۔

\*\*\*

شفائے تیار ہو کر کوئی دسویں بار خود کو آئینے میں دیکھ لیا۔ پورے گھر کے بیسیوں چکر بھی لگائے لیکن عمیر بھائی تھے کہ آنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ بدیہ بے چاری انتظار کر کے سو بھی گئی۔ ٹرفون کر کے الگ دھارے کھا رہی تھی۔

”میری اکلوتی پیسٹ فرینڈ۔ میری ماںوں پر اتنا لیٹ یاد رکھنا شفا! تم سے پہلے اگر سمیر کے گھر والے پہنچ گئے تھے تو میں بخشوں گی نہیں تمہیں دعا کرتا شروع کرو کہ سمیر لوگ لیٹ ہو جائیں۔“

”عجیب لڑکی ہو۔ سارے زمانے کی لڑکیاں خوش ہو رہی ہوتی ہیں کہ ان کے دولہا اتنی جلدی پہنچ رہے ہیں۔ ایک تم زمانے سے زالی ہو کہ ان کے لیٹ ہونے کی دعائیں کروا رہی ہو۔“

”تمہارا بی فائدہ ہے۔“ اس نے مزے سے کہا۔

”اچھا ناں پارا! میں تو کب سے تیار ہو کر کھڑی ہوں۔ عمیر بھائی آنے کا نام ہی نہیں لے رہے۔“

”تم نے پہلے سے نہیں بتایا تھا؟“

”بتایا تھا۔ بھائی آفس سے تو نکل گئے ہیں ٹریفک جام میں پھنسے ہوئے ہیں۔“

خدا خدا کر کے کچھ دیر اور گزری تو عمیر بھائی آگئے اور اسے گیٹ پر ہی بلوایا۔

”کھانا تو کھائیں۔“ شفائے کہا۔

”اب ٹائم نہیں ہے۔ تم آؤ جلدی سے۔ تمہیں چھوڑ آؤں۔ کھانا تو واپس آکر بھی کھایا جاسکتا ہے۔“ ان کو اس سے بھی زیادہ جلدی تھی۔

”اچھا۔ بس ابھی آئی۔“ شفا جلدی سے اندر گئی اس کی واپسی پانچ منٹ بعد ہوئی تھی۔

”چلیں۔“ اس نے بدیہ کو پچھلی سیٹ پر بٹھایا اور خود بھی بیٹھ گئی۔

”پہلے تو شور مچا رکھا تھا کہ جلدی آئیں۔ دیر ہو گئی تو

خیر ناراض ہو جائے گی۔ اب آگیا ہوں تو کہاں چلی گئی تھیں۔“ عمیر نے گاڑی اشارت کرتے ہوئے پوچھا۔

”آپ کا کھانا گرم کر کے ٹیبل پر رکھ کر آئی ہوں۔ اب واپس جاتے ہی کھا لیجئے۔“ وہ اپنے پاؤں میں کچھ تلاش کر رہی تھی۔

”میں جا کر گرم کر لیتا۔ تم نے ایسے ہی تکلف کیا۔“ عمیر نے ایک موڑ کاٹتے ہوئے بے دھیانی میں کہا۔

”تکلف۔“ شفائے تعجب سے انہیں دیکھا پھر خفیف سانس دی۔ بولی کچھ نہیں۔ اس کے بعد عمیر بھائی ہی باتیں کرتے رہے اس نے بس ہوں ہاں میں ہی جواب دیا۔

”جواب دیا۔“ شمر کا گھر آگیا تو اسی خاموشی سے اتر گئی۔

”واپسی میں شاید دیر ہو جائے۔ آپ ویٹ نہ کیجئے گا۔ میں اور بدیہ رات کو یہیں رک جائیں گے۔“

”نہیں۔ جب فارغ ہو جاؤ تو کال کر دینا۔ میں آجاؤں گا لینے۔“ خالی گھر مجھے کٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔

”تو پھر گھر کی اصل مالکن کو واپس لے آئیں سورنہ خالی گھر تو ایسے ہی کٹ کھانے کو دوڑتا رہے گا۔“

شفائے بے ساختگی سے کہہ دیا تھا۔ فیصلے کا ایک لمحہ ہوتا ہے اور شفائے اس لمحے کو گنوا نامناسب نہیں سمجھا۔

عمیر چونک کر اسے دیکھنے لگے۔ شفا گاڑی کی کھڑکی میں جھک گئی۔

”آپ کے گھر کو میری یاد بدیہ کی ضرورت نہیں ہے بھائی! ہم تو اس گھر کی بیٹیاں ہیں۔ اور بیٹیاں ساری زندگی باپ بھائی کے گھر میں نہیں رہتیں۔ آپ کے گھر کو بیوی کی ضرورت ہے۔ آپ کو ساہر بھائی کی ضرورت ہے۔“

وہ اتنے پیار اور نرمی سے بول رہی تھی کہ اس کا لفظ لفظ عمیر کے دل میں اترتا چلا گیا۔

”پھر بات کریں گے۔“ انہوں نے بات سمیٹی اور زن سے گاڑی بھگالے گئے۔

شفائے خفیف سی ہوئی۔ سانس نہیں۔

”آپ جتنے چاہے پروے ڈال لیں اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ ساہر بھائی کے بغیر آپ کی زندگی میں اتنا بڑا خلا پیدا ہو گیا ہے جسے کوئی دوسرا انسان نہیں بھر سکتا۔“ بدیہ کا ہاتھ پکڑتے اس نے دل ہی دل میں عمیر کو مخاطب کیا تھا۔

”چھو! بدیہ منہ اٹھا کر معصومیت سے اسے دیکھ رہی تھی۔“

”یامااما کو گھر لے آئیں گے ناں؟“

”ضرور لے آئیں گے۔ بس دو دن اور۔“ اس نے پیار سے بدیہ کا گل چھوا۔ وہ اسی میں خوش ہو گئی۔

\*\*\*

”ماںوں تو ٹیپیکل خواتین کی رسم ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا ہم دونوں چغند وہاں کیا کرنے جا رہے ہیں۔“ تقی جڑ کر بول رہا تھا۔ پہلے تو آنے پر ہی راضی نہیں تھا اور جب آیا کالے رنگ کی اسٹائنلش سی شلوار قمیص میں سج کر آگیا۔ اس تیاری کے ساتھ وہ دولہا کا دست کم خود دو لہا زیادہ لگ رہا تھا۔

”ماں اور ساری خواتین کو شمر کے گھر کسی نے تو چھوڑنے جانا تھا تو میں نے سوچا ہم دونوں فارغ ہوں گے تو ہم چھوڑ آتے ہیں۔“ سمیر نے کہا۔

”بڑا اچھا سوچا۔ تم سے تو کسی اچھی سوچ کی توقع کرتا ہی بے وقوفی ہے۔“ تقی نے جل کر کہا تھا۔ سمیر نے اسے بری طرح گھورا۔

”بھولو مت۔ تم میرے پیسٹ فرینڈ اور شہر والے ہو۔ اس لیے تمہیں ساری شادی میں میرے ساتھ ساتھ رہنا پڑے گا۔“

”بھائی! میں اس جبری تقرری سے مستعفی ہوتا ہوں۔ تم یہ پوسٹ کسی اور کو دے دو۔“

”تقی! وہ بچوں کی طرح جسور نہ لگا۔“

”اور نہیں تو کیا یار! میں نے سوچا تھا اتنے دنوں بعد ذرا ریلیکس ہونے کا موقع مل رہا ہے۔ آرام سے بیٹھیں گے۔ کوئی مووی دیکھیں گے۔ ذرا Chill کریں گے۔ تو نے سارا پروگرام بگاڑ دیا۔“

”تو نے میری شادی کے لیے آف لیا ہے ناں۔ تو پھر اتنی باتیں کیوں سنا رہا ہے۔ اور خدا را اب آہستہ پونہ۔ اماں پہلے ہی مجھے ساتھ لے جانے پر راضی نہیں تھیں۔ میں نے کہا اکیلا تھوڑا جاؤں گا تقی کو بھی ساتھ لے جاؤں گا تاکہ شمر کے گھر والوں کو بھی اعتراض نہ ہو کہ دولہا اٹھ کر آگیا ہے۔“

”ہاں تو دولہا ٹک کر گھر کیوں نہیں بیٹھتا۔ لو فروں کی طرح خواتین کے فنکشن میں انٹری مارنے کی کیا ضرورت ہے؟“

”چار دن ہو گئے ہیں میں نے شمر کو نہیں دیکھا۔“ تقی انداز میں اطلاع دی گئی۔ ”پھر شمر کی بھی خواہش تھی کہ میں آؤں۔“

”تقی نے اسے گھور کر دیکھا لیکن اس کی شکل دیکھ کر ہنسی آ گئی۔“

”بیٹا! تم صحیح جو رو کے غلام ثابت ہونے والے ہو۔ خیر کب تک لکھتا ہے؟“

”ابھی کہاں لکھتا ہے؟“ اس لیے کہا جیسے اس کی عقل پر شک گزرا ہو۔

”ابھی تو میں تیار ہوں گا۔ تم اتنا تیار ہو کر آگئے ہو کہ شہر والے کم دولہا زیادہ لگ رہے ہو۔ مجھے تو فکر بڑ گئی، کہیں شمر کی رشتہ دار خواتین میرے بجائے تمہیں اسٹین لگانا شروع کر دیں۔“

”ہا ہا ہا۔ اتنا فکر مند نہ ہو۔ میں خود ہی ذرا پیچھے چھو رہوں گا تاکہ کوئی غلط فہمی کا شکار ہو ہی نہیں۔ لیکن پھر بھی تم دل میں دعا ضرور کرتے رہنا۔ دراصل میری پر سنالٹی ہی ایسی ہے کہ بڑے بڑے کام پلہ کس کا شکار ہو جاتے ہیں۔ پھر تم کیا چیز ہو۔“

”ہو نہ۔“ اس نے منہ کا زاویہ بگاڑ کر کہا ہی تھا کہ سمیر کی اماں آ گئیں۔

”ارے تقی! تم آگئے۔“ تقی کے سر پر پیار دیتے ہوئے کہا۔

”جی اماں! کوئی کام ہے تو بتائیں؟“ وہ فوراً تابع دار بنا۔

”بیٹا! کام کیا ہوتا ہے بس ذرا سمیر کا ہاتھ پکڑے



رہنا۔ انہوں نے بڑی سنجیدگی سے کہا تھا۔ وہ دونوں حیران ہو کر ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے۔  
 ”اس کی کوئی نرالی شادی ہو رہی ہے کہ خوشی سے پاؤں ہوا جا رہا ہے۔ ایسا نہ ہو وہاں ناچنا ہی شروع کر دے۔ اب تم آگے ہو تو مجھے تسلی رہے گی ذرا سنبھال لیتا۔“  
 ان کا سنجیدہ انداز۔ تقی کا قہقہہ بے ساختہ تھا اور سیر کی شکل دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

شفا ثمر کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ۔ سامنے ہی بیٹھی تھی۔ گھر کے سادہ سے لباس میں تھی۔ سایوں کا جوڑا تو ابھی سیر کے گھر سے آتا تھا لیکن اس روپ میں بھی خوب دک رہی تھی۔ شادی کا ایک الگ سی روپ ہوتا ہے جو لڑکی کے چہرے پر نظر آنے لگتا ہے۔  
 ”بڑی جلدی آگئی ہو۔“ تنہا ہو کر کہا۔  
 ”یار! عمیر بھائی دیر سے آئے نا۔“ وہ معذرت خواہانہ انداز میں کہتی اپنا پاؤں اس کے بیڈ پر اچھالتی اس کے پاس آگئی۔

”میں نے ابھی کھڑکی سے دیکھا۔ ابھی بھی تم عمیر بھائی سے بات کر رہی تھیں۔ یہ ضروری بات کسی اور دن نہیں ہو سکتی یا آج ہی سارے کام نبھانے تھے۔“ ثمر اس کے دیر سے آنے پر بہت خفا تھی۔  
 ”میں ان سے کہہ رہی تھی سما ہر بھائی کو واپس لے آئیں۔“  
 ”کیا؟“ ثمر کا دل غ بھک سے اڑ گیا۔ ”انہوں نے تمہارے ساتھ اتنا برا کیا پھر بھی تم چاہتی ہو وہ واپس آئیں۔“

”اس کے علاوہ کوئی دوسرا آپشن بھی تو نہیں ہے۔“ شفا نے سادگی سے کہا۔ ”ہدیہ ہر وقت سما ہر بھائی کو یاد کر کے روتی ہے۔ زندگی میں کوئی کتنا بھی پیار کر لے ماں کی کمی پوری نہیں کر سکتا۔ پھر عمیر بھائی کو دیکھو، کتنے کمزور ہو گئے ہیں وہ۔ کھانا نہیں کھاتے بات نہیں کرتے ایسے تو نے بکھرے کبھی

نہیں تھے وہ۔ مجھ سے ان کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔ جو ہوتا تھا ہو چکا۔ اس سب کو بھلانا اور بھائی کو معاف کرنا مشکل ہو گا لیکن ناممکن نہیں۔ ویسے بھی میں اتنی خود غرض کبھی نہیں ہو سکتی کہ بھائی کے کیے کی سزا ان کے بچوں کو دوں۔ عادل ساری زندگی کے لیے باپ سے محروم رہے گا اور ہدیہ ماں سے۔ یہ میں نہیں چاہتی کسی قیمت پر نہیں۔“ اس نے پورے مصمم لہجے میں کہا تھا۔

ثمر اس کے ارادے سے باز رکھنا چاہتی تھی لیکن اس کے لہجے کا ٹھوس پن دیکھ کر اپنا ارادہ بدل دیا کہ بہر حال ارادہ برا نہیں تھا اس کا۔  
 انتقام کی اس جنگ میں اگر کوئی سب سے زیادہ خسارہ اٹھاتا تو وہ ہدیہ اور عادل ہی تھے۔  
 ”جیسے تمہاری مرضی۔“ ثمر نے مسکرا کر نرمی سے کہا تھا پھر موضوع ہی بدل دیا۔  
 ”بڑی تیار ہو کر آئی ہو؟“ چھی لگ رہی ہو ویسے۔“ انداز میں شرارت بھر کر کہا تھا۔

”تنی محنت سے تیار ہوئی ہوں۔ اچھی کیسے نہ لگتی۔“ شفا خوش ہو کر گھڑی ہوئی اور شیشے میں خود کو دیکھنے لگی۔ اس نے بہت خوب صورت زرد جامہ وار کی لمبی گھیس کے ساتھ چست پاجامہ پہن رکھا تھا۔ دوپٹا ایک کندھے پر دوسرے پر نفاست سے گندھی چھیا۔ کانوں میں بڑی بڑی بالیاں آکھوں میں خوب بھر بھر کر کاجل اور ہونٹوں پر ہلکی لب اسٹیک۔  
 ”لڑکیو! جلدی کرو۔ لڑکے والے آگئے ہیں۔ اور ثمر! یہ شفا کو تو تیار کرو۔ اتنی سادگی سے تیار ہوئی ہے کہ لگ ہی نہیں رہا بیابانہ جی ہے۔“ ثمر کی امی اندر آکر کہنے لگیں۔ ”باہر آکر دیکھو میرے دیور کی بیٹیاں تم سے دس گنا زیادہ تیار ہو کر آئی ہیں۔“

شفا خفیف سی ہو گئی۔  
 ”شفا اس سادگی میں بھی ان سب سے زیادہ اچھی لگ رہی ہے۔“ ثمر نے صورت حال سمجھ کر فوراً بات سنبھالی۔  
 ”ویسے بھی شفا کو ان کی طرح غیر ضروری میک اپ

لانے کی عادت نہیں ہے۔ یہ ایسے ہی ٹھیک ہے۔“  
 ”اچھا بھئی جیسے تم لوگوں کی مرضی میں مہمانوں کا استقبال کرنے جا رہی ہوں ذرا سی بھی دیر ہو گئی تو سیر کی اماں برا مان جائیں گی کہ دولہا کی ماں کو صحیح پروٹوکول نہیں ملا۔“ انہوں نے مزے سے کہا اور جلدی سے باہر نکل گئیں۔

وہ دونوں ان کے انداز پر مسکرا رہی تھیں ان کے جاتے ہی ثمر نے اس کا پیچھا لیا۔  
 ”امی بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ اچھی تو لگ رہی ہو تم لیکن کسی اینگل سے بیابانہ نہیں لگ رہیں۔“ وہ اسے گہرے رنگ کی لب اسٹیک لگانا چاہتی تھی شفا نے اس کا ہاتھ روک دیا۔  
 ”عم بھول رہی ہو۔ میں بیابانہ ہوں بھی نہیں۔“ اس کے لہجے میں اداسی کی ہلکی سی رمت تھی۔  
 ثمر اصرار نہیں کر سکی۔

اور وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ سیر کو اندر تک آنے کی اجازت نہیں ملی۔ معاملہ کچھ یوں تھا کہ اس کی اپنی ہی اماں۔ مخالف بن گئیں۔  
 ”ڈرائیور کا کام ختم۔ اب نکلو یہاں سے۔“  
 ”اماں! سوتیلے بیٹوں والا حال کیوں کر رہی ہیں؟“ اس نے لاڈ سے کہا لیکن اماں لاڈ اٹھانے کے موڈ میں نہیں تھیں۔

”اس بات پر سسرال میں طعنے کھاؤ گے۔ یہ مجھے منظور نہیں۔ راجپوتوں کی ایک شان ہوتی ہے اسے برقرار رکھنا چاہیے۔“  
 ”ایسی بات ہے تو مجھے ساتھ لانے کی کیا ضرورت تھی۔ گھر میں ہی منع کرو۔“ اس نے جل کر کہا۔  
 ”گھر میں ہی منع کرو تھی تو تمہیں تمہاری ضد کی سزا کیسے ملتی۔ اب باہر بیٹھ کر انتظار کرو۔“

”اچھا یہ مٹھائی کا ٹوکرا تو اندر پہنچا لینے دیں۔ آپ خود اٹھا کر لے جاتی اچھی لگیں گی کیا؟“ اس نے محبت سے کہا۔ مقصد صرف یہ تھا کہ ثمر کے گھر والوں کو پتا

چل جائے کہ وہ بھی ساتھ آیا ہوا ہے پھر اسے یقین تھا۔ کوئی نہ کوئی اسے اندر لے ہی جانا لیکن یہ اماں بھی تھیں۔

”ٹوکرا تقی اندر پہنچا دے گا۔ تقی بیٹا! آنا ذرا۔“ انہوں نے پیار برساتے انداز میں تقی سے کہا۔ تقی کو سیر کی درگت بننے دیکھنے میں پہلے ہی گد گدی ہو رہی تھی۔ اس بات پر نہایت تالخ داری سے آگے بڑھ کر ٹوکرا اٹھایا اور اچھا پیچہ بن کر اماں کے پیچھے چل دیا۔ جاتے جاتے سیر کو چڑانا نہیں بھولا تھا۔

”اماں کی راجپوتانہ شان بھی غلط وقت پر جاگتی ہے۔“ سیر منہ لٹکا کر گاڑی کے بونٹ پر چڑھ کر بیٹھ گیا اسے اس وقت پر افسوس ہو رہا تھا جب تقی کو ساتھ لے آنے کا مشورہ دیا تھا۔ نہ لانا تو اب ٹوکرا اٹھا کر وہی اندر جا رہا ہوتا۔

اندر تقی کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ ایک تو یہ کہ وہ ٹی وی آرٹسٹ پھر دولہا کا بہترین دوست اور سب سے بڑی بات یہ کہ رنج کے بیٹھ سم۔  
 ثمر کی کزنز نے چپکے چپکے دل تھامے تو ان کی والدہ اؤں نے امید باندھ لی۔

ان ہی میں سے ایک کزن ثمر کو اطلاع دینے بھاگی۔  
 ”مائے اللہ ثمر! تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ سیر بھائی کا کوئی دوست لی وی آرٹسٹ بھی ہے۔“ وہ اتنی ایکساٹینڈ تھی کہ اپنا سانس ہی سنبھال رہی تھی۔  
 ثمر بایوں کا جوڑا پہنے شفا سے چولی بنوا رہی تھی۔ شفا کے ہاتھ ٹھک کر رک گئے۔ دونوں رک کر اسے دیکھنے لگیں۔

”تقی بھائی کی بات کر رہی ہو سہہ بھی آئے ہیں؟“  
 ”ہاں وی تقی وہ موبائل فون کے ایڈ والا۔ آف یہ بندہ تولی وی پر کچھ لگتا ہی نہیں جتنا اصل میں بیٹھ سم ہے۔“ دل پر ہاتھ رکھ کر وہ توفد اہی ہوئی پڑی تھی۔ ثمر نے ذرا نا پسندیدگی سے اسے دیکھا۔

”تم باہر جا کر بے ہوش ہو جاؤ۔ یہاں مجھے تیار ہونا ہے۔“  
 کزن پر نئے نئے عشق کا دورہ پڑا تھا اس لیے ثمر کی



بات کا برا نہیں مانا اور جیسے آئی تھی ویسے ہی لہرائی باہر نکل گئی۔

”تقی بھائی آئے ہیں تو سمیر بھی ضرور آیا ہوگا۔ تم ذرا جا کر دیکھو گی؟“ شمر نے برجوش ہو کر کہا۔

لیکن شفا خود کو لا تعلق ظاہر کرنے کی کوشش میں مصروف تھی۔ یہ الگ بات کہ دل تقی کی آمد کا سن کر عجیب انداز میں دھڑکنے لگا تھا۔

”تقی آیا ہے تو سمیر بھائی بھی آئے ہوں گے۔ ابھی کوئی ان کی خبر بھی لے کر پہنچ جائے گی۔ تم ذرا سر سیدھا رکھو مجھے۔ ٹاٹ بنانے دو۔“ زبردستی پکڑ کر اس کا سر سیدھا کیا۔

”ٹاٹ بنائی نہیں جاتی لگائی جاتی ہے۔“ شمر نے اس کے ہاتھ سے برش لے کر ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دیا اور پورا اس کی طرف گھوم کر زور دے کر بولی۔

”اور وہ بھی ٹوٹتے ہوئے رشتوں کی۔ جب ساہر بھابھی اور عمیر بھائی کا رشتہ جوڑنے کی کوششوں میں لگی ہو تو خود پر بھی رحم کرو۔ زیادہ اچھے پن کا مظاہرہ کرنے کے لیے اپنے دل کی خوشی کا خون مت کرو۔“

”کیسی باتیں کر رہی ہو۔ پاگل تو نہیں ہو گئیں۔“ اس نے گہرا کر جھٹکے سے ہاتھ چھڑایا۔

”پاگل میں نہیں تم ہو گئی ہو۔“ شمر نے رساں سے کہا۔ ”اپنے دل کا حال تم ساری دنیا سے چھپا سکتی ہو شفا۔ لیکن مجھ سے نہیں۔ اب جاؤ اور تقی بھائی سے مسکرا کر ملو۔“

”جب تمہیں باہر لے کر جاؤں گی تو مل لوں گی۔ اسپیشلی جا کر ملنا ضروری نہیں ہے۔“ اس نے کٹی کٹر کر کہا۔

”بالکل ضروری ہے۔“ شمر اسے لے کر دروازے کی طرف چلی۔

”شمر! ایسے عجیب لگے گا۔ میں نہیں جا رہی۔“

”اچھا۔“ شمر نے رک کر سوچا پھر بولی۔ ”او میں بھی ساتھ چلتی ہوں۔“

\*\*\*

جس وقت شمر شفا کا ہاتھ پکڑے بھاگ بھاگ

سیدھیاں اتر کر نیچے آ رہی تھی، عین اسی لمحے تقی خواتین کی محفل سے جان بچا کر کھسک رہا تھا۔ لالہ میں لکراؤ ہو گیا۔

تقی نے چونک کر دیکھا پھر فوراً ”سلام جڑوا۔“

شفا شمر کے ٹھوکوں کے باوجود خاموش رہی۔

”تقی بھائی! مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے، آپ فرار ہو رہے ہیں۔“

”معاذہ کچھ ایسا ہی ہے۔“ اس نے انگلی کی پور سے پیشانی کھجاتے ہوئے کہا۔

”اتنی خواتین کے بیچ میں اکیلا پھنس گیا۔ شکر ہے آپ کی امی نے جان بچالی۔ سمیر خود تو اطمینان سے باہر بیٹھا ہے لے کر مجھے پھنسا دیا۔“

”سمیر بھی آیا ہے۔“ شمر کھلکھلائی۔

”جی ہاں بالکل۔ لیکن امی نے باہر ہی روک دیا۔ کہنے لگیں ڈرائیور کو اندر آنے کی اجازت نہیں ملے گی۔“

شمر کو اس بات پر بڑی گدگدی ہوئی۔ خوب کھلکھلا کر ہنسی۔ ”سمیر کا موڈ آف ہو گا پھر تو۔“

”ایسا ویسا۔“ تقی بھی مزے سے بولا پھر شفا کی طرف دیکھا۔

”تم خیریت سے ہو؟“

”ہاں بالکل۔“ شفا بھی مسکرائی پھر دونوں ہی خاموش ہو گئے۔ کوئی بات ہوتی تو کرتے۔ ایسا لگ رہا تھا دانستہ ہی ایک دوسرے سے گریزاں ہیں۔

شمر پہلے تو خاموش رہی پھر دونوں کو باری باری دیکھا۔

”کوئی بات کر لیں یا خاموش ہی رہتا ہے؟“

”میں چلتا ہوں۔ ایک تو سمیر کو اندر آنے نہیں دیا پھر میں بھی اس کے پاس نہ گیا تو غصے سے بھوت بن جائے گا۔“ وہ جلدی سے کتابا ہر نکل گیا تھا۔

شمر نے اس کے جاتے ہی شفا کو بری طرح گھورا۔

”آج ہی منہ میں گوند ڈالنا ضروری تھی؟“

شفا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور ہال کی طرف چلی گئی۔ شمر جیسے اس کی عقل پر

السوس کر کے رہ گئی تھی۔

\*\*\*

شفا دانستہ شمر سے بچتی محفل میں شامل ہو گئی۔ اسے ڈر تھا۔ وہ زبردستی تقی کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دے گی تب ہی ڈھولک لے کر بیٹھ گئی۔ لیکن شمر بھی اپنے نام کی ایک ہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اسے زبردستی سب کے بیچ میں سے اٹھا کر لے گئی۔

”ضروری کام ہے۔“ شفا کے انکار کے جواب میں اس نے بس اتنا کہا اور اسے کھینچتی ہوئی لے گئی۔

ڈھولک کے ہنگامے میں کسی نے نوٹس بھی نہیں لیا۔

”کیا مصیبت ہے تمہیں؟“ باہر آ کر اس نے زبردستی ہاتھ چھڑوایا۔

”مجھے سمیر سے ملنا ہے۔“ شمر نے بے چارگی سے کہا تھا۔ شفا نے سر پیٹ لیا۔

”شادی والے روز رتی برابر روپ نہیں آئے گا۔ پھٹکار پر سے گی۔ دیکھ لینا۔“ خبردار کرنا چاہا لیکن شمر ٹھان چکی تھی۔ مزے سے بولی۔

”اور اگر یہ دن گزر گیا تاں تو دوبارہ میری زندگی میں نہیں آئے گا۔“

وہ بنا پروا کیے گھر کی پچھلی طرف چل پڑی۔

”سمیر پچھلے گیٹ پر انتظار کر رہا ہے۔“ وہ بہت پر جوش ہو رہی تھی۔ شفا کو ناچار اس کی پیروی کرنا پڑی۔

دل ہی دل میں حیران بھی تھی کہ شمر اتنا بڑا رسک کیسے لے رہی ہے۔ کسی کو کاٹوں کلن بھی خبر ہو جاتی تو بہت بے عزتی ہوتی۔

وہ دونوں باہر نکلیں تو دیکھا گیٹ کے بالکل سامنے انتظار ہو رہا تھا۔ تقی گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔

سمیر گاڑی کے بونٹ پر سوار تھا۔ شمر کو دیکھ کر وہ چھلانگ لگا کر اتر آیا۔ چہرے پر خوشی سی پھیل گئی تھی۔

”بڑی دیر لگا دی۔“

”بلایا کیوں ہے؟ یہ بتاؤ۔“ شمر نے کھٹکتے لہجے میں کہا۔

”ضروری بات کرنا تھی۔“ سمیر بہت ہی خوش تھا۔

”آپ لوگوں کو جو بھی بات کرنی ہے۔ ذرا جلدی کر لیں۔“ شفا پر سخت گھبراہٹ سوار تھی۔ ”اندر کسی کو بتا چلا کہ ہم باہر ہیں تو مصیبت ہو جائے گی۔“ وہ بار بار مرکز گیٹ کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”تم ہر بات کو چار سے ضرب دے کر بیان کرنا مت چھوڑنا۔“ تقی نے جواب تک خاموش تھا، مداخلت کی، پھر سمیر سے بولا۔

”سمیر! تم لوگ آرام سے اپنا کام نبھاؤ۔ یہاں کوئی مسئلہ ہوا تو میں سنبھال لوں گا۔“ ساتھ ہی اس نے گاڑی کا انکلا دروازہ کھول دیا۔ شمر چپکتی ہوئی اندر بیٹھ گئی۔

سمیر نے ہاتھ اٹھا کر تقی کو سراہا۔ ”شکریہ میرے دوست۔“

وہ گاڑی میں بیٹھا۔ گاڑی اشارت ہو گئی اور زن سے چلی گئی۔

ایک منٹ کی بات تھی۔ شفا ہکا بکا کھڑی شکل دیکھتی رہ گئی۔

”منہ بند کر لو ورنہ کبھی چلی جائے گی۔“ تقی نے جتنی بے ساختگی سے کہا تھا۔ شفا نے اتنا ہی گہرا کر منہ بند کیا جیسے سچ کچھ کبھی چلی جائے گی۔ پھر جواب نہ دیکھنے کا عہد کر رکھا تھا۔ اس عہد کو توڑ کے تقی کو دیکھا۔

”ان لوگوں کو اس طرح نہیں جانا چاہیے تھا۔ ابھی شمر کو ابٹن لگتا ہے ان کی واپسی سے پہلے کسی نے شمر کو بلوایا تو ہم کیا جواب دیں گے۔“ وہ سچ کچھ بہت گہرائی ہوئی تھی۔

”ذرا ذرا سی باتوں پر گھبرانا چھوڑ دو شفا! بڑی ہو چکی ہو تم۔“ ایک چھوٹے سے پتھر کو ٹھوکر سے اڑاتے ہوئے تقی نے مزے سے کہا۔

”اور تم ہر بات کو معمولی لینا چھوڑ دو۔“ شفا نے چڑ کر کہا۔

”یہ معمولی بات ہی ہے۔“ تقی نے زور دے کر کہا۔ ”دو روز بعد ان دونوں کی شادی ہو جائے گی۔ اگر



ساتھ چلے بھی گئے تو کون سی قیامت آجائے گی۔ ویسے بھی انہوں نے ایک رنگ ہی خریدنی ہے۔ زیادہ سے زیادہ بیس منٹ میں واپس آجائیں گے۔“

بتا کر تکی آگے جانے لگا پھر مڑ کر اسے دیکھا۔

”کہاں؟“ وہ حیران ہوئی۔

”ایسے بدھوؤں کی طرح میں یہاں نہیں کھڑا رہ سکتا۔ تھوڑی دیر کر لیتے ہیں۔“

شفا نے مڑ کر گھر کی طرف دیکھا۔ تذبذب میں کھڑی رہی پھر جیسے ہر بات پس پشت ڈال کر اس کے ساتھ چل پڑی۔

”وہ سامنے ایک دکان ہے۔ تمہیں آئس کریم کھلاتا ہوں۔“ وہ بالکل نارمل لگ رہا تھا۔

”گھر میں سب کیسے ہیں۔؟ امی اور بین کو بھی لے آتے۔“

”ٹھیک ہیں۔ وہ دونوں ہندی اینڈ کریں گی۔ آج تو میرا بھی آنے کا ارادہ نہیں تھا۔ سیر زبردستی لے آیا۔“

”تمہیں کیسی ہے؟“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے سرسری سا جواب دیا۔

فرزرد دکان کے باہر ہی رکھا تھا۔ وہ کھول کر اندر جھانکنے لگا۔

”کون سی کھاؤ گی۔“ شفا نے بھی اندر جھانکا اور اپنی پسند کی آئس کریم نکال لی۔ تکی اندر جا کر پیسے دے آیا۔

واپس آیا تو دونوں دوبارہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے گھر کی طرف چل پڑے۔

”تم نے میرا ڈراما دیکھا؟“ تکی نے اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھا۔

شفا نے زور سے اثبات میں سر ہلایا۔ ”میں تو حیران رہ گئی۔ بہت اچھا فارم کیا تم نے۔“

تکی خوش ہو گیا جیسے اسے سند مل گئی ہو۔ ”صرف تم ہی نہیں کر سکتے کسی بھی حیران رہ گئے مجھے بہت اپری سی ایشن ملی ہے۔“ وہ جوش سے بتانے لگا۔

”پانے کیا کہا؟“

”وہ بھی بہت خوش تھے۔ کہنے لگے شفا نے بتایا تھا تم اچھی ایکٹنگ کرتے ہو۔ اتنی اچھی کرتے ہو۔ یہ نہیں بتایا تھا۔“ اس نے ہنس کر بتایا۔ ساتھ ہی شفا کے ہاتھ سے آئس کریم لے کر ایک بائٹ لی۔ شفا اس حرکت پر خفیف سی ہوئی لیکن کچھ کہنے سے پہلے ہی تکی آئس کریم اس کے ہاتھ میں دے چکا تھا۔

تکلفاً خاموش ہی رہی۔

”تمہیں یاد ہے ہم نے پہلے بھی ایک بار ایسے سیلیبریٹ کیا تھا۔ جب میرا پہلا بل بورڈ لگا تھا۔“ تکی کو اچانک یاد آیا۔

شفا نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔ شرارت سے بولی۔ ”تم سڑک پر کتنا ناچ رہے تھے۔ بالکل پاگل لگ رہے تھے۔“

اس بات پر تکی نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔ ”میرا پہلا ڈراما آن ایر ہوا تب بھی میرا دل چاہ رہا تھا کہ ویسے ہی سیلیبریٹ کروں۔“

”پھر؟“

”پھر کیا۔ تم تو تھیں نہیں کون میرے ساتھ آؤ گی رات کو سڑک پر جاتا۔“ اس نے ایسے کہا جیسے شفا کی عقل پر شک گزرا ہو۔

شفا کے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں لیا۔

”تمہیں کو بلا لیتے تے۔“ اس نے آہستگی سے کہا۔

تکی نے سر جھٹکا۔ ”تمہیں خود بڑی آدمی ہے بھی اس کے پاس اتنی فرصت کہاں کہ بیٹھ کر ہماری چھوٹی چھوٹی خوشیاں منائی پھرے۔“ عام سے لہجے میں کہتے ہوئے اس نے شفا کے ہاتھ سے دوبارہ آئس کریم لیتا چاہی۔ شفا جو اس کی بات پر ابھی پوری طرح حیران بھی نہیں ہو پائی تھی۔ اس نے بے ساختہ ہاتھ پیچھے کر لیا۔

”اتنے بڑے آدمی تو تم بھی ہو گئے ہو کہ دو آئس کریم خرید سکو۔“ یہ کھلا طعنہ تھا لیکن تکی بالکل بھی بد مزاج نہیں ہوا۔

”تمہاری آئس کریم شیر کرنے کی عادت بڑھ گئی ہے۔ تمہارے جانے کے بعد تو میں نے آئس کریم

کھانا ہی چھوڑ دی تھی۔“

وہ آئس کریم کھاتا آگے نکل گیا۔ شفا وہیں کھڑی رہ گئی۔ اور وہ ایسا ہی تھا بڑی بڑی باتیں اتنے آرام سے کہہ جاتا کہ بس۔

\*\*\*

”میرا خیال ہے۔ تکی بھائی اور شفا نے کافی باتیں کر لی ہوں گی۔ ہمیں واپس چلنا چاہیے۔“ ٹمر نے بڑا سا گول گپا منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

سیر اسے قریبی مارکیٹ لے آیا تھا۔ ٹمر کی فرمائش پر اسے گول گپے لے کر دیے۔

”ان دونوں نے باتیں کی ہوں گی یا نہیں۔ میں تو جی بھر کے دیدار کر لوں۔“ سیر نے بازو باندھتے ہوئے اور بند گاڑی سے کندھا لگا کر کھڑے ہوتے ہوئے بڑے محبت بھرے انداز میں ٹمر کو دیکھا تھا۔ وہ پیلے رنگ کے سوٹ میں بے ڈھنگے پن سے سر بردھٹا اوڑھے مزے سے گول گپے کھانے میں مصروف تھی۔ ان کی گاری ٹھیلے سے تھوڑی دور کھڑی تھی اور گول گپوں کی زڑے گاڑی کی چھت پر رکھی ہوئی تھی۔

”واہ۔ ایسے بات کرتے ہوئے اتنے لوفر لگے ہوں گے کہ کیا بتاؤں۔“ ٹمر نے بڑے آرام سے اس کے رومانٹک موڈ پر پانی پھیر دیا۔

”اسی لوفر کے ساتھ آپ نے ساری زندگی گزارنی ہے میڈم!“ اس نے بھی چڑا کر کہا تھا۔

”ڈھمکی دے رہے ہو؟“ اس کی آنکھیں پھیل گئیں لیکن اس کی آنکھوں سے زیادہ سیر پھیل گیا۔

”نہیں۔ التجا کر رہا ہوں۔ پیار بھری۔ محبت بھری التجا۔“ اگر اس کے ساتھ ہی کھڑا ہو گیا۔

ایک تو دیکھ ایسے رہا تھا پھر اتنا قریب بھی آگیا تھا۔ ٹمر جتنی مرضی پھنے خان بن لیتی تھی تو لڑکی۔ اور لڑکیوں کے دل کو ذرا جلدی ڈانوں ڈول ہو جانے کی عادت ہوتی ہے۔ خصوصاً اس مرد کے معاملے میں جو دل سے پہلے ہی قریب ہو اور اتفاق سے ایک دو روز میں زندگی کا ساتھی بھی بن جانے والا ہو۔

اس نے زور سے گلا کھنکھار کر اس طلسم کو ختم کرنے کی کوشش کی جو سیر کی محبت لٹاٹی نظروں سے پھیل رہا تھا۔

”دور ہو کے کھڑے ہو اور زیادہ مجنوں کے جانشین بننے کی ضرورت نہیں ہے۔“ اپنی گھبراہٹ پر بڑی مشکل سے قابو پار ہی گئی۔

سیر نے اسے غصے سے گھورا اور گن کر چار قدم دور ہٹ گیا۔

”یہ لو ہو گیا دور۔ اور مار دیا میں نے اپنے اندر کے مجنوں کو۔ اب شادی کے روز بھی کوئی رومانٹک بات کر لی تو میرا نام پیل دیتا۔“

اس بات پر ٹمر کو بڑے زور سے ہنسی آئی۔

”تکی بری لگ رہی ہو ایسے ہنستی ہوئی کہ بس۔“ اس نے دانت کچکچائے ٹمر اور زور سے ہنس دی۔

”چھا چلو موڈ ٹھیک کرو۔“ پھر موضوع بدل کر بولی۔

”تمہارا کیا خیال ہے سیر! شفا اور تکی بھائی کا بیچ اپ ہو جائے گا؟“

”ان دونوں میں کوئی جھگڑا تو ہے نہیں کہ بیچ اپ کا سوال اٹھے۔“ سیر نے گاڑی اشارت کرتے ہوئے کہا تھا۔

”بس ان دونوں کو یہ احساس ہو جانا چاہیے کہ وہ ایک دوسرے کے لیے کتنے ضروری ہیں۔ یہ جو ابھی ہنگامی ملاقات کروائی ہے اس کے پیچھے بھی میرا یہی مقصد تھا۔ میں چاہتا ہوں وہ دونوں کچھ وقت ساتھ گزاریں تاکہ انہیں ایک دوسرے کی قدر آئے۔ پتا چلے، الگ ہونے کا فیصلہ کر کے وہ کس قدر حماقت کر رہے ہیں۔“

ٹمر کی آنکھیں حیرانی اور صدمے سے کھل گئیں۔

”یعنی تم مجھ سے ملنا نہیں چاہ رہے تھے۔ ان دونوں کی ملاقات کے لیے تم مجھے یہاں ملائے ہو۔“

”اور نہیں تو کیا۔“ اس نے مزے سے کہا۔

”اور میں سمجھی۔ شادی سے پہلے ایک آخری بار تم



مجھ سے ملنا چاہ رہے ہو اسی لیے ان دونوں کی ملاقات کا بھی کہہ دیا۔ ”اچھا خاصا صدمہ پہنچا تھا۔“  
”تو تمہارا کیا خیال تھا تم سے ملنے کے لیے مراجارہا ہوں۔“ خوب دل جلانے والے انداز میں کہا تھا۔ ”ممنہ بنا کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ سمیر کن اکیوں سے اسے دیکھتا اس بات پر خوش ہو رہا تھا کہ حساب برابر ہو گیا۔

\*\*\*

”تم نے کلج میں ایڈمیشن لے لیا؟“  
”نہیں۔“ شفا نے نفی میں سر ہلادیا۔ ”پرائیوٹ ایگزامینوں کی۔ سوچا سال ضائع ہونے سے بچاؤں۔“  
”ایک بات مانتی بڑے گی۔“ تقی نے سر ہٹنے والے انداز میں کہا۔ ”کبھی کبھی سوچتی ہو لیکن اچھا سوچ لیتی ہو۔“ شرارت سی شرارت۔  
شفا نے اسے کڑی نظروں سے گھورا۔

”تمہیں پتا ہے تقی! تم بہت منہ پھٹ انسان ہو۔“  
اس نے ہر لفظ چبا کر ادا کیا تھا۔ ”تمہیں کبھی اس بات کا احساس نہیں ہوتا کہ تمہاری بک بک سن کر کسی کے دل پر کیا اثر ہو گا۔ تم صرف اپنی کہتے ہو۔ اپنی سنتے ہو۔“

اپنی طرف سے اس نے تقی کی بہت بے عزتی کردی تھی لیکن وہ تقی ہی کیا جو شرمندہ ہو لے۔  
ذرا سا جھک کر کارلش بجالایا۔ اس ڈھٹائی پر شفا کا خون کھول اٹھا۔

”میں جارہی ہوں اندر۔ کسی نے ثمر کے بارے میں کچھ پوچھا تو باہر بھیج دوں گی۔ پھر خود ہی سنبھالتے رہنا۔“ وہ جتنی تیزی سے اندر جانے لگی تھی۔ تقی نے اتنی ہی سرعت اور بے ساختگی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا تھا۔

شفا لڑکھار کر سنبھلی۔ تقی نے اسے روکنے کے لیے ہاتھ پکڑا تھا لیکن دو قدم کے فاصلے نے یہ کیا کہ وہ دونوں ارد گرد بھول گئے۔

اب وہ دونوں تھے اور ساحل کی ریت کی طرح بہتی

چمک دار براسرار رات۔  
اماؤس کی رات جیسی گہری سیاہ آنکھیں اور ان پر اٹھتی جھکتی پلکیں۔  
تقی کے دل نے چاہا ان پلکوں کے سائے تلے زندگی گزار دے۔

اور شفا کے دل نے دعا کی قیامت آجائے یا زمین بھٹے اور وہ دونوں اس میں سما جائیں لیکن خوشی کے اس ایک لمحے سے آگے زندگی نہ ہو۔

گاڑی کا ہارن بجا تو فسون ختم ہو گیا۔ ان دونوں نے ہی سٹپا کر ہاتھ چھوڑ دیے تھے۔  
شفا نے پھر مڑ کر نہیں دیکھا ایسے بھاگی جیسے چور چوری کر کے پکڑے جانے کے ڈر سے بھاگتا ہے۔  
تقی وہیں رہ گیا بالکل تنہا لیکن شاکند۔

\*\*\*

سمیر اور ثمر واپس آئے تو تقی گیٹ کے ساتھ بنے بیچ پر سر جھکائے بیٹھا تھا۔

وہ دونوں پریشان ہو کر اس کے پاس آئے۔  
”تقی! سمیر نے اس کا کندھا ہلایا تو تقی نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ جیسے کسی گہری سوچ میں گم بیٹھا تھا۔ اچانک جیسے گہری نیند سے جاگا۔

”بڑی جلدی آگئے تم لوگ۔ میرا خیال تھا ابھی اور وقت لئے گا۔“ وہ بول ضرور رہا تھا لیکن یہ اس کا انداز نہیں تھا۔

سانحہ گزر جائے یا محبت کے اور اک کا ایک لمحہ۔  
سننے والے کی حالت ایک سی ہو جاتی ہے۔  
”شفا کہاں ہے تقی بھائی؟“

تقی نے جواب نہیں دیا۔ گردن سے گہری طرف اشارہ کر دیا۔

”فب اندر چلی گئی۔“ ثمر ہر اسل ہو کر اندر دوڑی۔

”تمہیں کیا ہوا ہے تقی!“ سمیر نے پوچھا۔ اس کا چہرہ بتاتا تھا۔ کچھ نہ کچھ ہوا ضرور ہے۔

”میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ مجھے گھر چھوڑ دو

میں؟“ اس نے سر اٹھا کر سمیر کو دیکھا۔  
سمیر کے دل میں کئی سوال سر اٹھا رہے تھے لیکن وہ جانتا تھا۔ تقی ابھی کسی سوال کا جواب نہیں دے پائے گا۔ خاموشی سے گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

لیکن اس کے لیے بھی خاموش رہنا مشکل تھا اس لیے کہ تقی کی مستقل خاموشی قابل توجہ ہو یا نہیں اس کے سنجیدہ تاثرات ضرور دل میں خدشات ابھارتے تھے۔ اتنا تو شاید وہ ساری زندگی میں سنجیدہ اور دکھی نہیں ہوا ہو گا جتنا اس وقت نظر آ رہا تھا۔

”تقی! تجھے ہوا کیا ہے؟“ وہ خود کو پوچھنے سے روک نہیں سکا۔

”کچھ نہیں۔“  
”بھابھی سے جھگڑا ہوا ہے کیا؟“ ذرا محتاط ہو کر پوچھا۔

”کاش! جھگڑا ہی ہو گیا ہوتا۔“ آہستگی سے کہا۔

”کیا مطلب؟“  
”کچھ نہیں یار!“ تنگ آکر بولا۔ ”مجھے نیند آرہی ہے۔“

ناچار سمیر نے گاڑی چوتھے گہر میں ڈال دی۔

\*\*\*

دروازہ بند کر کے اس نے خود پر ضبط نہیں کیا۔ جتنے آنسو تھے مہمہ جانے دیے۔ دل میں آوارہ ہوا کی طرح سر پٹختی سسکیوں کو باہر آنے کا رستہ مل گیا تھا۔ وہ خوب جی بھر کر روئی۔

”کیوں۔ آخر کیوں؟“ اس نے دل سے خوب جھگڑا کیا۔

”جب پتا تھا وہ میرا مقدر نہیں بن سکتا۔ جب پتا تھا وہ کسی اور کا ہے تو اس کے آگے کھٹنے ٹیکنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس پر نظر پڑتے ہی مجھے دعا دینے کی کیا ضرورت تھی۔“ وہ خوب سسک سسک کر روئی۔

”شفا! دروازہ کھولو پلینز۔“ ثمر دروازہ بجاتی مسلسل بول رہی تھی۔

شفا جب دیر تک رو چکی تو سر اٹھا کر آئینے میں اپنا

عکس دیکھا۔ چہرہ بتاتا تھا دل پر قیامت گزری ہے۔ پورا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا نفاست سے لگا کاجل آنکھوں کے گرد پھیل چکا تھا۔

اس نے جھک کر زور زور سے پانی کے چھپاکے چہرے پر مارے۔ پھر ہمت مجتمع کرتی اسی طرح کیلے چہرے کے ساتھ باہر آئی۔

ثمر نے دروازہ کھلتا دیکھ کر سکون کا سانس لیا تھا لیکن اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی دھک سے رہ گئی۔

”شفا!“  
”مجھے گھر جانا ہے۔ پلینز کسی سے کہو، مجھے گھر چھوڑ آئے۔“ اس نے بو بھل آواز کے ساتھ لیکن دونوں کو انداز میں کہا تھا۔

”تقی جلدی کیسے جاسکتی ہو۔ ابھی تو رسم ہونا باقی ہے۔“ ثمر نے جیسے لہجے میں کہا۔

”اس شکل کے ساتھ۔ تمہیں لگتا ہے میں رسم میں بیٹھ پاؤں گی۔ اور اگر تم چاہتی تھیں میں پورا فنکشن اینڈ کروں تو مجھے تقی کے ساتھ اکیلا چھوڑ کر کیوں گئی تھیں۔“ اپنے چہرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے جارحانہ لہجے میں کہا تھا۔

ثمر کے دل پر کھٹ سے کچھ لگا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ شفا سمجھ جائے گی کہ وہ اور سمیر اسے اور تقی کو جان بوجھ کر تنہا چھوڑ گئے ہیں۔

”مجھے لگا۔ تم لوگوں کو کچھ وقت ملنا چاہیے۔ بات کرنا چاہیے آپس میں۔“ اسے شفا کی حالت دیکھ کر سخت پیچھاؤ محسوس ہو رہا تھا۔  
”میں تمہیں کیسے سمجھاؤں، مجھے وقت نہیں چاہیے۔ بات کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ کیونکہ میں جانتی ہوں اس کے بغیر زندگی مشکل ہو جائے گی۔“ وہ بیڈ پر گرنے کے انداز میں بیٹھی اور سر جھکا کر ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

ثمر جلدی سے اس کے پاس آئی۔

”آئی ایم سوری شفا! میں تمہیں ہرٹ کرنا نہیں چاہتی تھی۔“

ثمر نے ایک ہاتھ اس کے کندھوں کے گرد پھیل کر



اسے اپنے ساتھ لگایا تھا۔ وہ شفا کی خوشیاں واپس لانا چاہتی تھی۔ یہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ اس طرح بیٹھ کر روئے۔

”لیکن تمہیں یہ بھی نہیں کرنا چاہیے تھا۔ تمہیں پتا ہے میں نے تھی کا گھرا تھی جلدی کیوں چھوڑ دیا تھا؟ کیونکہ مجھے اسی وقت پتا چل چکا تھا کہ اب میرا دل ضد کرے گا۔ اس لیے میں وہاں سے جلدی نکل آئی کہ ہر گزرتا دن میرے دل میں تھی کا نقش گہرا کر رہا تھا۔ میں خود سے ڈر گئی تھی۔ شفا۔“

”تو تم یہ سب تھی کو بتاتی کیوں نہیں ہو؟“ شمرنے جیسے اسے اکسایا تھا۔

شفا کے چہرے پر اس مسکراہٹ آگئی۔ ”محبت مانگ کر نہیں لی جاتی ویسے بھی میں خائن نہیں کہلاتا چاہتی۔“

”تو پھر کیا ساری زندگی اسی طرح اس محبت کا ماتم کرتی رہو گی؟“ اب شمر کو غصہ آگیا تھا۔

شفا نے سامنے دیکھا۔ چند لمحے سوچا لیکن دماغ کسی جواب پر آمادہ تھا نہ دل، سو ایک بار پھر نفی میں سر ہلانے لگی۔

”پتا نہیں۔ مجھے صرف اتنا پتا ہے کہ میرا اور تھی کا راستہ کبھی ایک نہیں ہو سکتا۔ کسی سے کوئی مجھے گھر چھوڑ دے۔“ وہ حتمی انداز میں کہتی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ شمر چپ چاپ کمرے سے باہر نکل گئی۔

\*\*\*

عالیہ کمرے میں آئیں تو دیکھا کھانے کی ٹرے جوں کی توں بڑی تھی۔ کھانے کو ہاتھ لگانا تو دور کی بات اس نے پانی کے گلاس سے ایک گھونٹ تک نہیں بھرا تھا۔

انہوں نے گہری سانس بھرتے ہوئے دکھ سے ساہر کو دیکھا۔ وہ کمرے میں نیم تیار کی پھیلائے بیڈ پر چٹ لیٹی ہوئی تھی۔ کھڑکی کھلی تھی اور کھڑکی کے راستے آنے والی روشنی سیدھی بیڈ پر پڑ کر اس کے وجود کو اپنے حصار میں لیے ہوئے تھی۔ عادل اس کے پاس

گہری نیند سو رہا تھا۔ ساہرا تھی گہری سوچ میں تھی کہ اس نے عالیہ کی آمد کا بھی نوٹس نہیں لیا تھا۔ عالیہ کے دکھ میں اضافہ ہوا۔

یہ آج کی بات نہیں تھی۔ وہ جس دن سے آئی تھی عالیہ اس کا یہی حال دیکھ رہی تھیں۔

جہاں بیٹھتی وہیں گھنٹوں گزار دیتی۔ کوئی بلا لیتا تو بات کر لیتی ورنہ اتنی لمبی چپ سا دھتی کہ گونگے پن کا گمان ہوتا۔ بہت اصرار پر چند نوالے کھالے تو کھالے ورنہ کوئی پروا نہیں۔

”ساہرا!“ عالیہ نے وہیں کھڑے کھڑے اسے پکارا اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اس کے پاس آگئیں۔ ”کھانا تو کھا لو بیٹا!“

”بھوک نہیں ہے امی!“ اس نے چھت سے نظریں ہٹا کر انہیں دیکھا۔

”کھانا تو زندہ رہنے کے لیے کھانا پڑتا ہے میری جان! کھانے سے کیسی ناراضی۔“ انہوں نے پاس بیٹھ کر پیار سے اس کے بال سہلائے تھے۔

”میں تمہارے لیے دودھ لے کر آتی ہوں۔“ عالیہ کے پاس اس کی بات کا جواب تو تھا نہیں۔ اٹھنے لگیں تو اس نے کھٹے پر ہاتھ رکھ دیا۔

”رہنے دیں۔ مجھ سے پتا نہیں جائے گا۔“ ”ایسا کب تک چلے گا ساہرا! یہ تو سراسر اپنے ساتھ دشمنی ہے۔“ وہ پھر اسے سمجھانے بیٹھ گئیں۔

”دشمنی ہی تو کی ہے میں نے اپنے ساتھ۔ اپنے بچوں کے ساتھ۔“ اس کا لہجہ اور آواز دھیمی تھی۔ ”عمید میرے بغیر تین گھنٹے نہیں گزار پاتے تھے۔ اب تین مہینے گزر گئے۔“

”میں کہتی تھی ناں ساہرا! نقصان تمہارا ہی ہو گا۔ پرانی باتیں بھول جاؤ۔ جو کر رہی ہو غلط ہے۔“

”مجھے وہ سب یاد کروا میں امی! میری ساری کوتاہیاں کھول کھول کر میرے سامنے رکھیں۔ میں چاہتی ہوں میں اتنا پچھتاؤں کہ خود کشی کر لوں۔“ وہ بے حس ہو کر بول رہی تھی لیکن حلق میں آنسو اٹکنے

لگے تھے۔

”اللہ نہ کرے۔ کیسی باتیں کر رہی ہو۔“ عالیہ نے دہل کر کہا پھر اس کی ٹوٹی بھری حالت دیکھی تو پیار سے سر پر ہاتھ پھیر کر بولیں۔

”اتنا پچھتاؤا ہے تو معافی کیوں نہیں مانگ لیتیں۔ ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا ساہرا! ایک بار عمید سے بات تو کر کے دیکھو۔“

”عمید تب تک معاف نہیں کرے گا جب تک شفا نہیں کرے گی اور شفا کیوں کرے گی۔ میں نے کتنا برا کیا اس کے ساتھ۔“

”کروے گی۔ شفا اچھی لڑکی ہے۔“ ”اچھی لڑکی تو میں بھی تھی امی! لیکن انتقام نے مجھے اندھا کر دیا۔“

”تم بات تو کرو شفا۔“ ”بات کرنے سے بھی کچھ نہیں ہو گا۔ جب شفا نے معافی مانگی تو میں نے بھی معاف کر دیا تھا لیکن دل میں عناد رکھتا تھا۔ شفا نے بھی معاف کر کے دل میں عناد رکھا تو میں کیا کروں گی۔“ عالیہ اب سمجھیں۔ اس کے پاس صرف پچھتاوا نہیں تھا اس کے پاس خدشات بھی تھے اور ان خدشات کا دور ہونا زرا مشکل تھا۔

وہ تھک ہار کر اس کے پاس سے اٹھ گئیں۔ ٹرے اٹھا کر کمرے سے باہر جاتے ہوئے انہوں نے مڑ کر دیکھا وہ اسی طرح بے سدھ لیٹی بے آواز رو رہی تھی۔ ان کا دل دکھ سے بھر گیا لیکن وہ اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتی تھیں کیونکہ خود کو اس حال تک اس نے خود پہنچایا تھا۔

باہر نکل کر آہستہ سے دروازہ بند کر دیا وہ جانتی تھیں آج کی رات ساہر کے لیے ہر روز سے زیادہ بھاری ثابت ہونے والی ہے۔ آج اس کی شادی کی سالگرہ تھی۔

\*\*\*

اور صرف ساہر کے لیے ہی یہ رات بھاری نہیں تھی کوئی اور بھی تھا جس کے لیے یہ رات عذاب سے

کم نہیں تھی۔

عمید نے الیم نکال لیے تھے۔ شادی کی تصویروں میں ساہر کا چمکتا دمکتا روپ۔ ہر تصویر کے ساتھ اس سے وابستہ یادیں انہیں تنگ کرنے لگیں۔

”دیکھیں عمید! مجھ پر سی گرین کلر کیا لگتا ہے؟“ ”میرا دل چاہتا ہے میں آپ کے لیے اتنا تیار ہوں کہ خود آپ ہی تنگ پڑ جائیں۔“

”کھانا کھاتے ہوئے آپ پہلا نوالہ میری پلیٹ سے کھایا کریں اس سے محبت بڑھتی ہے۔“

اس کا بیٹا سنو رنا اس کا کھلکھلاتا شرارتیں کرنا۔ ایک ایک کر کے عمید کو اس کے ساتھ گزارا ایک ایک دن یاد آتا چلا گیا۔ اور صرف وہ ہی ان کی دیوانی تھوڑی تھی۔ خود عمید نے بھی محبت لٹانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی، لیکن وہ ان کی محبت سمجھی ہی نہیں۔ سمجھ سکتی ہی نہیں تھی۔

”مجھ سے ایسے ہی محبت کرتے رہے گا عمید! جس دن آپ کی محبت میں کمی آئی۔ یاد رکھیے گا میں میرا دل لے گی۔“ ان کے کانوں میں اس کی آواز گونج رہی تھی۔

”مار تو تم نے مجھے دیا ہے۔“ وہ اس کے خیال سے مخاطب ہوئے۔

”میں نے تم سے محبت تو کبھی کی ہی نہیں تھی۔ میں نے تو عشق کیا تھا اور اس عشق کے بدلے میں تم نے مجھے مار دیا۔ بہت برا کیا ساہرا! بہت برا کیا۔“

تاریک کمرے میں بیٹھے یادوں میں گھرے عمید بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔

تھی کے دل و دماغ میں جنگ چھڑی ہوئی تھی لیکن کوئی فیصلہ کرنا مشکل تھا۔ اسے اپنے سر میں آگ جلتی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ شاہر کھول کر دیر تک اس کے نیچے کھڑا رہا۔

عمید بخار میں پھنک رہے تھے۔ شفا نے سہارا دے کر انہیں کمرے میں پہنچایا، واپس آکر ان کی فائزر سمیٹنے لگی تو ہاتھ میں ساہر اور بچوں کے البمز آگئے۔ اضطراب بڑھ گیا۔ غلطی اس کی نہیں تھی، لیکن



پچھتاوے اس کے گرد بھی پھنکارنے لگے۔  
اس نے البمز کو جوں کا توں رکھ دیا تاکہ عمید کو خبر نہ ہو سکے۔  
اس کی آنکھیں رو کر پہلے ہی بھاری ہو رہی تھیں۔ اب ان بھاری آنکھوں میں پھر سے نمی تیرنے لگی۔  
وہ رات کسی ایک کے لیے نہیں ان چاروں کے لیے بھاری تھی اور وہ چار افراد چار مختلف مقامات پر اس ایک عم کا شکار تھے جس کا نام ”محبت“ ہے۔

\*\*\*

شرفون پر پوری شدہ سے شفا کو کوس رہی تھی۔  
”کیا میرے ہی ہر فنکشن پر تمہارا لیٹ پنچنا ضروری ہے؟“ تھوڑا جلدی گھر سے نہیں نکل سکتی تھیں۔

”گھر سے تو جلدی ہی نکلی تھی۔ اب مجھے کیا پتا تھا۔ راستے میں اتنا برا ٹریفک جام ہو گا۔“ شفا نے وند شملہ سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ آگے پیچھے دائیں بائیں ٹریفک ہی ٹریفک تھا۔  
”لیکن خیر تم فکر نہ کرو۔ دو لہا والوں سے تو پہلے ہی پنچ جاؤں گی۔“

”دیر سے پنچ کر تو دکھاؤ۔ میرج ہال میں گھسنے بھی نہیں دوں گی۔“ شرف نے دھمکی دے کر فون بند کر دیا۔ شفا نے ہنستے ہوئے فون اپنے برس میں رکھا۔ پھر عمید کو دکھا۔ بخار اتر چکا تھا، لیکن کمزوری کا اثر چہرے پر نظر آتا تھا۔

”آپ کو دوبارہ بخار ہو رہا ہے؟“  
”بخار تو نہیں ہو رہا، لیکن یہ ٹریفک جام ختم ہو جائے تو سکون ہو۔“ عمید نے بے زاری سے کہا۔ شفا نے کوئی جواب نہیں دیا، پھر اسے کچھ خیال آیا تو محتاط انداز میں گردن موڑ کر پہلے عمید کو دکھا، پھر پیچھے بیٹھی ہدیہ کی طرف مڑ گئی۔

”ہدیہ! ٹھیک تو نہیں گئی ہو؟“ پیار سے پوچھا۔ ہدیہ نے منہ بنا کر اور بازو پھیلا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

”بس تھوڑی دیر میں ہم ہال میں پہنچ جائیں گے۔“ اس نے پچکار کر کہا۔ ”آپ کو پتا ہے ہدیہ! فنکشن سے فارغ ہو کر ہم آپ کی ماما کو لینے غائی کے گھر جائیں گے۔“ اس نے بڑے سر پر اتر دینے والے انداز میں کہا تھا۔

”رسی پھپھو!“ ہدیہ تو حیران ہوئی سو ہوئی، عمید بھی ہونق ہو کر اس کی شکل دیکھنے لگے۔ شفا محل کر مسکرائی۔

”بالکل۔ آپ مس کرتی ہو نا ماما کو؟“ پوچھا ہدیہ سے۔ کھانسی عمید نے سامنے دیکھتے ہوئے خود کو لا تعلق ظاہر کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رکھا تھا۔  
”بہت زیادہ۔ مجھے ماما بہت یاد آتی ہیں۔“ ہدیہ نے معصومیت سے کہا تھا۔

”تو بس ٹھیک ہے۔ جب یاد آتی ہیں تو لے آتے ہیں ماما کو۔ ان سے کہیں گے ہدیہ کو دوبارہ چھوڑ کر تبھی نہ جائیں۔ ایک بات یاد رکھنا ہدیہ! ہم جن سے محبت کرتے ہیں ان کی غلطیاں معاف کر دینی چاہئیں، تاکہ انہیں اپنی غلطیاں سدھارنے کا ایک موقع ضرور ملے۔ ایسی محبت بھی کس کام کی جو دوسرا موقع بھی نہ دے۔“ ہدیہ ہونق بنی منہ کھول کر اس کی بات سن رہی تھی۔

”تم زیادہ دادی اماں بن کر ہدیہ کو کچھ مت سمجھاؤ۔ اسے کچھ سمجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ عمید نے سامنے دیکھتے ہوئے سختی سے کہا تھا۔  
”ہدیہ کو نہ سہی۔ کسی اور کو تو ضرورت ہے۔“ عمید نے مزید سختی سے کہا تھا۔

”جتنی بڑی غلطی تھی اس کے مقابلے میں یہ سزا تو کچھ بھی نہیں ہے۔“  
”آپ سزا دے کس کو رہے ہیں۔ خود کو۔ ان کو۔ یا اپنے بچوں کو۔“ وہ بھی سنجیدہ ہوئی۔  
عمید نے جواب دینے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ شفا نے ٹوک دیا۔

”سنیں عمید بھائی! اگر آپ یہ سب میری وجہ

سے کر رہے ہیں تو میں جادوں، میرے دل میں ان کے لیے کوئی جگہ کوئی شکوہ نہیں ہے۔“  
ہدیہ کی موجودگی کی وجہ سے وہ ساہر کا نام لینے سے گریز کر رہی تھی۔

”میں انہیں ان کے لیے معاف نہیں کر رہی۔ میں نے آپ کی محبت میں انہیں معاف کیا۔ ہدیہ اور عادل کے لیے انہیں معاف کیا اور جب میں نے معاف کر دیا تو آپ کس لیے سزا دینے پر تلے بیٹھے ہیں؟ اور ویسے بھی سزا دینے کا یہ کوئی طریقہ نہیں ہے کہ سزا سنا کر سائیڈ پر ہو گئے۔ آپ دونوں کے درمیان ایک کنکشن ہے جس کا نام محبت ہے اور محبت سنوارنے کا نام ہے بگاڑنے کا نہیں۔ یا تو مان لیں آپ ان سے محبت نہیں کرتے۔ راتوں کو جاگ جاگ کر انہیں یاد نہیں کرتے۔“

عمید نے راتوں کو جاگنے والی بات پر کھینا سا ساہو کر اسے دیکھا تھا۔

شفا کے چہرے پر بڑی بیماری مسکراہٹ آگئی۔  
”امید ہے ہدیہ کو بات سمجھ میں آگئی ہوگی۔“ اس نے جتا کر کہا اور مڑ کر ہدیہ کو دیکھا۔

”ٹھیک ہے نا ہدیہ! فنکشن کے بعد ہم ماما کو لینے جائیں گے۔“ ہدیہ نے خوش ہو کر زور زور سے سر ہلا دیا۔

شفا نے عمید کو دکھا اور ان کے کندھے پر ٹھونگ بجا کر بولی۔

”میں کیا پوچھ رہی ہوں ہدیہ! ٹھیک ہے نا؟“ وہ شرارت کر رہی تھی۔ عمید نے ایک بار نظر انداز کیا لیکن شفا مستقل ایسے ہی کیے جا رہی تھی۔ انہیں ہنسی آگئی۔

”ہاں بھئی۔ ٹھیک ہے۔“ انہوں نے ہنستے ہوئے زور سے کر کہا تھا اور وہ تینوں ہنسنے لگے تھے۔

\*\*\*

یہ ٹریفک جام ایک بڑی سیاسی جماعت کے ہنگامی دھرنے کا نتیجہ تھا اور چونکہ تقی اینڈ فیملی کو بھی اسی

میرج ہال میں پنچنا تھا سو وہ بھی وہیں قریب ہی بے بس کھڑے تھے۔

”امی! آپ ابھی فارغ ہی ہیں۔ میں نمبر ملا دیتا ہوں، ممک کی ماما سے بات کر لیں۔“ تقی نے اسٹیرنگ و ہیل چھوڑ کر آرام وہ پوزیشن میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

”کیا بات کروں؟“ وہ حیران ہوئیں۔  
”میں بتائیں کہ ہم لوگ شادی کی تاریخ طے کرنا چاہ رہے ہیں۔“

”آئی جلدی کس بات کی ہے تقی؟“ وہ اور زیادہ حیران ہو کر بولیں۔

”بات جلدی کی نہیں ہے۔ بات صرف یہ ہے کہ میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔ جو کام کل کرنا ہے وہ آج ہی ہو جائے تو بہتر ہے۔“

وہ بہت سنجیدگی سے بولتا نمبر ملائے لگا تھا۔ امی اسے منع کرنا چاہتی تھیں، لیکن اس کی سنجیدگی دیکھ کر خاموش ہو رہیں، لیکن سچ تو یہ ہے کہ انہوں نے تقی کے ہاتھ سے بڑی بددلی سے فون پکڑا تھا۔ منل مستقل سبین کو تنگ کر رہی تھی۔ سبین کی گود میں چند مینے کا ہادی تھا۔ تقی اسے لے کر گاڑی سے باہر نکل گیا۔

”یہ ٹریفک تو پتا نہیں کب کھلے۔ میں اسے باہر لے کر کھڑا ہو جاتا ہوں۔“

منل کو گاڑی کی چھت پر بٹھا کر وہ ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔

تب ہی اس کی نظر عمید پر پڑ گئی۔ وہ سڑک کے مخالف سمت سے آرہے تھے۔ تقی بے اختیار ہاتھ ہلا کر اسے متوجہ کر بیٹھا۔ عمید نے بھی خوش دلی سے ہاتھ ہلا دیا اور سیدھا اسی کی پاس آگئے۔

”کیسے ہیں عمید بھائی!“

”میں ٹھیک ہوں۔ السلام علیکم آئی!“ عمید کھڑکی میں جھک کر امی سے حال احوال معلوم کرنے لگے پھر تقی سے بولے۔

”اس ہنگامے نے تو آج کمال ہی کر دیا۔“



”کوئی ایسا ویسا۔“  
 ”اچھا ہاں۔ تم لوگ بھی تو شرکی مندی میں  
 اٹو ایٹڈ ہو گے نا۔“ عمیر کو جیسے اچانک یاد آیا تھا۔  
 ”لیکن ہم لڑکے والوں کی طرف سے ہیں۔“  
 ”عمیر بیٹا! تم اکیلے ہی ہو یہاں؟“ امی فون بند  
 کر چکی تھیں۔  
 ”میں آنٹی! شفا اور ہدیہ بھی ساتھ ہیں۔ لیکن  
 میری گاڑی آپ لوگوں سے کافی پیچھے ہے۔“ عمیر  
 نے کہا۔  
 ”میں شفا سے تول لوں۔“ امی یکدم جیسے پرجوش  
 ہو کر گاڑی سے اترنے لگی تھیں۔  
 ”ہاں میں مل لیجئے گا۔ اب اتنی ٹریفک میں آپ  
 کہاں نکلیں گی۔“ تقی نے اپنی جڑ جڑا ہٹ چھپاتے  
 ہوئے لیکن تیز لہجے میں کہا۔  
 ”میں۔۔۔ مجھے ابھی ملنا ہے۔“ اس کی آنکھوں  
 کے اشارے نظر انداز کرتے ہوئے امی نے بچوں کی  
 سی ضد کے ساتھ کہا۔  
 ”آپ ریس آنٹی! میں شفا کو یہاں بلا لیتا ہوں۔  
 تقی ٹھیک کہہ رہا ہے آپ کو ٹریفک میں دقت ہوگی۔“  
 ناچار تقی کو خاموش ہونا پڑا۔ اب عمیر کے سامنے  
 کیا کہتا۔  
 ”آپ ہر معاملے میں بچوں کی طرح ضد کیوں  
 کرنے لگتی ہیں۔“ عمیر کے جاتے ہی اس نے چڑ کر  
 کہا۔  
 امی اس سے زیادہ چڑ کر بولیں۔  
 ”بس بس۔ جب میری بات نہیں مانی تو اب  
 میرے معاملات میں بھی دخل مت دو۔“ انہوں نے  
 ڈپٹ ہی دیا تھا۔  
 تقی تقریباً پاؤں پٹخ کر دوسری طرف دیکھنے لگا،  
 جیسے اسے اس معاملے سے واقعی کوئی سروکار نہ ہو۔

☆ ☆ ☆  
 شفا بھی اس فرمائش پر تذبذب میں پڑ گئی۔  
 ”وہ بڑی ہیں۔ ملنا چاہ رہی ہیں تو مجھے انکار کرنا

مناسب نہیں لگا۔ جب تک ٹریفک نہیں کھل جاتا، تم  
 ان سے مل لو۔“  
 عمیر نے کہا تو وہ خود پر جبر کرتی اتر آئی۔ بائیل گرین  
 غرارے کے ساتھ میروں رنگ کی قمیص، باریک  
 دوپٹے کو اسٹائل سے آگے پھیلا رکھا تھا۔ بالوں کو نئے  
 اسٹائل میں کٹوا کر اچھے سے سیٹ کروا لیے تھے اور  
 کانوں میں آج بھی بڑے بڑے جھمکے پہنے تھے۔ اگر  
 پتا ہوتا ایسے ٹریفک سے گزرنا بڑے گا تو کبھی اس حلیے  
 میں نہ آئی۔ مناسب تو عمیر کو بھی نہیں لگ رہا تھا  
 لیکن بات اگر تقی کی امی کی نہ ہوتی تو کبھی وہ ایسا نہ  
 کرتے۔  
 تقی نے اسے دور سے آتے دیکھا تو دیکھا ہی رہ گیا،  
 برا بھی لگ رہا تھا کہ اتنے لوگ بھی اسے دیکھ رہے  
 ہیں۔  
 ”کیا ضرورت تھی اتنا تیار ہو کر آنے کی؟“  
 عمیر چونکہ ہدیہ کا ہاتھ پکڑ کر آرہے تھے اس لیے  
 کچھ قدم پیچھے ہی تھے شفا کے قریب آنے پر تقی نے  
 ناپسندیدگی سے اسے دیکھا تھا۔  
 شفا جو بہت سنجیدہ رہنا چاہتی تھی۔ اس بات پر تقی  
 سے بھی زیادہ ناپسندیدگی سے اسے دیکھا۔  
 ”تمہیں کیا تکلیف ہے۔ میں جتنا مرضی تیار  
 ہوں۔“ ترخ کر کہا۔  
 ”آپھی تو نہیں لگ رہی ہو بالکل بیکری لگ رہی  
 ہو۔“ اس نے جھٹکے سے گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔  
 ”ہونہہ!“ وہ گاڑی میں بیٹھ گئی۔  
 تقی نے کہا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا اور  
 ٹھاہ کر کے دروازہ بند کیا۔ اسے بلاوجہ ہی غصہ آرہا تھا۔  
 اس پر مستزاد اندامی کا جذباتی ڈراما شروع ہو گیا تھا۔  
 تقی کا خون اور بھی کھولنے لگا، لیکن ایک بات طے  
 ہے۔  
 سورج مغرب سے نکل سکتا ہے۔ دن جو بیس کے  
 بجائے بارہ گھنٹوں کا ہو سکتا ہے اور وہ سب کچھ ہو سکتا  
 ہے جس کا نہ ہونا آپ کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو،  
 لیکن عورتوں کو جذباتی ہونے سے روکا نہیں جاسکتا۔

وہ بری طرح پیچ و تاب کھاتا گاڑی سے دور ہٹ  
 گیا۔

☆ ☆ ☆  
 تقی کو سمیر اور مک کے مسلسل فون آرہے تھے۔  
 دو لہا والے ہال میں پہنچے دلتے تھے جبکہ مک اپنی گاڑی  
 میں آئی تھی اور ہال میں پہنچ چکی تھی۔  
 شفا کا دل غم خیز تھا کہ ہاتھ لگا رہا تھا۔  
 لیکن یہ بھی شکر تھا انہیں مزید انتظار نہیں کرنا پڑا،  
 بیس منٹ تک متبادل راستہ کھول دیا گیا۔ اس راستے  
 سے تقی کی گاڑی قریب بھی سو یہاں بھی امی نے اس  
 کے ضبط کو آزما دیا اور تقی کی خدمات پیش کر دیں۔  
 ”عمیر بیٹا! شفا ہمارے ساتھ ہی ہال میں پہنچ  
 جائے گی۔ تم اپنی گاڑی لے کر آ جاؤ۔“  
 ”امی! گاڑی میں جگہ کہاں ہے۔ دیکھیں سین  
 بھا بھی کو کتنی دقت ہو رہی ہے۔“ تقی نے جلدی سے  
 کہا۔  
 ”نہیں مجھے کوئی دقت نہیں ہے۔ پیچھے لوگ ہی  
 کتنے ہیں جو دقت ہو۔ شفا تو ویسے بھی آگے تمہارے  
 ساتھ ہی بیٹھے گی۔“ سین نے مزے سے کہا۔  
 ”میں چلی جاتی ہوں امی! آپ لوگوں کو ویسے بھی  
 مسئلہ ہوگا۔“ شفا نے کہا۔ اسے تقی کے انداز غصہ دلا  
 رہے تھے۔  
 ”ارے چکی بیٹھی رہو۔ ایک تو یہ کہ عمیر بھی  
 چلا گیا ہے۔ دوسرے پھر اتنے لوگوں میں سے  
 گزرو گی۔ کسی کی نظر اچھی کسی کی بری۔ میری بیٹی  
 کو نظر ہی نہ لگ جائے۔“  
 ”جی ہاں۔ اتنی اچھی لگ رہی ہے کہ چڑیلوں کا  
 بیوٹی کانٹیسٹ ہو تو آپ کی اسی بیٹی کو پہلا انعام ملے  
 گا۔“ تقی نے غصے کے عالم میں گاڑی کا دروازہ بند کیا  
 اور اشارت کر دی۔ شفا کو اس کی بات پر بری طرح تاؤ  
 آیا تھا۔  
 ”بھئی پیار محبت والے جذبات اپنی جگہ، لیکن اسے  
 اتنا حق نہیں تھا کہ اسے چڑیل ہی کہہ دے۔“

”بات سنو۔ مجھے بھی اس کھانا میں بیٹھنے کا کوئی  
 شوق نہیں ہے۔ امی نے کہا ہے اس لیے بیٹھ رہی  
 ہوں۔“  
 ”مجھے بھی تمہیں بیٹھانے کا کوئی شوق نہیں ہے،  
 امی نے کہہ دیا ہے اسی لیے بٹھا رہا ہوں۔“ اس نے  
 احتیاط سے گاڑی نکالتے ہوئے حساب برابر کیا۔ ”اور  
 اب ذرا خاموش ہو کر بیٹھو۔ اتنا بولتی ہو، سر میں درد ہو  
 گیا ہے میرے۔“  
 اس بات پر امی نے ایک زوردار دھموکا اس کے  
 کندھے پر جڑ دیا۔  
 شفا ہونہہ کہہ کر بارہ دیکھنے لگی۔  
 سارا راستہ وہ دونوں اسی طرح لڑتے آئے تھے۔  
 پتا نہیں کس بات کا غصہ تھا، جو جواب دے، جواب دے  
 کر بھی سینے میں ٹھنڈ نہیں پڑ رہی تھی۔ ہال کی پارکنگ  
 میں جب سین اور شفا گاڑی سے اتر گئیں تو وہ امی کی  
 طرف پلٹا۔  
 ”آپ صحیح لبا کی جانشین ہیں۔ ہر کام اپنی مرضی  
 سے کراتی ہیں۔ کیا ضرورت تھی شفا کو لفٹ دینے کی۔  
 خود ہی عمیر بھائی کے ساتھ آ جاتی۔“  
 ”اے بٹھا کر تمہاری گاڑی کھس گئی یا تمہیں کھینچ  
 کر لانا پڑی ہے کہ تھک گئے۔“ امی نے سنگ کر کہا۔  
 ”سارا راستہ تم اس کے ساتھ جھگڑتے آئے ہو۔  
 کیا سوچتی ہوگی بے چاری۔ ایک ذرا سارا راستہ ہی تو  
 طے کرنا تھا اس پر بھی لے کر کئی باتیں سنا دیں۔“  
 ”وہ جو مرضی سوچے۔ کم سے کم اسے ساتھ  
 بٹھانے سے پہلے آپ کو تو سوچنا چاہیے تھا۔ پتا بھی  
 تھا مک بھی یہاں پہنچ چکی ہے۔ وہ شفا کو ہمارے ساتھ  
 آتے دیکھے گی تو کیا سوچے گی۔“  
 ”ممممم ممممم ممممم۔“ امی نے بے زاری  
 سے کہا پھر طنزیہ انداز میں بولیں۔ ”جب دیکھو زبان پر  
 اسی ایک نام کا کلمہ بیٹھے! تم صحیح زن مرید ثابت ہونے  
 والے ہو۔ میرا خیال ہے شادی کے بعد تو کھانا بھی  
 مک کی اجازت سے ہی کھایا کرو گے۔“  
 امی نے بھگو کر جو تمارا تھا وہ کھانا سا ہو گیا۔ اب



انہیں کہے سمجھاتا ملک اس کے اعصاب پر سوار نہیں ہوتی تھی وہ جان بوجھ کر ایسا کر رہا تھا تاکہ شفا کا رنگ مائل نہ جائے۔

\*\*\*

ملک بارنگ میں ہی اس کی منتظر تھی۔ تکی تیز تیز قدم اٹھاتا اس کے پاس آگیا۔ ملک گاڑی سے نیک لگا کر کھڑی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر سیدھی ہوئی۔

”سوری۔ سوری۔ سوری۔ یار! ٹریفک اتنا تھا۔“ وہ آتے ہی وضاحت دینے لگا۔

”یہ شفا تم لوگوں کے ساتھ کیوں آئی ہے؟“ جوڑ تھا وہی ہوا۔ تکی سے فوری طور پر کوئی جواب نہیں بن پڑا۔ پھر اس نے ساری بات کہہ سنائی۔ اور کوئی حل جو نہیں تھا۔

”اور کوئی گاڑی نہیں تھی جس میں وہ آجاتی یا تمہاری گاڑی میں بیٹھنا ہی ضروری تھا؟“

”ممک! امی کی خواہش تھی تو میں منع نہیں کر سکتا۔“ تکی نے لاچاری سے کہا تھا۔

امی کا نام سن کر ملک خاموش ہو گئی لیکن اس کے تاثرات اس کے دل کا حال بیان کر رہے تھے۔

”تمہاری امی نے میری ماما کو فون کیوں کیا تھا؟“ تکی نے جو اس کے لیٹ پہنچنے پر اس کی ناراضی کا گراف کم کرنا چاہ رہا تھا اس بات پر تعجب سے اسے دیکھا۔

”میں تمہیں بتا چکی تھی کہ میں ابھی شادی کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ پھر انہوں نے ماما سے شادی کی تاریخ کی بات کیوں کی؟“ اس کا لہجہ تیز نہیں تھا لیکن خفگی اور ناپسندیدگی نمایاں تھی۔

میں شادی کا ذکر سب سے آخر میں آتا ہے۔ ابھی پلاکی فرم جوائن کی ہے۔ ایزاے فونو گراف مجھے اپنا کیریئر بنانا ہے۔ ایک لمبا راستہ ہے جو ابھی مجھے طے کرنا ہے اور صرف مجھے ہی کیوں؟ تم تو خود ابھی اسٹرگل کر رہے ہو۔ کتنا کچھ ہے جو ہم دونوں کو زندگی میں حاصل کرنا ہے اور ابھی سے شادی۔ ناٹ ایٹ آل۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی ایسا۔“

”کیریئر تو شادی کے بعد بھی بنایا جاسکتا ہے۔“ تکی نے کہا۔

”ہاں بنایا جاسکتا ہے لیکن پھر کنسنٹرٹ نہیں کیا جاسکتا۔ ابھی تم شادی کرنا چاہتے ہو۔ کل کو تمہاری امی کہیں گی جلد از جلد دو تین بچے بھی ہو جائیں پھر تم مجھے پریشر آؤ گے کہ اب امی جان کو شوق ہو رہا ہے تو ہمیں ان کی خواہش پوری کرنی چاہیے۔ ساری ٹیبل کلاس امیوں کے یہی شوق ہوتے ہیں کہ پہلے بیٹے کی شادی ہو جائے پھر بچوں کا ڈھیر لگ جائے۔“ اس کا انداز تھوڑا سا مسترخانہ ہو رہا تھا۔

تکی کو برا لگا۔ ویسے بھی وہ کچھ عرصے سے نوٹ کر رہا تھا۔ اس کے گھر والوں کے بارے میں بات کرتے ہوئے ملک بہت زیادہ ٹیبل کلاس ٹیبل کلاس کا راگ الاپتی تھی۔

”ٹھیک ہے۔ جیسے تمہاری مرضی۔“ اس نے کہا۔ ”میں امی کو منع کر دوں گا وہ دوبارہ تمہاری ماما سے بات نہیں کریں گی۔“

”تمہی بات ہے۔“ ملک نے بناوٹی سی خوش دلی کے ساتھ پورے دانتوں کی نمائش کر ڈالی۔

”اندروں چلیں؟“ تکی خاموشی سے اس کے ساتھ ہولیا۔

”مجھے لگ رہا تھا تم میری بات نہیں سمجھ پاؤ گے۔“ تھینکس گاڈ! ام نے مجھے ڈس پائنٹ نہیں کیا۔ وہ خوش ہو گئی تھی۔

”مجھے خوشی ہوتی مگر تم بھی میری بات سمجھ لیتیں۔“ تکی مسکوا بھی نہیں رہا تھا۔

”لیکن تم میری طرف دیکھو۔ میں ممک ہوں ملک۔ شفا ٹائپ لڑکیوں جیسی نہیں ہوں جن کی زندگی کا واحد مقصد صرف شادی کرنا ہی ہوتا ہے۔“ وہ بولتی جا رہی تھی اور تکی کو ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کی آواز دل پر ہتھوڑے کی طرح برس رہی ہو۔

\*\*\*

تکی کی وجہ سے ملک کو اسٹیشن پر دو ٹوکول ملا تھا پھر وہ خوب صورت بھی بہت تھی تو خود بخود مرکز نگاہ بن گئی لیکن امی نے اسے کوئی خاص اہمیت نہیں دی تھی۔ انہیں تو ہر طرف شفا ہی نظر آرہی تھی اور یہی بات ملک کو کھول رہی تھی۔

تکی کا مرکز نگاہ کون تھا۔ یہ تکی ہی جانتا تھا۔ لیکن یہ بھی اس کی خام خیالی تھی۔ تاڑنے والوں کی نگاہ قیامت کی ہوا کرتی ہے۔ تاڑنے والے ایک طرف، دوسری طرف ملک تھی جو شفا کو نظروں میں رکھے ہوئے تھی۔ جب بھی سامنا ہوا ایک طنزیہ اور تقریباً ”تقریباً“ نفرت بھری نگاہ ہی اس پر ڈالی۔ آتے جاتے جب بھی موقع ملا کوئی جملہ ہی کسا۔

شفا نے تو خیر کیا رد عمل کرنا تھا۔ شمر کی برداشت ختم ہونے لگی۔

”تم جو بہت اچھی بن کر تکی بھائی اور اس کا بیچ اپ کروانے کی کوششیں کرتی رہی ہو تو اب بھگت لو۔“ کب سے کب تک کیے جا رہی ہے۔ تم اسے کوئی منہ توڑ جواب کیوں نہیں دیتیں۔“ چونکہ شفا دلہن کے ساتھ ساتھ تھی۔ اس لیے سب کچھ شمر کے سامنے ہی ہو رہا تھا۔

”یہ تھوڑی کھسکی ہوئی ہے۔ اب ایسے انسان کو منہ توڑ جواب دے کر اپنے ہی منہ کا زائقہ کیا خراب کرنا۔“ شفا نے اپنے دل کی کیفیت چھپا کر آرام سے کہا۔

”تم خاموش رہ کر جو اچھے پوائنٹس جمع کرنا چاہتی ہو نا۔ کر لو۔ اس کی طبیعت تو میں صاف کرتی ہوں۔“

”رہنے دو۔ بلا وجہ اپنا موڈ خراب مت کرو۔“ شفا نے کہا۔ ”چلو تمہیں رسم کے لیے بٹھاتے ہیں۔“ تھوڑی سی تصویریں بنوا لو پھر سیر بھائی کو بھی لے آئیں گے۔“

اس وقت تو شمر خاموش رہی لیکن جب باقاعدہ رسم ہو رہی تھی۔ سب بزرگ رسم کر چکے تھے اور جوانوں کی ٹولی ہی آگے پیچھے تھی۔ سب کے ایک ساتھ اسٹیج پر آنے سے شفا اور تکی اتفاقاً ”ساتھ ساتھ آگئے۔“

ملک نے ان دونوں کو ساتھ کھڑے دیکھا تو غصے سے کھول اٹھی۔ وہ محتاط ہو کر اسٹیج پر گئی اور اراداً ”شفا کو دھکا دے کر تکی سے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ شفا اسٹیج سے گرتے گرتے بجی۔“

”اوہ۔ ایم ریلی سوری۔“ ملک نے ایسے کہا جیسے یہ ایک حادثہ ہو لیکن وہاں موجود ہر بندہ جی کہ تکی بھی جانتا تھا کہ اس نے یہ اراداً کیا ہے۔ شمر کا تو خون ہی کھول اٹھا تھا۔ اگر وہ دلہن بنی نہ بیٹھی ہوتی تو بچ بچ ملک کی طبیعت صاف کر دیتی۔

رسم کے بعد کھانا شروع ہوا تو سب لڑکیوں کو ایک ہی جگہ اکٹھے بیٹھنے کا موقع مل گیا۔ وہ سب ایک دوسرے کی صورت دلہن کے لیے بنائے گئے کمرے میں بیٹھ گئی تھیں۔ کھانا بھی انہیں وہیں پیش کر دیا گیا تھا۔

ملک لڑکیوں میں ”راجہ اندر“ بنی بیٹھی تھی۔ ممکن ہے وہ سادگی سے بات کر رہی ہو لیکن چونکہ پہلی ملاقات میں ہی شمر اسے ناپسند کر چکی تھی۔ لہذا اس کی ہر بات بناوٹ ہی لگ رہی تھی۔

وہ ملک کی ہر بات پر منہ کے زاویے بگاڑ کر شفا کو دیکھتی۔ اب شفا اس معاملے میں کیا کر سکتی تھی تھک ہار کر اس نے شمر کی طرف سے رخ ہی پھیر لیا۔

”میں نے آج تک ایسے فنکشنز کے بارے میں بس سنایا تھا لیکن یہاں آکر احساس ہوا ہے شادی کی فنکشنز تو ٹیبل کلاس لوگ بھی دھوم دھام سے ارجح کرتے ہیں۔“

ملک کو احساس تک نہیں تھا یہ کہہ کر اس نے وہاں موجود ہر لڑکی کو ہی اپنے خلاف کر لیا تھا۔



”جس کی جتنی حیثیت وہ اتنا پیسہ لگا لیتا ہے۔“  
ایک کزن نے کہا۔ ”کیوں؟ کیا آپ کے یہاں دھوم دھام سے شادیاں نہیں ہوتیں؟“  
”دھوم دھام۔“ ”مہک ہنسی۔“ ”بھئی ہمارے یہاں تو بہت گریڈ فنکشنز آرینج کیے جاتے ہیں۔ پانی کی طرح پیسہ لگتا ہے۔ ہر فنکشن کا الگ الگ ڈریس کوڈ اور تھیم ہوتی ہے۔ باقاعدہ ایونٹ مینجر ہائر کیے جاتے ہیں۔“

”نمر نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ ایک نظر شفا پر ڈالی اور پھر صحیح معنوں میں کمر کس کے میدان میں اتری۔“

”یہ تو سراسر اصراف ہے۔ میں تو شادی کے فنکشن پر اتنا پیسہ لگانے کے خلاف ہوں۔“  
”ایسی بات ہے تو اپنی شادی پر اتنا پیسہ کیوں لگوا رہی ہو؟“ ”مہک نے ایک ابرو اٹھا کر دیکھا۔“

”میں نے تو امی بابا کو منع کیا تھا لیکن ان دونوں کی ہی خواہش تھی کہ اکلوتی بیٹی کی شادی خوب دھوم دھڑکے کے ساتھ ہو۔ اسی لیے میں چپ ہو گئی۔ ورنہ ہوتا تو یہ چاہیے کہ پورا اسلامی طریقہ فالو کیا جائے۔ مسجد میں نکاح اور بس رخصتی۔ اگلے روز سارے قریبی رشتہ داروں کو جمع کر کے کھانا کھلادیا۔ اسی کو ولیمہ کہتے ہیں اور یہی درست اسلامی طریقہ ہے۔ ڈھونکی، لہسن، سبب ماڈرن دور کی اختراع ہیں۔ بس یہ ہے کہ پیسے والوں کو اپنا پیسہ خرچ کرنے کا بہانہ مل جاتا ہے اور بے چارے غریب کی جان مصیبت میں آجاتی ہے۔“ ”نمر نے اسٹاپ بول رہی تھی۔“

”تھوڑا بولو تو کسی بزرگ کے کان میں آواز پڑ گئی تو شامت آجائے گی کہ دلہن کتنا بول رہی ہے۔“ ”اس کے ارادوں سے بے خبر شفا نے اسے خبردار کرنا مناسب سمجھا۔“

”ارے ہاں شفا! مجھے یاد آیا تمہاری اور تقی بھائی کی شادی بھی تو بہت سادگی سے ہوئی تھی۔ ولیمہ تو ابھی باقی ہے نا؟“

نمر نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے عین اس

وقت کہا جب سب ہی اس کی بات دھیان لگا کر سن رہی تھیں۔

جہاں شفا دھک سے رہ گئی وہیں مہک کے چہرے کا رنگ بدلا تھا۔ جب کہ باقی ٹولی میں ہلچلی مچ گئی تھی۔ ”شفا! تقی کی وائف ہیں۔ تم نے ہمیں پہلے کیوں نہیں بتایا؟“ سب کے اپنے اپنے سوال تھے۔ ”تم نے بالکل ٹھیک کہا نمر! ان دونوں کی شادی سادگی سے ہوئی تھی۔“ ”اچانک مہک نے مسکرا کر کہا تھا۔“

”لیکن یہ بھی تو دیکھو نا جیسے ان دونوں کی شادی ہوئی۔ ایسی شادیاں سادگی سے ہی ہوتی ہیں۔ چھپ کر کیے گئے نکاح پر دھوم دھڑکے کون کرتا ہے۔“ ”مہک نے رکھ کر پھٹکارا تھا۔ شفا کا رنگ پیلا پڑ گیا۔“

”نمر کو غصے سے لال پیلا ہوتا دیکھ کر شفا نے آنکھوں آنکھوں میں اسے چپ رہنے کی التجا کی تھی۔“ ”کیا مطلب؟“ ”کیسے ہوا تھا ان دونوں کا نکاح۔“ ”سننے والوں کو کھد کھد گئی تھی۔“

”نمر! اپنی کزنز کو یہ بھی تم بتاؤ گی یا میں ہی بتا دوں؟“ ”مہک نے کمینگی کی حد کر دی تھی۔“ ”مہک! اس سے آگے ایک لفظ مت کہنا۔“ اس نے انگلی اٹھا کر کہا تھا۔

”کیوں بھئی؟“ ”جب ان سب کو یہ بتایا جاسکتا ہے کہ تقی جیسے مشہور آدمی کی بیوی شفا ہے تو انہیں یہ بھی پتا ہونا چاہیے۔ شفا صاحبہ کا ماضی کتنا روشن ہے۔“ ”پھر اس نے سب کی طرف دیکھا۔“

”اپنے ہی گھر میں شفا کسی لڑکے کے ساتھ پکڑی گئی تھی اس کے بھائی نے اپنی عزت بچانے کے لیے تقی سے ریکوسٹ کی کہ وہ شفا سے نکاح کر لے۔ بس ہو گئی دونوں کی شادی۔ شفا! آئی گیس۔ وہ لڑکا تمہارا بوائے فرینڈ تھا۔ ہے نا؟“

وہ اتنا معصوم بن کر پوچھ رہی تھی کہ نمر کا دل چاہا اس کا سر ہی پھاڑ دے۔ شفا جواب کیا دیتی۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنا شروع ہو گئے تھے۔ زلت، زلت، زلت۔ آخر اسے کتنی ذلت سہتا تھی۔

تقی اور مہک کی بھلائی سوچ کر بھی وہ بری ہی رہی۔ ”نکو اس میت کرف۔ تم اچھی طرح جانتی ہو وہ سب ایک غلط فہمی تھی اور کچھ نہیں اور تم بھول گئی ہو شفا ہی نے تمہارے اور تقی بھائی کے درمیان کی مس انڈر اسٹینڈنگ دور کی ہے۔ تمہیں ان کی زندگی میں واپس لے کر آئی ہو ورنہ۔“ ”نمر نے کہا۔“

”سووات“ ”مہک نے کندھے اچکا کر کہا تھا۔“ ”شفا کی جگہ کوئی بھی لڑکی ہوتی وہ یہی کرتی۔ جب پتا ہو غلطی اپنی ہے تو کوئی بھی انسان اپنی غلطی سدھارنے کی کوشش ضرور کرتا ہے۔“

”تو ٹھیک ہے تم بھی اپنی غلطی سدھارنے کی ایک کوشش کرو۔“ ”جیسے آئی تھیں ویسے ہی واپس چلی جاؤ۔ ورنہ میں دھکے مار کر یہاں سے نکلوا دوں گی۔“

”میرا بھی اس گھٹیا سی گید رنگ میں رکنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ وہ تو تقی کا اصرار تھا تو میں آگئی۔ ورنہ ایسے فنکشنز تو ہمارے ملازم بھی آرینج کر لیتے ہیں اور ہم وہاں جانا بھی پسند نہیں کرتے۔“ ”مہک نے نخوت سے کہا۔ اور ایک نفرت بھری نظر شفا پر ڈالی اور ایک اداسے پلٹ کر چلی گئی۔“

”ہو نہ۔ تقی کا اصرار تھا۔ بیٹا! تمہارے کس بل تو میں نکلواتی ہوں۔ اگلی بار کسی کے اصرار پر بھی کہیں جانے کا نام نہیں لو گی۔“ ”نمر نے چہرے پر ہاتھ پھیر کر کہا۔“

اس نے مڑ کر دیکھا۔ شفا کہیں نہیں تھی۔ نمر کو ایک دم پریشانی نے گھیر لیا تھا۔

\*\*\*

نمر کو یہ فیصلہ کرنے میں زیادہ دقت نہیں ہوئی تھی کہ اب اسے کیا کرنا ہے۔

اس نے سمیر کو فون کر کے اسے وہیں بلوایا تھا اور تقی کو ساتھ لانے کے لیے کہا تھا۔ ان دونوں کے آتے ہی نمر نے ہر ایک بات تقی کے گوش گزار کر دی تھی۔ تقی اس کی باتیں سن کر سکتے میں ہی آگیا تھا۔ نمر نے اسے بھی خوب کھری کھری سنائی تھیں۔

”شفا اس وقت کہاں ہے؟“

”مجھے نہیں پتا کہاں ہے۔ جتنا میں اسے جانتی ہوں مجھے یقین ہے کسی کونے میں چھپ کر رو رہی ہو گی۔ وہ ساری زندگی آپ سے محبت کرتی رہے گی، مگر ساری زندگی منہ سے اعتراف نہیں کرے گی۔ پتا نہیں احسان مندی کا یہ کون سا انداز ہے۔“

”محبت؟“ ”تقی نے نمر کو دیکھا۔“ ”محبت نہیں تو اور کیا ہے۔ آپ کو اس لڑکی سے ملوانا چاہتی تھی جو آپ کی محبت ہے۔ شفا نے تو آپ کو یہ بھی پتا چلنے نہیں دیا کہ مہک کو اسی نے آپ سے رابطہ کرنے کے لیے منایا تھا۔ اس کی یہی اچھائی ہمیشہ اس کے گلے پڑ جاتی ہے۔ دو سروں کی بھلائی سوچتے سوچتے وہ اپنے لیے سوچ ہی نہیں پاتی۔“ ”نمر نے اسٹاپ بول رہی تھی۔“

تقی چپ چاپ کھڑا جیسے سوچ کے گھرے گرداب میں تھا۔ تب ہی اس کا موبائل بجنے لگا۔ اس نے دیکھا مہک کال کر رہی تھی۔ تقی نے کال کاٹ دی۔

”اس بھی کچھ نہیں بگڑا تقی!“ ”سمیر نے کہا۔ ”اس ٹوٹے ہوئے رشتے کو بچالو۔ ایسا نہ ہو پھر ساری زندگی پچھتانا پڑے۔ زندگی میں محبت دوبارہ مل سکتی ہے روح اور دل کا سکون دوبارہ نہیں ملے گا۔ زندگی کا سکون شفا بھائی کی ہمراہی میں ہے اور پلیز اب یہ بھی مت کہنا کہ تمہیں شفا بھائی سے محبت نہیں ہے۔ تمہاری شکل پر لکھی ہوئی ہے محبت۔“ ”وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔“

تقی نے موبائل فون سے سر اٹھا کر اسے دیکھا اس کے چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔ معا اس نے سیل فون سمیر کے ہاتھ میں پکڑا دیا اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے پیچھے پلٹنے لگا۔

”تو صحیح کہہ رہا ہے سمیر! دل کا سکون۔ روح کا سکون۔ محبت ہے۔“ ”وہ مڑ کر مخالف سمت میں تیز تیز قدم اٹھانے لگا کہ بھاگنے کا گمان ہوتا تھا۔“

مہک کی کال مستقل آ رہی تھی۔



سمیر نے پیچھے سے آواز لگائی۔ ”باجی مہک کو کیا جواب دوں۔“

”اس سے کسم بھاڑ میں جائے۔“ تقی نے گردن موڑ کر چمک کر کہا اور پھر چند قدم آگے جا کر واپس آیا۔

”تم کیوں کہو۔ یہ نیک کام میں خود ہی کر لیتا ہوں۔“ وہ جوش سے بولتا واپس پلٹ گیا تھا۔

جبکہ سمیر اور شمر کے چہرے پر خوشی اور اطمینان پھیل گیا تھا۔



”مہک!“

مہک نے آواز پر مڑ کر دیکھا۔ تقی دوڑا چلا آ رہا تھا۔ وہ رک کر اس کا انتظار کرنے لگی۔

”تمہارا فون کہاں ہے۔ میں کب سے کال کر رہی ہوں۔“ قریب آنے پر اس نے سنجیدگی سے کہا تھا۔

”جو بات تم نے کرنی تھی وہ پھر تمہیں کر لیں گے۔“ تقی نے کہا۔ ”میں تم میرے ساتھ چلو اور شفا سے معافی مانگو۔“ مہک کا دماغ ٹھک سے اڑ گیا۔

”کیا کہا۔؟ میں معافی مانگوں۔؟“ وہ جیسے سُن رہی تھی۔

”اس لڑکی کی اوقات کیا ہے جس سے معافی منگوا رہے ہو؟“

”اس کی اوقات یہ ہے کہ وہ تقی لودھی کی بیوی ہے۔“ تقی نے غرا کر کہا تھا۔

”میں نے تم سے کچھ نہیں چھپایا تھا مہک! سب کچھ بتا دیا تھا۔ یہ بھی کہ شفا کس طرح کی لڑکی تھی اور یہ بھی کہ ہمارا نکاح کس سچویشن میں ہوا۔ اس کے باوجود تم نے شفا پر کچھ اچھا حال۔ شرم آرہی ہے مجھے یہ سوچ کر کہ تم میری پسند ہو۔“

اس نے محبت کا لفظ استعمال نہیں کیا تھا۔

”اور مجھے اس وقت برا فہم ہو رہا ہے جب میں نے تم سے کانٹیکٹ کیا تھا۔“ مہک نے بھی کسی لگی لپٹی کے بغیر کہا۔

”خواہ مخواہ میں شفا کی باتوں میں آگئی۔ مجھے سمجھ لیتا چاہیے تھا جب اس وقت تم دونوں ایک دوسرے کی سائیڈ لینے سے باز نہیں آ رہے تو بعد میں کیا کرو گے۔ میرا تم جیسے ڈبل فیسلڈ انسان سے شادی کرنے کا فیصلہ ہی غلط تھا۔“

تقی اس بات پر خاموش رہا۔ پول ہی نہیں سکا۔ اس کا مطلب واقعی شفا نے اسے تقی کے لیے قائل کیا تھا۔

”لیکن اب میں فیصلہ کر چکی ہوں۔ شادی تو دور کی بات، تمہاری شکل بھی دوبارہ نہیں دیکھوں گی۔ تم جیسا کنزرویٹو انسان مجھ جیسی لائف پارٹنر ڈروہی نہیں کرتا۔ تمہیں تو شفا ہی سوٹ کرتی ہے۔ شکل سے ہی بے چاری لگنے والی مل کلاس لڑکی جس کی ساری زندگی بچن میں کھانے پکانے اور کپڑے دھوتے گزر جاتی ہے۔ وہ بالکل تمہاری امی جیسی بنے گی۔ جیسے ان کی زندگی بچے پالتے گزر گئی، شفا کی بھی گزر جائے۔ ہو پ لیس اینڈ پوروائف۔“ اس کے انداز میں بے پناہ نخوت تھی۔

تقی نے اسے نظر بھر کر دیکھا، یہ چہرہ اس کی محبت کا چہرہ تھا جو اس وقت اسے دنیا کا سب سے برا چہرہ لگ رہا تھا۔

”تمہیں کیا پتا مہک! یہ شکل سے ہی بے چاری لگنے والی کھانے پکانے والی اور کپڑے دھونے والی مل کلاس لڑکی سے محبت کا نشہ کیسا ہوتا ہے۔ تم جیسی امیر زادیاں تو کبھی اس لیول تک پہنچ ہی نہیں سکتیں۔“

”ضرورت بھی نہیں ہے۔“ مہک نے ایک بار پھر نخوت کا مظاہرہ کیا تھا۔

”امید ہے دوبارہ ملاقات نہیں ہوگی۔“ تقی نے سنجیدگی سے کہا تھا۔ مہک نے غضب ناک نظروں سے اسے دیکھا اور زن سے گاڑی نکال لے گئی تھی۔

\*\*\*

تقی اسے ڈھونڈتا ہوا پارکنگ میں آیا تھا اور توقع

کے عین مطابق وہ اپنی گاڑی میں چپ چاپ بیٹھی تھی۔ اس پر نظر پڑنے ہی تقی نے سکون کا سانس لیا۔ پھر قریب آ کر کھڑکی کے شیشے پر دستک دی۔

شفا نے گردن موڑ کر دیکھا، تقی کو دیکھ کر حیران ہوئی۔ دروازہ کھولنے کے لیے بے ساختہ ہاتھ بھی پڑھایا، لیکن پھر فوراً ”رک گئی۔ وہ تذبذب کا شکار تھی۔

تقی سمجھا نہیں۔ وہ کیوں رکی ہے۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے وجہ پوچھی، لیکن شفا کو کس سے مس نہ ہوتے دیکھ کر دوبارہ دستک دے ڈالی۔ اس بار شفا نے دروازہ کھولنے کے بجائے تھوڑا سا شیشہ کھول دیا تھا۔

”میں تمہیں پورے ہل میں ڈھونڈ آیا ہوں۔ یہاں اکیلی بیٹھی کیا کر رہی ہو؟“ اس نے ایسے پوچھا جیسے کچھ جانتا نہ ہو۔

”میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ شفا نے نظریں چراتے ہوئے کہا وہ رو نہیں رہی تھی، لیکن چہرہ بتاتا تھا ہمت دیر تک روتی رہی ہے۔

”طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو کیا اکیلے بیٹھ کر ٹھیک ہو جائے گی؟“ وہ حجت کرنے لگا۔

”میں کچھ دیر اکیلے رہنا چاہتی ہوں۔ تم یہاں سے جاؤ تقی!“ اس نے الجھن بھرے لہجے میں کہہ کر شیشہ بند کرنا چاہا لیکن اس سے بھی پہلے تقی نے ہاتھ ڈال کر لاک کھول لیا تھا۔

”تقی پلیز!!“ اس نے زور دے کر کہا لیکن حلق میں آنسوؤں کا گولہ پھنس رہا تھا، آنکھوں میں نمی سمٹنے لگی تھی۔ جب اس سے خود پر کنٹرول نہیں ہوا تو ذرا سا رخ ہی بدل لیا، لیکن آنسوؤں کو سہ جانے دیا۔

تقی نے دروازہ کھول کر اس کا ہاتھ آہستگی سے پکڑ کر خفیف سا جھٹکا دیا۔ وہ اسے باہر بلانا چاہتا تھا۔

اس کے اصرار پر شفا نے پاؤں باہر نکالے، لیکن نکلی نہیں۔ سر جھکا کر شدت سے رونا شروع کر دیا تھا۔

تقی اس کے سامنے بچوں کے بل بیٹھ گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں بے حد نرمی سے شفا کا ہاتھ پکڑا ہوا

تھا۔

اس نے ایک لفظ نہیں کہا تھا۔ بس نرمی اور پیار سے اس کا ہاتھ سہلاتا رہا تھا۔

جی بھر کر رونے کے بعد شفا نے سر اٹھا کر شرمندگی سے اسے دیکھا۔ اپنا ہاتھ چھڑوانے کی کوشش کی، لیکن تقی کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

”مگر میں سوری بول دوں تو معاف کر دو گی؟“ شفا کے ہاتھ پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے اس نے آہستگی سے پوچھا۔

”تمہاری تو کوئی غلطی نہیں ہے۔“ اس نے ہاتھ کی پشت سے گل پونچھتے ہوئے کہا تھا۔ ”یہ سب تو میری قسمت کا تصور ہے۔“

”قصود۔ تمہیں پتا ہی نہیں کتنی اچھی قسمت ہے تمہاری۔ مجھ جیسا بندہ تم سے محبت کرنے لگا ہے۔ اس سے زیادہ اچھی قسمت کیا ملے گی تمہیں۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا تھا۔ شفا نے بے ساختہ جھٹکے سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھیں شرارت سے زیادہ سچائی کی چمک سے جگر جگر کر رہی تھیں۔

شفا کا دل چاہا۔ اس کی بات پر ایمان لے آئے لیکن۔ اس نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑوا لیا۔

”تم مذاق کر رہے ہو؟“

”مذاق تو پہلے کر رہا تھا۔ وہ بھی اپنے ساتھ۔ یہ نہ مان کر کہ جو تمہارے لیے محسوس کرنا ہوں وہ محبت ہے۔“ سمجھ نہیں پارہی تھی کس طرح کا رد عمل دکھائے۔

”مجھ سے کیسے محبت کر سکتے ہو۔ تمہیں تو مہک سے محبت تھی۔“

”تھی۔ ہے نہیں۔“ اس نے ان تین لفظوں پر زور دے کر معاملہ سمیٹنا پھر مزے سے بولا۔

”اب تو معاف کر دو۔ اب تو میں نے اعتراف بھی کر لیا ہے۔“

”کس لیے معاف کروں۔؟ تمہاری تو کوئی غلطی نہیں ہے۔“

”تھوڑی سی تو ہے۔ نکاح کے بولوں کے ساتھ



بیوی کی ذمہ داری فرض ہو جاتی ہے۔ میں نے نکاح کر لیا، لیکن سچ بات ہے تمہاری ذمہ داری شوہر کی طرح اٹھانی نہیں پایا۔ پہلی بار ہی تم کو تمہاری طرف انگلی اٹھانے سے روک دیتا تو آج اس کی دوبارہ ہمت نہ ہوتی، لیکن اس وقت میں اپنی ذمہ داری سمجھ ہی نہیں سکا۔ مجھے اس کا افسوس ساری زندگی رہے گا لیکن اس افسوس کا اثر ہماری زندگی پر نہیں پڑے گا۔ تم دیکھنا! ہم بہت اچھی زندگی گزاریں گے۔ تم ہر روز مزے مزے کے کھانے پکایا کرنا۔ میں کھایا کروں گا۔ وہ ایسے بول رہا تھا جیسے ان دونوں کے درمیان کوئی تیسرا نہ ہو۔ شفا البتہ تذبذب کا شکار تھی۔

”تم مجھے بےوقوف بنا رہے ہو نا۔“

”بے بنائے پر تو میں محنت نہیں کرتا۔“ اس نے کان کھاتے ہوئے کہا۔ شفا نے اسے خفگی سے دیکھا تو ہنس دیا۔

”اب تو مان جاؤ۔ یا کان پکڑ کر اٹھک بیٹھک لگاؤ۔“

”اور تمہارے شفا نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں تھی۔“

”تمہارے“ تقی نے ناک چڑھا کر اسے دیکھا۔

”میں اس سے شادی نہیں کروں گا۔ بہت دن سے ہمت جمع کر رہا تھا کہ اسے یہ بات بتا دوں، لیکن بتا نہیں پا رہا تھا۔ پھر یہ بھی خیال آتا تھا زبان سے پھر نامروں کی شان نہیں ہوتی، لیکن شکر ہے آج اس نے خود ہی کہہ دیا کہ وہ مجھ سے شادی کرنا نہیں چاہتی، کیونکہ میں اسے ٹل کلاس پرانے خیالات کا انسان لگتا ہوں۔ میں نے کہا، نہیں کرتی تو نہ سہی۔ میرے پاس میری شفا ہے، وہی مجھے کھانے بنانا کرکھایا کرے گی۔“

”تمہارے شفا نے تمہیں انکار کر دیا؟“ شفا کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

”ہاں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے کی بات ہے۔ میں نے اس سے کہا تھا۔ تم سے معافی مانگے تو اس نے آگے سے یہ کہہ دیا۔“ تقی کے انداز سے یہ بہت عام

سی بات لگ رہی تھی۔

”اس کا مطلب تمہارے تمہیں انکار کیا تو تم میرے پاس آگے۔ وہ انکار نہ کرتی تو تم کبھی نہ آتے۔“ شفا نے ناراضی سے کہا۔

”نہیں۔ تمہارے پاس تو میں پھر بھی آتی جاؤں۔ ایک چھوٹی سی تمہاری قدر مجھے تمہارے جانے کے بعد آئی تھی۔ مجھے بہت افسوس ہوا کہ تم چلی گئی ہو، لیکن اب میں تمہیں کہیں جانے نہیں دوں گا اب ایسی بیوی کو کون چھوڑے جو اتنا اچھا کھانا بناتی ہو۔“

اس نے بہت شرارت سے، بہت ہنس مہر سے، بہت محبت اور لاڈ سے اس کا ہاتھ دبایا تھا لیکن شفا خفا ہی رہی۔

”یہ بات تم نے کوئی چوتھی دفعہ کہی ہے۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے میرے اندر اچھا کھانا بنانے کے سوا کوئی کوالٹی ہی نہیں ہے۔“

”نہیں نہیں یار! تم خود کو انڈر ایسٹیمیٹ نہ کرو۔ اچھی باور چن کے ساتھ ساتھ۔ تم بہت اچھی

دھون بہت اچھی جمعہ دینی اور بہت ہی اچھی سپروائزر بھی ہو۔ مجھے اب تک یاد ہے، مجھ سے کیسے صفائی کروائی تھی تم نے۔“ ناک چڑھا کر کہا۔ شفا نے ڈیش بورڈ پر پڑا نشوونما کا ڈبا اٹھا کر اسے کھینچ مارا۔ تقی نے اسے ہنستے ہوئے سچ کیا تھا۔ پھر شفا کی طرف دیکھا۔ وہ بے ساختہ زور سے ہنس دی تھی۔

تقی نے اسے ایسے ہنستے دیکھا تو سرشار ہی ہو گیا۔

زندگی میں کچھ ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کی ہنسی ہمارے دلوں کو سیراب کر دیتی ہے۔

تقی کا دل بھی سیراب ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

سمیر اور ثمر نے عین وقت پر دھواوا بولا۔

”اگر لیلیٰ مجھوں کا سینہ مکمل ہو گیا ہو تو کیا ہم آجائیں۔“ سمیر میسنرین کر پوچھ رہا تھا۔

”تو نہ سدھرنا سمیر! جتنی بری تیری شکل ہے اتنے ہی غلط وقت پر انشوی دیتا ہے۔“ تقی نے جل کر کہا۔

”اے تو نہ کہیں تقی بھائی! شکل تو بہت اچھی ہے۔“ ثمر نے فوراً حمایت کی۔ اس بات پر تقی اور سمیر نے بے ساختہ قہقہہ لگایا تھا۔

”بڑا وکیل ڈھونڈا ہے۔“ تقی نے سمیر کو چڑایا، لیکن وہ کالر جھاڑ کر بولا۔

”اپنی اپنی قسمت کی بات ہے۔“

”خیر وکیل تو ہمارا بھی بڑا قابل ہے۔“ تقی نے سینے پر بازو باندھ کر گاڑی سے کمر لگاتے ہوئے شرارت سے شفا کو دیکھا تھا۔

وہ خاموش رہی لیکن بڑی پیاری مسکراہٹ تھی اس کے چہرے پر۔

تقی نے بڑی لگن سے اسے دیکھا۔ سمیر نے شرارت سے اس کے چہرے کے آگے ہاتھ ہلا دیا۔

”چلو بس کرو۔ ہم تم دونوں کو یہی یاد کروانے آئے تھے کہ آج ہماری مندی ہے۔ یہاں تم لوگوں نے الگ ہی اپنی فلم چلائی ہوئی ہے۔“

”چلو بھائی! پہلے تمہاری مندی لگوا لیں۔ ہمارا کام تو بعد میں بھی ہو جائے گا۔“

تقی نے سمیر کے کندھے پر بازو پھیلایا۔

ثمر نے خوشی سے شفا کو گلے لگایا، پھر جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر ان دونوں کے پیچھے چل پڑی۔

ہنستے کھلکھلاتے وہ چاروں آگے پیچھے چل رہے تھے۔ آسمان پر پوری تارہ خوں کا چاند اتار روشن آج سے پہلے کبھی نہ تھا۔

☆ ☆ ☆

آسمان پر چاند بہت اداس لگ رہا تھا۔

ساہرلان میں آکر ایک کرسی پر بیٹھ گئی، پھر اس نے پاؤں بھی کرسی پر رکھ لیے۔ دل بہت خالی خالی سا ہو گیا تھا۔

تھوڑی دیر گزری تو ڈور بیل بجنے لگی، لیکن وہ شخص سی بیٹھی رہی ڈور بیل مسلسل بج رہی تھی۔ ساہر کو ابھرنے ہوئے لگی۔ نہ جانے کیوں اندر سے کوئی آکر دروازہ کھول ہی نہیں رہا تھا۔ ناچار اسے ہی اٹھنا پڑا۔

بے زاری بہت تھی۔ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی گیٹ تک آئی۔

گیٹ کھولا تو سامنے عمیر کھڑے تھے۔ وہ دنگ رہ گئی۔

”آ۔۔۔ آپ۔۔۔“

”چلو۔ میں تمہیں لینے آیا ہوں۔“ وہ سنجیدہ لگ رہے تھے، لیکن انداز میں نرمی تھی۔

”عمیر! میں۔۔۔“ اس کے الفاظ گم ہو گئے۔ آنکھوں سے آنسو برسنے لگے۔ عمیر نے ہاتھ بڑھا کر اس کے آنسو پونچھ دیے۔

”تمہارے پاس صرف پندرہ منٹ ہیں۔ جلدی خود بھی تیار ہو جاؤ اور عادل کو بھی تیار کرو۔ ہمیں عمر کی مندی میں پہنچنا ہے۔“

”اے۔۔۔“ وہ ہونقوں کی طرح ان کی شکل دیکھنے لگی۔

عمیر بہت خوب صورتی سے مسکرا دیے۔ اور اس کی آنکھوں کے عین سامنے اپنی کلائی لا کر بولے۔

”صرف پندرہ منٹ۔ میں باہر تمہارا ویٹ کر رہا ہوں۔“

وہ واپس مڑ گئے تھے۔ وہ انہیں روک کر کچھ پوچھنا چاہتی تھی۔ معافی مانگنا چاہتی تھی لیکن عمیر کی اور ہی موڈ میں تھے۔ وہ جلدی سے اندر چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

جس وقت وہ دونوں ہال میں پہنچے اسٹیج پر فوٹو شوٹ ہو رہا تھا۔

دو لہادلسن کے ساتھ تائی امی، سین، جری، رضی، ابا، تقی اور شفا تصویریں بنا رہے تھے۔

شفا نے انہیں دیکھتے ہی وہیں اسٹیج سے ہاتھ ہلا دیا تھا۔

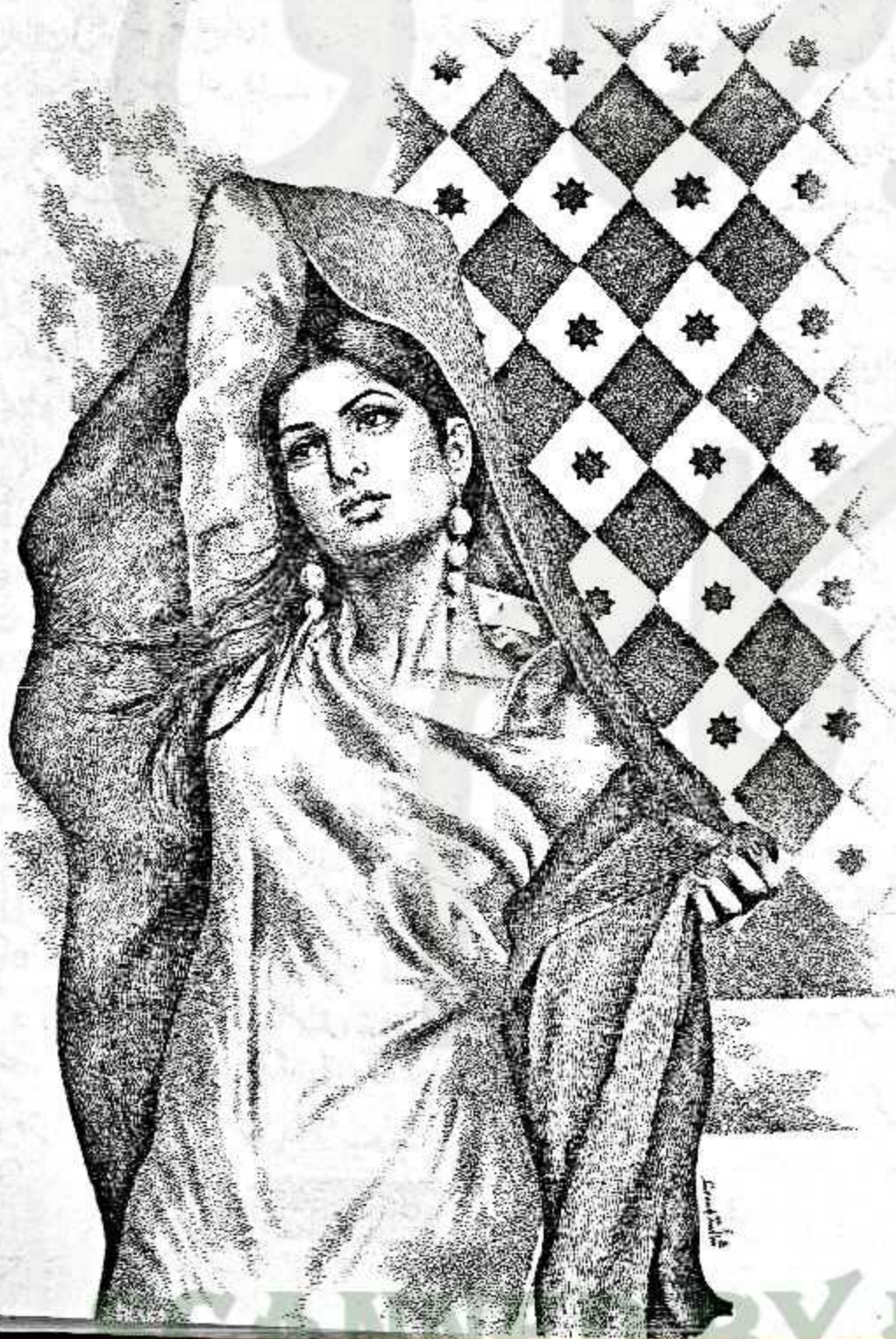
”او۔۔۔“ عمیر نے کہا تو وہ جھجکتے ہوئے ان کے ساتھ آگے آئی۔

”بھابھی! شفا والہانہ انداز میں اس سے لپٹ گئی تھی۔“ تقی دیر لگادی آنے میں۔ ہم کب سے آپ کا





”تم ارسلان کے پاس کیوں کھڑی تھیں۔“ وہ  
کڑے تیوروں سے آنکھیں سکوڑ کر پوچھ رہا تھا۔  
”کب؟“ مارہ نے الٹا اسی سے پوچھ ڈالا۔  
”کیمسٹری کے پیریڈ کے بعد“ وہ ہنوز برہم تھا اس  
کے انداز میں ہی سختی نہیں تھی بلکہ اس کا چہرہ بھی غصے  
سے دھبک رہا تھا مارہ برسوں انداز میں پیشانی پر اپنی انگلی  
رکھ کر سوچ میں گم ہو گئی۔  
”وہ ہاں یاد آیا“ بس حال احوال پوچھ رہا تھا اور



بھی اپنا دل ساہرہ بھابی کی طرف سے صاف کر لو۔“  
”تمہیں کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ کلم تو میں  
پہلے ہی کر چکا ہوں۔ کیونکہ ایک مرتبہ کسی کو میں نے  
غصے سے سنا تھا کہ ”جب کوئی معافی مانگ رہا ہو تو بتا اس  
بات پر دھیان دے کہ اس کے دل میں سچ سچ کی  
شرمندگی ہے یا نہیں“ اسے معاف کر دینا چاہیے۔  
کیونکہ اس وقت اللہ گیند ہمارے کورٹ میں ڈال دیتا  
ہے کہ ہماری مرضی ہم اس گیند کو کس طرح کھیلیں۔  
تو کیا ہمارے لیے بہتر نہیں کہ ہم گیند کو اللہ کی مرضی  
کے مطابق کھیلتے ہوئے اس بندے کو معاف کر دیں  
جو اپنی غلطی پر شرمندگی ظاہر کر رہا ہے کیونکہ معاف  
کر دینا اللہ کے نزدیک بڑا احسن عمل ہے اور دلوں کا  
حال بھی صرف اللہ ہی جانتا ہے۔ ویسے بھی جو انسان  
دوسروں کی چھوٹی چھوٹی غلطیوں کو معاف کرنے کا  
حوصلہ نہ رکھتا ہو۔ اسے یہ امید بھی ترک کر دینا  
چاہیے کہ اللہ اس کی بڑی غلطیوں کو معاف کرے  
گا۔ ہم چاہتے ہیں کہ اللہ ہماری بڑی بڑی کوتاہیوں کو  
معاف کر دے اور خود دوسرے انسانوں کی چھوٹی چھوٹی  
غلطیاں بھی نظر انداز نہیں کر پاتے۔ یہ تو بڑا دوغلا طرز  
عمل ہے بھی۔“  
اس نے شرارت سے من و عن وہی سب دہرایا  
جو شفا سے سن چکا تھا۔  
”چھاتی۔“ شفا نے شرارت سے اسے دیکھا پھر  
وہ دونوں ہی زور سے ہنس دیے تھے۔



انتظار کر رہے ہیں۔“  
ساہرہ کی آنکھیں ایک بار پھر نم ہونے لگی تھیں۔  
عمیر اسے راستے میں بتا چکے تھے انہیں یہاں شفا  
نے بھیجا ہے۔ اتنی محبت۔ ایسا احترام۔ وہ اس  
سب کے قابل تو نہیں تھی اور پتا نہیں اللہ نے کس  
مٹی سے شفا کا دل بنایا تھا جو معاف کرنے کی اتنی  
صلاحیت رکھتا تھا۔  
”شفا! مجھے معاف کر دو۔“ اس نے آنسو بھری  
آنکھوں کے ساتھ شرمساری سے اس کے سامنے  
ہاتھ جوڑنا چاہے شفا نے فوراً اس کے ہاتھ کھول  
دیے۔  
”جو ہونا تھا ہو چکا۔ اب اس برے وقت کو یاد  
کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ آپ خوشی کے اس  
موقع پر رویں نہیں۔ جائیں۔ ابابھی ہیں ای  
ہیں۔ سب سے ملیں۔“  
”جب تک تم معاف نہیں کرو گی۔“  
”میں نے معاف کیا بھابی! میرے دل میں آپ  
کے لیے کوئی گلہ نہیں ہے۔“ اس نے پیاری سی  
مسکراہٹ کے ساتھ ساہرہ کو دوبارہ گلے لگالیا تھا۔ ”میں  
نے آپ سے کہا تھا نا بھابی! ایک وقت آتا ہے  
نندیں چلی ہی جاتی ہیں۔ میں بھی عنقریب اپنے گھر  
چلی جاؤں گی پھر آپ کو ہی عمیر بھائی اور ان کے گھر پر  
راج کرنا ہے۔ وہ وقت آگیا ہے۔“  
اس نے کہا اور بصد اصرار اسے اسٹیج کی طرف  
دھکیلا۔  
ساہرہ جھجکتے ہوئے گئی تھی۔ شفا وہیں کھڑی  
اسے سب سے ملتا دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔ چند منٹ  
بعد تقی بھی اس کے پاس آگیا۔  
”بڑا مسکرایا جا رہا ہے۔“ شفا نے گردن موڑ کر  
اسے دیکھا۔ کہا کچھ نہیں۔ اسی طرح مسکراتی رہی پھر  
کچھ خیال آنے پر بولی۔  
”ایک بات مانو گے تقی! جو ہونا تھا ہو چکا۔ تم



اسٹڈی کیسی جا رہی ہے یہ بس۔  
”وہ کون ہوتا ہے تمہاری خیر خبر پوچھنے والا؟“ وہ  
پوری طاقت سے دھاڑا، اشتعال سے اس کی مٹھیاں  
چھیچھی گئیں، اضطرابی کیفیت میں وہ سانس اندر باہر  
کرتے لگا۔

”اُزلان کیا ہو جاتا ہے تمہیں، کلاس فیلو ہے ہمارا  
ارسلان، اور حال احوال پوچھ لینے سے کیا ہو جاتا ہے  
انتا غصہ کیوں کرتے ہو۔“

ماثر نے سہم کر اپنے اطراف میں دیکھا گو کہ سب  
اسٹوڈنٹس جا رہے تھے چھٹی کا وقت تھا سب خوش  
گاہیوں میں مگن گیٹ کی طرف جا رہے تھے کوئی بھی  
ان کی طرف متوجہ نہیں تھا مگر ماثر ڈر رہی تھی اگر کوئی  
بھی اُزلان کی کرختگی بھری دھاڑ سن لیتا تو خواہ مخواہ تماشا  
بن جاتا۔ بیسیوں سوال اٹھ کھڑے ہوتے اور ماثر ایسا  
نہیں چاہتی تھی جبکہ اُزلان؟

”ٹھیک ہے آج کے بعد تم مجھ سے بات نہیں کرنا“  
صرف ارسلان سے بات کرتا۔ ”اس وقت وہ دونوں  
کلج کا ریڈور سے گزر رہے تھے جب اُزلان نے دو  
ٹوک کہہ دیا اور تیز قدموں سے ماثر کو وہیں چھوڑ کر  
آگے بڑھ گیا۔

”اُزلان رکھو پلیر“ وہ بھی لمحے کے توقف کے بعد اس  
کے پیچھے بھاگ اٹھی اور اس کا بازو پکڑ لیا۔  
”پھوڑو میرا ہاتھ“ مجھے کوئی بات نہیں کرنی۔“  
اُزلان نے بے رحمی سے ماثر کا ہاتھ جھٹک کر اپنا بازو  
چھڑایا۔

”کیا ہو گیا ہے آخر اتنی معمولی سی بات پر جھگڑا  
کر رہے ہو تم مجھ سے ایسی کوئی قیامت ٹوٹ پڑی  
ہے۔“ ماثر رو دینے والی ہو رہی تھی اُزلان کا رویہ اور  
اس کی بے اعتنائی ماثر برداشت کر ہی نہیں سکتی تھی  
اب تو وہ انتہائی سنگدلی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

”یہ معمولی بات ہے تمہاری نظر میں، بتاؤ مجھے۔“  
وہ غصے سے کھولتا ہوا واپس مڑا اور تن کر ماثر کے  
سامنے کھڑا ہو گیا قہر آلود نظریں خوں خوار لب و لہجہ ماثر

بس چپ ہو گئی اس وقت اسے خاموش رہنا ہی  
مناسب لگا تھا اُزلان غصے میں تھا اور اگر وہ بھی دعبود  
مقابلہ کرتی تو جھگڑا طول پکڑ جاتا۔

”چھا ریلیکس ہو جاؤ آئندہ خیال رکھو گی  
ارسلان کے سلام کا جواب بھی نہیں دلو گی بس اپنا  
موڈ ٹھیک کر دینا۔“ ماثر بچی لہجے میں بولی۔

ماثر نے دیکھا کہ اُزلان کے تھے ہوئے عضلات  
ڈھیلے پڑ گئے، دونوں ساتھ چلتے کلج گیٹ تک آئے  
اُزلان اپنی گاڑی کا فرنٹ ڈور کھولنے لگا اُزلان روزانہ کو  
اس کے گھر ڈراپ کرتا تھا۔

”بات کرونا، گمانا آئندہ خیال رکھو گی احتیاط  
برتو گی۔“ ماثر نے یقین دلایا۔

”یہ مت بھولا کرو کہ تم سید اُزلان شاہ کی محبت  
ہو۔“ اُزلان کے لہجے میں زعم سا بھرا تھا وہ ہمیشہ اپنا نام  
جما جما کر ادا کیا کرتا تھا اسے شاہوں کا بیٹا ہونے پر گھمنڈ  
تھا وہ جب بھی اپنا نام آپ لیتا تو ایک خودی کا سرشاری  
کا احساس اس کے بدن میں سریے فٹ کر دیتا خود  
پسندی کی انتہا تھی۔

”مجھے نہیں پسند کہ تمہیں کبھی ہوا بھی چھوئے کجا  
کہ کوئی مرد تم سے بات کرے، تمہیں نظر بھر کر دیکھے  
خون کھولتا ہے میرا، تم صرف میری ہو، میرے لیے ہو  
دھیان میں رکھا کرو یہ بات۔“ ماثر بہت کچھ کہنا چاہتی  
تھی مگر مصلحتاً خاموش رہی، ماثر منہ میں زبان رکھتی  
تھی اور بوقت ضرورت اپنی زبان کا استعمال کرتا بھی  
جانتی تھی۔ مگر یہ بھی سچ تھا کہ وہ سید اُزلان شاہ سے  
محبت بھی بہت کرتی تھی اس لیے اُزلان کی کڑوی  
کسمپلی اور ناگوار باتیں بھی ہنس کر سہ جاتی تھی۔ ماثر  
کا گھر آگیا تھا اُزلان نے گاڑی روکی۔

”آجاؤ کھانا کھا کر چلے جانا۔“ ماثر نے کہا تو اُزلان  
ہنس پڑا، وہ ایسا ہی تھا پل میں تولد پل میں ماشہ اپنی  
منوانے والا، اپنی چلانے والا، اب اس کا غصہ اتر چکا تھا  
لہذا موڈ بھی ٹھیک ہو گیا تھا۔

”سچ میں آجاؤں۔“ اُزلان نے مسکراتی ہوئی ماثر کو

نظروں کے حصار میں لے کر پوچھا ماثر فرنٹ ڈور کھول  
کر اتری اور اوڑھ کھلے پٹ پر ہاتھ رکھ کر اُزلان کو دیکھنے  
لگی دیکھتی رہی۔

”بھی نہیں پہلے میں مناسب وقت دیکھ کر اپنی امی  
سے تمہارا ذکر کروں گی اور پھر تمہیں اپنی امی سے  
ملواؤں گی اب جاؤ۔“ دونوں ایک ساتھ ہنسے۔

”بائے“ اُزلان نے گاڑی دوبارہ اشارت کی۔  
”بائے“ ماثر نے جوابی ذرا سا ہاتھ بلند کر کے کہا  
اور گھر کے اندر چلی گئی۔



سید ارسلان شاہ کا اُزلان شاہ اکلوتا بیٹا تھا اور  
تین بیٹیاں تھیں ان کے ہاں لڑکیوں کو زیادہ پڑھنے کی  
اجازت نہیں تھی۔ خاندان کی چند ایک لڑکیاں ہی  
ایسی تھیں جو کلج تک پہنچی تھیں ورنہ تو میٹرک یا اس  
سے بھی کم تعلیم دلوانے کے بعد لڑکیوں کو گھروں میں  
محصور کر لیا جاتا۔

ہاں ان کے خاندان کے لڑکے ضرور کلج،  
یونیورسٹیز میں پڑھ رہے تھے زمیندار لوگ تھے  
خوشحالی نسل در نسل آگے منتقل ہو رہی تھی ہر لڑکے کو  
ایک شادی تو لازمی خاندان میں ہی کرنا ہوتی تھی کیونکہ  
اپنی لمبی چوڑی زمینیں خاندان سے باہر جانے کا خطرہ  
مول لینا پڑتا اگر خاندان کی لڑکیاں باہر بیابا جاتیں تو۔  
جو کہ شاہ خاندان کو گوارا نہیں تھا کہ بیٹیاں باہر بیابا  
کی صورت میں غیر لوگ ان کے سامنے سرائٹھائیں اور  
جائیداد میں سے اپنے حصوں کا مطالبہ کریں زمینوں کا  
بؤارہ ہو۔

عورتوں کو گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں تھی اگر  
کسی مجبوری کی بنا پر خواتین کو گھر سے باہر جانا بھی پڑتا تو  
ٹوپی والے پرانی طرز کے برقعے اوڑھ کر گھروں سے  
نکلنی تھیں برقعوں میں ملبوس خواتین کی عمر وغیرہ کا  
اندازہ لگانا انتہائی مشکل ہوتا کیونکہ وہ سر سے پاؤں  
تک ڈھکی چھپی ہوتیں حتیٰ کہ ان کے ہاتھ بھی  
دستانوں میں چھپے ہوئے ہوتے۔

سید اُزلان شاہ اور ماثر شاہ اکٹھے کلج میں بی۔ ایس  
سی کر رہے تھے ماثر کے والد شاہ احمد ابو ظہبی میں تھے  
ماثر کا ایک بھائی شہر کا جانا مانا وکیل تھا جبکہ دوسرا بھائی  
ڈی۔ ایس۔ بی تعینات تھا۔ ماثر کا گھر انہ خوشحال بھی  
تھا اور روشن خیال بھی۔

ماثر اور اُزلان شاہ کی دوستی کلج میں ہی ہوئی تھی اور  
پھر دوستی دھیرے دھیرے محبت میں بدل گئی اُزلان شاہ  
بظاہر تو خوش شکل لڑکا تھا اور ذہین بھی بلا کا تھا۔ مگر اس  
کی ذات کی خامی یہ تھی کہ وہ اپنے سامنے کسی کو کچھ  
گردانتا ہی نہیں تھا۔ حد سے زیادہ خود پسندی اور زعم۔

..... جبکہ ماثر بہت سلیجی ہوئی طبیعت کی حامل لڑکی  
تھی ذہانت رکھ رکھاؤ اس کی ذات کے اعلا ترین  
وصف تھے مزاجاً بھی صلح جو اور نرم خوشی لہذا اس  
کی بہت سارے معاملات میں اُزلان شاہ سے ذہنی ہم  
آہنگی نہیں ہو پاتی تھی ایسی جگہوں پر وہ مصالحت کی راہ  
اختیار کرتی تھی بلاوجہ بھی جھک جایا کرتی تھی۔

جو بھی تھا اُزلان شاہ سے ماثر کو محبت بہت تھی اور  
محبت کی تابعداری ماثر ناچاہتے بھی کر جاتی تھی۔

بارہا اسے شدت سے  
احساس ہوتا کہ وہ ایسی مجرم ہے جو بغیر جرم کیے کٹہرے  
میں کھڑی ہے۔ اُزلان طیش کے عالم میں ماثر پر یوں  
برس رہا ہوتا کہ ماثر کو کبھی کبھی لگتا بہت ہو گیا اب اور  
نہیں اسے اپنی عزت نفس دو کوڑی کی محسوس ہونے  
لگتی۔

”سید اُزلان شاہ کی تم محبت ہی نہیں عزت بھی ہو،  
کسی طور مجھے گوارا نہیں کہ کوئی تمہیں دیکھے بات  
کرے، جان نکل جاتی ہے تن بدن میں آگ لگ جاتی  
ہے جو میرا روم روم جھلسا دیتی ہے۔“

”اُزلان تمہیں کیا خوف ہے مجھے نہیں پتا، مگر مجھے  
صرف تمہارے روٹھ جانے کا اور پھچھڑ جانے کا خوف  
ہے جو میری زبان پر تالے لگا دیتا ہے ورنہ برا تو مجھے  
بھی بہت لگتا ہے جب تم مجھے بغیر کسی دوش کے بغیر  
کسی خطا کے اتنی بے دردی سے لعن طعن کرتے ہو۔“



وہ یہ ساری باتیں کہنا چاہتی تھی مگر کہہ دینے کی کوشش میں مائہ کے نازک لب محض کپکپا کر رہ جاتے اور محبت ہر بار مائہ کا سر اپنے آہنی شکنے میں لے کر اپنے قدموں میں جھکا دیتی اور مائہ اپنی عزت نفس کا خون ہوتا دیکھتی رہتی کمزور پڑتی رہتی اور جھکتی رہتی۔

\*\*\*

مائہ اور اذلان شاہ فاضل ایگزٹام کے بعد آج کل فارغ تھے رابطہ فون پر ہی ہوتا تھا اذلان شاہ اپنی امی کو مائہ کے گھر بھیجنے کے لیے اصرار کر رہا تھا مگر نچانے کیوں مائہ اپنی امی سے اذلان کا ذکر نہیں کیا رہی تھی۔ اس دن مائہ اپنے کمرے میں لپٹی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی جب اسلام آباد سے اس کے ماموں کر تل ریاض کی کال آئی مائہ نے لپک کر فون اٹھایا اور ماموں سے باتیں کرنے لگی وہ اپنے ماموں کی بہت لاڈلی تھی ماموں کی کوئی بیٹی نہیں تھی صرف دو بیٹے ہی تھے اس لیے ماموں مائہ سے سکی بیٹی کی ہی طرح محبت کرتے تھے۔

”بیٹا تمہاری امی کہاں ہیں۔“ ماموں نے پوچھا۔  
”اپنے کمرے میں ہیں۔“  
”موسم کیسا ہے لاہور کا۔“ انہوں نے پوچھا۔  
”سرڈی کی شدت بڑھ گئی ہے جاتی ہوئی سردیاں اپنا رنگ ڈھنگ دکھا رہی ہیں۔“ وہ کھلکھلائی۔  
”ہاں بیٹا ورنہ گرمیوں کی آمد آمد ہے ٹھنڈی کوئی تک نہیں بنتی لاہور میں تو ان دلوں میں نارمل ساموسم ہوتا ہے اچھا بیٹا اپنی امی کو تو فون دو ذرا ضروری بات کرنی ہے ان کا نمبر بند جا رہا ہے۔“

”جی ماموں میں دیتی ہوں۔“ مائہ پھرتی سے بند سے اتری اور پاؤں میں چھپک چھپک کر کمرے سے نکلی وہ تیزی سے سیڑھیاں اتر رہی تھی جب ہی مائہ کے نمبر پر اذلان شاہ کی کال آنے لگی۔ مائہ کے ہنستے مسکراتے ہونٹ بل میں سکڑ گئے تھے اور دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

”امی جی ماموں کا فون۔“ مائہ ہلکی سی دستک دے کر اندر جا کر بولی اور فون ان کو پکڑا کر خود صوفے پر بیٹھ گئی

وہ دونوں بہن بھائی باتوں میں غم ہو چکے تھے اور مائہ فون چرے کے ساتھ اپنی امی کی چمکتی خوشیوں سے پھر پور آواز سنتی رہی آنکھوں سے جھلکتی خردانہ سلاط کی روشنی دیکھتی رہی محبت سے اپنوں کا مان رشتوں کا فخر انسان کے اندر کیسے توانائی بھرتا ہے۔

”بیٹا کسی کی کال مسلسل درمیان میں آ رہی ہے۔“ مسز شاعر نے کان سے سیل فون ہٹا کر اسکرین کو اپنی آنکھوں کے سامنے کیا مائہ کا دل دھک سے رہ گیا۔  
”کوئی اذلان شاہ ہے نکلاں فیلو ہو گا نا۔“

”جی امی“ مائہ نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری۔  
”میں بھائی کو اپنے نمبر سے کال کرتی ہوں آپ بات کر لو بیٹا اچھا نہیں لگتا ایسے۔“ انہوں نے کر تل صاحب کی کال کاٹ کر سیل فون مائہ کو تھمایا اور کر تل صاحب کو اپنے نمبر سے کال کر لی۔ وہ باتوں میں پھر سے منہمک ہو چکی تھیں مگر مائہ شرمندہ سی سیل فون ہاتھوں میں تھامے وہیں کھڑی تھی۔ پھر کچھ دھیان آنے پر دیکھا تو دس منٹ کی فیل سی کال میں اذلان شاہ کی ہندو مسئلہ کاڑ آئی ہوئی تھیں۔ مائہ کا دل بچاؤ ہونے لگا وہ ٹوٹے بکھرے قدموں سے کمرے سے نکلی اور سیڑھیاں چڑھنے لگی تبھی اس کی پھر کال آنے لگی مائہ نے ٹھنڈی آہ بھر کر آنتا ہٹ سے کال کاٹ دی۔  
مائہ اپنے کمرے میں آکر ٹھنڈے لگی وہ غصے سے تلملارہی تھی تب ہی پھر کال آنے لگی۔  
”ہاں بولو۔“ مائہ تلخی سے بولی۔  
”کس کے ساتھ بات کر رہی تھیں اتنی دیر سے؟“

وہ چیخا حسب عادت۔  
”ماموں سے۔“ مائہ نے خود کو کنٹرول میں رکھ کر صرف اتنا کہا۔

”بکواس بند کر گھبراہٹ کی باتوں کا۔“ وہ پھٹ پڑا اذلان کا بس نہیں چل رہا تھا کیا کروالے اس کی پھنکارتی ہوئی سانسیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔  
”اپنی زبان سنبھال کر بات کرو مسز اذلان، تمہیں کوئی حق نہیں ہے مجھ سے سوال جواب کا اور یہ اپنی دھونس آج کے بعد مجھ پر کبھی مت جمانا۔“ مائہ بھی

آج اسے کھری کھری سننے پر تل گئی تھی۔ اذلان کی چند ٹانگیں آواز بند ہو گئی۔

”میں اب تھک گئی ہوں تمہارے جیسی بیمار ذاتیت کے شخص کے ساتھ چلتے چلتے، تم سے تعلق بوجھ بن گیا ہے۔ تعلق انسان کو مضبوط بناتا ہے کمزور نہیں، میں ہر بار تم سے دیتی رہی اب اور نہیں بہت بہت ہو گیا۔“ مائہ بھی تلخی سے بولتی چلی گئی۔  
”مجھے اچھا نہیں لگتا مائہ۔“ اذلان اس کا یا پلٹ پر کچھ نرمی سے بولا۔

”کیا اچھا نہیں لگتا، میں جیتی جاگتی انسان ہوں کوئی چیز نہیں ہوں جس پر تمہاری اجارہ داری ہو۔ میری اپنی سوچ ہے اپنی ترجیحات ہیں تم میری ذات پر حاوی ہو کر میری ذات کو ختم کر دینا چاہتے ہو کیسی محبت ہے یہ تمہاری جو ہمہ وقت مجھے ڈر اور خوف میں مبتلا رکھتی ہے۔“ مائہ تو آج اسے خاطر میں ہی نہیں لارہی تھی۔ وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ مائہ نے فون بند کر دیا۔

”اوہ مائی گاڈ! امی کیا سوچتی ہوں گی کہ میری دوستی ایسے لوگوں سے ہے جن کو مینوز کا ہی نہیں پتا کال کال کیے جا رہا تھا، کوئی رکھ رکھاؤ نہیں کوئی شائستگی نہیں۔“ مائہ کو صحیح معنوں میں آج امی کے سامنے خفت اٹھانا پڑی تھی، عجیب سی شرمندگی نے مائہ کو حصار میں لے رکھا تھا اسے وہ رہ کر اذلان پر غصہ آ رہا تھا، کوفت ہو رہی تھی۔ وہ جلتی جھتی کمرے میں چکر کاٹی رہی۔

\*\*\*

مائہ نے دو دن تک اذلان شاہ سے بات نہیں کی تھی ہر بار غصہ، اذلان شاہ لڑتا تھا اور مائہ سنتی تھی مناتی تھی مگر اس بار معاملہ الٹا ہو گیا تھا اذلان مسلسل اسے کال کر رہا تھا لاتعداد معافی کے میسجز بھیجتا رہا، مائہ کا دل پیچ گیا ان کی صلح ہو گئی اذلان شاہ اسے منانے میں کامیاب ہو ہی گیا تھا اس نے اپنی تمام غلطیوں کا اعتراف کر لیا تھا۔

اب وہ روز اسے فون کرتا وہ دونوں گھنٹوں باتوں میں گمن رہتے مستقبل کے سہانے سننے بنتے رہتے تھے انہی دنوں مائہ نے سنا کہ امی فون پر ابو کو بتا رہی تھیں کہ ماموں اپنے بیٹے ڈاکٹر حمزہ کا رشتہ مائہ سے کرنے کے خواہش مند ہیں، وہ بے تحاشا خوش تھیں۔

مائہ پریشان تھی اس نے اذلان کو بتایا۔ وہ ملنے کا پروگرام بنانے لگے ماکہ اطمینان سے بیٹھ کر بات کر سکیں وہ دونوں ہی غم غم سے ہو گئے یہ بات سن کر۔ آج کل ان کا کسی بھی بات پر اختلاف نہیں تھا دونوں شیرو شکر ہو گئے تھے ساری بد مزگی ساری تلخ کلامیاں قص پارینہ سن گئی تھیں۔

مائہ پر اذلان جی بھر کر محبت لٹا رہا تھا اس کی ہر بات مان رہا تھا شاید وہ بدل گیا تھا یا بدل رہا تھا کم از کم مائہ کو تو ایسا ہی لگ رہا تھا شاید محبت خوش گماں ہوتی ہے۔ خوش فہمیاں پالنا محبت کا برسوں پرانا طور رہا ہے۔

مائہ آج اذلان سے ملنے کے لیے جا رہی تھی طے یہ پایا تھا کہ وہ گھر سے نکل کر روڈ پر آئے گی وہاں سے اذلان اسے پک کرے گا پھر دونوں کسی ہوٹل میں کھانا کھائیں گے اور اس مسئلے پر بات کریں گے سارے گھر سے کسی دوست سے ملنے کا کہہ کر نکلی تھی۔

شام کا وقت تھا سورج ابھی دور افق میں اپنی تاباکیاں بکھیر رہا تھا مائہ گھر سے کافی دور نکل آئی تھی اور اب وہ ایک الگ تھلگ سی جگہ پر کھڑی ہو گئی اس نے اذلان کو بتایا تھا کہ وہ گھر سے نکل آئی ہے مگر اذلان نہیں پہنچا تھا۔ سڑک پر گاڑیوں کا ازدحام سا نظر آ رہا تھا وہی روڈ والی مخصوص چپل پسل شور شرابا آتے جاتے لوگ، چبھتی ہوئی تاڑتی ہوئی نظریں۔

”ہم چھوڑ آئیں کہاں جانا ہے۔“ ایک گاڑی والے نے بالکل مائہ کے پاس گاڑی روک کر فو معنی لہجے میں آنکھیں نچا کر کہا مائہ کی رنگت بل میں پھسکی پڑ گئی۔ اس کا دل وحشت زدہ سا ہو کر تیز دھڑکنے لگا پھر وہ اس کی حالت زار سے لطف اندوز ہوتا گاڑی بھگالے گیا۔ مائہ کا چہرہ بل میں خفت زدہ ہو کر چٹخنے لگا اس نے





زیرین کی زندگی میں اس کی کو اس کی اکلوتی جیٹھانی ندرت نے پورا کیا تھا۔ جن کے بعد مزید کسی پریشانی کو سننے کا نہ اس کا جگر اٹھانہ ہمت۔ پتا نہیں کہاں سے لاتی تھیں۔ وہ روزانہ اتنی ڈھیر ساری باتیں۔ ان کی طرح ان کی درجن بھر سہیلیاں اور بڑی بہن تپا عظمت بھی کام دھندوں سے فارغ لگتی تھیں۔ اس مارکیٹ کا کپڑا اچھا ہے۔ اس مارکیٹ کے جوتے، فلاں برانڈ کی لان زبردست ہے۔ فلاں کی کاسمیٹکس ہی نہیں۔ گھر بیٹھے کی شاپنگ سے جی بھر جاتا تو

”چلو زیرین بی بی۔ ہو گیا ایک اور برے دن کا آغاز، جس کے دامن میں آج بھی سوائے مایوسی اور ناامیدی کے کچھ نہیں۔“ بچوں کو اسکول کالج روانہ کرنے کے بعد زیرین نے بیڈرمار خود کلائی کی اور کچن کی راہ لی۔

”پتا نہیں، لوگ اتنے ڈھیٹ کیوں ہوتے ہیں۔ ہمیں تو ذرا سی پریشانی لاحق ہو تو ہونٹ مسکراتے تک کو تیار نہیں ہوتے اور انہیں دیکھو۔“ زیرین نے کچن کی گھڑکی کے بار لاؤنج میں صوفے پر پھیل کر بیٹھی ندرت بھابی کی طرف دیکھا۔ ناشتے کے بعد فون پر بے ہنگم قہقہے لگانے کی ورزش جن کا روز کا معمول تھا۔ زیرین نے کچے برسا برسا کر آنے پر اپنا غصہ نکالنے

کی کوشش کی۔ تقریباً ”ہر شادی شدہ عورت کی زندگی میں ولن نماساس، مسر، منڈیں، دیور، دیورائیاں موجود ہوتے ہیں۔“

”میری جان، میرا بیٹا کیوں رو رہی ہو اور اس وقت گھر سے کس لیے نکلیں تم؟“ وہ ماٹھ کو ساتھ لگائے پیار سے پوچھ رہا تھا ماٹھ کو شرمندگی سر اٹھانے نہیں دے رہی تھی اس کا ہاں جابا اس کا محافظ اس کے ساتھ تھا پھر کون تھا جو اسے نظر بھر کر ذوق معنی فقرہ اچھا لگا تھا وہ عزت تو اس بھائی کی تھی۔

”وہ بھاپرا اکھانے نکلی تھی پھر اندھیرا چھانے پر ڈر گئی۔“ وہ بچکیوں کے درمیان بولی۔

”نگلی نہ ہو تو اس میں ڈرنے اور رونے کی کیا بات ہے پوئیس والے کی بہن ہو کر ڈرتی ہو۔“ وہ اس کا سر سینے سے لگائے کہہ رہا تھا۔ پھر راستے سے پرالے کر وہ گھر آگئے تھے ماٹھ کو اذلان نے سوری کا مسیج کیا تھا وہ نہیں آسکتا تھا گھر میں بڑی ہو گیا تھا۔

ماٹھ نے اپنا نمبر تبدیل کر لیا وہ نہیں چاہتی تھی کہ اذلان کوئی عذر کوئی بہانہ تراش کر دوبارہ اسے منالے۔ بھلے دیر سے ہی سہی پر وہ جان گئی تھی اذلان شاہ وہ شخص نہیں ہے جس کے ساتھ ماٹھ زندگی کی شروعات کر سکے کسی باہر والی لڑکی کو عزت کتنا اور بات ہے مگر سمجھنا ناممکنات میں سے ہے ورنہ اذلان شاہ یوں اس کی ہستی کو بے مول نہ کرتا، ماٹھ بہت اچھی طرح سمجھ چکی تھی کہ اذلان ماٹھ کو اپنی ملکیت سمجھتا ہے زندگی دو دن کی بات تو نہیں عمر بھر کا ساتھ ہے۔

اذلان شاہ نے جیسے اسے بے سرو سامان سڑک پر تماشا بنایا اس دن ماٹھ نے پھٹ جانے کے خوف سے ہاتھ چھڑا لیا، عزت نفس سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں محبت بھی نہیں محبت نہ ملے تو لڑکیاں زندگی دیتی ہی لیتی ہیں مگر عزت نہ ملے تو لڑکیاں جیتے جی زندہ درگور ہو جاتی ہیں۔

ماسوں ماٹھ کا ہاتھ مانگنے آرہے تھے ماٹھ کی امی نے ماٹھ سے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔ اسے پتا تھا کہ اس کا پورا خاندان خوش ہے تو وہ بھی مستقبل میں ضرور ڈھیروں محبتیں اور عزت و ایمان پا کر شاد رہے گی۔

چور نظروں سے ارد گرد دیکھ کر اپنے برس میں سے سیل خون نکال کر اذلان شاہ کو دو منٹ کی کال کی تھی اس نے جلد پہنچنے کا وعدہ کر کے انتظار کا کہہ دیا۔

آتے جاتے لوگ رک رک کر جا چکی ٹولتی نظروں سے ماٹھ کو دیکھ رہے تھے اس کا سارا بدن کچکپا رہا تھا وہ گھر سے اکیلی بھی نہیں نکلی تھی گو کہ اس پر گھر والوں کی جانب سے کوئی پابندی نہیں تھی مگر وہ پھر بھی کبھی اکیلے گھومنے پھرنے کی شوقین نہیں رہی تھی کجا کہ عادی ہوتا۔

ماٹھ نے دیکھا اس کے سامنے دو تین لڑکے آکر کھڑے ہو گئے تھے اور آپس میں سرگوشیاں کرتے ہوئے ماٹھ کی طرف مبہم سے اشارے کر رہے تھے۔ ماٹھ کو تشویش لاحق ہوئی اگر بڑے بھیا نے دیکھ لیا تو۔

اس نے اپنی نازک سی کلائی پر بندھی رسٹ واپس پر اچھتی سی نظر ڈالی اسے گھٹنے سے زیادہ وقت ہو گیا تھا اس کے دل میں وسوسے اور خدشات سر اٹھانے لگے دل ملال سے بھر گیا نجانے اذلان شاہ کہاں رہ گیا تھا۔

”کوئی تمہیں نظر بھر کر دیکھے مجھ سے برداشت نہیں ہوتا کیونکہ تم میری عزت ہو۔“ اذلان شاہ کی آواز کی باز گشت ماٹھ کی سماعتوں میں گونج رہی تھی۔ آنسو پلوں سے دامن چھڑا کر آچل میں جذب ہو رہے تھے سورج غروب ہو رہا تھا شام گہری ہو رہی تھی وہ تیزی سے گھر کی طرف بھاگ رہی تھی ایسی تحقیر اتنی انسٹلٹ کیا وہ جان بوجھ کر نہیں آیا۔ خاک سمجھا اس نے ماٹھ کو اپنی عزت۔

”ماٹھ تم۔“ کوئی قریب سے پکارا ماٹھ اچھل پڑی۔ سامنے ڈی۔ ایس۔ پی آصف ٹائر فل یونی فارم میں اپنی جیب سے سر نکالے پوچھ رہا تھا۔ ماٹھ بے اختیار کھل کر رو دی اور بھاگ کر جیب میں سوار ہو گئی۔ وہ جیسے دھوپ سے گھنی چھاؤں میں آگئی تھی حواس بحال ہونے لگے۔





شامت آجاتی، خاندان، برادری، آس پڑوس کے ان لڑکے، لڑکیوں کی، جن کے رشتے ممکنہ طور پر ایک دوسرے سے کروائے جاسکتے تھے۔

بچن کے ضروری کاموں سے فراغت یا کروہ ذرا دیر سکون کی خاطر اپنے کمرے میں آ بیٹھی۔ لیکن سکون کیسے ملتا، ابھی چند گھنٹوں میں اقصیٰ کلج سے آنے والی تھی۔ جس کی آنکھوں میں آج بھی وہی روز کا سوال ہو ماکہ کیا اس نے ابو سے الگ گھر کی بات کی اور روز کی طرح آج بھی زرین کا وہی ایک جواب۔ وہ بے چینی سے کمرے میں ٹھٹھکتے لگی۔

”کیوں ہم چاہ کر بھی اپنے بچوں کی خواہش پوری نہیں کر سکتے۔ اپنی تو پوری زندگی الگ گھر کی حسرت میں گزر گئی۔ لیکن اب بچوں کے وقت بھی وہی ناامیدی۔ جانے ندرت بھابھی اور احسان بھائی کو جوائنٹ فیملی سسٹم سے چپکے رہنے میں کیا خوب صورتی نظر آتی ہے۔ جس طرح ہمارے بچے الگ گھر میں سکون سے رہنے کے لیے تڑپتے ہیں، کیوں ان کے بچوں میں بھی یہ احساس پیدا نہیں ہوتا۔ ہم دوسرے گھر میں چلے جائیں گے تو انہیں بھی پرائیویسی اور زیادہ جگہ کی سہولت میسر آئے گی۔ لیکن کیوں؟ کیوں صرف ماما اور میرے بچے ہی جلتے کڑھتے رہتے ہیں؟“

ابھی پچھلی رات ہی اس نے رضوان سے بات کی تھی۔ لیکن ان کا بھی وہی ایک جواب۔

”احسان بھائی نہیں چاہتے کہ ہم دو بھائیوں کی فیملی الگ الگ رہیں۔“

”لیکن اقصیٰ اب کلج میں آگئی ہے۔ اسے الگ کمرہ چاہیے۔ سنی اور عبداللہ رات گئے تک گیمز کھیل کھیل کر اس بے چاری کا دل کھا جاتے ہیں۔ وہ کتنی مشکل سے ان کے ساتھ ایڈجسٹ کر رہی ہے۔“

”ہاں۔ لیکن میں اب بھائی جان سے کیسے یہ سب کہوں۔ ابھی پچھلے سال ہی تو ان کی بیٹی بیاہ کر دوسرے گھر گئی۔ وہ سوچیں گے ہم نے تو کبھی بچوں کی پرائیویسی کے چونچلے نہیں اٹھائے۔ ویسے

بھی لڑکی کا اصل گھر تو اس کا سرال ہوتا ہے۔ جب تک شادی نہیں ہو جاتی، اقصیٰ کو جیسے تیسے گزارا کرنا پڑے گا۔ اگلے گھر تو اپنی ہر چیز کی مالکین خود ہوگی۔“

”ہاں۔ جیسے میں ہوں نا یہاں۔ اپنی ہر چیز کی مالکین۔“ زرین نے تنک کر رضوان کو دیکھا۔

”اچھا۔ ہم چھت پر کنسرکشن شروع کروا رہے ہیں۔ اور دو کمرے بن جائیں گے تو۔“ رضوان نے گویا مصالحت کی کوشش کی۔

”ضرورت نہیں ہے۔“ زرین نے فوراً بات کاٹی۔ ”اوپر کا پورشن بن گیا تو نئے گھر کی رہی سہی امید بھی ختم ہو جائے گی۔ اور مجھے نہیں رہتا“ اس بڑبڑاتی باتوں کی فیکٹری کے ساتھ۔ نہ ان کی زندگی کا کوئی مقصد ہے۔ نہ بچوں کے مستقبل کی فکر۔ ان کے بچے کہاں سے آرہے ہیں مگر ہر کو جا رہے ہیں، انہیں کچھ پروا نہیں ہوتی۔ بس سارے جہان کی فکریں ایک ہماری جان سے چپکی ہیں، پتا نہیں قسمت ایسے لوگوں کے ساتھ کیوں لا پاندھتی ہے، جن کی ہم صورت تک دیکھنا گوارا نہیں کرتے۔“

”زرین۔ زرین۔“ لاؤنج سے ندرت بھابھی نے اونچی آواز سے پکارا تو وہ ایک دم سوچوں سے باہر آئی۔

”میں ذرا عظمت آپا کے ساتھ مارکیٹ تک جاری ہوں۔“ وہ پرس میں کچھ رکھتی۔ تیز تیز بولتی باہر نکل گئیں۔ زرین ست روی سے بچن کی طرف چل پڑی۔ اقصیٰ کے آنے کا وقت ہو رہا تھا۔ اس نے تھوڑے سے چاول بھگوئے تھے سوچا لائٹ سا پلاؤ بنا لے۔ بچن میں کام کرتے شاید آواہا گھنٹا ہوا تھا۔ جب ڈور بیل بجی۔ وہ وال کلاک پر نگاہ ڈالتی دروازے پر آئی، یقیناً اقصیٰ ہوگی۔ اس نے دروازہ کھولا۔ لیکن یہ دیکھ کر حیران ہو گئی کہ اقصیٰ کے پیچھے ندرت بھابھی بھی تھیں۔

”آپ۔ آپ۔“ اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی، لیکن بھابھی نے منہ پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ زرین نے حیران حیران نظروں سے اقصیٰ کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور آنسوؤں کی ایک لکیر اسی وقت بے اختیار اس کے گل پر اتر رہی تھی جسے انگلی سے صاف کرتی وہ اپنے کمرے میں دوڑ گئی۔

”کیا ہوا بھابھی۔ یہ۔“

”جلدی سے ٹھنڈے پانی یا جوس کا ایک گلاس لے۔“ فی الحال کچھ مت پوچھنا۔“ وہ اسے ہدایات دیتی اقصیٰ کے پیچھے چلی گئیں۔ زرین خالی دماغ لیے بچن میں آئی۔ گلاس میں جوس بھر کر کمرے میں آئی تو اقصیٰ ہچکیوں کے ساتھ رو رہی تھی۔ ندرت بھابھی اسے بازوؤں میں لیے پیار سے آہستہ آہستہ کچھ بول رہی تھیں۔

زرین نے گلاس آگے بڑھایا۔ بھابھی نے پرس سے ایک گولی نکال کر زبردستی اقصیٰ کو جوس کے ساتھ کھلا دی اور اس کا سر گود میں رکھ کر نرمی سے اس کا سر سہلانے لگیں۔ زرین کو اشارے سے لائٹ آف کر کے باہر جانے کا کہا۔

”نگ۔ کیا بات ہے بھابھی، میرا دل ڈوب رہا ہے، جلدی بتائیں۔“ کچھ دیر بعد جب ندرت بھابھی ملنے سے دروازہ بند کرتی باہر آئیں تو زرین دوڑ کر ان کے قریب آئی۔ دماغ جیسے آندھیوں کی زد میں تھا۔ کیا ہو چکا تھا، کیا ہونے والا تھا۔

”ادھر میرے کمرے میں آ جاؤ۔ اقصیٰ اب سو گئی ہے۔“ وہ اپنا بھاری وجود سنبھالتی اپنے کمرے میں داخل ہو گئیں۔

”اب بتائیں بھابھی، کیا بات ہے؟“ زرین نے بشکل ان کے ہنسنے کا انتظار کیا۔

”وہ کسی لڑکے کے ساتھ تھی، میں نے اسے بس اسٹینڈ کی طرف جاتے دیکھا تھا۔“

”بس اسٹینڈ؟“ زرین کے خاک پلے نہیں پڑا۔

”وہاں کیا کرنے گئی تھی اور لڑکا۔“

”بس اسٹینڈ آدمی گھومنے نہیں جاتا زری۔ وہ اس لڑکے کے ساتھ جا رہی تھی، کسی دوسرے شہر۔“

”جی۔“ اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

”میں اور عظمت آپا مارکیٹ جا رہے تھے۔ ہماری گاڑی اس وقت سگنل پر کھڑی تھی۔ جب اقصیٰ کسی لڑکے کا ہاتھ پکڑے ہمارے آگے سے سڑک پار کر کے بس اسٹینڈ کے اندر چلی گئی۔ عظمت آپا اس طرف بالکل دھیان نہیں تھا۔ انہوں نے اقصیٰ کو نہیں دیکھا۔ مجھے تو بس بل میں خطرے کی بو آگئی اور میں یہ بھی جان گئی کہ اگر ابھی یہ موقع ہاتھ سے نکل گیا تو۔۔۔ خدا نخواستہ بہت بڑا نقصان ہو سکتا ہے۔ بس میں نے فوراً آپا سے اجازت لی اور گاڑی سے نکل آئی۔“

”آپ نے انہیں اقصیٰ کے متعلق نہیں بتایا؟“

زرین کی قدر بے یقینی سے بے ساختہ بول گئی۔ ”پاگل ہوئی ہو۔ میرے گھر کی عزت داؤ پر لگی تھی۔ کیا میں اوروں سے شیر کرتی پھرتی۔ بلکہ اگر وہ اقصیٰ کو دیکھ بھی لیتیں تو میں کوئی بھانا بنا لیتی اور انہیں بات کی سنجیدگی کا احساس نہ ہونے دیتی۔ بس اچھا ہوا جو سگنل کھل گیا اور وہ کچھ بھی بول نہیں پائیں۔ بعد میں کچھ نہ کچھ کہہ کر ٹال دوں گی۔“

”پھر۔ اس کے بعد۔“ زرین نے دھیان دوبارہ اقصیٰ والی بات کی طرف دلایا۔

”ہاں۔ پھر میں بھی بس اسٹینڈ کے اندر چلی گئی۔ وہاں اس وقت دو ہی بسیں روانگی کے لیے تیار کھڑی تھیں۔ مجھے اقصیٰ اور وہ لڑکا یا ہر کہیں دکھائی نہیں دیے تو میں نے باری باری دونوں بسوں میں دیکھا۔ یہ دونوں مجھے دو سری بس میں مل گئے۔ مجھے دیکھ کر اقصیٰ پر شدید گھبراہٹ سوار ہوئی۔ وہاں چونکہ اور بھی بہت لوگ تھے۔ میں نے بنا کچھ کہے خاموشی سے اس کا بازو پکڑا اور باہر نکل آئی۔ اتنی دھکم پیل اور شور ہنگامے کا ماحول تھا کہ کسی کو کچھ پتا نہیں چلا۔“

”اور وہ لڑکا؟“

”وہ تو یوں سرپٹ بھاگا جیسے پولیس آگئی ہو۔ ابھی یہی بات میں اقصیٰ کو سمجھا رہی تھی کہ جس کی محبت کے بل پر تم سارے رشتے ناتے چھوڑ کر جا رہی تھیں۔ وہ تو ہمیں سپورٹ کرنے کے لیے ایک قدم بھی آگے نہیں آیا۔ یہ تو ابھی میں تھی ایک کمزور



عورت سے اگر جو تمہارے تایا جان اور ابو وہاں آئے ہوتے، اس نے تو وہیں ڈر کے بارے جان دے دینی تھی۔ کہاں تم کسی دوسرے اجنبی شہر میں اس کے سہارے زندگی گزارنے کے بارے میں سوچ رہی تھیں۔ وہ تو دو دلوں میں اپنا مقصد نکال کر وہیں کہیں انجان گلیوں میں تمہیں چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوگا۔

”وہ تھا کون؟ اسے کہاں ملا؟“ زین بے شکل اپنی اندرونی حالت کو دبائے سوال کر رہی تھی۔

”بتا رہی تھی انٹرنیٹ پر دوستی ہوئی۔ آمنے سامنے ایک دوبارہ دیکھا تھا۔ پتا نہیں کس خاندان اور ذات کا تھا۔ مجھے تو حلیے سے عجیب ہونے والا لگا۔ بہت ہی عام اور لو فر ٹائپ کا تھا۔ عمر بھی کافی کم تھی شاید نویں دسویں میں پڑھتا ہو۔“

”اب آگے کیا ہو گا بھابھی۔ احسان بھائی اور رضوان۔“

”میں نے سب سوچ لیا ہے۔ تم فکر مت کرو تمہاری پہلی ترجیح صرف اور صرف اقصیٰ ہونی چاہیے۔ وہ اس وقت کس ذہنی کیفیت سے دوچار ہے اور کیا سوچ رہی ہے۔ اس پہ دھیان دو۔ اسے اکیلا مت چھوڑو، پیار اور نرمی سے پیش آؤ۔ کسی قسم کے طعنے، ڈانٹ، پھینکار کا سوچنا بھی مت، نفسیاتی طریقے سے ہینڈل کرو، سچی ہے، ان شاء اللہ جلدی سمجھ جائے گی۔ بس میں آج ہی پاپا سے بات کرتی ہوں۔“

آخری جملہ وہ منہ ہی منہ میں برسرِ پاتی اٹھ کھڑی ہوئیں تو زین بوکھلا کر ان کے پیچھے آئی۔

”کب کیا بات۔ آپا سے کیا کہیں گی؟“

”ارے گھر آؤ مت۔“ ندرت بھابھی اس پورے دورانیے میں پہلی بار مسکرائیں۔

”بھئی وہ کافی عرصے سے جاذب اور اقصیٰ کے رشتے کی بات چلانا چاہ رہی ہیں، لیکن میں ہر بار یہ کہہ کر ٹالتی رہی کہ ابھی اقصیٰ بہت چھوٹی ہے اور پڑھ رہی ہے۔ لیکن اب کسی طریقے سے انہیں جلد آنے کے لیے قائل کر لوں گی۔ اقصیٰ کا جلد از جلد کہیں رشتہ کرانا بہت ضروری ہے اور جاذب کا رشتہ ہر لحاظ

سے بہت اچھا ہے۔ فی الحال صرف منگنی بھی ہو جائے تو اس کی ذہنی رو جاذب کی طرف پلٹ جائے گی جو اس حادثے کو بھلانے میں اسے مدد دے گی۔“

وہ پتا نہیں اور بھی کیا کچھ بولے جا رہی تھیں۔ زین ہکا بکا ان کی صورت تک رہی تھی۔

”آپ ایک ایسی لڑکی سے اپنے بھانجے کا رشتہ کریں گی؟“

”پاگل ہو زین۔“ ندرت بھابھی نے تقریباً چلائے ہوئے اس پر غصہ کیا۔ ”خبردار جو اقصیٰ کو ایسی کسی لڑکی کہا اس کی عمر دیکھو۔ سترہ سال کی عمر میں کی گئی غلطی سے کسی کا کردار سامنے نہیں آ جاتا اور نہ ہی ہمیشہ کے لیے اسے اچھایا برا ہونے کا سرٹیفکیٹ دیا جاسکتا ہے۔ بیٹھو اور آرام سے میری بات سنو۔“

ندرت بھابھی نے اسے زبردستی سامنے صوفے پر بٹھایا۔

”اس عمر کی غلطیوں کے پیچھے اکثر ہم بیویں کی کوئی نہ کوئی کوتاہی ہوتی ہے۔ جب تم اس کے لیے انٹرنیٹ لگو رہی تھیں، میں تب بھی تمہیں کہنا چاہتی تھی کہ تم ذرا جلدی کر رہی ہو، لیکن بس مداخلت کرنا مناسب نہیں لگا۔ دیکھو۔ میں انٹرنیٹ یا موبائل فون وغیرہ کے خلاف نہیں ہوں۔ بھلے ہم نے اپنا دور ان چیزوں کے بغیر گزارا، لیکن اس کے باوجود میں سمجھ سکتی ہوں کہ آج کل کے بچوں اور نوجوانوں کا ان سہولیات کے بغیر گزارا تقریباً ناممکن ہے۔ لیکن بھئی بیویں کی نگرانی بھی کوئی چیز ہے۔ سنی نے نویں جماعت میں آتے ہی موبائل فون کی ضد کی اور باپ نے اس کی بات مان بھی لی، لیکن تم نے غور کیا، میں نے کبھی اس کا موبائل اس کے پاس نہیں رہنے دیا۔ وہ دوستوں سے بات کرنے کے لیے مجھ سے موبائل مانگنے آتا ہے اور رات کو تو کبھی اس کے سر پر موبائل نہیں چھوڑتی۔ اب تو اسے بھی عقل آگئی ہے۔ خود ہی سونے سے پہلے میرے حوالے کر جاتا ہے۔ تمہیں چاہیے تھا، کبھی کبھار اس کے پاس جا بیٹھیں۔ پڑھی لکھی ہو ایک دو مرتبہ میں ہی سمجھ جاتیں کہ انٹرنیٹ پر اس کی

مصروفیات کیا ہیں۔ لیکن اکثر والدین محض اس لیے ایسی باریکیوں سے صرف نظر کرتے ہیں کہ کہیں ان کے بچے برا نہ مان جائیں اور یہ نہ سمجھیں کہ والدین ہم پر بھروسہ نہیں کرتے۔ بس یہی کیوں کیشن گیپ آگے چل کر بڑے نقصان کا باعث بن جاتا ہے۔ حالانکہ ہونا تو یہ چاہیے کہ آپ کے پاس بچوں کے ہر سوال کا جواب ہو۔ انہیں باور کرائیں کہ تم ابھی نا سمجھ ہو اور صحیح سمت میں تم لوگوں کی رہنمائی ہمارا فرض ہے۔ انہیں زمانے کی اونچ نیچ بتائیں۔ انٹرنیٹ کے غلط استعمال پر اس سے کھل کر بات کریں۔ خیر۔“ انہوں نے ذرا دیر کو رک کر سانس لی۔

”جہاں تک اپنے بھانجے سے اس کا رشتہ کرانے کی بات ہے تو زین۔ اقصیٰ مجھے جاذب سے زیادہ عزیز ہے۔ وہ ”میرے“ گھر کی عزت ہے اور حقیقت میں بہت سیدھی اور معصوم ہے۔ اگر اقصیٰ کہیں اور پبی بڑھی ہوئی تو شاید میں بھی ایسے واقعے کے بعد اسے برا تصور کرتی، لیکن وہ میرے ہاتھوں میں کھیلی ہے۔ میری گود میں پبی بڑھی ہے۔ اس کی سترہ سالہ زندگی کا ایک ایک بل میری آنکھوں کے سامنے گزرا ہے۔ مجھے اس کی اچھائی کے متعلق کسی کی گواہی کی ضرورت نہیں ہے۔ تم بے فکر ہو کر رشتے کے لیے ہامی بھرو۔ بھلے آپا میری سگی بہن ہیں۔ لیکن اس واقعے کی انہیں زندگی بھر ہوا بھی نہیں لگنے دوں گی۔ البتہ احسان اور رضوان کو مناسب لفظوں میں بتانا بہت ضروری ہے۔ گھر کے مردوں سے کبھی کوئی بات نہیں چھپانی چاہیے۔ یہ میرا اصول ہے۔ ویسے بھی کل کو خدا خواستہ اشارہ آتا۔“ بھی کوئی بات سامنے آگئی یا وہ لڑکا ہی پریشان کرنے آکھڑا ہو تو کم از کم ہمارے مرد معاملات کو اچھے طریقے سے نمٹائیں گے۔ اب تم جاؤ۔ دیکھو اقصیٰ جاگ نہ گئی ہو۔ بس دھیان رکھنا۔ ڈانٹو کی تو وہ باغی ہوگی اور اگر پیار سے پیش آوگی تو وہ اپنی غلطی پر شرمندہ ہوگی آگے تمہاری مرضی۔“

”جی۔“ زین ہولے سے سر ہلاتی ضمیر پر دو دو بوجھ لیے وہاں سے اٹھ آئی۔ پہلا بوجھ اولاد کی تربیت

میں اتنی بڑی چوک ہو جانے کا اور دوسرا بوجھ اس نے ندامت سے لب چبائے۔ ندرت بھابھی کے متعلق اتنی نہ سمجھو رائے رکھنے کا۔ گزرے اٹھارہ برسوں میں جیٹھائی سے نفرت کا جذبہ ایسے ہر بات پر حاوی رہا کہ مثبت انداز میں سوچنے کی اس نے کبھی زحمت ہی نہیں کی تھی۔ جبکہ انہوں نے ”اس کے“ گھر کی لٹی بکھری عزت پر اپنی محبت کا آچل ڈالا تھا۔

”اگر بھابھی بھی مجھ سے اور میرے بچوں سے اتنی نفرت کرتیں، جتنی میں اور میرے بچے ان سے کرتے ہیں تو آج۔“ زین سوچ کر ہی لرز گئی۔ ”آج ان کے لیے اس نفرت کو نکالنے کا سب سے سنہری موقع ہوتا۔ لیکن وہ تو میرے اور میرے بچوں کے لیے اتنی محبت رکھتی ہیں۔“

جس جوائنٹ فیملی سسٹم سے نکلنے کے لیے وہ برسوں سے ہاتھ پیر مار رہی تھی، آج اسی سسٹم نے بدنامی کا داغ لگنے سے بچالیا تھا۔ بھابھی کے جملے بار بار کانوں سے گزر رہے تھے۔ ”اقصیٰ کی سترہ سالہ زندگی کا ایک ایک بل میری آنکھوں کے آگے گزرا ہے۔“

زین آہستہ سے سوئی ہوئی اقصیٰ کے سر ہانے بیٹھ کر بغور اسے دیکھنے لگی۔

”آج کی صبح کا آغاز اس نے دن کو برا کہہ کر کیا تھا۔ وہ دن جو اس کی نظر میں صرف اس لیے برا تھا کہ پھر اس میں بھابھی کے بے ہنگم قہقہے اور بے سرپر کی باتیں ہوں گی۔ جبکہ وہی دن دراصل اس کی اپنی کوتاہی کی وجہ سے برا ثابت ہوا تھا۔ دن خود کہاں برا ہوتا ہے۔ سورج کی سنہری کرنوں اور پرندوں کی میٹھی بولیوں سے شروع ہونے والے اللہ پاک کے ہر دن میں اس کی قدرت اور شان نظر آتی ہے۔ برے تو ہم اور ہماری خیتیں ہوتی ہیں۔ ہماری سوچ، ہماری خود ساختہ نفرتیں اور ہمارے اعمال ان روشن دنوں کے چروں پر سیاہی ملتے ہیں۔ کچھ بھی بولنے سے پہلے کاش ہم اپنے گریبانوں میں جھانک لیں تو کبھی کسی دن کو برا نہیں کہیں گے۔“





### کبھی ایسا بھی کرتا،

کبھی ایسا بھی کرنا

شام کی دہلیز پر

پل بھر کو دکنا

دوبتے سورج کا منظر دیکھنا

اور سوچنا

کہ شام کی گہری آوازی کا سبب کیا ہے؟

مسافر جب تھکا ہارا

سیر منزل

کبھی تنہا اترتا ہے

تو کیا محسوس کرتا ہے

یوسف خالد

لودے اٹھے وہ حرفِ طلب سوچ رہے ہیں

کیا لکھے سیرِ دامنِ شب، سوچ رہے ہیں

کیا جاتے منزل ہے کہاں، جلتے ہیں کس سمت

بھٹکی ہوئی اس بھیڑ میں سب سوچ رہے ہیں

بھگی ہوئی اک شام کی دہلیز پہ بیٹھے

ہم دل کے سلگنے کا سبب سوچ رہے ہیں

بجھتی ہوئی شمعوں کا دھواں ہے سیرِ محفل

کیا رنگ ہے آخرِ شب سوچ رہے ہیں

اس لہر کے پیچھے بھی رواں ہیں تڑپ لہریں

پہلے نہیں سوچا تھا جواب سوچ رہے ہیں

شکیب جلالی

اپنی طلب کا نام ڈبوئے کیوں جائیں مے خانے تک

ترشہ لبی کا اک دیا ہے شیشے سے ہی مانے تک

حسن و عشق کا سوز تعلق سمتوں کا پابند نہیں

اکثر تو خود شمع کا شعلہ بڑھ کے گیا پروانے تک

ساقی کو یہ خوش فہمی تھی، ہم تک مون نہ آئے گی

بیاس کا جب پیمانہ چھلکا ڈوب گئے مے خانے تک

مٹی سے جب پھول کھلائے کار جنوں کی محنت تے

شہر کچھ اس انداز میں پھیلے جا پہنچے ویرانے تک

زخمِ سحر کا رنگ سلامت، سب کو خبر ہو جائے گی

کتنے چہرے ہم نے ترشے ہاتھ قلم ہو جانے تک

اس غربت کی دھوپ میں شاعر اپنوں کا سایہ بھی نہ تھا

جس غربت کی دھوپ میں ہم کو یاد آئے بے گانے تک

شاعر لکھنوی

ہے اگرچہ شہر میں اپنی شناسائی بہت

پھر بھی رہتا ہے ہمیں احساسِ تنہائی بہت

اب یہ سوچا ہے کہ اپنی ذات میں سمٹے رہیں

ہم نے کر کے دیکھ لی سب سے شناسائی بہت

مذہبِ آستین میں دیر تک روتے رہے

رات ڈھلتی چاندنی میں اس کی یاد آئی بہت

اپنا سایہ بھی جدا لگتا ہے اپنی ذات سے

ہم نے اس سے دل لگانے کی سزا پائی بہت

اب تو سیلِ درد و تھم جائے، سکونِ دل کو ملے

زخمِ دل میں آچکی ہے اب تو گہرائی بہت

وہ سحر تار کیوں میں آج بھی روپوش ہے

جس کے غم میں کھو چکے آنکھوں کی بینائی بہت

میں تو جھوڑ کا تھا، اسیرِ دام کیا ہوتا کلیم

اُس نے زلفوں کی مجھے زنجیر بہت ہی بہت

کلیم مثنوی





رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،  
حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ  
صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔  
”کبیرہ گناہوں میں سے ایک بڑا گناہ کسی مسلمان  
کی عزت پر ناحق حملہ کرنا ہے۔“  
(ابوداؤد)

### تاریخی جملہ

ٹروین امریکہ میں نائب صدر کے عہدے پر فائز  
تھا۔ روز ویلٹ کی امانت وفات کے بعد وہ صدر کا  
مضبوط ستھان لے جا رہا تھا تو اسپیکر نے برن لے ٹروین  
کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔  
”دیکھو ہیری! اب بہت سے لوگ تمہیں بتائیں گے  
کہ تم اس ملک کے ذہین ترین فرد ہو لیکن میں اود تم  
دونوں جلتے ہیں کہ تم ایسے نہیں ہو، اس لیے محتاط  
رہنا“

### محبت

محبت سے غم ادا اسی ضرور پیدا ہوگی۔ وہ  
محبت ہی نہیں جو ادا سے نہ کر دے۔  
(اشفاق احمد۔ بابا صاحب)  
نوال افضل گمن۔ جرات

### ظرافت طبع

قطع آمدنی مسرود ہو جانے سے مرزا غالب نے  
پریشانی سے اور لوگ روٹی کھاتے تھے تو بقول غالب  
وہ خود کپڑا کھاتے تھے (ناداری کے باعث گھر میں

کپڑے اڑھنا پھونکا جو کچھ تھا، سب بیچ بیچ کر کھانا  
بڑا پریشانی کی اس حالت میں بھی وہ اپنی ظرافت کو  
بھیج سکتے تھے باز نہ رکھ سکے۔ ایک خط میں میر جگر  
کو لکھتے ہیں۔  
”میاں، بے رزق جینے کا ڈھب مجھ کو آ گیا ہے۔  
اس طرف سے خاطر جمع رکھنا، رمضان کا مہینہ دھندلے  
کھا کھا کر کاٹا۔ آگے خدا نازق ہے مجھے اور کھانے کو نہ  
ملا تو تم تو ہے نا“

حلقہ قریشی۔ ملتان

### بے چارگی

ٹرین کے ایک پورے ڈبے میں بات بات بیٹھی تھی۔  
ایک آدمی کو جب کہیں جگہ نہ ملی تو وہ بھی ٹرین کے  
اسی ڈبے میں آگے بٹھ گیا۔ ٹرین چل پڑی۔ کچھ دیر بعد  
بات بات نے ایک ڈبہ کھولا ادا اس میں سے بیٹھے چاول  
نکلے اور ساری بات بات کو دیے۔ لیکن اس آدمی کو نہ  
دیے۔ وہ جب کر کے بیٹھا ہا کہ کوئی بات نہیں۔ شاید  
انہوں نے سمجھ دیکھا نہیں۔ تھوڑی دیر بعد بات بات نے  
ایک اڈہ کھولا۔ اس میں سے برقی نکالی اور ساری  
بات بات میں تقسیم کر دی لیکن اس آدمی کو نہ دی۔ اسے  
بہت غصہ آیا کہ ایک میں ہی باہر کا آدمی ہوں مجھے  
بھی دے دیتے تو کیا تھا۔ لیکن وہ ضبط کر کے بیٹھا رہا۔  
بات بات نے لڑو نکالے اور سب کو ایک ایک لڑو دیا۔  
لیکن اس آدمی کو نظر انداز کر دیا۔ آدمی کو بہت غصہ  
آیا اور وہ کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا۔  
”اللہ کرے اس ڈبے پر بجلی گرے اور تم سب مر جاؤ“  
بات بات میں سے ایک سیانا آدمی کھڑا ہوا

اور لولا۔  
”اگر اس ڈبے پر بجلی گری تو تم کیسے بھوگے؟“  
اس آدمی نے جواب دیا ”جیسے چاول، برقی اور  
لڑو کی دفعہ بچ گیا تھا“  
ارم کمال۔ فیصل آباد

### قربانی

محبت کسی کے لیے اپنی جان قربان کرنا نہیں ہے  
کیونکہ یہ جان تو اللہ کی امانت ہے ہمارے پاس۔ محبت  
تو کسی کی رضا اور خوشی کے لیے اپنی رضا اور خوشی قربان  
کر کے کا نام ہے۔  
(اشفاق احمد)

### تجربہ

جب آپ تجربات سے بھر جاتے ہیں تو اس قدر  
بڑے ہو چکے ہوتے ہیں کہ کوئی بھی آپ کے تجربے کو  
ملازمت نہیں دیتا۔  
(بانی قدسیہ۔ ماہ رواں)

نوال افضل گمن۔ جرات

### باتیں کچھ کام کی

انتظار کرنے والوں کو اتنا ہی ملتا ہے، جتنا کوشش  
کرنے والوں سے بچ جاتا ہے۔ اور ہم انتظار کو صبر  
کا نام دے دیتے ہیں۔ آخری لفظ یہ ہوتا ہے کہ  
قیمت میں ہی نہیں تھا۔ سو ہمیشہ کوشش کرو  
انتظار نہ کرو۔  
زندگی میں دو باتوں کا کہنا حقیقی طور پر مشکل ہے کسی  
اجنبی کو پہلی دفعہ ”ہیلو“ کہنا اور اس سے واقعی  
محبت ہو تو اسے ”گڈ بائی“ کہنا۔  
جب آپ کسی غیر ملکی کسی شخص کی زندگی میں کوئی  
تبدیلی نہیں لاسکتے تو آپ کی موجودگی اس شخص  
کی زندگی میں کوئی معافی نہیں رکھتی۔  
منفی رویہ کسی مثال پر شہ ثائر کی مانند ہے،  
جس کو آپ تبدیل کیے بغیر کہیں نہیں پہنچ سکتے۔  
جو شخص آپ سے غصے کا اظہار کرے تو اسے غلط

مت سمجھو کیونکہ غصہ گہری محبت کے اظہار کا  
ساتھ ترین اور بخوشی جیسا طریقہ ہے۔  
سونو گوندل۔ جہلم

### انداز ہیاں اور

ماں نے دوسرے کمرے سے آواز دے کر بیٹے  
سے پوچھا۔  
”بیٹا! تمہارا چھوٹا بھائی کیوں رو رہا ہے؟“  
”میں اس کے پاس لپکتا کھارہا ہوں ادا سے نہیں  
دے رہا اس لیے رو رہا ہے“ بیٹے نے جواب دیا۔  
”تو اس کے پاس اپنے لپکتا نہیں ہیں کیا...؟ میں  
نے اسے بھی تو دیے تھے“ ماں نے پوچھا۔  
”نہی! جب میں اس کے لپکتا کھارہا تھا، یہ تب  
بھی رو رہا تھا“ بڑے بیٹے نے شکوہ کرتے ہوئے کہا۔  
مہک فہم۔ لیاری

### بات تو سچ ہے مگر

۱۔ اگر آپ کسی بے وقوف کی شکل نہیں دیکھنا چاہتے  
تو آپ کو پہلے اپنا آئینہ توڑنا چاہیے۔  
۲۔ تجربہ بہترین استاد ہے لیکن اس مدرسے کی  
فیس بہت زیادہ ہے۔  
۳۔ ڈپو میٹ وہ شخص ہے جو ایک عودت کی سالگرہ  
کا دن تو یاد رکھے لیکن اس کی عمر بھول جائے۔  
۴۔ تین آدمیوں میں ملازدارہ سکتا ہے بشرطیکہ ان  
میں سے دو مرچے ہوں۔  
۵۔ ایک مرتبہ شادی کرنا فرض ہے دوسری مرتبہ  
حماقت اور تیسری مرتبہ پاگل پن۔  
۶۔ ہجوم میں کئی سر ہوتے ہیں لیکن دماغ نہیں ہوتے۔  
۷۔ مہمان چلے جانے کے بعد اکثر بہت اچھے لگتے ہیں۔  
۸۔ جب دولت محو گفتگو ہوتی ہے تو کوئی قطع کلامی  
نہیں کرتا۔  
۹۔ اپنے متعلق آپ خود کچھ نہ کہیں، یہ کام آپ کے  
جاننے کے بعد ہو جائے گا۔  
۱۰۔ کوئی آئینہ انسان کی اتنی حقیقی تصویر نہیں پیش



## امت الصبور خالص کی ڈاڑھی

غزل سب قادیان بہنوں کے لیے۔

حالت حال کے سبب حالت حال بھی گئی  
شوق میں کچھ نہیں گیا شوق کی زندگی گئی

تیرا فراق جان عیش تھا کیا میرے لیے  
یعنی تیرے فراق میں خوب شراب پی گئی

کہنی ہے مجھ کو ایک بات آپ یعنی آپ سے  
آپ کے شہر و وصل میں لذت بھر بھی گئی

ان کی گلی سے اٹھ کر میں آن پڑا تھا اپنے گھر  
ایک گلی کی بات تھی اور گلی غلی گئی

تیرے وصال کے لیے اپنے کمال کے لیے  
حالت جان کہ تھی خراب اور خراب کی گئی

اس کی امید ناز کا مجھ سے یہ مان تھا کیا آپ  
عمر گزار دیجیے، عمر گزار دی گئی

تم نے بہت شراب پی اس کا سب ہی کو دکھائے تھیں  
اور جو دکھ ہے وہ یہ ہے تم کو شراب پی گئی



### فرزانہ کوثر

جب کوئی بہت اپنا اذہم سفاکی و بے اعتنائی کا  
مظاہرہ کرے تو آنکھوں سے جھلکتا دکھ اور دل میں چلتی  
خوش فہمیاں انسان کو کنارے نہیں لگنے دیتیں۔ اسی  
کیفیت کو بیان کرتی احمد فراز کی یہ غزل۔

تیسرا قرب ہے نہ بادہ ہے، کیا کیا جائے  
پھر آج دکھ بھی زیادہ ہے، کیا کیا جائے

کچھ اپنے دوست بھی ترکش بدوش پھرتے ہیں  
کچھ اپنا دل بھی کشادہ ہے، کیا کیا جائے

نہ ان سے ترک تعلق کی بات کر پائیں  
نہ ہمدی کا ارادہ ہے، کیا کیا جائے

وہ مہرباں ہے، مگر دل کی حرص بھی تو کم ہو  
طلب کرم سے زیادہ ہے، کیا کیا جائے

ہمیں بھی عرض تمنا کا ڈھب نہیں آتا  
مزاج یار بھی سادہ ہے، کیا کیا جائے

سلوک یار سے دل ڈوبنے لگا ہے فراز  
مگر یہ محفل اعداء ہے، کیا کیا جائے

### سیدہ نسبت نہرا

میری ڈاڑھی میں تحریر جون ایلیا کی یہ خوبصورت

کو ملایا اور فرمایا کہ ان سوالات کے جوابات لکھ دیں۔  
سیدنا عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے جوابات تحریر فرمادینے۔  
پہلا جواب جو دونوں بھائی ایک دن ایک ہی  
وقت پیدا ہوئے اور دونوں کی وفات بھی ایک ہی  
دن ہوئی اور ان کی عمریں سو سال کا فرق۔ یہ بھائی  
سیدنا عذر علیہ السلام اور ان کے بھائی تھے۔ یہ  
دونوں بھائی ایک ہی دن ایک ہی وقت ماں کے  
بطن سے پیدا ہوئے ان دونوں کی وفات بھی ایک

ہی دن ہوئی۔ لیکن بیچ میں سیدنا عذر علیہ السلام کو  
اپنی قدرت کاملہ دکھانے کے لیے پورے سو سال مارے  
دکھا۔ سو سال موت کے بعد اللہ تعالیٰ نے زندگی بخشی۔  
سودا آل عمران میں یہ ذکر موجود ہے: ”وہ گھر گئے پھر کچھ  
عرصہ مزید زندہ رہ کر حلت فرمائی“ دونوں بھائیوں کی  
وفات بھی ایک ہی دن ہوئی۔ اس لیے سیدنا عذر  
علیہ السلام کی عمر اپنے بھائی سے چھوٹی ہوئی اور ان کی عمر  
سو سال بڑی ہوئی۔ دوسرا جواب وہ زمین سمندر کی  
کھاڑی قلمزم کی تہہ ہے جہاں فرعون عرق ہوا تھا۔  
سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے معجزے سے دریا خشک ہوا  
تھا۔ حکم الہی سے سورج نے بہت جلد سکھایا۔ سیدنا موسیٰ  
علیہ السلام مع بنی اسرائیل پار چلے گئے۔ اور جب فرعون  
اور اس کا لشکر داخل ہوا تو وہ عرق ہو گیا۔ اس دن میں  
پر سورج ایک دفعہ لگا پھر قیامت تک بھی نہ لگے گا۔  
تیسرا جواب جس قیدی کو قید خانہ میں سانس لینے کی  
اجازت نہیں اور وہ بغیر سانس لیے زندہ رہتا ہے،  
وہ بچہ ہے جو اپنی ماں کے شکم میں قید ہے غلط فہمی  
نے اس کے سانس لینے کا ذکر نہیں کیا اور نہ وہ سانس  
لیتا ہے۔

چوتھا جواب وہ قبر جس کا مردہ بھی زندہ اور قبر  
بھی زندہ۔ وہ مردہ سیدنا یونس علیہ السلام تھے اور  
ان کی قبر چھلی تھی جو ان کو بیٹھ میں رکھے جگہ پھرتی  
تھی یعنی سیر کرتی تھی۔ سیدنا یونس علیہ السلام اللہ کے  
حکم سے چھلی کے بیٹھ سے باہر آ کر عرصہ تک حیات  
دے پھر وفات پائی۔

نمرہ، اقرأ۔ کراچی

کر سکتا جتنی اس کی بات چیت۔  
۱۔ خوش آمدیدی ایک ”ماسٹر کی“ ہے۔ جس سے  
ہر نندہ وازہ کھولا جاسکتا ہے۔  
۲۔ انسان کی زندگی بھی پودوں جیسی ہوتی ہے۔ کچھ کو  
پانی دینے کے لیے اللہ تعالیٰ کسی کو راہ دکھاتے ہیں  
کچھ کو جنگل کے پودوں کی طرح خود سنبھالتے ہیں۔  
سیدہ نسبت نہرا۔ کہروڑ پکا

سیدنا عبد اللہ بن عباسؓ کا فہم دین،  
امیر المؤمنین سیدنا عمرؓ اکثر اوقات سیدنا عبد اللہ  
بن عباسؓ سے کبھی مسائل پوچھتے رہتے تھے۔ سیدنا عبد اللہ  
بن عباسؓ رضی اللہ عنہ کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا  
تھی: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے حضور دعا  
فرمائی کہ اے اللہ! عبد اللہ بن عباسؓ کو کتاب اور حکمت سکھا  
دے۔ اس دعا کی بدولت سیدنا عبد اللہ رضی اللہ عنہ کی  
علمی استعداد بہت خوب تھی۔

ایک دفعہ ایک نصرانی بادشاہ نے چند سوالات لکھ کر  
سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجے۔ ان کے جوابات  
آسمانی کتابوں کی رو سے دینے کا مطالبہ کیا۔ سوالات  
درج ذیل ہیں۔

پہلا سوال ایک ماں کے شکم سے دو بچے ایک  
دن ایک ہی وقت پیدا ہوئے۔ پھر دونوں کا انتقال بھی  
ایک ہی دن ہوا۔ ایک بھائی کی عمر سو سال بڑی اور دوسرے  
کی سو سال چھوٹی ہوئی۔ یہ کون تھے؟ اور ایسا کس طرح ہوا؟  
دوسرا سوال وہ کون سی زمین ہے کہ جہاں ابتدا  
سے قیامت تک صرف ایک دفعہ سورج کی کرنیں لگیں،  
نہ پہلے بھی لگی تھیں نہ آئندہ کبھی لگیں گی؟

تیسرا سوال وہ کون سا قیدی ہے جس کو قید خانہ میں سانس  
لینے کی اجازت نہیں اور وہ بغیر سانس لیے زندہ رہتا ہے؟  
چوتھا سوال وہ کون سی قبر ہے جس کا مردہ بھی زندہ  
اور قبر بھی زندہ اور قبر اپنے مدفن کو سیر کرتی پھرتی تھی۔  
پھر وہ مردہ قبر سے باہر نکل کر کچھ عرصہ زندہ رہ کر وفات  
پایا۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے سیدنا عبد اللہ بن عباسؓ سے





مسز نگہت غفار کراچی صبا کراچی  
تجھے حواس کی آوارگی کا علم کہاں  
کبھی میں تجھ کو تیرے سامنے تلاش کروں  
کبھی چپ رہوں بھی بے وجہ ہنس پڑوں محنت  
اسے گواہ کر عجب حوصلے تلاش کروں  
کنز شاپن آخون باندی  
چاند بھی کھو یا کھو یا سامنے تیرے بھی خواہید ہیں  
آج فضائے تو جھل بن سے لہجے بھی سنجیدہ ہیں  
اس بستی میں ایک شہر کے جس سے ہم گرفت ہے  
اس کے نیچے پگڈنڈی ہے جس کے ہم گرویدہ ہیں  
خاسم اعوان آخون باندی  
کچھ خوشی کے سائے ہیں، اور کچھ غم کے ساتھ ساتھ  
زندگی کٹ ہی گئی انجمنوں کے ساتھ ساتھ  
کاش پھر سے لوٹ آئیں، وہی بچپن کے دن  
بھاگنا پھولوں کی خاطر، تیلوں کے ساتھ ساتھ  
فضہ اکبر علیزے شاہ سرگودھا  
جو تیرا نصیب تھا تجھے مل گیا جوں نہ سکا تیرا نہ تھا  
تیرا دل یہ رمز سمجھ گیا تو کوئی کمی نہ تھری لائے گی  
امبر عارف کراچی  
پاؤں نگار جس میں ہوئے، وہ سفر نہ تھا  
جس گھر میں عمر کٹ گئی، وہ میرا گھر نہ تھا  
تنہا یوں کے دست تھے، بیگانگی کی دھوپ  
میں جل رہا تھا اور کوئی چارہ گر نہ تھا  
نسیم احمد مغل حیدر آباد  
خود سے روٹھوں تو کئی روز نہ خود سے بولوں  
پھر کسی درد کی دیوار سے لگ کر رولوں  
تو سمند رہے تو پھر اپنی سخاوت بھی دکھا  
کیا ضروری ہے کہ میں بیاس کا دامن کھولوں

مدیر نورین مہک برنالی  
محبت آزمائی ہو فقط اتنا ہی کافی ہے  
ذرا سا دھڑک کر دیکھنا کون آتا ہے  
نخبہ اکرم گھاٹل کوئٹہ  
لحاظ عشق نہ ہوتا تو تجھ سے رنجش ہوتی  
شکایت صرف یہ ہے کہ تو سمجھا نہیں مجھ کو  
عارف ارشد لیاری کراچی  
اُس سے کب ہم نے ملاقات کا وعدہ چاہا  
دُور رہ کر اُسے اور زیادہ چاہا  
یاد آتا ہے کچھ اور بھی شہرت سے  
محوں جانے کا اُسے جب بھی ارادہ چاہا  
سمیرا یوسف کراچی  
بڑے اسرار پوشیدہ ہیں اس تنہائی پسندی میں  
یہ ممت سمجھو کہ دیوانے جہاں دیدہ نہیں ہوتے  
تجربہ کچھ نہیں مجھ کو کہ دنیا مجھ سے ناخوش ہے  
بہت سے لوگ دنیا میں پسندیدہ نہیں ہوتے  
سلٹی بانو کراچی  
ہر اک بار سوچ کے دل بھر آیا ہے  
اپنی عمر میں کیا کھو یا کیا پایا ہے  
مسکان قریشی ملتان  
اپنی اپنی انا کے قیدی تھے  
ہمارے بیچ کوئی دوسرا نہ تھا  
ادم کمال فیصل آباد  
آئیں ہیں سرخ ہونٹ سیاہ زرد ہیں  
ہر شخص جیسے میرے قبیلے کا فرد ہے  
جب میں نہ تھا تو میری وفاؤں میں دھم تھی  
اب میں ہوں اور سارے زلے کا درد ہے  
سمیرا احمد جھنگ  
اپنا گھر لے کے کہیں اور نہ جایا جائے  
گھر میں بکھری ہوئی چیزوں کو سمجایا جائے  
گھر سے مسجد ہے بہت دُور چلو یوں کر لیں  
کسی روتے ہوئے بچے کو ہنسا یا جائے

# شاہینا

بہنوں کا اپنا ماہنامہ  
لاہور

جون 2014 کا شمارہ شائع ہو گیا ہے  
جون 2014 کے شمارے کی ایک جھلک

- ☆ "ایک دن حنا کے ساتھ" میں "شگفتہ شاہ" کے شبِ روز
- ☆ "دل کی اداس نگری میں" فرحت مران کا مکمل ناول
- ☆ "ابھی کچھ دل باقی ہے" مزہ نواز کا مکمل ناول
- ☆ "تعلیٰ کا آشیانہ" مہک قاسم کا ناول
- ☆ "کاسہ دل" سندس جیل کا ناول
- ☆ حیات نگاری، ہمشہ بان، قرۃ العین رائے، نسیم بکینہ
- ☆ اور قرۃ العین ہاشمی کے افسانے
- ☆ "اٹک جہاں اور سے" سدرۃ المنتہی کا سلسلہ دار ناول
- ☆ "تم آخری جزیرہ ہو" ام مریم کا سلسلہ دار ناول



اس کے علاوہ پیارے نئی شے کی پیاری باتیں، انشاء نامہ شہزاد کی دنیا کی  
طلو، مصنفین سے عید سروے اور وہ سب کچھ جو آپ پڑھنا چاہتے ہیں

جون 2014 کا شمارہ آج ہی اپنے قریبی  
بک اسٹال سے طلب کریں





(ایسا کون سا رنیلٹی شو ہے جو دن رات...؟)  
ریکارڈنگ مکمل کروانے کے بعد نئے پروجیکٹس پر  
کام شروع کروں گی۔ (ہاں جب تک شاید کوئی "سچ" کی  
آفر آئی جائے) لیکن ہم بھی چاہتے ہیں کہ آپ کا یہ  
رنیلٹی شو (خفیہ) جلد منظر عام پر آئے۔

### مقبولیت

شعیب اختر کا کرکٹ کیریئر تو ختم ہو گیا لیکن ان کی  
مقبولیت میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ وہ بی وی پروڈیو  
دار بصرے تو کرتے ہی ہیں، لیکن فی الحال وہ پہنچے  
ہوئے ہیں ممبئی جہاں وہ ایک رنیلٹی ٹی وی شو میں  
حصہ لے رہے ہیں۔ شعیب فخر خان اور انو ملک کے ساتھ  
اس پروگرام میں پنج گے فرائض انجام دے رہے ہیں۔  
(اب ہمارے کرکٹرز دوسرے ملکوں میں جا کر می کر رہے  
ہیں) شعیب اختر نے اپنی تیز رفتاری (یعنی چرب  
زبانی) سے بھارتی شائقین کو بھی اپنا گرویدہ بنا لیا۔  
شعیب اس موقع پر پروگرام میں حصہ لینے والوں کی  
کارکردگی سے بھی بہت متاثر ہوئے (کہنے میں کیا جانا  
ہے)

مقابلے میں مختلف انداز میں پیش کریں گے۔ (مثلاً)  
کیا مختلف حیرت ہے میرا اور حال ہی میں وینا ملک کا  
انجام دیکھ کر بھی آپ کو یہ خوش فہمی ہے۔

### خفیہ

لیجئے جناب۔! آج کل اداکارا لیلیٰ ایک رنیلٹی شو  
کی ریکارڈنگ میں مصروف ہیں (کیوں بھی مارننگ شو  
سے کیا چھٹی ہی ہو گئی؟) لیلیٰ کہتی ہیں کہ وہ ایک  
رنیلٹی شو کی بجائے (آہم۔!) کی حیثیت سے ریکارڈنگ  
کرا رہی ہیں۔ جس میں پاکستان کے مختلف شہروں  
سے نوجوان حصہ لے رہے ہیں۔ جن کی ڈانس  
پرفارمنس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے ملک میں  
حقیقی معنوں میں ٹیلنٹ موجود ہے (لیلیٰ کی ججمنٹ  
اور ٹیلنٹ کی تلاش۔ کیا مذاق ہے بھی) اگر  
نوجوانوں کو اچھا پلیٹ فارم مہیا کیا جائے تو وہ اپنا نام  
روشن کر سکتے ہیں (موسم بتی جلا کر...؟) ان کا مزید کہنا  
ہے کہ مجھے مختلف فلموں اور ٹی وی پروجیکٹس کے  
لیے آفرز ہوئی ہیں (خواب میں؟) تاہم (آہم) فی الحال  
دن رات رنیلٹی شو کی ریکارڈنگ میں مصروف ہوں



### آٹم نمبر

سارہ لورین (بھٹی اپنی مونا لیزا) انتہائی صبر اور  
خاموشی کے ساتھ بولی ووڈ میں اپنے لیے جگہ بنا رہی  
ہیں۔ بھارتی فلم "برکھا" کے بارے میں خبر ہے کہ  
سارہ کو انیس بڑی نے اپنی آنے والی فلم "ویلم بیک"  
میں ایک آٹم نمبر کے لیے بھی منتخب کر لیا ہے۔ (بس  
اس حد تک ہی اہمیت دیتے ہیں وہ ہماری ہیروئنوں کو)  
بقول سارہ لورین "میں نے اس گانے کی ویڈیو تو ریکارڈ  
کرا دی ہے، لیکن مجھے اسے پروڈیو کرنے کی بے  
چینی ہو رہی ہے (پروڈیو پر آنے کے بجائے آپ کا  
آٹم سوئنگ پروڈیو میں ہی رہتا تو زیادہ بہتر نہ تھا؟)  
کیونکہ انیس بڑی نے وعدہ کیا ہے کہ وہ انیس پہلے کے



## خبریں و بیک

### واصفہ بیل



### مسک

ادا کارہ نشو سحر لودھی کی فلم "موسم" میں ایک  
اہم کردار ادا کر رہی ہیں (دیکھا! چونک گئے نا آپ بھی  
کہ نشو اور سحر کی فلم...؟) جس کی شوٹنگ گزشتہ  
دنوں لاہور کے مقامی فارم ہاؤس میں شروع ہو گئی  
ہے۔ اس فلم کو لکھا ہے (ہمیشہ کی طرح) پروڈیو "میں نے"  
اور ہدایت کار عرفان بتائے جاتے ہیں۔ فلم کے ہیرو  
سحر لودھی خود ہیں (اپنی فلم میں کون کسی اور کو لیتا ہے  
بھٹی) دوسری طرف۔ نشو کا کہنا ہے کہ وہ معیاری اور  
دلچسپ کردار دیکھ کر فلم سائن کرنے پر آمادہ ہوئی ہیں۔  
(مل گیا۔ یہی بڑی بات ہے آپ کے لیے) نشو کا مزید  
کہنا تھا کہ "موسم" کی ٹیم اور سحر کی صلاحیت (کیا  
واقعی؟) دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مستقبل میں سحر  
لودھی ایک کامیاب ہیرو ثابت ہوں گے۔ (ہااا...؟)





نادیہ خاتون



خط بھجوانے کے لیے پتا

خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

Email: info@khawateendigest.com  
khawateendigest@hotmail.com

گسار رہے ہیں، وہ صرف یہی ڈائجسٹ تھے ورنہ اس دنیا کی چھٹی ہوئی باتیں تو نجانے کب کا ختم کر چکی ہوتیں مجھے۔ میں شکر یہ ادا کرتا چاہوں گی آپ کا کہ آپ نے بہن سعدیہ اعوان گاؤں بوتالہ جھنڈا سنگھ کے خط کے جواب میں یہ لکھا۔

(کہ گاؤں کے گورنمنٹ اسکول میں اساتذہ حاضری لگانے بھی نہیں آتے) اور آپ کا جواب پڑھ کر مجھے لگا کہ مجھے بھی خط لکھنا چاہیے۔ میں عرصہ دس سال سے گاؤں کے گورنمنٹ پرائمری اسکول میں بیچر ہوں صرف میں ہی نہیں بلکہ میری تین اور بہنیں بھی پرائمری اسکول بیچر ہیں ہم سب اعلا تعلیم یافتہ ہیں ایک عورت ہونے کے ناتے ہمیں کنونٹس پر اہل علم اور دوسرے پر اہل علم کا بھی سامنا رہا لیکن ہم نے یہ عزم کیا تھا کہ ہم اپنی جاب کو پوری ایمان داری کے ساتھ سرانجام دیں گے۔ باوجود اس کے کہ گاؤں

عالیہ بتول سے حویلی بہادر شاہ

ماڈل رانیہ کافی اچھی لگ رہی ہے۔ عنیزہ سید تو اچھا لکھ ہی رہی ہیں۔ عفت سحر نے بھی کمائی کو آگے بڑھانا شروع کر دیا ہے۔ تنزیلہ ریاض کا عہد الست بھی اس دفعہ اچھا لگا، مطلب کچھ تیز ہوا۔ ناول نایاب جیلانی کے بارے کیا کہوں، تعریف کے لیے الفاظ کم ہیں۔ بہت خوب صورت تحریر لکھی ہے۔ عدیل نے جس طرح ماسن کو جواب دیا تھا اس کے سوال کا کتنی محبت کرتے ہو اور جتنے بے اس نے لگائے خوب مزا آیا پڑھ کر لیکن ماسن کی جذباتیت اچھی نہیں لگی اور عفتیہ نے تو بالکل اچھا نہیں کیا تھا۔ محبت کا بہتر رویہ مہدی کا بھی اچھا تھا۔ زندگی ہو تم صدف آصف کی تحریر بھی دل کو بھائی اگر خوش بخت نے خاموش رہ کر اپنی ساس اور شوہر کے دل میں جگہ بنائی تو ساس نے بھی بے وجہ ٹانگ نہیں اڑائی۔ تب ہی تو دونوں خوش رہیں۔ روشنی عانتہ فیاض کا کافی اچھا افسانہ تھا ہندی کمائی بھی مزے کی تھی۔

ج : عالیہ! آپ تو ہماری پرانی قاری ہیں اور ہمیں باقاعدگی سے خط لکھتی رہی ہیں۔ پچھلے ماہ آپ کا خط شامل نہیں ہو سکا۔ اس کا ہمیں افسوس ہے۔ خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

ارم ریاض سے کلاوال ریتالہ خورو

جیسے ہی خواتین ڈائجسٹ ہاتھ میں آتا ہے دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیتا ہے۔ دل خود بخود تعریف پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اتنی اچھی اور سبق آموز تحریریں ہوتی ہیں کہ دل چاہتا ہے پڑھتے رہیں۔ تمام سلسلے میرے موسٹ فیورٹ ہیں۔ سب سے پہلے جو افسانہ بہت پسند آیا وہ تھا ”زندگی ہو تم“ بہت خوب صورت تحریر جس سے بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ باقی افسانے بھی بہت اچھے اور سبق آموز تھے۔

ج : پیاری ارم! آپ کے خطوط شامل نہ ہو سکے اور آپ کو دکھ ہوا اس کے لیے معذرت خواہ ہیں۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

شازیہ رحمان غوری سے کمروڑ پکا

میں نے اپنی زندگی میں بہت سی پریشانیوں اور غموں کا سامنا کیا ہے لیکن اس ذات پاک کی مہربانی اور میری پیاری اہلی کی بے پناہ محبت کے بعد جو میرے بہترین دوست اور عم

پچھ ادھر ادھر سے

بغل میں چھری منہ پر رام رام جیسا محاورہ نریندر مودی اینڈ کمپنی کے لیے تراشا تھا۔ گزشتہ ماہ دہلی میں ہونے والے مشاعرے میں کراچی کی شاعرہ رحمانہ روجی نے کتنی خوب صورت بات کہی تھی۔

بظاہر دوستی یاری بہت کی، ہماری دل داری بہت کی محبت تو نہیں کی اس نے، محبت کی اداکاری بہت کی (منصور اصغر راجسہ بے نیام)

☆ کراچی کی سخت جانی حیرت انگیز ہے۔ شدید ترین ہنگامہ آرائی اور خون ریزی کے بعد جس طرح یہ شہر دوبارہ معمول کے مطابق زندگی کی طرف لوٹ جاتا ہے یہ حیرت انگیز ہے۔

(سابق امریکی سفیر) ☆ مقدمہ کے سائل کے لیے سب سے آسان طریقہ ہے کہ اگر جج پسند نہ آئے تو اسے گالیاں دے دیں اور پھر کہہ دیں کہ جج متعصب ہے۔

(جسٹس ایس خواجہ) ☆ مجھے ایک بار بھارت کے دارالحکومت ممبئی جانے کا اتفاق ہوا اور میں یہ دیکھ کر وحشت زدہ ہو گیا کہ بلا مبالغہ لاکھوں مرد، عورتیں اور بچے فٹ پاتھوں پر تنگ دھڑنگ سوئے ہیں۔ میں نے اپنے رب کا شکر ادا کیا تھا کہ ایسا منظر پاکستان میں کہیں نہیں دیکھا اور ہمارے لوگ کہیں بہتر زندگی بسر کر رہے ہیں۔

(الطاف حسن قریشی۔ صورت حال) ☆ یہ قوم اور اس کے ”آزاد“ صحافی جنرل مشرف کے خلاف تو نہیں کھڑے ہوئے، جس نے امریکی احکامات پر محسن قوم قدیر خان کو جھوٹے الزامات لگا کر ذلیل کیا اور جان سے مارنے کی دھمکیاں دے کر ان سے اقرار جرم کروایا۔

(کڑواج۔ نیزیدی واشنگٹن)

☆



ڈر

گلوکار جواد احمد نے سیاست میں آنے اور سیاسی پارٹی بنانے کی تردید کرتے ہوئے کہا ہے (یعنی خبر سچی ہے!) کہ کچھ لوگوں نے ایسے ہی یہ خبر اڑادی کہ میں نے یوم مٹی پر سیاسی پارٹی بنانے کا اعلان کیا ہے۔ جب کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے تو صرف ”برابری“ کے نام پر ایک تحریک چلانے کا اعلان کیا ہے جو کہ میری تنظیم انٹرنیشنل یوتھ اینڈ ورکرز موومنٹ چلائے گی۔ (وجہ تو فرق کیا ہے اس میں؟) کیونکہ ہم سمجھتے ہیں پاکستان میں غریبوں، مزدوروں اور کسانوں کو اپنی آواز بلند کرنے کے لیے ایک سیاسی عمل شروع کرنے کی اشد ضرورت ہے ورنہ انہیں ان کے حقوق کبھی نہیں ملیں گے۔ (تقریر بھی پکی سیاسی کرڈالی اور کہتے ہیں۔) پتا نہیں جواد احمد آپ اس بات کو اتنا خفیہ کیوں رکھ رہے ہیں۔ بھی جب ارادہ کر لیا تو چھپانا کیسا؟ آخر ابراہیم الحق بھی تو بٹانگ دہل تحریک انصاف میں شامل ہو چکے ہیں۔ تو آخر آپ ”کس“ سے ڈر رہے ہیں۔



کے لوگ ہم سے تعاون نہیں کرتے۔ ان کا کہنا ہے کہ علم حاصل کرنے سے کون سا ان کی غریبیت ختم ہو جائے گی؟ آپ یقین کریں کہ ہم نے بہت سی مشکلات سہی ہیں اس جانب میں۔ میرے ابو بھی اس شعبے سے منسلک تھے اور مجھے خوشی ہے کہ آج میرے پڑھائے ہوئے اسٹوڈنٹس کالج میں زیر تعلیم ہیں حالانکہ پسماندہ علاقے کا وہی دو کمروں کا اسکول ہے غریب بچے ہیں جو یونیفارم پہن کر بھی نہیں آتے، بچوں کے منہ تک دھلے ہوئے نہیں ہوتے، ہم شہر سے ٹائم پر اسکول پہنچ جاتے ہیں لیکن بچے بہت لیٹ اسکول آتے ہیں حالانکہ سب کے گھر نزدیک ہیں اور روزانہ یہ ہماری ڈیوٹی ہوتی ہے کہ ہم بچوں کو گھروں سے بلاتے ہیں کہ اسکول آئیں اور جیب میں سے اسکول جو آٹن کیا تھا تو چار دیواری تک نہیں بھی شاید آپ میری باتوں سے میری مشکلات کا کچھ اندازہ لگا سکیں کہ گورنمنٹ اساتذہ کئی مشکلات سے اپنے فرائض سر انجام دے رہے ہیں اور لوگوں کی سوچ جو گورنمنٹ اسکولوں کے بارے میں بن چکی ہے اس میں تبدیلی آجائے۔

ج: پیاری شاذیہ! طوالت کی وجہ سے ہم آپ کا پورا خط شامل نہیں کر سکے بہت اچھا خط لکھا ہے آپ نے۔ تحریر مربوط، رائٹنگ بہت خوب صورت، اندازہ کر سکتے ہیں کہ آپ بہت اچھی استاد ہوں گی۔ بہت اچھی بات ہے کہ آپ علم کی اہمیت کو سمجھتی ہیں اور اپنے فرائض کو بھی کسی بھی شعبہ کے بارے میں اظہار خیال کیا جاتا ہے تو وہ وہاں کی اکثریت کو دیکھ کر کیا جاتا ہے۔ ہمارا مطلب یہ نہیں تھا تمام پچھڑ غریبہ دار اور کام چور ہیں۔ یقیناً ان میں بہت سے اچھے لوگ بھی ہوں گے جو اپنے فرائض ذمہ داری سے انجام دیتے ہوں گے۔ آپ نے گاؤں کے لوگوں کی حالت اور تعلیم سے عدم دلچسپی کے بارے میں جو لکھا وہ درست ہے لیکن یہ بھی تو دیکھیں کہ آپ نے اس دو کمروں کے اسکول میں جس کی چھت بھی نہ تھی۔ ذمہ داری سے اپنا فرض نبھایا اور ان لوگوں کو تعلیم دی جو پڑھائی میں دلچسپی نہیں رکھتے تھے تو آج اس گاؤں کے بچے جو آپ کے شاگرد رہے ہیں۔ کالج میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اس کا مطلب تو یہی نکلتا ہے کہ اگر استاد اپنے فرائض ذمہ داری سے ادا کریں تو وہ لوگ ذہانت میں کسی

سے کم نہیں ہیں۔ وہ پڑھ سکتے ہیں۔

نخبہ اکرم۔ گاؤں کو کیلی گجرات

بہت سی پریشانیوں نے گھیرا ہوا تھا جس کی وجہ سے میں پچھلی دفعہ خط نہ لکھ سکی۔ میری تمام پریشانیوں کا حل مجھے خواتین ڈائجسٹ اور شعل سے ملتا ہے یہ میرے استاد ہیں۔

آئی جی سب سے پہلے تو میں نے یہ بتانا ہے کہ میرے دو نام ہیں۔ زونہ اکرم، نخبہ اکرم۔ زونہ اکرم میرا جڑوا نام ہے۔ خاندان میں سب مجھے اسی نام سے جانتے ہیں اور میری اسکول کی فرینڈز بھی۔ میں جامعہ میں پڑھتی رہی ہوں اور ہر نسل صاحبہ نے میرا نام نخبہ رکھ دیا تو سب نخبہ ہی بلانے لگ گئے۔ آج میں اپنے پیارے سے گاؤں کو کیلی کے بارے میں بتانا چاہتی ہوں الحمد للہ رب باری تعالیٰ نے ہمارے علاقے کو ہر قسم کی سہولت سے نوازا ہے یہ دریائے چناب کے کنارے واقع ایک بہت بڑا اور خوب صورت گاؤں ہے یہاں پر ضروریات زندگی کی ہر چیز دستیاب ہے۔ یہاں کے لوگ پڑھے لکھے باشعور ہیں اور تعلیم کی اہمیت سے آگاہ ہیں اسی لیے یہاں لڑکوں کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کی تعلیم پر بھی بہت زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ لڑکیوں کے لیے گورنمنٹ گرلز کالج ہے جہاں پر لڑکیاں ایف اے تک تعلیم حاصل کرتی ہیں گورنمنٹ گرلز اینڈ بوائز اسکول کے علاوہ یہاں پر بہت سے پرائیویٹ اسکول بھی قائم ہیں۔ اس کے علاوہ ہمارے گاؤں میں دینی مدارس بھی ہیں۔ گیس اور وائرسٹائی کی سہولت بھی ہے ہمارے گاؤں کی سڑکیں کشادہ اور پکی ہیں۔ یہاں کے لوگ مہمان نواز اور مہنتی ہیں۔

آئی جی اک لڑکی خط لکھتی تھی سونیا ربانی قاضیاں سے اب وہ گیارہویں نہیں لکھتی۔ رہ نور دشتی، پڑھا فکرتا پیارا لکھتی ہیں ہماری لکھاری بہنیں۔ گل افشاں رانا کتنا اچھا لکھتی ہیں آپ۔ کتنا اچھا بولتی ہیں آپ، بہت دکھ ہوا جب یہ پڑھا کہ میں پچھلے دس سال سے اپنے پاؤں پر چلنے کی عظیم نعمت سے محروم ہو چکی ہوں۔ آنکھوں میں آنسو آگئے۔

ج: پیاری نخبہ! آپ کے گاؤں کے بارے میں جان کر دل خوشی ہوئی۔ اگر بڑے شہروں کی طرح دیہی علاقے کی ترقی پر توجہ دی جائے وہاں روزگار کی سہولیات مہیا ہوں تو

ملک تیزی سے ترقی کر سکتا ہے۔ خصوصاً پنجاب حکومت نے جو پکی سڑکیں بنانے پر توجہ دی ہے اس سے علاقوں میں بہت بہتری آئی ہے۔ آپ کے گاؤں میں لڑکیاں بھی تعلیم حاصل کر رہی ہیں یہ بہت خوش آئند بات ہے۔ ایک لڑکی کی تعلیم ایک گنہ کی تعلیم ہے۔ شعل کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

عائشہ خان۔ ٹنڈو محمد خان

ٹائٹل بہت پیارا لگا، ہر چیز پرفیکٹ، ماڈل کلر کبھی نیشن سب اچھا لگا۔

آبدیدہ ہو کر کرن کرن روشنی پڑھا۔ مجھے بہت رونا آیا کہ اللہ کی رحمت کتنی زیادہ ہے۔ رہ نور دشتی میں گل افشاں رانا کے متعلق پڑھ کر دکھ ہوا اور ان کے حوصلے کو داد بھی دی۔ آپ کا باورچی خانہ، رحمہ فریال ملک ویل ڈن، اب تک کے آپ کا باورچی خانہ کلبیسٹ تھا۔ ویلڈن رحمہ، تمہارے مزاجیہ اشائل کے ساتھ بہت مزا آیا۔ بابا ہا اور گو بھی گوشت کی ترکیب سن کر آپ کے شوہر کی حالت جو آپ نے بیان کی، مجھے بہت ہنسی آئی۔ افسانوں میں صدف آصف نمبر لے گئیں۔ دوسرے نمبر پر روشنی ہے۔ خبریں ویرس میں توبہ بھی واصفہ فلم اشار زبیا کو جو برجستہ جواب دیے۔ بے اختیار ہنسی آگئی۔ میری بیاض سے میں امبرگل، طیبہ نواز، شفاعت، بتول نین تارا کے شعر پسند آئے۔

ہمارے نام میں امبرگل حیات بخاری شاہدہ ظفر کا تفصیلی تبصرہ اچھا لگا، نسبت زہرہ اور (پچہ پارٹی) مریم سارہ ایشاع طوبی کی انٹری اچھی لگی۔ سزعلی کے اعتراض پر آئی جی کا جواب۔ ہمیں قائل ہونا ہی پڑا اور اقرار ملک تفصیل سے لکھا کرو۔ تنزیلہ ریاض کی بہترین موضوع پر لکھے گئے۔ ناول عمدت بہت زبردست چل رہا ہے۔ میرا تو دماغ مھوم گیا۔ بے چارہ بچہ صرف پڑھائی کرنا رہتا ہے۔ یہ ناول وہ ماں باپ ضرور پڑھیں جو اپنے بچوں کو جادوگر سمجھتے ہیں ان کے سر پر ایک ٹینشن طاری کر دیتے ہیں کہ ہر حال میں پوزیشن لالی ہے۔ سب سے اچھا جملہ صفحہ نمبر 100 پر (آسانیاں تلاش کرتے رہنے سے مشکلات بڑھتی ہیں اس لیے مشکلات کا حل تلاش کرتے ہیں، آسانیاں نہیں۔ واہ زبردست جملہ ہے۔

ج: پیاری عائشہ! تفصیلی تبصرے کے لیے شکریہ۔

ارم احمد۔ لاہ

مجھے سائرہ رضا صاحبہ کے بارے میں بات کرنا تھی۔ کیا کمال کا لکھتی ہیں۔

”عدل اور جرات“ کی تعریف نہ کرنا بے ایمانی ہوگی۔ بہت ہی پیاری اور صبر سے گندھی تحریر تھی۔ بہت سی جگہ آنکھوں میں آنسو بھی آئے اور دل سکڑ سا گیا مگر آخر میں عدل کو جزا مل ہی گئی۔ مامن اور یامن بہت منفرد نام تھے۔ اس کے مطلب کیا ہیں؟

عمدالت میں کردار بہت زیادہ ہو گئے ہیں۔ ملی کی کچھ سمجھ نہیں آ رہی کہ کون ہے وہ۔ عمر کا کردار بھی اچھا ہوا ہے۔ صرف زارا اور شہزاد کی ہی سمجھ آ رہی ہے۔ خیر وقت یہ پتا چل ہی جائے گا۔ ”کوہ گراں تھے ہم“ بس بھی بہت ہو گیا مسپنس۔ اب ختم ہو جائے تو اچھا ہے۔ ”ماہ تمام“ بہت ہی زبردست کہانی ہے۔ رضیہ مہدی صاحبہ نے ٹھیک ہی کہا ہے۔ محبت کا ہر عورت کو ہی آتا ہے۔ ماہ نور نے فیصلہ اچھا کیا۔ اسے بارہیے بدل انسان کو چھوڑی دینا چاہیے تھا۔

”بن ماگنی دعا“ میں ابھی تک میری دلچسپی ہی نہیں پیدا ہو سکی۔ معذرت کے ساتھ بہت ہی پرانا پرانا سناول لگ رہا ہے۔ سچ کہوں تو پسند ہی نہیں آ رہا۔ ساری شاعری کمال کی تھی۔ خواتین ڈائجسٹ کا انتخاب لا جواب ہوتا ہے۔

ج: پیاری ارم! کافی وقت کے بعد آپ کی آمد اچھی لگی۔ کوہ گراں تھے ہم اختتام پذیر ہے چند ہی اقساط باقی ہیں۔ مامن کے معنی ہیں امن میں رہنے والی اور یامن کے معنی ہیں دامن و اتھ والی۔

خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

سحر لغاری۔ ٹنڈو باگو

پہلے رسالہ پڑھنے پر بابا کچھ نہیں کہتے تھے۔ اب کہتے ہیں پڑھائی پڑھیان دو۔ ناول بعد میں بھی پڑھ سکتی ہو۔ اس لیے میں اپنے بابا سے ڈائجسٹ چھپ کر پڑھتی ہوں مگر ڈائجسٹ شہر سے لاتے میرے بابا ہی ہیں۔ بے نامزے کی بات۔

میں ناولوں اور افسانوں پر تبصرہ نہیں کروں گی کیونکہ



بہت دیر ہو رہی ہے کام اور بھی بہت ہیں پر اتنا ضرور کہوں گی ہے آئی کنیز نبوی سے ضرور لکھوا میں بلکہ ہر ماہ ان کی تحریریں شائع کریں۔ پلیز۔

ج : پیاری سحر خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ اس ماہ یعنی جون کے شائع میں کنیز نبوی کی تحریر شامل ہے۔

آپ کے بابا جان بہت اچھے ہیں وہ آپ کو ہر ماہ رسالہ لا کر دیتے ہیں۔ ان کا کہنا صحیح ہے آپ اپنی پڑھائی پر توجہ دیں۔ ٹائم مقرر کر لیں کہ روزانہ دو یا تین محنتیں صرف پڑھائی کرنا ہے۔ امتحانوں سے فراغت کے بعد رسالے پڑھیں۔ یا پڑھائی سے وقت بچے تو ذہن کو پرسکون کرنے کے لیے آپ مطالعہ کر سکتی ہیں۔

آئینہ جہنگ صدر

پیاری آئی! صرف میں ہی نہیں پورا خاندان ادب کا انتہائی اعلیٰ ذوق رکھنے والا "خواتین شائع" کا دیوانہ ہے۔ ہر گھر کی ٹیبل پر چھ سات رسالوں میں سے سب سے اوپر خواتین شائع نظر آتے ہیں ہماری پیدائش سے قبل ہمارے گھروں کی خواتین میں سب سے زیادہ چچا "خور" کا تھا ہم نے بھی پرانے "خور" پڑھے۔ عجیب روئاس تھا اس رسالے کا کہ آج تک ہماری بزرگ خواتین کو نہیں بھولا۔ بعد میں جب وہ رسالہ بند ہو گیا تو افسردگی کی ایک لہر تھی جس نے تمام خواتین کو اپنی لپیٹ میں لے لیا جائے گا۔ بیچ میں کئی رسالے آئے اور گئے ایک رسالہ کافی برس آتا رہا مگر اس کی جگہ شائع نے لے لی۔ جو دنیا کے ادب کا ہار دیا کرتا تھا اپنا معیار کھو بیٹھا۔

مگر اللہ آباد رکھے آپ سب کو کہ ڈائجسٹ کی ٹیبل پکڑ کر سنجیدہ ادب کی طرف موڑ دیا۔ اب خواتین تو خواتین مرد بھی اس رسالے کے شوقین بن گئے۔

پہلے رومانی کہانیوں کا غلبہ تھا اور یہ سچ ہے کہ رومانس میری ابتدائی ذاتی یادداشتوں میں نبیہ نقوی کا نام سب سے نمایاں ہے۔ میرے خوابوں کی آبیاری کا نام ایک اکھڑ مزاج مرد کو ایک نازک لڑکی کا اپنی شرافت سے تحیر کرنا دل کو بڑا بھاتا تھا۔ ان کی کئی کہانیاں پوری یاد ہیں۔

تین ناموں والی ایک خاتون جو سلسلے وار ناول بہت لکھتی تھیں؟ (رفعت ناہید سجاد؟ ایم سلطانہ فخر؟)

سوری مجھے کچھ بھی یاد نہیں آ رہا۔ "تحریک" ایک لمبے بالوں والی لڑکی کا سلسلہ وار ناول۔ جس کی منگیت کے خاندان سے کوئی رنجش ہوتی ہے۔ مرو بخاری کی ایک کہانی کبھی نہیں بھولتی۔ پوری یاد ہے ایک ایک بات۔ حنا، ثناء، بہنیں ہوتی ہیں زوہیب ان کا چھوٹا بھائی میٹرک کے بعد ان کے گھر پڑھنے کے واسطے آتا ہے۔ بے حد اچھی کہانی تھی۔ نہایت حقیقی۔

زہرہ ممتاز جنہوں نے آصف والا سلسلہ وار ناول لکھا اور اپنی نمایاں پہچان بنائی۔ اقبال بانو فاطمہ ثریا بجیا اگر میں غلط نہیں تو ہمارے ہی رسالے میں بہت شروع میں لکھا تھا۔ آیا (بانو قدسیہ) نے بھی کچھ کہانیاں لکھیں۔ لمبے سے وقفے کے بعد۔

امرتا پریم۔ یاسمین نشاط۔ سیما غزل، سیما مناف، رخ چوہدری بابا ملک (نہایت اسٹارٹ سی لڑکی) اور بہت ساری۔ کیا کسی پرانی رائٹری کوئی بیٹی بھی لکھ رہی ہے اور اگر ہے تو کون؟ بہت دل چاہتا ہے پرانے لوگوں سے ملنے کو۔ نجانے کیا کرتی ہوں کی آج کل۔؟ آئینہ مفتی موجودہ دور کی کافی دنوں سے غائب ہیں بے حد اچھا لکھتی ہیں۔ بہت پہلے ایک دفعہ ایک قسط میں ہو گئی رازی یا باری والی۔ اف جان یہ بن آئی۔ جھنگ کی ایک لڑکی جو آپ کو اکثر خط لکھتی تھی (سیدہ عابدہ عروج) اس سے رابطہ کیا کہ قسط بھجواؤ۔ فرمایا۔ میں تو لا بریری سے لے کر پڑھتی ہوں۔ وہ کوفت آج تک یاد ہے۔

اس زمانے میں رسالے کے ہر صفحے پر "خواتین ڈائجسٹ" نہیں چھپا ہوا ہوتا تھا اگر ابتدائی صفحات پھٹ جاتے تو رسالے ترتیب دینے بڑے مشکل لگتے تھے تب رسالے کسی متاع کی طرح سنبھال کر رکھتے تھے۔ اب تو خیر

لوگ نکلے ہی نہیں دیتے۔ سانگ جو بوہ گئی ہے کچھ بچیوں کی تعلیم میں بھی اضافہ ہوا ہے۔

ایک بری عادت جو شروع سے لے کر اب تک ہے نام بھول جاتی ہوں چہرے یاد رہتے ہیں اکثر شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

کہانی کا نام تو خیر میں بالکل پڑھتی ہی نہیں ہوں صرف رائڈ کا نام اور سامنے بنی تصویر دیکھتی ہوں۔ جنید انصاری تصویریں بے حد پسند تھیں زندہ جیتی جاتی اور بولتی تصویریں بعض تو فریم کروالینے کو جی چاہتا تھا پھر مومن کی

روئاس کی انفرادیت میں فرحت اشتیاق کا کوئی ثانی نہیں۔ آج کل سمیرا حمید اور سعیدہ ریس کا نام ڈھونڈتی ہوں۔

ایک افسانہ چند سال پہلے چھپا تھا "پھوپھی کھوئی گئی" کسی نیم پاگل عورت کا قصہ تھا جو کم ہو جاتی ہے بہت پر اثر تحریر تھی پتا نہیں۔ وہ لڑکی دوبارہ کیوں نہیں لکھ رہی؟ پھر سلیمان احمد جس کا ناول چھپا اور بے حد تنقید ہوئی مگر مجھے اچھی لگی تھی تحریر۔ بس کہانی کا ماحول ذرا مبہم تھا۔ یہ بات کسی حد تک سچ لگی (معذرت) کہ جو کچھ نہیں کرتے وہ تنقید کرتے ہیں۔

اباجی کو بشری سعید۔ بشری احمد بے حد پسند ہیں۔ "رقص طاؤس اور سفال گر" کو بہت سراہتے تھے۔

خواتین اور شائع اباجی اور چاچا جی سب شوق سے پڑھتے ہیں۔ نسخ ٹائٹل والے رسالے جب عینک لگا کر پروکار پورھے کر سبوں پر براجمان پڑھ رہے ہوتے ہیں تو بڑا اچھا لگتا ہے۔ ہمارے خاندان کے ہر گھر میں یہ رسالے باقاعدگی سے آتے ہیں لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ قسط مرس ہو جائے تو نہ وہ ہمیں رسالہ دیتے ہیں نہ ہم انہیں دیتے ہیں جانے کیوں مگر ایسا ہی ہے۔ خواتین ڈائجسٹ اب موجودہ ادب کا بادشاہ بن چکا ہے۔

ج : پیاری آئینہ! آپ کا خط اس بات کا عکاس ہے کہ واقعی آپ کے گھرانے میں رسائل بہت شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ جن پرانے رسالوں اور ناموں کا آپ نے ذکر کیا۔ اس نے بہت سی کہانیاں یاد دلادیں۔ تین ناموں والی افسانہ نگار ایم سلطانہ فخر تھیں جو اب اس دنیا میں نہیں اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے۔ پھوپھی جو کھوئی گئیں۔ یہ تحریر آدم جی انعام یافتہ مصنفہ رضیہ فصیح احمد کی تھی اور رقص طاؤس بشری سعید نے نہیں نگہت سیما نے لکھا تھا۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے پرچوں میں سیما غزل نہیں لپٹی غزل لکھتی تھیں۔ سیما غزل کا شاید کوئی ایک افسانہ شائع ہوا ہو۔ اسی طرح فاطمہ ثریا بجیا کی کوئی تحریر ہمارے ہاں کبھی شائع نہیں ہوئی۔

کسی مصنف کی بیٹی نے ابھی تک تو نہیں لکھا شاید آگے جا کر لکھیں۔

مسز کرن نعمان۔ نامعلوم شہر

سب سے پہلے میں نے خواتین پڑھنا شروع کیا تھا پھر

چند ماہ بعد شائع ان دونوں رسالوں کا جو معیار ہے وہ کسی اور رسالے کا نہیں۔ شائع کی طرح خواتین کے تمام سلسلے بھی مجھے پسند ہیں سب ہی شوق سے پڑھتی ہوں اور اس بار جو آپ نے "رہ نور شوق" میں نو عمر مصنفین سے سروے کیا وہ تو بہت ہی اچھا لگا خاص طور پر جو آپ نے سوال کیا کہ ادارہ خواتین کے علاوہ دیگر کن مصنفین کو پڑھتی ہیں؟ پسندیدہ کتابیں؟ اس بار کہانیوں میں سب سے پہلے عفت سحر طاہر کا "بن ماگنی دعا" پڑھا یہ ناول کافی اچھا جا رہا ہے۔ اس کے بعد تنزیلہ ریاض کا "عبد الست" پڑھا بہت بہت خوب صورت تحریر اور ایک کہانی میں 4 مختلف کہانیوں کو لے کر چلنا ایک ماہر رائٹر کا کام ہی ہو سکتا ہے۔

نایاب جیلانی کا "عدل اور جزا" اچھا تھا میرا خیال ہے بے جا طویل کر دیا گیا۔ ہمارے معاشرے میں عموماً "چچا نایا کی اولاد ایک گھر میں بل بڑھ کر جوان ہو جاتی ہے اور اکثر گھرانوں میں رشتے داریاں بھی بن جاتی ہیں۔ مجھے یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ نکاح کے بعد ڈاکٹر کبیر نے جوتی کو اس کی انھیال میں کیوں چھوڑا۔ چلو مانا نانی نہیں مان رہی تھی۔ پر ایک جگہ بتایا گیا کہ نانی نے کمادستور کے مطابق لے کر جاؤ ایسے نہیں بھیجوں گی تو ڈاکٹر کبیر لے آتے نکاح تو ہو چکا تھا پھر خالموں کے ساتھ کیوں چھوڑا۔ رضیہ ممدی کا "محبت کا ہنر" بھی اچھا تھا۔

ج : کرن! آپ کا بہت شکریہ۔ ہماری کوشش تو یہی ہوتی ہے کہ خواتین اور شائع کا معیار برقرار رکھ سکیں۔ کئی بیٹی البتہ ضرور ہوتی رہتی ہے۔ نایاب جیلانی کے ناول میں آپ کا اعتراض بجا ہے ناول کے کردار بھی ہماری اور آپ کی زندگیوں سے لیے جاتے ہیں۔ جس طرح ہم سے غلطیاں کو تاہیاں ہوتی ہیں۔ اسی طرح وہ بھی غلطیاں کرتے ہیں۔ ڈاکٹر کبیر نے ایک نہیں کئی غلطیاں کیں جن کی بنا پر جزا کو بہت سے کٹھن مراحل سے گزرنا پڑا۔ جہاں تک آپ کے سوال کا تعلق ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ نانی یہ چاہتی تھیں کہ ڈاکٹر کبیر باقاعدہ بارات لے کر آئیں اور جزا کو رخصت کر کے لے جائیں۔ ڈاکٹر کبیر نہیں چاہتے تھے کہ اس چکر میں ان کے بیٹے کی تعلیم متاثر ہو اس لیے وہ عدل کی تعلیم مکمل ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔

ثناء اقبال۔ اسلام آباد







پہلی قسط میں پتا چل گیا تھا۔ بہر حال عفت جی بہت ہی اچھا لکھ رہی ہیں۔ تنزیلہ ریاض کا ”عبدالست“ مکمل ناول بھی اچھا جا رہا ہے نایاب جیلانی تو میری فیورٹ رائٹر ہیں۔ ان کا ”عدل اور جزا“ مکمل ناول بہت اچھا لگا۔ نایاب جی ہر ماہ لکھتی رہا کریں ہمیں آپ کی کہانیاں بہت پسند ہیں۔ پیاری نایاب! خواتین کی پسندیدگی کے لیے تمہ دل سے شکریہ۔

ایبہا سلوی، شمو الماس۔ شاہ والا تحصیل سمبڑیال خواتین سے ہمارا تعلق تقریباً ”دس سال پر مبنی ہے۔ اور سب سے مزے کی بات یہ ہے کہ ہم سب فرینڈز مل کر رسالہ پڑھتی رہیں اور دکھ کی بات یہ ہے کہ جب میرے نوے گور رسالے کی حالت میری دوستوں کے ہاتھوں تباہ ہوتی ہے تو غصے سے میری حالت رسالے سے زیادہ خراب ہوتی ہے۔ (ہاہا) اس کے باوجود ہم رسالہ شیر نہ کریں یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ ویسے تو سب رائٹرز ہی بہت اچھا لکھتی ہیں لیکن آج کل سائرہ رضا ہر طرف چھائی ہوئی ہیں۔ ج۔ ایبہا سلوی، شمو اور الماس! جل کر محبت سے رہنے میں بہت برکت ہے۔ آپ اپنی دوستوں کو اپنا رسالہ پڑھنے کے لیے دیتی ہیں۔ یہ آپ کی فراخ دلی ہے۔ رسالہ یا کتاب کسی کو دینے کے لیے بہت ہمت کی ضرورت ہے ہم ان سطور کے ذریعے آپ کی دوستوں سے التماس کر رہے ہیں کہ وہ آپ کو رسالہ صحیح سالم حالت میں واپس کریں۔

صائمہ سعید۔ لاہور

عفت سحر طاہر کے ناول کی آٹھویں قسط بے حد انٹریٹنگ تھی۔ فریدہ اشفاق کی تحریریں کافی عرصے سے نظر نہیں آئیں افسانوں میں سب سے اچھا افسانہ صدف آصف کا زندگی ہو تم تھا۔ رضیہ مہدی کا ناول پڑھ کے دل غمگین ہو گیا۔ تنزیلہ ریاض کے ناول کی رائے اختتام پذیر ہونے تک محفوظ ہے۔ نایاب جیلانی کا ناول پڑھ کے صبر ایثار قربانی کے نئے سبق سیکھنے کو ملے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عورت کے اندر مرد سے زیادہ صبر رکھا ہے۔

ج : صائمہ! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے تمہ دل سے شکریہ۔

صوفیہ مدثر، عمیریہ کوثر۔ سعادت پور جہلم السلام علیکم! سرورق بہت اچھا تھا۔ کافی عرصے کے بعد نایاب آئی۔ ایک دھماکے کے ساتھ۔ بہت بہت بہت اچھا ناول لکھا۔ میں حیران ہوں کہ جزائیں اتنا صبر۔ اور آکل ایک بہترین اسٹوری تھی۔ ایک ہی نشست میں پڑھنے کا مزہ آگیا۔ ”عبدالست“ تنزیلہ ریاض کی ایک بہترین کاوش جو پڑھنے والے پر اپنا سحر طاری کر دیتی ہے۔ ”بن ماگنی دعا“ عفت چونکہ میری 4 سالہ بیٹی کا نام ہے اس لیے عفت کی ہر تحریر مجھے پسند ہے۔

صدف آصف تیزی سے ہماری پسندیدہ بنتی جا رہی ہیں۔ ”زندگی ہو تم“ بہترین افسانہ تھا۔ لیکن صدف ایسی ساس کہاں پائی جاتی ہے ضرورت پائیے گا۔ نکتہ سیم اور عائشہ فیاض کے افسانے اچھے تھے۔ ”سدا حار و روثہ“ کا افسانہ پڑھ کر تھکن پڑھ گئی۔ عورت کی بھی کیا زندگی ہے۔ اگر اسے قدر دان مل جائے تو زندگی جنت اور اگر نہ ملے تو جہنم سے بھی بدتر۔ تبصرے سب کے اچھے تھے۔ لیکن عائشہ خان ٹاپ آف دی لسٹ رہیں۔ ہمیں لیمن جوس کو محفوظ کرنے کا کوئی طریقہ بتائیں کہ لیموں کو نچوڑ کر کیسے محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ فریز کر کے یا کوئی اور طریقہ ہے۔ عدنان بھائی کے مشورے ہمیشہ زبردست ہوتے ہیں۔ بیوٹی بکس بھی ہمیشہ کی طرح اچھا تھا۔

ج : صوفیہ اور عمیریہ! لیمن جوس کو محفوظ کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ آپ لیموں کا رس نکال لیں اور اسے فریج کی ٹرے میں ڈال کر کیوبز کی شکل میں فریز کریں۔ پھر اپنی ضرورت کے مطابق کیوبز نکال کر استعمال کریں۔ نایاب جیلانی کے بھائی اپنے گھر آچکے ہیں اس ماہ یعنی جون کے شعل میں نایاب نے قارئین کا شکریہ ادا کیا ہے۔

آپ نے صحیح سنا ہے، عمیرہ احمد کی شادی ہو چکی ہے۔ رخصت ہو کر وہ لاہور آئی ہیں جہاں ان کے شوہر ڈی سی ہیں۔

کوثر پروین۔ میلسی

”عبدالست“ حسب معمول دلچسپ رہا، عائشہ فیاض کے نام سے ہی ہمارے ارد گرد اجالا ہو گیا۔ موضوع بہت

ہی اچھا تھا۔ کاش سعدیہ جیسے کردار کہانیوں کے علاوہ حقیقت میں بھی دیکھنے کو ملیں ”رہو گی وہی“ پڑھتے ہوئے آغاز سے اختتام تک مسکراتے رہے۔ ”ہری چک“ سادہ سا افسانہ۔ نکتہ آبی کا چاہے کوئی طویل ناول ہو یا افسانہ ہر ہیروئن اتنی خوب صورت ہوتی ہے کہ بس ”دانت جیسے موتی“ آنکھیں غزال، گال گلال، ہونٹ لال اور بال! اتنے لمبے اتنے لمبے کہ ختم ہی نہیں ہوتی لبالبی۔ عنیزہ آبی نے اس بار کمال کیا۔ ان کی تحریر بے مثال ہے اور اب آخر میں ”عدل اور جزا“ خوب صورت نام و تحریر پڑھتے ہوئے کتنے آنسو ٹوٹے۔ کچھ پتا نہ رہا ہمارا دل تو بس جوتی کے دکھوں اور مشقتوں پر ٹپتا رہا۔ جو لوگ اپنی اولاد سے بے پناہ محبت کرتے بلکہ عشق کی حد تک چاہتے ہیں وہ کیسے دوسروں کی اولاد سے اتنی زیادہ نفرت کر لیتے ہیں۔

ج : پیاری کوثر! طبیعت کی خرابی کے باوجود آپ نے ہمیں خط لکھا، بہت شکریہ۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت و سکون عطا فرمائے۔ آئین۔ خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

سب لوگ تو ایسے نہیں ہوتے لیکن کچھ لوگ جو تنگ دل اور ذہنی پستی کا شکار ہوتے ہیں۔ وہ اپنی اولاد سے تو محبت کرتے ہیں لیکن دوسروں کی اولاد۔

عظمیٰ یونس۔ مردان طورو

کوہ گراں انتہائی نفیس ناول ہے۔ پلیز عنیزہ جی! ماہ نور اور سعد کے ساتھ کچھ برانہ ہونے دیں۔ رابعہ انعم کا انٹرویو بہت اچھا رہا۔

”بن ماگنی دعا“ اب بہت انٹریٹنگ ہوتی جا رہی ہے خدا کریں معیزہ اور ایبہا مل جائیں۔ ماہ تمام بھی اچھا تھا۔ لیکن سب سے زیادہ مصنفین سے سروے جس میں رائٹرز کے بارے میں پتا چل جاتا ہے۔

تنزیلہ ریاض کا عبدالست جو ابھی ابتدائی تعارف میں ہے۔ مجھے لکھنے اور کالج میں پڑھانے کا بہت شوق ہے دعا

کریں کہ میرے یہ ارمان پورے ہو جائیں۔ پیاری عظمیٰ! ہم دعا گو ہیں اللہ تعالیٰ آپ کے سارے ارمان پورے کریں۔ آئین، ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ کے پچھلے خط شائع نہ ہو سکے۔ خواہش کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔



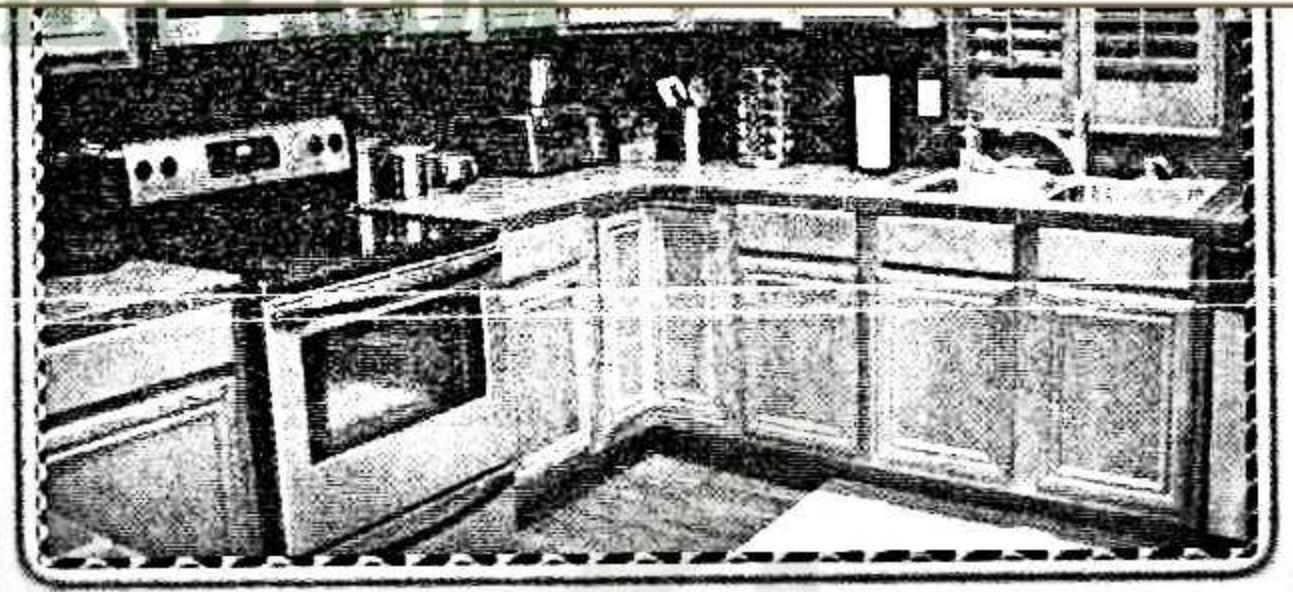
قارئین متوجہ ہوں!

- 1 خواتین ڈائجسٹ کے لیے تمام سلسلے ایک ہی لفافے میں بھجوائے جاسکتے ہیں۔ تاہم ہر سلسلے کے لیے الگ کانڈ استعمال کریں۔
- 2 افسانے یا ناول لکھنے کے لیے کوئی بھی کانڈ استعمال کر سکتے ہیں۔
- 3 ایک سطر چھوڑ کر خوش خط لکھیں اور صفحے کی پشت پر یعنی صفحے کی دوسری طرف ہرگز نہ لکھیں۔
- 4 کہانی کے شروع میں اپنا نام اور کہانی کا نام لکھیں اور اختتام پر اپنا مکمل ایڈریس اور فون نمبر ضرور لکھیں۔
- 5 مسودے کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں۔ ناقابل اشاعت کی صورت میں تحریر واپسی ممکن نہیں ہوگی۔
- 6 تحریر روانہ کرنے کے دو ماہ بعد صرف پانچ تاریخ کو اپنی کہانی کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔
- 7 خواتین ڈائجسٹ کے لیے افسانے، خط یا سلسلوں کے لیے انتخاب، اشعار وغیرہ درج ذیل پتے پر رجسٹری کروائیں۔

ادارہ خواتین۔ 37 اردو بازار کراچی۔

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے رچوں ماہنامہ شعل اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ڈی جیٹل یا ڈیٹا بیس میں ڈیٹا کی کاپی اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ صورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔





## آپ کا باورچی خانہ

صائمہ عصمت

کھانا بنانا ایک فن ہے اور اس فن میں ہم تھوڑے بہت ماہر ہیں بقول ہمارے مجازی خدا کے۔ لیکن اس سے زیادہ یہ میری ہالی ہے۔ اس لیے میں نے سوچا کیوں نہ اپنی ہالی سب کے ساتھ شیئر کی جائے اب ذرا سوالات کی جانب آتے ہیں۔

1 پہلا سوال ہر لحاظ سے اہم ہے۔ واقعی کھانا پکانے وقت میں سب سے زیادہ جس بات کا خیال رکھتی ہوں وہ غذائیت اور کھانے میں برکت ہے۔ اس لیے کھانا بنانے سے پہلے بسم اللہ ضرور پڑھتی ہوں اور جہاں پسند کی بات آتی ہے تو ایک بات تو طے ہے۔ اگر آپ کھانا محبت سے بنائیں گے اور چاؤ سے پیش کریں گے تو وہ سب کو ضرور پسند آئے گا۔

2 آج کل موبائل فون نے یہ مسئلہ حل کر دیا ہے تقریباً سارے مہمان بتا کر آتے ہیں اور اگر کوئی بغیر بتائے آجائے تو نوپر اہلم۔ کیونکہ میں چکن فریج میں رکھنے سے پہلے اسے دھو کر نمک ایک چمچ اور ایک چمچ لال مرچ اور دو چمچے دیں گے لگا کر رکھتی ہوں کیونکہ آج کل بچے زیادہ چکن کھانا پسند کرتے ہیں۔

چاہے سبزی میں ہو یا پھر دال میں تو اگر مہمان آجائیں تو جھٹ چکن فریج سے باہر نکالیں اور اس سے مزے داری ڈش تیار کریں جو کہ مہمانوں کو امید ہے ضرور پسند آئے گی۔

### چکن و دال کا جو بادام

اجزا :	ایک کلو
چکن	ایک کھانے کا چمچ
لسن پیسٹ	ایک کھانے کا چمچ
ادریک پیسٹ	ایک کھانے کا چمچ
دہی	ایک پاؤ
بادام	10 سے 15 عدد
ہر ادھنیا	گارنش کے لیے
لال مرچ	ایک کھانے کا چمچ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	دو کپ
کاجو	10 سے 15 عدد
ہری مرچ	8/6 عدد
ترکیب :	

چکن پر دہی اور لسن اور ک پیسٹ لگا کر رکھیں کڑا ہی میں تیل گرم کریں۔ جب تیل گرم ہو جائے تو چکن ڈال کر ڈھکن بند کر دیں۔ آٹھ تیز رکھیں۔ پانچ منٹ بعد پلٹ دیں۔ پھر ڈھکن لگا دیں۔ دس منٹ

تک گوشت اچھی طرح فرائی ہو جائے گا۔ اب چولہا ہلکا کر دیں۔ کاجو اور بادام باریک گرائنڈ کر لیں اور تھوڑا پانی ڈال کر پیسٹ بنالیں اور چکن میں شامل کر دیں۔ جب کھی اوپر آجائے تو ہری مرچ لہبائی میں کاٹ کر ڈال دیں اور ہرے دھنیے سے گارنش کر کے چپاتی یا نان کے ساتھ پیش کریں۔ ان شاء اللہ سب کو پسند آئے گا۔

3 کھانا بناتے وقت مجھے بکرا ہو چکن سخت ناپسند ہے۔ اس لیے میں کھانا بناتے وقت ساتھ ساتھ چیزیں سمیٹنے کی قائل ہوں۔ ہفتے میں ایک بار چکن کینسٹ ضرور صاف کرتی ہوں۔ تاکہ چیزیں بھی ترتیب سے رہیں اور صفائی بھی ہو جائے کیونکہ بعض دفعہ جلدی میں ہم چیزیں ادھر سے ادھر رکھ دیتے ہیں اور مجھے چیزیں ترتیب سے رکھنا بہت پسند ہے اور یہ میں نے اپنے ابو جان سے سیکھا ہے کہ چیز جہاں سے اٹھاؤ وہیں واپس رکھو تاکہ پریشانی نہ ہو اور میرے نزدیک یہ اچھا پکانے والے کی خاصیت بھی ہے۔

4 ناشتا ہمارے گھر ویسا ہی ہوتا ہے جیسا نارمل سب کے گھر میں۔ یعنی پراٹھا اور رات کا سالن یا پھر آلیٹ فرائی انڈا وغیرہ۔ اگر لائٹ کھانے کا موڈ ہو تو پھر ڈبل روٹی کے ساتھ چائے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ چھٹی کے دن یا جس دن میرے شو ہر گھر ہوتے ہیں جو تک وہ بزنس کرتے ہیں۔ میرا دل چاہتا ہے ان کے لیے کچھ اسپیشل بناؤں۔ کیونکہ وہ چھ سال باہر رہے ہیں تو اب ذرا ان کے ناز نخرے اٹھانے کا دل کرتا ہے تو ایک ڈش اکثر بناتی ہوں۔ یہ میں نے دہی قیام کے دوران کھائی تھی اور پھر خود بنائی تو سب نے بہت پسند کی۔ آپ بھی بنائیں اور مزے سے کھائیں۔

### فلافل

اجزا :	ایک کپ
بواکل سیم کی پھلی	ایک کپ
بواکل سفید پنچے	ایک عدد
بڑی پیاز	

لسن پیسٹ  
زیرہ نمک  
ہری مرچ  
سوکھا دھنیا  
سفید تل

دو جوئے  
نہیں کھانے کے چمچ  
ایک چائے کا چمچ  
حسب ذائقہ  
8 سے 10 عدد  
ایک چائے کا چمچ  
تین سے چار چمچے

سیم کی پھلی بواکل کر لیں۔ پھر اس میں سب چیزیں بٹل کے علاوہ شامل کر کے چوپر میں ڈال کر اچھی طرح چوب کر لیں اور پھر پاؤ کی شکل بنا کر تل میں رول کر کے فرائی کر لیں۔ مزے دار فلافل تیار ہیں۔ آپ اسے بریڈ روٹی اور چاول کے ساتھ بھی سرو کر سکتے ہیں۔

5 ہم چونکہ چھوٹے سے قصبہ نما شہر میں رہتے ہیں۔ یہاں ہوٹل نہیں۔ لیکن باہر کھانے کا رواج نہیں۔ ہاں جب ملتان یا کہیں اور جا میں تو پھر کھانا باہر کھاتے ہیں۔ 6 کھانے بناتے وقت موسم کا خیال رکھا جائے تو کھانے کا مزہ دوبا ہوتا ہے۔ جیسے بارش کے موسم میں پکڑے اور چائے سردیوں میں مکی اور باجرے کی روٹی، مکھن اور سرسوں کے ساگ کے ساتھ اور گرمیوں میں دوپہر کے کھانے کے ساتھ ہرے دھنیے اور پودینے کی چٹنی انار دانہ ڈال کر یا پھر کچی کیری کی چٹنی اور ساتھ میں ٹھنڈی ٹھنڈی لسی کھانے کا مزہ دوبا کر دیتی ہے۔

7 اچھا پکانے کے لیے محنت سے زیادہ محبت کی ضرورت ہوتی ہے۔ کھانا بنانے میں محنت تو درکار ہوتی ہے۔ لیکن اگر محبت شامل ہو تو ذائقہ اور برکت دونوں شامل ہو جاتی ہیں۔ میں جو بھی بناؤں میرے شو ہر کتے ہیں کمال کا بنا ہے۔ اس لیے میری کوشش ہوتی ہے جو بھی بناؤں ان کے ساتھ باقی گھر والوں کو بھی کمال ہی لگے۔

8 چکن کی ٹپ۔

اگر چاول نئے ہیں تو ان کو نیم گرم پانی سے دھوئیں اور جب دم پر رکھنے لگیں تو سوکھی روٹی کا ٹکڑا رکھ کر دم دیں چاول ڈھیلے نہیں ہوں گے۔



## جب اچانک مہمان آجائیں.....

### صباح

لسن، مرچ پیسٹ  
نمک، تیل  
ترکیب :  
دو دو چائے کے چمچے  
حسب ذائقہ و ضرورت

نماز کو لمبائی میں کٹ کر بیچ نکال دیں۔ تیل گرم کر کے نماز کو ہلکا سا فرانی کر کے نکال لیں۔ اسی تیل میں چوپ کی ہوئی ایک پیاز لسن اور ہری مرچ کا پیسٹ ڈال کر کچھ دیر بھونیں، پھر چکن ڈال دیں۔ پانچ منٹ فرانی کریں۔ چکن گل جائے تو پسی کالی مرچ، کئی لالی مرچ، نمک اور لیموں کا رس ڈال کر روغن آنے تک پکائیں۔ دس میں نکال کر فرانی کیے ہوئے نماز کس کر کے پیش کریں۔

### سنگاپوری فرائیڈ رائس

ضروری اجزا :  
بغیر ہڈی کا چکن  
ایک پاؤ  
آدھا کلو  
دو کپ  
آدھا کپ  
حسب ذائقہ و ضرورت

گرم تیل میں کیوبز میں کٹی سبزیاں ہلکی فرانی کریں۔ پھر چکن کے ساتھ ایک چمچ سفید پسی مرچ، سرکہ، دو چمچے دو سٹر ساس اور نمک ڈال کر تیز آگ پر تیزی سے کس کریں۔ ایک کئی ابلے چاول شامل کر کے مزید چند منٹ پکائیں۔ چاول اور آمیزہ اچھی طرح کس ہو جائے تو گرم گرم پیش کریں۔

### چکن بادامی کشکش

ضروری اجزا :  
چکن کا قیرہ  
بادام  
آدھا کلو  
آدھا کپ

مہمانوں کی غیر متوقع آمد جہاں حیرت آمیز خوشی کا باعث بنتی ہے وہیں فوری طور پر "ان کی تواضع کیسے کی جائے" کا مسئلہ بھی گھیر لیتا ہے۔ اس ماہ ہم نے کوشش کی ہے آپ کو ایسی دس شے سے متعارف کروانے کی جو کم وقت، کم بجٹ میں تیار بھی ہو سکیں، ڈالتے میں بھی منفرد ہوں اور مہمان بھی آپ کی مہمان نوازی کی تعریف کرتے ہوئے رخصت ہوں۔

### مرغ ناریل مسالا

ضروری اجزا :  
چکن  
تازہ چھوٹا ناریل  
دہی، کریم  
سرخ، سفید مرچ  
نمک، تیل  
ترکیب :  
ایک کلو  
ایک عدد  
آدھا آدھا کپ  
آدھا آدھا چائے کا چمچ  
حسب ذائقہ و ضرورت

ناریل کو بلینڈ کر کے باریک پیسٹ بنالیں۔ تیل گرم کر کے دو پیاز سنہری کریں، پھر چکن اور ایک کھانے کا چمچ لسن اور ک پیسٹ شامل کر کے بھونیں۔ پانی خشک ہو جائے تو نمک، سرخ و سفید پسی مرچ ڈال دیں۔ تھوڑی دیر بھوننے کے بعد ناریل پیسٹ شامل کریں اور ڈھک دیں۔ ناریل کا پانی خشک ہونے لگے تو دہی اور ایک چمچ آمیزہ ڈال کر خوب بھونیں۔ جب روغن آنے لگے تو ہلکے ہلکے کریم کس کر دیں۔ پانچ منٹ دم پر رکھ کر نان یا چپاتیوں کے ساتھ پیش کریں۔

### چکن فرائیڈ ٹماٹو

ضروری اجزا :  
چکن بغیر ہڈی کا  
ٹماٹر  
لیموں کا رس  
آدھا کلو  
چھ عدد  
دو چائے کے چمچے

ابلے آلو  
انڈا  
کارن فلور  
نمک، تیل  
ترکیب :  
چار عدد  
ایک عدد  
دو چائے کے چمچے  
حسب ذائقہ و ضرورت

تین کھانے کے چمچے تیل میں قیرہ ڈال کر فرانی کریں۔ پانی خشک ہو جائے تو پیالے میں نکال کر کتر۔ ہ ہوئے بادام میٹھ کیے ہوئے آلو، ایک ایک چائے کا چمچہ سرخ مرچ، چاٹ مسالا، بھنا زیرہ، سویا ساس، کارن فلور، انڈا اور نمک ڈال کر خوب اچھی طرح کس کریں۔ حسب پسند شیب میں گٹس بنا کر ہلکے تیل میں گٹس۔ سنہری ہو جائیں تو پچن پیپر پر نکال لیں اور گرم گرم پیش کریں۔

### چکن میکرونی

ضروری اجزا :  
بغیر ہڈی کا چکن  
ابلے مٹر، ابلے میکرونی  
میدہ، مکھن  
نمک، تیل  
ترکیب :  
ایک کپ  
ایک ایک کپ  
دو دو کھانے کے چمچے  
حسب ذائقہ و ضرورت

دو کھانے کے چمچے تیل میں دو لسن کے جوے چوب کر کے سنہرا کریں۔ پھر ابلے چکن ڈال کر تھوڑی دیر تک فرانی کر کے الگ نکال لیں۔ اور ریٹے کر لیں۔ اسی تیل میں مکھن اور میدہ کس کریں، پھر نمک اور سرخ پسی مرچ ڈال دیں۔ مسلسل چمچہ بلا لیں۔ آمیزہ گاڑھا ہو جائے تو پیالے میں نکال کر ابلے ہوئی میکرونی، چکن، مٹر اور تین کھانے کے چمچے کریم ڈال کر چمچے سے اچھی طرح کس کریں اور پیش کریں۔

### جھٹ پٹ فروٹ فالوور

ضروری اجزا :  
دودھ  
لال شربت  
رنگین سویاں  
جیلی  
ایک کلو  
آدھا کپ  
ایک کپ  
ایک پکٹ

فروٹ کاک ٹیل  
ایک چھوٹا ڈبا  
ترکیب :

دودھ پکا کر تین پاؤ کر لیں۔ ٹھنڈا کر کے لال شربت ملائیں اور فریزر میں رکھ دیں۔ (فریج میں پہلے سے رکھا دودھ لے لیں تو اسے اتنا پکانے کی ضرورت نہیں ہوگی) جیلی جما کر چوکور کٹ لیں۔ سویاں ابلال لیں۔ حسب ضرورت بادام اور پستہ باریک کتر لیں۔ ایک بڑے گلاس میں تھوڑی سی رنگین سویاں، فریزر والے دودھ کے دو بڑے چمچے، تھوڑے سے پستہ بادام، جیلی اور فروٹ کاک ٹیل کس کریں اور مزید ٹھنڈا کر کے پیش کریں۔

### بنانا فروٹ کرئج

ضروری اجزا :  
دودھ  
بنانا کسٹرو  
چینی  
جیلی  
کیلے  
کرئج  
ایک کلو  
چار کھانے کے چمچے  
ایک کپ  
ایک پکٹ  
آدھا عدد  
آدھا کپ

کرئج بنانے کے لیے فرانگ پان میں آدھا کپ چینی اور آدھا کپ پانی ملا کر شیرہ بنالیں۔ جب شیرہ گاڑھا ہو جائے تو ٹھنڈا کر کے جمائیں اور چورا کر لیں۔ آدھا کپ ٹھنڈے دودھ میں کسٹرو پاؤڈر حل کریں۔ باقی دودھ گرم کر کے اس میں چینی ملائیں اور پھر کسٹرو ڈال کر پکائیں۔ جیلی جما کر چوکور کٹ لیں۔ پیالے میں آدھی جیلی ڈالیں۔ پھر کرئج شامل کریں اور سب سے آخر میں بنانا کسٹرو ڈالیں۔ اسی طرح ایک اور تمہ لگائیں۔ سب سے اوپر جیلی کے مزید چند کلوے رکھ کر فریج میں رکھ دیں۔ ٹھنڈا ہونے پر کھانے کے ساتھ پیش کریں۔





میں بے حد دکھی لڑکی ہوں اور آپ سے وہ سب کچھ کہہ رہی ہوں جو میں ایک دوست اور ہمدرد سے ہی کہہ سکتی ہوں۔ میں میٹرک پاس ہوں۔ امی نے میری شادی اپنی مرحومہ بہن کے اکلوتے لڑکے سے کر دی جو بے روزگار اور ان پڑھ ہے۔ یہ شادی صرف اس وجہ سے ہوئی کہ خالہ جب فوت ہونے کو تھیں تو انہوں نے میری امی سے کہا میرے بیٹے کو اپنا بیٹا سمجھنا اور اس کو اپنی فرزندگی میں لے لینا ورنہ میری روح کو کبھی چین نہ آئے گا خالہ کے فوت ہونے کے بعد خالو نے اپنے بیٹے کی پرورش کچھ اس طرح کی کہ صبح اسے اپنے ساتھ دکان پر لے جاتے اور شام کو گھر لے آتے۔ انہوں نے اپنے بیٹے کو پڑھایا بھی نہیں اور نہ ہی کوئی کام سکھایا۔ عدنان بھائی میں کھاتے پیتے گھرانے کی لڑکی ہوں۔ میرے بھائیوں کے ماشاء اللہ اچھے کاروبار ہیں اور وہ پڑھے لکھے ہیں۔ میری ایک بہن شادی شدہ ہے جو اپنے شوہر کے ساتھ امریکہ میں مقیم ہے۔ ہمارے خاندان میں بہت پڑھے لکھے لڑکے ہیں۔ میرے لیے بھی بہت سے رشتے آئے۔ میری پھوپھی کا لڑکا جو شریف بھی ہے اور اچھے عہدے پر فائز ہے میں اسے پسند کرتی تھی۔ وہ بھی مجھے بہت چاہتا تھا۔ میری پھوپھی نے میرا رشتہ مانگا تو امی نے انکار کر دیا۔ میری پھوپھی نے کہا کہ کیوں تم اپنی خوب صورت اور سلیقہ شعار لڑکی کی زندگی برباد کرنے پر تلی ہوئی ہو جبکہ وہ لڑکا کوئی کام بھی نہیں کرتا اور نہ ہی پڑھا ہوا ہے۔ تمہاری بیٹی کا گزارہ کیسے ہو گا۔

یہاں تک کہ میرے سب بہن بھائیوں نے اس شادی کی مخالفت کی مگر امی نے کہا کچھ بھی ہو جائے۔ میں یہ شادی کر کے رہوں گی۔ اگر یہ شادی نہ ہوئی تو میں خود کشی کر لوں گی۔

عدنان بھائی! امی جب ایک بات کہہ دیں تو وہ پوری کر دکھاتی ہیں۔ مجبوراً میں نے ان کو بچانے کے لیے ہاں کر دی۔ اب میری شادی ہوئے چھ ماہ ہونے کو ہیں جو کوئی دیکھتا ہے افسوس سے کہتا ہے کہ ماں نے جان بوجھ کر بیٹی کی زندگی برباد کی۔ میں جب لوگوں کی باتیں سنتی ہوں تو اپنی قسمت پہ خون کے آنسو روتی ہوں اور کبھی بھی میں اتنی دل برداشتہ ہو جاتی ہوں کہ خود کشی کرنے کو جی چاہتا ہے۔

ج: اچھی بہن! آپ کا مسئلہ بہت اہم ہے۔ آپ نے یہ خط شادی سے پہلے لکھا ہو تا تو میں آپ کو مشورہ دیتا کہ آپ کسی حال میں بھی اس شادی کو قبول نہ کریں۔ آپ کے گھر میں والد بھائی سب تعلیم یافتہ ہیں۔ اسلام میں اس بات کی تاکید کی گئی ہے کہ لڑکی کی شادی ہم پہلے لڑکے سے کی جائے تاکہ لڑکی اسے کمتر نہ سمجھے ویسے بھی جیب آپ کی مرضی نہیں تھی تو آپ کی والدہ کو زبردستی نہیں کرنا چاہیے تھی۔ زبان انہوں نے بے شک دی تھی لیکن شادی کے لیے والدین کے ساتھ ساتھ لڑکی اور لڑکے کی رضامندی بھی ضروری ہے جب آپ راضی نہیں تھیں تو اس طرح زبردستی شادی کسی طور جائز نہیں تھی۔

مسئلہ یہ ہے کہ اب آپ کیا کریں۔ اس صورت میں پہلی بات تو یہ دیکھنا ہے کہ آپ کا شوہر کوئی کام نہیں کرتا تو گزر اوقات کیسے ہوتی ہے کیا آمدنی کا کوئی متبادل ذریعہ ہے بہر صورت گھر تو چلانا ہے۔ ابھی آپ دو ہیں۔ آگے چل کر بچے بھی ہوں گے تو کیا سلسلہ ہو گا۔ آپ خود بھی زیادہ تعلیم یافتہ نہیں کہہ جاب وغیرہ کر سکیں۔

آپ اپنی والدہ سے بات کریں۔ اگر آپ کے والد اور بھائی تعاون کرے ہیں اور آپ کے شوہر کو کوئی کاروبار کرنے میں مدد دینے پر آمادہ ہیں تو یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ آپ کی اس حد تک ناپسندیدگی کہ آپ موت کی دعائیں کرتی ہیں اور خود کشی کے بارے میں سوچتی ہیں تو سنجیدگی سے اپنا جائزہ لیں اگر خود کو کسی طور اس کے ساتھ پر آمادہ نہیں یا نہیں تو بہتر ہے کہ علیحدگی ہو جائے۔ بچے ہونے کے بعد اگر علیحدگی ہوئی تو مزید خرابیاں ہوں گی۔

صباحت... لاہور

س: میری شادی غیروں میں ہوئی ہے۔ کچھ لوگوں نے رشتہ بتایا۔ ان کے گھر والے دیکھنے آئے لڑکا لندن میں تھا۔ گھر والوں نے اپنے طور پر چھان بین کی اور رشتے کے لیے ہاں کر دی۔ شادی سے پہلے ہم لوگوں نے ان کی تصویر دیکھی تھی۔ شادی سے پہلے وہ آئے۔ ہر لحاظ سے مناسب تھے۔ گھر والے ان سے مل کر مطمئن ہو گئے، شادی ہو گئی۔ شادی کے بعد وہ چھ ماہ میرے ساتھ رہے۔ ہر طرح سے خیال رکھتے تھے۔ بہت والہانہ نہ سہی، لیکن ان کا رویہ خراب بھی نہیں کہا جاسکتا۔ سسرال والوں کا رویہ بھی بہت اچھا تھا۔ میں بہت خوش تھی شادی کے چھ ماہ بعد وہ باہر چلے گئے۔ انہوں نے کہا کہ وہ کاغذات بنوا کر بہت جلد مجھے بلا لیں گے۔ اب ڈیڑھ سال کا عرصہ گزر گیا ہے۔ وہ فون پر بات کرتے ہیں تو تسلی بخشی دیتے ہیں کہ جلد بلا لیں گے۔ لیکن اب ایسا انکشاف ہوا ہے جس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا ہے۔ پتا چلا ہے کہ موصوف کی دو شادیاں ہو چکی ہیں۔ ایک لندن میں ہے۔ ایک پاکستان میں ہے۔ دونوں بیویوں سے بچے ہیں۔ میرے ساس مسر زندہ نہیں۔ دیور، جٹھ کے ساتھ رہنا بہت مشکل تھا۔ میں اپنے گھر واپس آ گئی، لیکن میرے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ صرف ماں ہیں، لیکن نہ ہونے کے برابر، کیونکہ اب گھر بھائیوں اور بھابیوں کا ہے۔ مجھے بتائیے کیا کروں؟

ج: صباحت! آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ کے بچے نہیں ہیں۔ ورنہ اور مشکلات کا شکار ہوتیں۔ مشکل ہے کہ وہ شخص اب لوٹ کر آئے یا آپ کو بلائے۔ اس کو تو اپنے بچوں کی بھی پروا نہیں ہے۔ اس نے آپ کے ساتھ صرف کھیل کھیلا ہے۔ ورنہ دو بیویوں اور بچوں کے ہوتے اسے شادی کی کیا ضرورت تھی۔ یہ اچھی بات ہے کہ آپ ایک بڑے شہر میں رہتی ہیں جہاں آپ کو بہت سے مواقع حاصل ہیں۔ آپ کی انگریزی اچھی ہے۔ لاہور میں ایسے اسکول ہیں جہاں انگریزی بولنے اور لکھنے کی بنیاد پر ملازمت مل جاتی ہے۔ آپ کو شش کریں کہ آپ کسی ایسے اسکول میں ملازمت مل جائے کیونکہ یہاں تنخواہ بہت معقول ہوتی ہے۔ اپنے پیروں پر کھڑی ہوں گی تو اعتماد بڑھے گا، کیونکہ اس شخص نے تو آپ کو خرچ کے نام پر کچھ بھی نہیں بھیجا۔ ایک اچھی ملازمت حاصل کرنے کے بعد آپ اس سے صاف صاف بات کریں، اسے بتادیں کہ آپ اس کے بارے میں سب کچھ جان چکی ہیں۔ اب اگر وہ آپ کے حقوق ادا کر سکتا ہے تو ٹھیک ہے، ورنہ فوراً "خلع" کی درخواست دیں۔ فیصلہ آپ کو کرنا ہے۔ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں جب ایسی صورت حال پیش کی جاتی تھی کہ جب عورت شوہر کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی یا اس کا شوہر کے ساتھ رہنا گراں ہوتا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم طلاق دلوادیتے تھے۔

اس سلسلے میں ایک واقعہ ہے جو ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضرت ثابت بن قیسؓ کی المیہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں اور عرض کیا میں ثابتؓ کے دین اور اخلاق پر کوئی اعتراض نہیں کرتی، لیکن میرے لیے ایک بیوی کی حیثیت سے اس کے ساتھ خوش دلی کے ساتھ رہنا ممکن نہیں ہے۔ (ثابتؓ میں خوش شکل نہ تھے) میں کراہت کے ساتھ بیوی بن کر رہنے کو کفر (ناشکری) سمجھتی ہوں۔ تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ باغ جو صحابی نے مرثیہ دیا تھا واپس کرا کے جدائی کرا دی۔

مطلب یہ ہے کہ ناگزیر وجوہ کی بنا پر علیحدگی حاصل کرنا گناہ نہیں۔ ویسے بھی ابھی آپ کی عمر زیادہ نہیں۔ بچے بھی نہیں ہیں۔ علیحدگی کے بعد کوئی بہتر صورت نکل سکتی ہے۔



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ٹھیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو امیل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر ویو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریٹخ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سریم کوالٹی، ہمارے کوالٹی، کمپریڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریٹخ
- ☆ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

ہوئی کریم استعمال کریں۔ صابن کے استعمال میں بھی احتیاط کریں۔ رات سونے سے پہلے آدھا کپ نیم گرم پانی میں ایک چمچہ بورک ایسڈ ڈال کر روئی کے پھاہے کی مدد سے سرخ دانوں پر لگائیں۔ اور خشک ہونے پر پانی سے دھولیں۔

ہونٹوں کی سیاہی کے لیے ہر رات سونے سے پہلے زیتون کے تیل میں لیموں کا عرق ملا کر لگائیں۔ آپ کے ہونٹ گلابی ہو جائیں گے۔

فاتزہ نورین.... لاہور

س۔ میرا پیٹ بہت بڑھ گیا ہے۔ کوئی ایسی ورزش بتائیے کہ میرا پیٹ ٹھیک ہو جائے۔ میرا وزن پچپن کلو اور قد پانچ فٹ ایک انچ ہے۔

ج۔ فاتزہ بہن! آپ نے اپنی عمر نہیں لکھی۔ بہر حال قد کے لحاظ سے آپ کا وزن کافی زیادہ ہے۔ آپ کو کم از کم پانچ کلو وزن کم کرنا چاہیے اور خوراک کے ساتھ ساتھ ورزش پر بھی توجہ دیں۔

وزن کم کرنے کے لیے سب سے بہترین ورزش روزانہ باقاعدگی سے چل قدمی کرنا ہے۔ کم از کم آدھا گھنٹہ روزانہ پیدل چلیں۔

پیٹ کم کرنے کے لیے درج ذیل ورزش کریں۔ فرش پر سیدھی لیٹ جائیں اور اپنے دونوں پاؤں کسی میز یا صوفے کے نیچے پھنسائیں، تاکہ یہ ورزش کے دوران اوپر نہ اٹھیں۔ اپنے دونوں ہاتھوں کو گردن کے پیچھے اس طرح رکھیں کہ ایک دوسرے کی انگلیاں آپس میں پوسٹ ہوں۔

اب اپنے جسم کے اوپری حصے کو اوپر کی طرف اس طرح اٹھائیں کہ آپ سر سے گھٹنے کو چھو سکیں یا پھر آپ اپنے سر کو جس حد تک گھٹنے کے قریب لے جاسکیں اس دوران کمر بالکل سیدھی رکھیں۔ ابتدا میں یہ مکمل چار بار کریں۔ آہستہ آہستہ بڑھا کر پندرہ تک لے جائیں۔



امت الصبور

# بیوٹی ٹیکس



حرم اقبال.... کراچی

س۔ آج کل گرمی کا موسم ہے۔ میرا کام ایسا ہے کہ مجھے دھوپ میں باہر نکلنا پڑتا ہے۔ دھوپ کی وجہ سے میرا چہرہ جھٹکس گیا ہے اور رنگ سیاہ پڑ گیا ہے۔ میرے چہرے پر باریک باریک سرخ دانے بھی ہیں۔ اس کے علاوہ میرے ہونٹ بھی سیاہ ہیں۔ کوئی ایسی ترکیب بتائیں کہ میرے ہونٹ گلابی ہو جائیں۔

ج۔ حرم! آپ نیم گرم پانی سے چہرہ دھونے کے بعد اس پر ٹماٹر کا رس ملیں۔ دھوپ کا اثر ختم ہو جائے گا اور چہرے کا رنگ نکھر آئے گا۔ باریک دانوں کی وجہ الرجی ہو سکتی ہے۔ آپ چہرے پر اچھی کمپنی کی بنی